طنزیات و مقالات

سیّد محفوظ علی بدایونی

+++

مؤلفہ
محمد محی الدّین بدایونی، بی۔اے

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۔۱

۱۹۳

طنزیات و مقالات

سیّد محفوظ علی بدایونی

Marfat.com

Marfat.com

طنزیات و مقالات

سیدّ محفوظ علی بدایونی

مؤلف

محمد محی الدین بدایونی بی اے

Marfat.com

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو شمارہ ۳۵۹

13/263

اشاعت اول ۱۹۷۴ء
تعداد گیارہ سو
طابع انجمن پریس۔ شو مارکیٹ کراچی
قیمت

Marfat.com

فہرست مضامین

۱۔ تمہیدات

انتساب	مؤلف	۱۱
ہدیۂ سپاس	مؤلف	۱۲
حرفے چند	جمیل الدین عالیؔ	۱۳
حرفِ آغاز	محمد محی الدین بدایونی	۱۷
سیّد محفوظ علی بدایونی	سیّد ابن علی بدایونی	۲۵
ذکرِ میر	ضیا احمد بدایونی	۴۸

۲۔ مقالاتِ محفوظ علی

حصہ اوّل۔ علی برادران کی رفاقت

بلبلانِ اسیر کی رہائی	۷۷
محمد علی کی یاد میں	۹۷
محمد علی	۱۰۷

حصہ دویم۔ طنز و مزاح

غیر معمولی جلسہ	۱۳۹
کارروائی جلسہ	۱۴۴

Marfat.com

پروفیسر قطرب کی تقریر ۱۵۲

خطابات ۱۶۰

چھوٹے کامریٹ صاحب کی پابندی ۱۶۱

حاجی صاحب کی تقریر اور کارروائی جلسہ ۱۶۹

حاجی صاحب کی تقریر ۱۸۶

حاجی صاحب کی تقریر جنگ پر ۱۹۵

شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں ۲۰۷

بدایوں کی نمائش ۲۲۰

مسٹر صاحب دین ۲۲۱

اتحاد بین المسلمین والہنود ۲۴۶

حصہ سویم ۔ افسانے

شوہر کا شکار ۲۶۷

تلوّن ۲۸۴

انجمن نافرین زواج ۲۹۷

حصہ چہارم ۔ تنقید و تبصرہ

اردو رسائل پر ایک نظر ۳۰۹

مستانی جوگن اور اورنگ زیب ۳۲۵

حصہ پنجم ۔ سفرنامہ

افریقہ کا مسافر ۳۵۵

حصہ ششم ۔ مسئلہ زبان

اردو ہندی ۳۷۱

صوبجات متحدہ ۳۸۰

حصہ ہفتم۔ تحقیقات عالیہ

میاں	۳۹۲
خطاب	۴۰۶
عربی ہندسے	۴۵۸
عربی رقوم	۴۷۳
شہاب ثاقب	۴۸۱
تعلیم کا اثر اقوام کے نشو و نما پر	۴۸۲

حصہ ہشتم۔ تاریخ

مگر	۵۰۷
مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب	۵۱۴
روٹیوں کی جنگ	۵۲۷
نقلِ مکان	۵۳۵
نظامت بابِ ہند	۵۶۶

۳۔ حدیثِ دیگراں

حدیثِ دیگراں (۱) ۶۰

سبطین احمد بدایونی — محمد رضی الدین فرشوری بسمل بدایونی۔ — مؤلف

عبدالحق — تمکین کاظمی — مؤلف

حدیثِ دیگراں (۲) ۶۵

عبدالحق — بالیو رضا احمد بدایونی — حفیظ جالندھری

ابوالاعلیٰ مودودی — تمکین کاظمی — مؤلف

حدیثِ دیگراں (۳) ۷۵

عبدالحامد بدایونی — مؤلف — عبدالحق

Marfat.com

حدیث دیگراں (۴) ۹۳

رشید احمد صدیقی — سید عبداللہ — عبدالسلام خورشید — رئیس احمد جعفری

مولف — محمد علی جوہر — محمد علی جوہر — مولف

حدیث دیگراں (۵) ۱۰۴

رشید احمد صدیقی۔ — مولف۔ قاضی عبدالغفار۔ — مولف

رازق الخیری

حدیث دیگراں (۶) ۱۲۳

سید ہاشمی فرید آبادی — عبدالحق — عبدالسلام خورشید — مولف

رشید احمد صدیقی — سید سلیمان ندوی — محمد علی جوہر۔ — مولف

مہدی افادی — اللہ بخش یوسفی — نامہ نگار "ہمدرد"۔ — مولف

حدیث دیگراں (۷) ۱۴۹

وزیر آغا — غلام احمد فرقت — مولف

حدیث دیگراں (۸) ۱۷۰

ضیاالدین احمد برنی

حدیث دیگراں (۹) ۱۷۴

خواجہ حسن نظامی — ملا واحدی — وزیر آغا۔ — مولف

حدیث دیگراں (۱۰) ۱۸۴

عبدالماجد دریا بادی — عبدالماجد دریا بادی۔ — عبدالماجد دریا بادی۔

حدیث دیگراں (۱۱) ۱۹۳

تمکین کاظمی۔ — مولف۔ عبدالماجد دریا بادی۔ عبدالماجد دریا بادی

حدیث دیگراں (۱۲) ۱۹۸

گیان چند — کلیم الدین احمد — خورشید الاسلام۔ — مولف

غلام احمد فرقت — رشید احمد صدیقی — وزیر آغا — رشید احمد صدیقی

Marfat.com

رشید احمد صدیقی   مولف ۔ رشید احمد صدیقی   قاضی عبدالغفار

ہاشمی فرید آبادی   ابوالاعلیٰ مودودی۔ رشید احمد صدیقی   مولف

حدیث دیگراں (۱۳) ۲۱۴

عبادت بریلوی   انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا   عبدالحق   مولف۔

محمد سلیمان   سید سلیمان ندوی   ابواللیث صدیقی

حدیث دیگراں (۱۴) ۲۲۸

کلیم الدین احمد   مولف   غلام احمد فرقت   آل احمد سرور

رشید احمد صدیقی   مولف

حدیث دیگراں (۱۵) ۲۴۵

غلام احمد فرقت   مولف

حدیث دیگراں (۱۶) ۲۶۳

رشید احمد صدیقی   مولف

حدیث دیگراں (۱۷) ۳۰۷

سبطین احمد بدایونی   عبدالسلام خورشید۔   مولف ۔

حدیث دیگراں (۱۸) ۳۵۱

ظفر الملک ۔ حمید احمد خاں ۔ مولف ۔ عبدالحق

حدیث دیگراں (۱۹) ۳۸۷

غلام رسول مہر   ضیا احمد بدایونی۔   مولف   حمید احمد خاں

حدیث دیگراں (۲۰) ۴۰۵

ظفر الملک   محمد سلیمان بدایونی

حدیث دیگراں (۲۱) ۴۸۹

علامہ اقبال   ماہر القادری   مولف   نہال الدین بدایونی

میجر آفتاب حسن   مولف

Marfat.com

حدیث دیگراں (۲۲) ۵۱۲

حسن ریاض محمد سلیمان بدایونی مولف

حدیث دیگراں (۲۳) ۵۶۲

مولف رشید احمد صدیقی آل احمد سرور مولف

حدیث دیگراں (۲۴) ۵۸۲

عبدالحق رشید احمد صدیقی سبطین احمد بدایونی

۴۰. پس نوشت

مے باقی مولف ۵۸۳

گجر شام غریباں کا مولف ۵۸۷

آخری بات مولف ۵۹۲

کتابیات مولف ۵۹۸

Marfat.com

انتساب

میں

اس تالیف کو بصد عجز و عقیدت

مولانا غلام رسول مہر

کے نامِ گرامی سے معنون کرتا ہوں

کہ

وہ عصر حاضر میں بہترین سفیر ہیں اس دورِ ماضی کے جس میں

سیّد محفوظ علی بدایونی

کی

نگارشات پروان چڑھیں

مؤلف

Marfat.com

ہدیۂ سپاس

"حدیثِ دیگراں" کے تحت عباراتِ مستعار کو اس کے بجائے کہ میں اپنے الفاظ کا جولا پہنا کر پیش کرتا میں نے من وعن ضروری حوالہ جات کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہ تمام اقتباسات اس درجہ بلند و برتر ہیں کہ اُن کو کسی اور صورت یا رنگ میں پیش کرنا اُن کی خوبی اور خوش اسلوبی میں خلل انداز نہیں ہوتا۔

میں تمام اُن مصنفین اور ناشرین کا خلوص دل سے سپاس گزار ہوں جن کی تصنیفات اور مطبوعات اس تالیف میں کام آئیں جن کی مختصر تفصیل "کتابیات" میں درج ہے۔ ان میں سے جو حضرات اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اُن پر اللہ تعالیٰ اپنی ابدی رحمتیں نازل فرمائے اور جو حیات ہیں اُن کو تا دیر سلامت رکھے۔ آمین۔

حقیقت یہ ہے کہ "حدیث دیگراں" کے بغیر سید محفوظ علی مرحوم جیسے پاکیزہ اور نمود و نمائش سے بے نیاز ادیب کی شخصیت اپنے حقیقی ماحول میں اجاگر نہیں ہوتی اور نہ ہی اُن کا صحیح درجہ متعین ہوتا۔

میں بالخصوص پروفیسر محمد ایوب قادری کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کے مسودہ کو اول تا آخر مطالعہ کیا اور کئی مفید مشورے دیئے۔ اس کے علاوہ طباعت کے مختلف مراحل میں بھی وہ مددگار رہے۔

—— محمد محی الدین بدایونی

حرفے چند

جمیل الدین عالی

بہت سے اچھے لکھنے والے فرضی ناموں سے بھی لکھتے رہے ہیں۔ اظہارِ ذات کا دباؤ۔ خدمتِ خلق۔ کچھ کہنے کچھ کر گزرنے کی لگن اور مجبوریاں اور کسی کسی فرد کے معاملے میں کبھی شرارت کبھی کم اعتمادی کبھی دیگر عوامل جن کے اتصال یا امتزاج سے فرضی نام وجود میں آتے ہیں۔ یہ تماشا تو بیاتمام مشہور زبانوں میں ہوتا ہے۔ اور اردو میں بھی خوب ہوا ہے۔ مگر یہ موضوع دراصل بجائے خود ایک دلچسپ اور قابلِ تحقیق موضوع ہے اس وقت اس پر سیر حاصل گفتگو کی گنجائش نہیں نہ راقم الحروف اس موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کا اہل ہے۔ فی الحال تو اس بڑے موضوع کے ذیلی موضوع سے متعلق یہ کہنا ہے کہ اس فرضی نام کے ساتھ لکھنے کی روایت بھی بہت ہی بڑے اہلِ کمال کو مدتوں اس خراجِ تحسین سے محروم رکھتی ہے جو ان کا حق ہوتا ہے۔ شاید وہ خود بھی اس امکان سے واقف ہوتے ہیں مگر.....

مولوی محفوظ علی بدایونی ایک عالم فاضل اور طبّاع بزرگ تھے۔ جیسا وہ لکھتے تھے وہ اس مجموعے کی تحریروں سے ظاہر ہوگا۔ جتنا کچھ وہ جانتے تھے ایک ایک سطر اس کی گواہی دے گی مگر آج ہماری نسل اور نئی نسل ان سے کس حد تک واقف ہے۔ شاید کسی حد تک بھی نہیں حالانکہ ان کی شخصیت اور فن پر پہلے کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔

Marfat.com

آج ان کی پیدائش پر ایک سو چار برس اور وفات پر اکیتس برس گزر چکے ہیں مگر اب تک ان کے مضامین کا ایک ہی مختصر سا مجموعہ چھپا ہے۔ وہ بھی انجمن نے چھاپا تھا۔ انجمن نے کیا بابائے اردو نے ۱۹۵۶ء میں "مضامین محفوظ علی" کے نام سے ان کے چند مضمون جمع کر کے ایک مختصر سی کتاب بنا دی تھی کیونکہ اس وقت انھیں بس وہی کچھ ملا تھا اور اس سے زیادہ مواد تلاش کرنے کا یارا نہ تھا۔ اپنے مقدمے میں بابائے اردو نے تحریر فرمایا ہے:

"وہ نام و نمود سے بہت بچتے تھے اور اپنے کام کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ یہ مضامین بھی جو اس مجموعے میں شامل ہیں فرضی ناموں سے لکھے۔ افسوس کہ ہمیں ان کے اتنے ہی مضامین مل سکے۔ باقی اور بھی ہوں گے۔ اگر کبھی ملے تو ان کو بھی شائع کر دیا جائے گا۔"

جہاں انجمن نے بابائے اردو مرحوم کی دوسری کئی ہدایات کو غلامی وصیتیں جان کر ان پر عملدرآمد کی کوشش کی۔ مولوی محفوظ علی صاحب کی تخلیقات کی تلاش بھی جاری رکھی۔ یہ ایک بہت کٹھن کام تھا کیوں کہ انھوں نے ایک نام سے نہیں کئی ناموں سے لکھا ہے۔ اُس وقت کے دانایان راز خود کبھی کے سپرد عدم بن چکے تھے، معلوم محفوظات کا نام ونشان نہیں تھا۔ جہاں بڑے بڑے تازہ زندوں کی تخلیقات معدوم ہو جاتی ہوں وہاں اتنے پرانے مردوں کے ایسے آثار جن پر ان کا نام بھی نہ ہو کیسے دستیاب ہوتے۔ اور مولوی محفوظ علی صاحب کون تھے۔ وہ جنھوں نے مولانا محمد علی مرحوم کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا تھا خواجہ حسن نظامی ان کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ علامہ اقبال ان کے نام کی مالا جپتے تھے۔ اس وقت کے جتنے بڑے بڑے ادیب اور سیاسی زعما تھے کسی نہ کسی طور سے مولوی محفوظ علی بدایونی کی ذہانت طباعی اور فضل و کمال کے قائل رہتے تھے۔ ان کا ایک خزانہ یقیناً ان کا نمذر

جیسا علم تھا لیکن جس ہنر سے انھوں نے اہلِ نظر کو چونکا دیا تھا وہ ان کی طرزِ نگارش تھی، اسلوب، انفرادیت۔ اس وقت کے اردو طنز و مزاح میں غالبؔ و سرشارؔ کے بعد محض پھکڑپن کا ایک شعبہ ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم نے سلاست اور تمیزداری کے ساتھ اپنی بات کہنے کی ایک بڑی خوبصورت وضع پیدا کی۔ ماضی کے بارے میں پیش گوئی ایک فیشن ہو گئی ہے لیکن اردو ادب کے ناقدین خود دیکھیں گے کہ اگر اس پھکڑپن کے زمانے میں مولوی محفوظ علی مرحوم نے اپنی ادائے خاص ایجاد نہ کی ہوتی تو اردو میں طنز و مزاح کی صنف کو شستگی کے ساتھ ابھرنے میں بہت زیادہ وقت لگتا۔ ان کا بویا اگلوں نے خوب کاٹا ہے اور اس کا تاریخی کریڈٹ مولوی صاحب مرحوم کو ملنا چاہیے۔

اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کی تاریخ اپنا ایک الگ تجزیہ طلب کرتی ہے مگر یہاں بھی یہ کہنا پڑے گا کہ مولانا محمد علی مرحوم کے اخبار "ہمدرد" میں مولوی صاحب کا کالم "تجاہل عامیانہ" ان کے بعد کے اور آج کے بہترین کالم نویسوں کا پیش رو ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحریر کی جو بے شمار خوبیاں ہیں وہ پڑھنے والے خود ملاحظہ کریں گے۔ ہم ایک آفتاب کی کتنی کرنیں گنوا سکتے ہیں۔

اس مجموعے کو انجمن تک لانے کا کام ہمارے رفیق کار عباس احمد عباسی مرحوم نے انجام دیا۔ وہ ایک دن ایک بڑا سا پلندہ بڑی خوشی اور اضطراب کے ساتھ اس طرح انجمن لائے جیسے کوئی پیاسا، پیاسوں کی محفل میں ایک برتن شربت سے بھرا ہوا لے آئے۔ ہم ان مرحوم کے ممنون ہیں۔ اس بظاہر چھوٹی سی دوڑ بھاگ کو بھی ان کا احسان سمجھتے ہیں۔

لیکن اس مجموعے کو دریافت اور مرتب کرنے کا سہرا جناب محمد محی الدین انصاری بدایونی کے سر ہے وہ ایک ایسے خاموش کارکن ہیں جنھیں بہت ہی کم حضرات جانتے ہوں گے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک راقم الحروف اور وہ ایک ہی چکّی گھر میں مشقت کرتے تھے۔ ہاں راقم الحروف کھل کر مشق سخن

Marfat.com

بھی کرلیتا تھا اور وہ لب گویا سے کام لینے کی بجائے اندر ہی اندر سلگتے رہتے تھے۔

اب برسوں بلکہ دو قرن بعد دیکھا تو ماشاءاللہ انھوں نے ترتیب و تالیف کا بہت سا کام کر رکھا ہے۔ ان کی خاموش کارکنی کا ایک تحفہ یہ کتاب ہے۔ محی الدین صاحب نے سید محفوظ علی مرحوم صاحب کی صحبت اٹھائی ہے اور سید صاحب کے اثرات ان پر نمایاں ہیں۔ سید صاحب مرحوم کے نیازمندوں میں پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جیسے مشاہیر اہل نقد بھی ہیں مگر قدرت کو یہی منظور تھا کہ سید صاحب کے ادب پاروں کی تدوین و تزئین محمد محی الدین صاحب انصاری بدایونی کے حصے میں آئے۔ محی الدین صاحب انصاری بدایونی کے حصے میں آئے۔ محی الدین صاحب نے کتنی محنت کی ہے یہ بھی پڑھنے والے قدم قدم پر خود محسوس کریں گے۔ مضامین جمع کرنا ایک مرحلہ اور پھر جگہ جگہ ان پر مختلف برمحل آرا کو سمونا ایک غیر مروجہ مگر مستحسن روگ، اتنی محنت کے لیے لگن کے ساتھ ساتھ بہت بڑی صلاحیت درکار تھی۔

ہماری نسل اور نئی نسل اور اردو ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والوں کو محمد محی الدین صاحب کا بہایت ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے ہمارا ایک ایسا اہم تاریخی خزانہ جمع کرکے ہمارے سامنے کھول دیا۔ اب دیکھیے یہ خزانہ کس شان سے جگمگا رہا ہے۔

Marfat.com

حرفِ آغاز

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صد سالہ یادگار منائی جا چکی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی کا موقع تھا۔ اس وقت مجھے شدید احساس ہوا کہ سو سال سے اوپر بیت گئے جب ہمارے عہدِ زرّیں کی شفق کی آخری شعاع تاریخِ عالم کے افق کے اتھاہ دھندلکوں میں ڈوبی تھی۔ بہادر شاہ کی وفات کے چند سال بعد مرزا غالب بھی ایک سیلابِ بلا چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوئے تھے۔ ٹیگور نے ایک جگہ کہا ہے۔ "سورج کے ڈوب جانے پر جو آنسو بہاتے رہتے ہیں، وہ ستاروں کو بھی کھو بیٹھتے ہیں"۔ چنانچہ گزرے ہوئے زمانے کی خاکستر میں ہی ہمیں زندگی کی نئی چنگاریاں تلاش کرنی چاہئیں۔

۱۹۶۹ء آیا اور ہم نے مرزا غالب کی صد سالہ برسی منائی۔ میں نے ایک سال آگے نظر دوڑائی تو خیال آیا کہ ۱۹۷۰ء تو کئی ملکی اور غیر ملکی صد سالہ تقریبات کا سال ہوگا۔ اس سال انگریزی مزاح نگار چارلس ڈکنس کی صد سالہ برسی اور انقلابِ روس کے اشتراکی قائد لینن کی پیدائش کی صد سالہ جوبلی ہوگی۔ اس ادیب کی وفات اور اس رہنما کی ولادت کے وقت ہندوستان میں سر سید احمد خاں اور اُن کے رفقائے کار جنگِ آزادی کے زخموں کے لیے مرہم تلاش کر رہے تھے۔ سر سید کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" اسی وقت جاری ہوا دارالعلوم علی گڑھ کی بھی داغ بیل پڑی۔ اس وقت برصغیر کے بہت سے ہونہار بروا ماضی سے بے خبر اور مستقبل سے بے نیاز ماں کی گود سے لپٹے ہوئے یا جھنگولوں میں لیٹے ہوئے کبھی مسکراتے، کبھی منہ بسورتے بلکتے یا ہاتھ کا انگوٹھا چوسنے کی مشق کر رہے تھے یا پاؤں کے انگوٹھے کو منہ میں رکھنے کی سعیٔ لاحاصل میں مشغول تھے۔ کچھ گھٹنوں کے بل چلنے لگے تھے اور

بچہ ماں کی آنکھ بچتے ہی باہر گلی میں کھیلنے نکل جاتے تھے۔ انھیں میں مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، علامہ راشد الخیری، مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں، اور سید محفوظ علی بدایونی تھے۔ مجھے خیال آیا کہ ۱۹۷۰ء میں ہی سید محفوظ علی کی پیدائش کو ایک صدی بیت گئی اور ان کی وفات کو ستائیس سال ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ اس موقع پر کیوں نہ سید صاحب کی حیات و ادبیات پر نگاہ مکرر ڈالی جائے، کیوں کہ مرور ایام کی گرد کی تہہ اُن پر جم رہی تھی۔ میں نے اس بارے میں سلسلہ جنبانی کی تو کئی بزرگ ہستیوں نے میری ہمت بڑھائی۔ چنانچہ مولانا عبدالحامد بدایونی نے فرمایا ـ " مقام مسرت ہے کہ کراچی میں ابھی مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حضرت مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولوی سید محفوظ علی بدایونی کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ ان میں بعض حضرات تو ایسے ہیں جن کی یادیں منائی جاتی ہیں، لیکن بعض ایسے ہیں جنھیں تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے، حالانکہ وہ اپنی ادبی و علمی خدمات کے لحاظ سے مشہور تھے۔" مولانا عبدالماجد دریابادی نے فرمایا ـ " الحمدللہ کہ مرحوم کی یاد تازہ رکھنے والے ابھی آپ کے جیسے لوگ موجود ہیں۔ مرحوم بڑے ہی مخلص، بڑے ہی شریف، وضعدار اور سچے دین دار تھے اور ساتھ ہی بڑے محتاط ادیب صاحب قلم اور نکتہ رس و متوازن نقاد، اور بہت ہی خوش ذوق بذلہ سنج " پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بھی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کئی کارآمد تحریروں کی طرف توجہ دلائی۔ مولوی سبطین احمد بدایونی نے بھی بڑی پر مقصد رہنمائی فرمائی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، حضرت حفیظ جالندھری، پروفیسر حمید احمد خاں اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی حوصلہ افزائی فرمائی ان اور بہت سے اور حضرات کے علاوہ میں نے اس ارادے کا ذکر مولانا غلام رسول مہر مدظلہ سے کیا۔ انھوں نے نہ صرف اسے سراہا بلکہ ازراہ نوازش اس سلسلے میں اوراقِ پارینہ سے کچھ نوادرات بھی مجھے مرحمت فرمائے۔ میری ہمت بڑھی اور ارادے نے عزم کی صورت اختیار کر لی۔

سید صاحب کے کم و بیش اکیس[۲۱] مضامین تک رسائی آسانی سے ہوگئی۔ انیس[۱۹] ان کے ہم جماعت اور قدیم دوست مولوی عبدالحق نے ۱۹۵۶ء میں "مضامین محفوظ علی" کے نام سے شائع کرائے تھے اور دو "علی برادران" میں شامل تھے[۱]۔ جو سندہ یا بندہ

[۱] دو مضمون محمد ایوب قادری کے ذریعہ "دکن ریویو" سے ملے یہ جلد سید محمد سعید صاحب کے کتب خانے میں محفوظ تھی

پایۂ تکمیل کو پہنچا، سید صاحب کے خلفِ اکبر سید ابن علی صاحب نے اور خود میں نے "دکن ریویو" "ہمدرد" "ملفوظاتِ حاجی بغلول" "نقیب" "انتخاب نقیب" "الناظر" اور علی گڑھ میگزین" سے چن کر مضامین فراہم کیے۔ ان کی تعداد ۱۳ تک پہنچ گئی۔ ابن علی صاحب نے ان مضامین کی اشاعت کی اجازت بھی مجھے مرحمت فرمائی اور ساتھ ہی سید محفوظ علی صاحب کی سوانح حیات بھی مرتب کر کے عنایت فرمائی۔ مزید برآں انھوں نے پروفیسر ضیا احمد بدایونی سے ایک سیر حاصل تذکرہ بھی لکھوا کر فراہم کیا۔ خود میں نے سید صاحب کے بارے میں اردو ادب و انشا کے نئے پرانے مشاہیر کی آرا، تنقیدات کی بھی تلاش اور چھان بین کی اور اس شغلِ غواصی میں بہت سے درہائے گراں قدر ہاتھ آئے۔ اس تمام "مالِ غنیمت" سے میں نے اس تالیف کی تدوین و ترتیب کی۔

اس مجموعے کی ترتیب کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ اس کے ایک حصے میں سید صاحب کے مضامین اکٹھے کر دیئے جاتے اور دوسرے حصے میں ان کی ذاتی اور ادبی حیثیت کے بارے میں جو حرف و حکایت ہے اسے پیش کر دیا جاتا۔ اس کے بجائے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ مضامین کے درمیان ہی دیگر تاثرات کو بھی پیش کرتا چلا گیا ہوں۔ منشا یہ ہے کہ قارئین سید صاحب، ان کے وطن، احباب اور مسودات سے ساتھ ہی ساتھ آگاہی حاصل کرتے چلے جائیں۔ یوں سمجھیے کہ یہاں سید صاحب کے ملفوظات تو بطور "سرِّ دلبراں" ہیں اور باقی جو ہے اس کا درجہ "حدیثِ دیگراں" کا ہے۔ اس اطلس و دیبا میں کہیں کہیں میں نے بھی بوریے کے پیوند لگانے کی جرأت کی ہے۔ اسے مداخلتِ بیجا کہنا تو بجا نہ ہوگا البتہ "دخل در معقولات" کہا جا سکتا ہے۔

ملٹن نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے۔ "شہرت کی طمع شریف النفس کی آخری کمزوری ہوتی ہے"۔ یہ امر کچھ کم قابلِ ستائش نہیں کہ سید محفوظ علی صاحب اس "آخری کمزوری" سے بھی مبرّا تھے۔ ادبی دنیا میں وہ ہمیشہ "نقاب پوش" رہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ انھیں شہرت کے مواقع اور ذرائع میسر نہیں ہوئے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذہن میں استغنا کا عنصر اس درجہ جاگزیں تھا کہ انھوں نے ہمیشہ شہرت پر گمنامی کو ترجیح دی۔ رشید احمد صدیقی ان کے بارے میں

Marfat.com

فرماتے ہیں ـ " اُن کی یہ صفت سب سے اونچی تھی کہ انھوں نے اُس زمانے میں بھی شہرت نہ چاہی جب شہرت بڑی مشکل سے حاصل ہوتی تھی لیکن وہ بڑی آسانی سے مشہور ہو سکتے تھے اور اب جب کہ شہرت ماری ماری پھرتی ہے تو وہ تقریباً گمنام ہو گئے تھے ـ" اسی ضمن میں ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے کہا ـ " قوم و ملّت کے گمنام مشاہیر کا کوئی تذکرہ اگر مرتب کیا جائے تو اس کا عنوان بعد علامہ حمیدالدین رحمۃ اللہ علیہ انھیں کے نام نامی کو بنایا جائے گا ـ"

گمنامی کے اسی شوق کے سبب انھوں نے تقریباً اپنے سارے مقالات فرضی ناموں سے لکھے ـ اسی باعث اُن کے مضامین کی تلاش میں عام طور پر بڑی مشکلات پیش آتی ہیں ـ فرضی نام بھی کوئی ایک اختیار نہیں کیا ـ جب ایک کا بھانڈا پھوٹ جاتا تھا تو وہ دوسرا چولا بدل لیتے تھے ـ البتہ ایک دلچسپ بات اُن کے قلمی ناموں سے متعلق یہ ہے کہ کہہ مکرنیوں کی طرح وہ اُن کے اندر ہی ان کی شرح چھپا دیتے تھے جس سے دانائے راز سراغ پا جاتے تھے فرانسیسی ادیب کا مقولہ ـ " مصنف اپنے رنگِ بیان سے پہچانا جاتا ہے ـ" سید محفوظ علی پر سولہ آنے صادق آتا ہے ـ مولانا سید سلیمان ندوی ان کے گمنام مضامین پڑھ کر انھیں لکھا کرتے تھے ـ "بھائی جان' ہم نے تاڑ لیا کہ اس پردے میں کون چھپا ہوا ہے ـ" اُن کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے خوب فرمایا ـ " وہ ہمیشہ اندازِ قد سے پہچانے گئے ـ" سید محفوظ علی صاحب کے چند فرضی ناموں کی شرح یہ ہے ـ

(۱) ملّائے سومالی ـ اس نام سے انھوں نے ایک مضمون ـ " اردو رسائل پر ایک نظر " مولانا ظفر علی خاں کے ' دکن ریویو ' میں لکھا تھا ـ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سید محفوظ علی سومالی لینڈ میں ججی کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے ـ حیدر آباد (دکن) میں عارضی ناکامی سے دوچار ہو کر مولانا ظفر علی خاں غم غلط کرنے وہیں بربرہ میں جا کر ان کے ساتھ ٹھہرے تھے ـ ان کا رسالہ بھی ہجرت کر کے بمبئی آ بسا تھا ـ یہ مضمون اس وقت لکھا جب سید صاحب سومالی لینڈ سے واپس آ چکے تھے اور بمبئی کی نامزد بلند نگ میں مولانا ظفر علی خاں " دکن ریویو " کا دفتر کھولے ہوئے تھے اور کالبا دیوی میں سید محفوظ علی اپنی دوکان جمائے ہوئے تھے ـ اس دوکان اور تجارت

کا منصوبہ دونوں نے بریرہ ہی میں بنایا تھا۔ اس میں سید صاحب کو بالآخر بڑا خسارہ اٹھانا پڑا۔

(۲) ملاّ علی کاتب بودھا مئوی۔ اس نام سے وہ مولانا محمد علی کے "ہمدرد" میں "تجاہل عامیانہ" کا فکاہی کالم لکھتے تھے۔ دراصل اس کالم کے وہ خود ہی موجد تھے اور اسے اُن کی عدم موجودگی میں محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری (مجنوں گورکھپوری کے والد ماجد) لکھا کرتے تھے۔ "ملاّعلی" سید محفوظ علی صاحب کا محبوب ترین ادبی نام رہا۔ 'علی' اُن کے نام کا جز تھا۔ علی گڑھ میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی۔ وہاں ان کے احباب میں علیین کی کثرت تھی۔ شوکت علی، محفوظ علی، ظفر علی، اور محمد علی کی 'رباعی' سے ہی اس وقت کا علی گڑھ علی گڑھ تھا۔ ان کے دیگر احباب میں ولایت علی (بمبوق) اور سب سے زیادہ عزیز ظفر الملک تھے۔ علی کی ردیف ظفر الملک کے اصلی نام، یعنی اسحٰق علی، کا بھی جز تھی۔ سید صاحب جب دہلی میں "ہمدرد" کے سلسلے میں مقیم ہوئے تو حکیم اجمل خاں کے ہاں بے تکلف بیٹھک رہتی تھی۔ ایک دن حکیم صاحب کے خاندان شریفی کے مورثِ اعلیٰ "ملا علی قاری" کا ذکر آ گیا۔ انھوں نے "قاری" کے مقابلے میں "کاتب" کا لفظ انتخاب کر کے "ملاّ علی کاتب" کا فرضی نام اختیار کیا۔ رہا بودھا مئو تو یہ دراصل بدایوں کا قدیم نام ہے جو کثرتِ استعمال سے پہلے "بداؤں" میں تبدیل ہوا اور بالآخر "بدایوں" کہلایا جانے لگا۔ اس طرح "بودھا مئوی" دراصل "بدایونی" کا مترادف ہے۔

(۳) ملاّ علی آق سقال = "آق" معنی سفید۔ "سقال" معنی ریش۔ یعنی چٹّی داڑھی والے ملاّعلی۔ سید محفوظ علی صاحب کی داڑھی بڑی ہی نورانی اور خوشنما تھی۔ اس میں ریشم کی نرمی اور چمک اور سچے موتیوں کی رنگت اور دمک تھی۔ جو بھی دیکھتا تھا کہتا تھا کہ ایسی پاکیزہ داڑھی شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ رشید احمد صدیقی اسے "کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی" کہتے ہیں۔ بدایوں میں اسکول کے لڑکے آپس میں تفریحاً کہا کرتے تھے کہ "میر صاحب اپنی داڑھی روزانہ بکری کے دودھ میں دھوتے ہیں۔" ان کی داڑھی سے متعلق اس تالیف میں کئی جگہ تذکرہ ہے۔ اسی کی مناسبت سے "ملاّعلی آق سقال" کے نام سے انھوں نے "نقیب' بدایوں میں مضامین لکھے۔

(۴) سمعب: یہ نام "شیخ سمار اللہ کی صاحبزادیاں" کے آخر میں درج ہے یہ دراصل

"سید محفوظ علی بدایونی" کا مخفف ہے، یعنی س = سیّد۔ م = محفوظ۔ ع = علی۔ ب = بدایونی۔ مضمونِ مذکور بدایوں کے رسالے "نقیب" میں چھپا تھا۔ "سمعب" غالب کے ایک فارسی مقطع میں تصرف کرکے استعمال کیا گیا ہے۔

(۵) مصئون العلی = "مصئون" معنی "محفوظ" مصئون العلی = محفوظ علی۔ اس نام سے انھوں نے مولانا ظفر الملک علوی کے رسالے "الناظر" لکھنؤ میں مضامین لکھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے فرضی نام کے ساتھ "ضریبتہ السادات" "بودھامئو" اور "مدینتہ الاولیا" کا اضافہ کر دیتے ہیں "بودھامئو" کی تشریح اوپر ہو چکی۔ "ضریبتہ السادات" "سیّد باڑہ" کا معرّب ہے جو سیّد صاحب کے محلہ "سیّد باڑہ" کو ظاہر کرتا ہے۔ "مدینتہ الاولیا" بدایوں کا لقب ہے کیوں کہ وہاں اولیا اللہ کے پرانے مزارات بے شمار ہیں۔

(۶) شمع بے نور = بظاہر یہ "شمع بے نوُر" ہے، لیکن حقیقت میں مراد "شمع بے نوُر" سے ہے۔ "نوُر" معنی نقطے۔ "شمع" سے نقطے ہٹائیے تو "سمع" رہ جاتا ہے جو سید محفوظ علی کا مخفف ہے۔ اس نام سے اُن کے مضامین علی گڑھ میگزین اور "الناظر" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے حقیقت یہ ہے کہ ان کے فرضی ادبی ناموں کی پہیلیوں میں یہ پہیلی سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔

سیّد محفوظ علی کے زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ کالج عروج پر تھا۔ اس وقت سرسیّد خود اس کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ انگریز اساتذہ میں آرنلڈ، بک اور مارسین اور ہندوستانیوں میں علامہ شبلی نعمانی قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا حالی بھی اس وقت سرسیّد کے رفیقِ کار کی حیثیت سے وہیں ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ اس وقت کے طلبا میں مولانا شوکت علی، خواجہ غلام الثقلین، مولانا حمید الدین فراہی، مولوی عبد الحق، مولانا ظفر علی خاں، حافظ ولایت اللہ، ڈاکٹر ضیاء الدین، چودھری خوشی محمد ناظر، مولانا محمد علی، سیّد سجاد حیدر یلدرم، وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔ سرسید کی آنکھیں بند ہوتے ہی کالج کے نظم و نسق میں زوال کے آثار نمایاں ہو گئے اور، اس وقت کی اصطلاح میں "اربابِ علیگڈھ" نے کالج کی بساط پر اپنی خود غرضانہ سیاست کے مہرے جمالیے۔ مولانا محمد علی اس صورتِ حال سے بے حد فکرمند تھے۔ سید محفوظ علی کی ژرف نگاہی اور گمنام نویسی کا شہرہ اس وقت تک ہو چکا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے اپریل ۱۹۱۰ء میں انھیں نوساری سے لکھا۔

13/263

Marfat.com

..." اس وقت تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔ اگر تم نے قلم اٹھایا اور چند اردو اخباروں میں گمنام خطوط لکھے تو بے حد مفید ثابت ہوگا۔" اس موضوع پر ایک اولڈ بوائے" کا مراسلہ اس زمانے کے" زمیندار" لاہور میں ملتا ہے۔ اغلباً یہ گمنام مراسلہ نگار سید محفوظ علی ہی تھے۔ ممکن ہے اس موضوع پر دوسرے اخبارات میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوئی ہوں۔ کالج کی بہبودی کے خیال کے علاوہ اس بارے میں انھیں محمد علی کا پاسِ خاطر بھی منظور تھا۔

آواگون یا تناسخِ ارواح کا فلسفہ یہ ہے کہ روحِ انسانی ایک نہیں بلکہ بہت سے جنم لیتی ہے۔ ع ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام

ایک ہی روح مختلف اجسام میں یکے بعد دیگرے سما کر اس دنیا میں بار بار آتی ہے تا آں کہ پے درپے پیکروں سے گزر کر وہ مآلِ کار روحِ مطلق میں جذب ہو جاتی ہے۔ یہاں مسئلہ تناسخ پر بحث مقصود نہیں لیکن آیئے وقت کی مشین کی کل کو ایک صدی پیچھے پھیر دیں۔ مرزا غالب کی وفات کے ایک سال بعد سید محفوظ علی کی ولادت ہوئی۔ اگر مان لیا جائے کہ افتادِ ذہنی اور فکرِ طبعی کسی قانونِ تناسخ کے تابع ہو سکتے ہیں، تو مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہ ہوگا کہ مرزا غالب کی بذلہ سنجی سید محفوظ علی کی شوخ نگاری میں سرایت کرکے بارِ دگر ظہور پذیر ہوئی۔ انھوں نے اردو طنز و ظرافت کو" اودھ پنچ" کے ارزاں معیار سے اٹھا کر غالب کے شگفتہ انداز کی رفعتوں سے دوبارہ ہم کنار کیا۔ یہ رائے میری نہیں بلکہ اس کے گواہ رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا تک ہیں۔ مرنے کے بعد مرزا غالب کا جسم فانی دہلی میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور طوطیٔ ہند حضرت امیر خسروؒ کے قریب پیوند زمین ہوا اور انھیں کے پاس مورخ عہد فیروز شاہی ضیاء الدین برنی بھی آسودۂ خاک ہیں۔ سید محفوظ علی کے جسدِ خاکی نے حضرت نظام الدین کے والد ماجد حضرت سید احمدؒ کے پاس جگہ پائی اور اسی شہر کی مختصر حدود میں جو مشاہیر آسودۂ خاک ہیں ان میں ملک الشعراء حضرت شہاب الدین مہمرہ، اور عہد اکبر کے شعلہ بیان اور حق گو مورخ ملا عبد القادر بدایونی ہیں۔ مرزا غالب اور سید محفوظ علی دونوں کو مرنے کے بعد زیر زمیں آسودگانِ خاک کا کیسا یکساں متوازی ماحول نصیب ہوا۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے ان کی صفت مشترک یہ ہے کہ دونوں ظریف، خوش اندیشہ، اور شگفتہ دماغ ادیب تھے

Marfat.com

جن کی یاد اہلِ ذوق کے دلوں میں آج بھی تازہ ہے ؎

عشق را ہنگامہ امروز از نظیری روشن است
ہر طرف از نکہت دگریش گرم محفل کردہ اند

کراچی

۵ فروری ۱۹۷۱ء

محمد محی الدین بدایونی

Marfat.com

سید محفوظ علی بدایونی مرحوم

(یہ فوٹو ۱۸۹۶ء تا ۱۹۰۰ء کے زمانے کا ہے جب مرحوم کی عمر ۲۵/۳۰ برس کی تھی اور وہ ریاست خیرپور میں معتمد قانون و مالیات کے عہدے پر تعینات تھے۔)

Marfat.com

Marfat.com

سیّد محفوظ علی بدایونی

میرے والد ماجد سید محفوظ علی صاحب مرحوم بی۔ اے (علیگ) جن کا مجموعۂ مضامین ادب آپ کے پیشِ نظر ہے مدینۃ الاولیا بدایوں کے ساداتِ کرام سے تھے۔ اُن کے جدِامجد سید محمد امین صاحب اٹھارویں صدی کے اوائل میں امروہہ ضلع مرادآباد کی سکونت ترک کر کے بدایوں آگئے تھے۔ اُن کے بیٹے سید محمد علی صاحب اودھ کے نواب وزیر کی فوج میں ملازم تھے اور جنگِ بکسر میں شہید ہوئے۔ اُن کے بیٹے سید مردان علی صاحب کے چار بیٹوں میں سب سے چھوٹے سید کاظم علی میرے حقیقی دادا تھے۔

۸ رمئی ۱۸۷۰ء کو میرے والد سیّد محفوظ علی مرحوم محلہ سید بازہ، بدایوں میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا لہٰذا اُن کی پرورش و پرداخت اُسی نہج پر ہوئی صوم وصلوٰۃ کی پابندی، بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ، اُس زمانے کی خصوصیات تھیں جو ہر خاندان اور ہر گھر میں پائی جاتی تھیں۔ مغربیت آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی تھی مگر میرے خاندان میں تمام تر مشرقیت ہی تھی۔ اپنے دادا کو میں نے ڈھیلے عرض کے پاجامے، پردہ دار انگرکھے اور عمامہ میں ہی دیکھا تھا۔ میرے خاندان میں میرے والد سے پہلے کسی نے انگریزی نہیں پڑھی تھی۔ عربی کا رواج کم ہوگیا تھا۔ فارسی زیادہ رائج تھی۔ مکتبوں میں تعلیم ہوتی تھی۔ میرے ماموں صاحب قبلہ سید رضا علی جو حضرت قبلہ گاہی صاحب سے بڑے تھے مکتب میں قاعدۂ بغدادی پڑھ رہے تھے۔ ان کا سبق سُن سُن کر قبلہ و کعبہ کو قاعدۂ بغدادی حفظ ہوگیا۔

حسب رواج چار برس، چار مہینے، اور چار دن کی عمر میں تسمیہ خوانی ہوئی۔ مکتب میں پہنچ کر کچھ دن بعد دوسروں کو سبق یاد کرانے بلکہ پڑھانے لگے۔ ملا شفیق نے فارسی پڑھائی لیکن دو سال گزرنے پاتے تھے کہ انھوں نے دادا صاحب سے فرمایا کہ اپنے لڑکے کے لیے کوئی دوسرا انتظام کر لیجیے

Marfat.com

اب اس کی تعلیم میرے بس کی بات نہیں رہی۔ چنانچہ پھر تعلیم و تدریس کا سلسلہ ایک ممتاز عالم مولوی امتیاز احمد صاحب بدایونی، مالک مطبع نسیمِ سحر سے متعلق ہو گیا۔ پندرہ سال کی عمر میں فارسی ادب پر کافی عبور حاصل کر لیا۔

۱۸۸۵ء میں دادا صاحب مرحوم ضلع شاہجہاں پور میں عدالت دیوانی کے منصرم تھے۔ پڑوس میں عدالت کے سررشتہ دار رہتے تھے۔ اُن کے لڑکے انگریزی پڑھ رہے تھے۔ قبلہ وکعبہ نے اُن لڑکوں کو فارسی پڑھائی اور بدلے میں انگریزی پڑھی۔ ایک سال کے عرصے میں اس قدر استعداد پیدا کر لی کہ ۱۸۸۶ء میں جب دادا صاحب پنشن لے کر بدایوں آئے تو اُسی سال مشن اسکول بدایوں کی چھٹی جماعت میں داخلہ لے لیا۔ اپنی جماعت میں اُن کا نام ہمیشہ سرِ فہرست رہا۔ خان بہادر عصمت اللہ خاں جو سروے ڈپارٹمنٹ میں کلاس وَنْ آفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے، اُن کے ہم جماعت تھے۔ اسکول کے اساتذہ میں محلہ قاضی ٹولہ کے مشہور و معروف استاد منشی افسر حسین صاحب ذہانت، طبّاعی اور قابلیت کی وجہ سے اپنے اس شاگرد کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ حضرت قبلہ وکعبہ اُن کا یہ فقرہ اکثر دہرایا کرتے تھے۔ "محفوظ! "تیری ذہانت سے میں بے حد خوش ہوں اور چاہتا ہوں کہ تیری اولاد کو پڑھاؤں اور خدا کرے وہ بھی تیری مثل ذہین ہو۔" اُن کی دُعا قبول ہوئی اور ٹھیک تیس۳۰ سال بعد ۱۹۱۵ء میں منشی افسر حسین صاحب نے میرے چھوٹے بھائی سید سبط علی سلمہٗ کو پڑھایا۔

۱۸۸۸ء میں قبلہ وکعبہ مڈل کے امتحان میں کامیاب ہو کر انٹرنس کی تعلیم کے لیے بریلی بھیج دیے گئے۔ جہاں مولوی غفور الحسنین فرشوری وکیل بدایوں اور خان بہادر حاجی معظم علی خاں عرف مکّہ میاں رئیس آنولہ ضلع بریلی، اُن کے ساتھیوں میں تھے۔ اِسی بریلی اسکول میں اُن کی ملاقات مسٹر شوکت علی اور مسٹر محمد علی سے ہوئی جو آگے چل کر مولانا ہوئے۔ شوکت علی اُن سے عمر میں بڑے اور محمد علی چھوٹے تھے۔ یہ دونوں بھائی ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ قبلہ مرحوم بھی انٹرنس اور ایف اے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ پہنچ گئے۔ ۱۸۹۵ء میں بی اے میں کامیاب ہوئے۔ اُن کے ہم سبقوں میں جنھوں نے اُسی سال بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، شیخ عبداللہ بانی گرلس کالج علی گڑھ، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق؛

اور مولانا ظفر علی خاں (ایڈیٹر زمیندار لاہور کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔[۱]

قبلہ وکعبہ کے ساتھ مولوی شکور بخش بدایونی اور مولوی زوّار حسین[۲] بدایونی پکّی بارک (S.S. EAST) کے کمرہ نمبر ۳۰ میں رہتے تھے۔ علی گڑھ کی تعلیم کے زمانے میں مولوی قمر علی وکیل بریلی، مولوی ریاض الدین وکیل بدایوں اور سیّد سجاد حیدر یلدرم سے خصوصی تعلقات تھے۔ مولوی شمس الحسن تحصیلدار بھی ہم سبق تھے۔ آخر الذکر ریٹائر ہونے کے بعد اکثر بدایوں آیا کرتے اور قبلہ وکعبہ اور خان بہادر سید محمد[۳] عرف میکو میاں رئیس شیخوپور بدایوں، کے لیے کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور لاتے تھے۔ شوکت علی اور محمد علی سے تو بریلی ہی سے مراسم تھے۔ علی گڑھ میں رہ کر اور زیادہ خصوصیت پیدا ہو گئی، کیونکہ یہ دونوں بھائی دو کمرے اُدھر نمبر ۳۳ میں رہتے تھے۔

قیام علی گڑھ کا ایک واقعہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ایک مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب ہمارے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولوی محمد سلیمان[۴]، مولوی اقبال احمد[۵]، اور قاضی سجاد حسین[۶] (سب بدایونی تھے جو اللہ کو پیارے ہو چکے) ہمارے دیوان خانہ میں بیٹھے تھے

---

[۱] - ان کے ایک اور ہم سبق حافظ محمد ولایت اللہ تھے۔ جو محمد اکرام اللہ مرحوم، سابق معتمد وزارت خارجہ پاکستان اور مسٹر ہدایت اللہ چیف جسٹس ہندوستان کے جو وہاں کے قائم مقام صدر بھی رہ چکے ہیں، والد تھے۔ ان کی شاعری اخلاقی اور اصلاحی ہوتی تھی۔ یہ ریاست بستر کے دیوان بھی رہے تھے۔ مؤلف۔

[۲] - پروفیسر ابرار حسین قادری اور ڈاکٹر افضال حسین قادری کے والدِ ماجد۔ مؤلف

[۳] - مولوی وحید احمد مسعود سابق مدیر "نقیب" کے بڑے بھائی۔ مؤلف

[۴] - ۱۹۶۳ء میں کراچی سے حج بیت اللہ کو گئے وہیں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔ کموڈور خالد جمیل ان کے بھتیجے ہیں۔ مؤلف۔

[۵] - پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے والدِ ماجد۔ مولف

[۶] - اخبار "العدل" کے مدیر خاں صاحب لطافت حسین ہاشمی کے بھائی۔ دونوں بھائی کراچی میں مدفون ہیں۔ مؤلف۔

Marfat.com

داڑھی کا ذکر نکل آیا۔ قبلہ و کعبہ فرمانے لگے۔[۱] "مجھے علی گڑھ میں والد مرحوم کا تار موصول ہوا کہ ایک شدید ضرورت درپیش ہے فوراً آجاؤ۔ میں صبح نو بجے کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ گرمی کا موسم تھا، پیاس معلوم ہوئی۔ ریل کے اس ڈبے میں سامنے والی سیٹ پر سپید داڑھی والے ایک نہایت باوقار بزرگ ہاتھ میں تسبیح لیے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی ان کے سامان کے ساتھ رکھی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر صراحی لینی چاہی۔ صراحی تک ہاتھ پہنچا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا، کیونکہ وظیفہ پڑھتے پڑھتے تیوریوں پر بل ڈال کر مولانا نے زور سے 'ہونہہ' کہہ کر ہاتھ کے اِشارے سے منع کیا۔ عرض کیا کہ پیاس لگ رہی ہے۔ ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کا حکم ملا۔ تھوڑی دیر میں وظیفہ روک کر فرمانے لگے کہ پانی مسلمان کے پینے کا ہے۔ عرض کیا کہ میں مسلمان ہوں اور علی گڑھ کا طالبِ علم، ترکی ٹوپی گواہ ہے، اور سیّد محفوظ علی نام ہے۔ ترش رو ہو کر مولانا نے فرمایا کہ مسلمان کی پہچان داڑھی سے ہوتی ہے۔ سیّد ہو کر تم داڑھی منڈاتے اور اپنے اسلاف کے نام کو بٹّہ لگاتے ہو۔ اُن کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ اُس دن کے بعد پھر داڑھی پر استرا نہیں لگا۔"

اسی سلسلے میں نماز کا تذکرہ بھی کر دوں۔ قبلہ مرحوم فرماتے تھے کہ نو سال کی عمر سے نماز

ا۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے خود یہ واقعہ ان الفاظ میں دہرایا ہے۔۔ "ایک دفعہ گرمیوں میں وہ علی گڑھ سے کہیں جا رہے تھے، پیاس شدت کی تھی، گاڑی میں سوار ہوئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ نہایت ثقہ صورت اس میں بیٹھے تھے، سامنے نہایت نازک اور سبک صراحی جس پر سرخ یکرنگہ (ٹول) کا کپڑا منڈھا تھا، اور آبخورہ بھی تھا، یہ داڑھی صاف علیگڈھ کے نوجوان تھے، پیاس کی طلب نے یہ صراحی دیکھ کر بیتاب کر دیا، صاحبِ صراحی سے پانی پینے کی اجازت چاہی، انھوں نے کہا کہ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ آپ مسلمان بھی ہیں، میر صاحب نے کلمہ پڑھا، انھوں نے کہا کلمہ تو ہندو بھی پڑھ دیتا ہے، یہ ظریفانہ شوخی کے ساتھ بولے تو اپنے اسلام کا ثبوت پیش کروں، وہ بزرگ بھی بڑے بے دھڑک نکلے، یہ ثبوت تو یہودی بھی پیش کر سکتا ہے، اب میر صاحب کا ترکش خالی ہو گیا، ہار مان لی، شرم سے پسینہ آگیا، آخر ان بزرگ نے پانی دیا، اور انھوں نے پیا، اس ساقی کے ایک جام نے ان کے خیالات کی دنیا بدل دی" ملاحظہ ہو یادِ رفتگاں ص ۳۰۲ "مؤلف

شروع کی ہے، اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ کبھی قضا نہیں ہوئی۔ امرِ واقعہ ہے کہ گھر پر ہوں یا سفر میں، تندرست ہوں یا بیمار، کسی موسم میں اور کبھی نماز قضا نہیں ہوئی، یہاں تک کہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور فالج کا دورہ پڑا، تو جب تک ہوش رہا لیٹے لیٹے گھڑی دیکھ کر نماز ادا کرتے رہے۔ بیماری کے دوران میں ایک دن مفتی محمد ابراہیم تشریف لائے تو اُن سے دریافت کیا کہ ایک ہاتھ تو اٹھتا نہیں، کیا صرف ایک ہاتھ باندھ کر اشارے سے نماز پڑھ سکتا ہوں؟ اُن کی آخری نماز مغرب کی تھی، جس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئے۔ اور چھ دن اسی حالت میں رہ کر اپنے خالق سے جا ملے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔

شاید آگے چل کر بھول جاؤں، اُن کی زندگی کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جو عام نظروں سے ہمیشہ پوشیدہ رہا۔ مجھے بھی کوئی علم نہ تھا، مگر پہچاننے والے نے پہچانا اور مجھے باخبر کیا۔

حیدر آباد (دکن) کی ملازمت کے زمانے میں جب کبھی میں بدایوں آتا تو حضرت مولانا مولوی سیّد یونس علی صاحب محدّث بدایونی کی خدمت میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور حاضر ہوتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر مولوی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ — "میں جانتا ہوں کہ آپ کے والد صاحب آپ سے بہت راضی ہیں، مگر دیکھیے، آپ اُن کی اور خدمت کیجیے اور دعائیں لیجیے۔ وہ بہت بزرگ آدمی ہیں۔ اُنھیں کوئی نہیں جانتا اور نہ وہ اپنے کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اس بات کو یاد رکھیے اور ہمیشہ اُن کی رضامندی حاصل کیجیے۔" میں نے عرض کیا — "بہت اچھا۔" میں مولوی صاحب کی خدمت میں کوئی ایک گھنٹہ حاضر رہا۔ اس دوران میں انھوں نے چار پانچ مرتبہ دہرایا کہ "یاد رکھیے آپ کے والد بہت بزرگ آدمی ہیں۔" مولوی صاحب سے یہ آخری ملاقات تھی کیونکہ اُس کے بعد ان کا وصال ہو گیا۔ حضرت مرحوم کا یہ ارشاد مجھے تین موقعوں پر خاص طور سے یاد آیا۔

۱۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے مولانا محمد علی مرحوم کے متعلق اپنی کتاب "محمد علی۔ ذاتی ڈائری" میں ایک جگہ لکھا ہے — "کوکناڈا میں کانگرس کا اجلاس تھا۔ مولانا محمد علی جیل سے چھوٹ کر آئے تھے۔ خطبے کے اردو ترجمے کے لیے مجھے بلایا اور لکھا میر محفوظ علی صاحب قبل سے آ چکے ہیں۔ فوراً پہنچو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بہ صد خرابی ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو شام کے وقت علی گڑھ پہنچا۔ نور الرحمٰن جامعی اسٹیشن پر پیشوائی کو

Marfat.com

آ گئے تھے۔ میر محفوظ علی صاحب کے لیے ایک وسیع خیمہ الگ نصب تھا۔ اسی میں جگہ ملی۔ یہ ملّائے بدایونی بھی بڑے چھپے رستم نکلے۔ دیکھنے میں ٹھیٹھ دنیا دار، علی گڑھ کے گریجویٹ، ادھر پچھلی رات ہوئی کہ آپ چوروں کی طرح اٹھے، دبے پاؤں چلے، اور وسط دسمبر کی شدید سردی میں باہر جاکر وضو کر آئے، تہجد پڑھ رہے ہیں، اپنی والی بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ۔ چوری پھر بھی کھل ہی گئی۔ میری نیند کھٹکے کی ہے۔ آنکھ کھل جاتی، اور لحاف کے اندر سے لیٹے لیٹے اس جراں ہمت سفید ریش کے اخفائے عبادت کے تماشے دیکھا کرتا۔"

۲- ۱۹۴۲ء میں میرے بہت اصرار کرنے پر بدایوں سے حیدرآباد تشریف لائے۔ اس وقت میں بھونگیر ضلع نلگنڈہ میں تعینات تھا۔ اسی زمانے میں وہاں ایک مجذوب صاحب آئے ہوئے تھے جو میری قیام گاہ سے کوئی ایک میل دور ایک کوٹھری میں رہتے تھے، نہ کسی سے کبھی بولتے، نہ سوال کرتے، نہ کسی اور طرف جاتے تھے۔ ایک سوداگران کو کھانا کھلادیتا اور وہ کھالیتے۔ کبھی جنگل کی طرف چلے جاتے جہاں سے کئی کئی دن بعد واپس آتے۔ جمعہ کا دن آیا تو حضرت قبلہ اور میں ایک مسجد میں نماز کو گئے۔ فریضۂ نماز ادا کر کے قبلہ وکعبہ آگے اور میں پیچھے مسجد کے صدر دروازے سے نکل کر سیڑھیوں پر سے اترے۔ سڑک پر پہنچے تو مجذوب صاحب اپنی پوٹلی بغل میں دبائے کھڑے تھے۔ قبلہ وکعبہ کو دیکھ کر نہایت ادب واحترام سے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور قبلہ کا "وعلیکم السلام" سنتے ہی واپس ہوگئے۔ یہ بزرگ اُس محلے میں کبھی نہیں آئے تھے، بلکہ اُس کے بعد دو سال تک میں نے انھیں دوبارہ اُدھر کبھی نہیں دیکھا۔ مگر اُس وقت ایسے کھڑے تھے جیسے وہاں آنا اور سلام کرنا اُن کے لیے بہت ضروری تھا۔ میں نے یہ واقعہ قبلہ کے سامنے عرض کیا، مگر انھوں نے کوئی دوسرا ذکر چھیڑ دیا اور میری بات قطعی ٹال گئے۔

(۳) تیسرا موقع سب سے زیادہ عجیب تھا۔ مردانی کوٹھی میں جہاں وہ ہمیشہ رہتے تھے فجر کی نماز کے لیے وضو کرتے وقت انھوں نے محسوس کیا کہ بایاں ہاتھ ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا ہے۔ بایاں پیر بھی کچھ بے سکت سا ہے۔ جیسے تیسے وضو کر کے مصلّے پر پہنچے اور نماز ادا کی۔ اُس کے بعد چودھری محب علی ملازم سے فرمایا کہ سبط علی (میرے چھوٹے بھائی سلمہٗ) کو زنانہ مکان سے بلا کر لاؤ۔ جب وہ آئے تو اُن سے فرمایا کہ حکیم پالکی کو بلاؤ (حکیم حاذق مولوی فضل الرحمٰن صاحب بدایونی

اسی نام سے مشہور تھے) ان کے آنے پر تصدیق ہوئی کہ بائیں شق پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ نو بجے صبح ایکسپریس تار کے ذریعہ مجھے حیدر آباد اطلاع کی گئی جو گیارہ بجے سے قبل ہی مجھ تک پہنچ گئی۔ بیوی بچوں کو لے کر میں شام ہی کو روانہ ہو گیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں کے نیچے کھڑی ہوئی موٹر میں سوار ہونے کے لیے میرا سیدھا پیر موٹر کے فٹ بورڈ پر اور بایاں زمین پر تھا۔ نہ کوئی خیال نہ گمان، نہ ذکر نہ تذکرہ' ایک دم میرے منہ سے نکلا ۔" بھائی جان' میں حاضر ہو رہا ہوں" (ہم سب بھائی بہن اُن کو" بھائی جان" کہا کرتے تھے) میں حیران ہوا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ موٹر میں بیٹھ کر میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں، یاد رکھیے گا' گھر پہنچ کر دریافت کریں گے کہ یہ کیا بات تھی۔ ریل میں بیٹھے ہم دونوں اُن کی بیماری کا ذکر کرتے چلے جا رہے تھے کہ کوئی دس بجے رات کو ایک مرتبہ پھر میرے منہ سے بے اختیاری میں وہی فقرہ نکلا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ ۔" دو مرتبہ یہ چیز ہو چکی ہے' کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" بدایوں پہنچ کر میں نے سبط علی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مجھے جو تار دیا گیا تھا' اُس کی رسید انھوں نے تکیے کے نیچے رکھ لی تھی۔ بار بار اس کو نکالتے اور دیکھتے تھے۔ سبط علی سے دن میں کئی مرتبہ دریافت کیا کہ ابن علی حیدر آباد سے کس وقت روانہ ہوں گے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک ہی گاڑی ہے جو ساڑھے آٹھ بجے چلتی ہے۔ جس شام کو میں حیدر آباد سے روانہ ہوا' اُسی شام کو ساڑھے سات بجے انھوں نے تار کی رسید نکالی' اُسے دیکھا اور لیٹے لیٹے ہاتھ اٹھا کر فرمایا ۔" ابن علی آجا' جلدی آجا" موٹر میں سوار ہوتے وقت میں نے حیدر آباد میں جواب دیا۔ دوبارہ پھر اسی طرح انھوں نے پکارا میں نے ریل میں بیٹھے ہوئے انھیں جواب دیا۔ برادرم سبط علی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ دونوں مواقع جب کہ میری زبان پر مذکورہ جملہ جاری ہوا تھا' وہی تھے جب والد صاحب نے لیٹے لیٹے مجھے پکارا تھا۔

فحوائے کلام میں ہم یہاں تک پہنچ گئے۔ مگر تسلسل بیان کی خاطر پھر ذرا پیچھے جانا اور قبلہ کی زندگی کے خاص خاص واقعات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۹۶ء میں جسٹس سید محمود کی سفارش پر ریاست خیرپور (سندھ) میں اسسٹنٹ جج کی حیثیت سے شریک ملازمت ہوئے۔ دادا صاحب قبلہ مرحوم

Marfat.com

نے زماں خاں ملازم کو اُن کے ساتھ کیا۔ یہ زماں خاں خیرپور، حیدرآباد دکن، سومالی لینڈ اور دہلی ہر جگہ اُن کے ساتھ رہا۔ نوکروں میں سے کسی اور کو کبھی نہیں لے گئے۔ ریاست خیرپور میں قبلہ اپنی قابلیت، فرض شناسی، دیانت داری، اور محنت کی بنا پر پانچ سال کے اندر نائب وزیر کے عہدے پر پہنچ گئے۔ اُن دنوں ریاست کے وزیر ایک اردو داں ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ خوشامدی اور خوشامد پسند تو تھے ہی، ریاست میں پہنچ کر دربار داری کا مزہ بھی لگ گیا۔ گانے بجانے کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایسے ہی کسی موقع پر قبلہ و کعبہ کو بھی بلایا۔ چونکہ وہ موسیقی کو بُرا سمجھتے تھے، اس وجہ سے شریک محفل نہ ہوئے۔ جب ملاقات ہوئی تو وزیر صاحب نے شکایت کی۔ قبلہ و کعبہ نے فرمایا کہ میں ان چیزوں کو خلافِ شرع سمجھتا ہوں، اسی لیے شریک نہیں ہوتا۔ وزیر صاحب نے فرمایا کہ شرعی احکام سے تو ہم واقف نہیں، مگر یہ ضرور جانتے ہیں کہ ہزاروں آدمی قوالی سنتے ہیں، چونکہ آپ موسیقی اور اُس کے جادو سے واقف ہی نہیں اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ سُر اور لَے تو جانوروں تک کو مست کر دیتی ہے۔ فنِ موسیقی سے اپنی واقفیت جتانے کے لیے وزیر صاحب نے بحث ہی چھیڑ دی، مگر انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ علم اکتساب کے علاوہ کتاب سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قبلہ و کعبہ نے موسیقی کی اصطلاحات، چھ راگ، چھتیس راگنیاں کومل اور تیور سُر، دادرا، ٹھمری اور خیال گانے اور کہروا، دادرا، تین تال، سول فاختہ، چوتالہ اکتالہ وغیرہ طبلے کے ٹھیکے بیان کر کے وزیر صاحب کو حیران کر دیا۔ اُس وقت تو بات رفت و گذشت ہوئی مگر بمبئی سے کاؤس جی کی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی جب آئی تو وزیر صاحب نے بطورِ خاص اُن سے کہا کہ آپ تو موسیقی خوب جانتے ہیں۔ آپ تھیٹر دیکھنے ضرور آئیں۔ مگر وہ نہیں گئے اور اُن کی غیرحاضری پر وزیر صاحب نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور جب کارکردگی کی ماہانہ رپورٹ اُن کے سامنے پیش ہوئی تو انھوں نے اس پر تحریر کیا کہ اِس مہینے میں کام کی رفتار قابلِ اطمینان نہیں پائی گئی۔ قبلہ و کعبہ سمجھ گئے کہ وزیر صاحب کے دل میں کدورت پیدا ہو چکی ہے، اب اُن سے نباہ ہونا مشکل ہے۔ دوسرے ہی دن استعفیٰ لکھ کر اُن کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ مگر وزیر صاحب نے واپس کر دیا۔ جب انھوں نے پھر استعفیٰ پیش کیا تو وزیر صاحب نے بلا کر کہا کہ آپ اُس ریمارک کا خیال نہ کیجیے۔ لیکن اُن پر کوئی اثر

Marfat.com

نہ ہوا۔ ایک مہینے تک استعفےٰ یونہی رکھا رہا' اور وزیر صاحب نے کئی آدمیوں سے کہلوایا کہ آپ ملازمت سے دست کش نہ ہوجیے' مگر یہاں تو جو فیصلہ ہوچکا تھا اس میں تبدیلی ممکن نہ تھی۔ زماں خاں کو حکم دیا کہ سامان باندھو اور ۱۹۰۱ء میں خیرپور سندھ سے واپس ہوتے ہوئے کچھ دن بمبئی ٹھہرے اور پھر بدایوں پہنچ گئے۔

حیدرآباد دکن میں اُس وقت مولوی عزیز مرزا ہوم سکریٹری تھے۔ مولانا ظفر علی خاں اُن کے دفتر میں مترجم کا کام انجام دیتے تھے۔ مولوی عبدالحق مدرسۂ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحلیم شرر بھی وہیں تھے۔ ظفر علی خاں نے عزیز مرزا سے کہہ کر راجہ رائے رایاں بہادر کے یہاں ایک ملازمت پر قبلہ وکعبہ کا تقرر کرایا اور حیدرآباد بلالیا۔ حیدرآباد پہنچ کر قبلہ وکعبہ راجہ رائے رایاں بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک بڑے کمرے میں راجہ صاحب ایک طرف تشریف فرما تھے اور لکڑی کے اسکرین (پردہ) کی آڑ میں دوسری طرف بالکل قریب وہ لوگ بیٹھے تھے جو راجہ صاحب سے ملنے آئے تھے۔ قبلہ وکعبہ کے پاس جو صاحب بیٹھے تھے انھوں نے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے دریافت کیا کہ آپ کس محکمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قبلہ نے فرمایا کہ میرا تقرر ہونے والا ہے اور میں ملنے آیا ہوں۔ اخلاقاً قبلہ نے اُن صاحب سے پوچھا کہ آپ کس محکمہ میں ہیں۔ فرمانے لگے — "کیا بتاؤں' ایک سال سے پریشان ہوں' نظم میں درخواست دی تھی' اب تک کوئی حکم نہیں ہوا۔" قبلہ نے سادگی کے ساتھ فرمایا کہ "آپ نے بھی غضب کیا' نثر میں درخواست دی ہوتی' نظم میں کیوں دی۔" وہ صاحب تو کچھ سمجھ نہ پائے' البتہ پردے کے اس طرف سے راجہ صاحب پھڑک کر بولے — "سبحان اللہ' کون صاحب ہیں' بلاؤ' لطف آگیا۔" فوراً نوکر آیا اور اُس نے کہا کہ وہ کون صاحب ہیں جنھوں نے ابھی کہا تھا کہ نثر میں درخواست دی ہوتی۔ راجہ صاحب کے سامنے پیشی ہوئی تو بہت دیر تک وہ راجہ صاحب فقرے کا لطف لیتے رہے' لیکن قبلہ وکعبہ کی سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ اس فقرے میں کیا بات تھی۔ واپس آکر مولوی عبدالحق کو سنایا تو وہ بھی خوب ہنسے' مگر بتایا کچھ نہیں۔ مولوی عزیز مرزا کے یہاں شام کی نشست میں جب مولوی صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا تو ہر شخص ہنسنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد بتایا گیا کہ "نظم جمعیت" غریبوں کی فوج کے محکمہ کو کہتے ہیں۔ جہاں الماغرب نے درخواست دی تھی۔

راجہ صاحب کے یہاں تو قبلہ کو ملازمت نہ مل سکی، البتہ مسٹر ہنکن[1] انسپکٹر جنرل پولیس نے اپنے یہاں مترجم کی جگہ پر ضرور رکھ لیا۔ چونکہ وہ "ملکی" (یعنی ریاست کے متوطن) نہ تھے، اس وجہ سے ملکی ہونے کی شرط سے استثنیٰ کے لیے دفتر پیشکاری (مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر) میں تحریک کر دی گئی۔ دو مہینے بعد جواب آیا کہ اس جگہ پر ملکی کا تقرر کیا جائے۔ تحریک استثنیٰ منظور نہیں کی جا سکتی۔ ہنکن صاحب نے قبلہ وکعبہ سے کہا کہ ایک سرٹیفکیٹ[2] اس امر کا لے آؤ کہ میں ملکی ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں جھوٹا سرٹیفکیٹ نہیں لا سکتا۔ ہنکن صاحب کہنے لگے کہ ابوالحسن صاحب ڈسٹرکٹ جج تمہارے ہم وطن ہیں، اُن سے لے آؤ (یہ مولوی ابوالحسن صدیقی فرشوری سے مراد ہے) قبلہ نے فرمایا کہ یہ تو ہرگز ممکن نہیں۔ ہنکن صاحب کو بہت تعجب ہوا۔ چونکہ قبلہ وکعبہ کے کام سے وہ بہت مطمئن تھے، لہٰذا کہنے لگے کہ اچھا ہم خود سرٹیفکیٹ منگوا کر شریک کرلیں گے۔ اس پر والد صاحب نے کہہ دیا کہ میں بے ایمانی کر کے ملازمت نہیں کر سکتا۔ ہنکن صاحب نے پھر زوردار سفارش کے ساتھ تحریک کی کہ یہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی ہیں۔ بطورِ خاص ان کے تقرر کی منظوری صادر فرمائی جائے۔ بہت تاخیر سے پھر وہی جواب آیا کہ آپ کی سفارش نامنظور کی جاتی ہے۔ اس حیص بیص میں ایک سال سے زیادہ گزر گیا۔ نہ کوئی تنخواہ نہ معاوضہ، گھر سے خرچ منگوا کر باقاعدہ طریقے پر دفتر میں اور دورہ پر فرائضِ منصبی ادا کرتے اور خوش تھے۔ ہنکن صاحب نے ہوم آفس سے سفارش بھجوائی وہ بھی نامنظور ہوئی۔

ایک دن دفتر میں بلا کر ہنکن صاحب کہنے لگے — محفوظ علی! ہم کو افسوس ہے کہ تم کام تو کرتے ہو مگر نہ تنخواہ ملتی ہے نہ اور کوئی معاوضہ۔ اب ہم ترپ کا یکہ کھیلیں گے۔ اگر پھر بھی کامیاب

---

[1] ہنکن ایک یوروپین عہدیدار تھے جو پولیس کا بڑا تجربہ رکھتے تھے۔ اردو فارسی اچھی طرح جانتے لکھتے پڑھتے اور بولتے تھے مقامی زبانوں سے بھی واقف تھے اور ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لیے انھوں نے محفوظ علی کو اپنی پیشی میں رکھا اور خوب آؤ بھگت کرنے لگے (تمکین کاظمی، نقوش، لاہور۔ اگست ۱۹۶۱ء)

[2] اس قسم کا جھوٹا صداقت نامہ (جیسے تکمیل حجت کے لیے مولوی عبدالحق، ظفر علی خاں، وغیرہ بھی پیش کر چکے تھے) محفوظ علی نے پیش کرنا گوارا نہیں کیا (تمکین کاظمی، نقوش لاہور اگست ۱۹۶۱ء)

نہ ہوئے تو نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہوگا۔" چنانچہ دوسرے ہی دن انھوں نے ریزیڈنٹ کو خط لکھا کہ لیاقت اور اہلیت کی بنا پر ہم نے اپنے یہاں ایک شخص کا تقرر کرلیا چونکہ وہ غیر ملکی تھا لہٰذا ضابطے کی منظوری کے لیے دفتر پیشکاری میں تحریک کردی، لیکن ڈیڑھ سال ہوچکا ہے منظوری نہیں آئی، حالانکہ کئی مرتبہ بطورِ خاص اُس کی سفارش کی جاچکی ہے۔ ہم زبان دے چکے ہیں، لہٰذا ہماری عزّت ذلّت کا سوال آگیا ہے۔ اگر آپ اس موقع پر ہماری مدد فرمائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ یہ خط قبلہ وکعبہ کو دکھا کر ریزیڈنٹ کے پاس روانہ کردیا، ایک ہفتہ بعد اطلاع کی خاطر ہنکن صاحب کے پاس اُس خط کی نقل وصول ہوئی، جو ریزیڈنٹ نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کو لکھا تھا کہ محکمہ پولیس کے ایک درخواست گزار سیّد محفوظ علی کے معاملے میں ہمیں دلچسپی ہے، مہربانی فرما کر اُس کے تقرر کی منظوری صادر فرمائی جائے۔ تین دن کے اندر دفتر پیشکاری سے منظوری آگئی۔ ہنکن صاحب نے بلوا کر قبلہ سے کہا کہ تھیلی سِلوا کر رکھو، ڈیڑھ سال کی تنخواہ بھی دلواؤں گا۔ اس طرح یہ ملازمت ملی۔

ظاہر ہے کہ کردار کی اس بلندی کو دیکھ کر ہنکن صاحب نے کیا رائے قائم کی ہوگی۔ چنانچہ جب سر تھیوڈور ماریسن کی سفارش پر ۱۹۰۴ء میں والد صاحب کا تقرر بحیثیت جج بربرہ' سومالی لینڈ' افریقہ میں ہوا اور انھوں نے ہنکن صاحب کے سامنے اپنا استعفیٰ پیش کیا تو ہنکن صاحب نے تین ہفتے تک اُسے منظور نہیں کیا اور پھر ترقی دیدی۔ لیکن آب و دانہ اُن کو افریقہ لے گیا۔

اسی زمانے میں مولانا ظفر علی خاں نے مسٹر واکر ریونیو سکریٹری کی ہجو میں "واکر نامہ" لکھا، جس کی پاداش میں حیدر آباد سے شہر بدر کردیئے گئے۔ وہ سیدھے قبلہ وکعبہ کے پاس سومالی لینڈ پہنچے جہاں تقریباً ایک سال تک رہے۔ "جنگِ روس وجاپان" والا ترجمہ انھوں نے وہیں مکمل کیا۔ ۱۹۰۷ء میں قبلہ وکعبہ نے اپنے الفاظ میں رخصت حاصل کی، جو استعفے کی دوسری شکل تھی۔ یہ صورت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ آپس میں یہ طے ہوا کہ ملازمت کے بجائے بمبئی میں تجارت[1] شروع کی جائے۔ قبلہ وکعبہ نے تجارت کا تہیہ اس وجہ سے نہیں کیا کہ

---

[1] بمبئی میں سید محفوظ علی نے جو دوکان کھولی تھی اس کے بارے میں خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں:" عجیب دکان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

وہ ملازمت سے بیزار تھے۔ یہ تو اس لیے ہوا کہ ایک تو مولوی ظفر علی خاں حیدر آباد سے شہر بدر اور بیکار تھے، دوسرے بمبئی میں رہنے سے قبلہ و کعبہ کو محمد علی صاحب سے قربت حاصل ہوتی تھی جو اُس زمانے میں بڑودہ ریاست میں ملازم تھے۔ چنانچہ بمبئی میں تجارت کا سلسلہ شروع ہوا، اور مولوی ظفر علی خاں نے اپنا "دکن ریویو" بھی وہیں سے نکالنا شروع کیا جو بند ہو چکا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اُن کی درپردہ کوشش اور مولوی عزیز مرزا کی مدد سے عتاب دور ہوا اور ان کو حیدر آباد میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ قبلہ و کعبہ کو تنہا چھوڑ کر وہ اپنی ملازمت پر حیدر آباد واپس چلے گئے۔ اس واقعہ کا تذکرہ انھوں نے نہ کبھی خود کیا، نہ کسی دوسرے کی زبان سے سننا چاہا، اور نہ اُس کے برتاؤ میں کبھی کوئی فرق آیا۔ ایک مرتبہ مولوی ظفر علی خاں بدایوں تشریف لائے اور ہمارے مہمان ہوئے۔ جمعہ کی نماز قبلہ و کعبہ کے ہمراہ جامع مسجد شمسی میں ادا کی۔ حاضرین نے بعد نماز اُن سے تقریر کی درخواست کی۔ منبر پر پہنچ کر انھوں نے فرمایا ——— "صاحبو! آپ مجھے جو کچھ بھی سمجھتے ہوں یا میں جو کچھ بھی ہوں وہ سب اس چھوٹے قد کے سفید داڑھی والے آپ کے ہم وطن کی جوتیوں کا طفیل ہے جو سامنے بیٹھا ہے۔"

لیکن مولانا ظفر علی خاں کے بمبئی سے اس طرح چلے جانے کا حال مولانا ظفر الملک ایڈیٹر "الناظر" لکھنؤ نے ایک پمفلٹ میں "پولیٹیکل گرگٹ"[۱] کے عنوان سے شائع کر دیا جو حضرت قبلہ

سے داخل ہوتے ہی کلفت و پریشانی غائب ہو گئی ——— جاپانی کمخواب اور برتن دکھائے . . . سبحان اللہ کیا لاثانی شاندار دکان ہے" (سفرنامہ ۱۹۰۷ء)

اس دوکانداری کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ مولوی عبدالحق نے بھی "مضامین محفوظ علی" کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مؤلف

[۱] مولانا ظفر الملک نے ایک تصنیف "کتاب الاشرار" کے نام سے شائع کی جس کے پہلے باب میں سید محفوظ علی اور مولانا ظفر علی خان کی تجارتی شراکت اور پھر ظفر علی خان کا سید محفوظ علی کو چھوڑ دینے کا تذکرہ تھا۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

کو پسند خاطر نہ ہوا۔

بمبئی کے قیام کے دوران میں مولانا محمد علی کے پاس اکثر و بیشتر آنا جانا رہتا تھا۔ خط و کتابت بھی رہتی۔ وہیں استادِ دیرینہ مولانا شبلی سے بھی ملاقاتیں ہوتیں۔ موصوف نے شعر العجم اُسی زمانے میں مکمل کی۔ یہ عطیہ فیضی والا دور تھا۔

۱۹۰۹ء کے دسمبر میں پانچ بچے چھوڑ کر میری والدۂ محترمہ نے رحلت فرمائی۔ شریکِ حیات کی رفاقت صرف بیس سال رہی مگر مفارقت کا زمانہ چونتیس* سال بعد ختم ہوا۔ مولانا محمد علی اُس زمانے میں نوساری (ریاست بڑودہ) میں تھے۔ اس واقعۂ جانکاہ کی اطلاع ملی تو تار کے ذریعے اظہارِ غم کیا اور پھر لکھا —— "برادرم! تم سمجھتے ہو گے کہ ایک تار بھیج کر تمھارا بھائی غم خواری کر چکا مگر یہ خیال اگر تم نے کیا ہے تو غلط ہے۔ تمھارے پوسٹ کارڈ سے انکشافِ حالات ہی نہیں، سینہ شگافی بھی ہوئی۔ بیدلؔ[۱] اور میں دونوں تمھارے حالِ زار پر آنسو بہاتے رہے مگر ؎

عرفیؔ اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن"

اس کے بعد ۱۴ جنوری ۱۹۱۰ء کو مولانا محمد علی نے ایک اور خط لکھا اور ظاہر کیا کہ وہ بھی نوکری سے بیزار ہیں۔ بہت اصرار کے ساتھ غم غلط کرنے کی خاطر اپنے پاس بلایا۔ چنانچہ حضرت قبلہ نوساری پہنچے۔ کچھ دن ٹھہرے اور مولانا نے جب یہ ظاہر کیا کہ وہ اب ملازمت

جنگِ عظیم کے زمانے میں جب مولانا محمد علی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا ظفر علی خاں میں ایک ادبی اور سیاسی جنگ چھڑی ہوئی تھی "کتاب الاشرار" کے اس باب کو ایک مختصر اور اضافی تمہید کے ساتھ "پولیٹیکل گرگٹ" کے عنوان سے مولوی عبدالحق کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق ہاپوڑی نے شائع کرا دیا۔ اس کا دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے "غلام نظام الدین نظامی پیری" کے فرضی نام سے لکھا تھا، جس کا راز مولانا محمد علی جوہر نے دلائل کے ساتھ فاش کیا تھا۔ مؤلف

[۱] سید حامد حسین بیدلؔ شاہجہان پوری جو بعد میں "ہمدرد" کے عملے میں شامل کیے گئے۔ مؤلف

نہیں چاہتے تو "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا تخیل زیر بحث آیا۔ اس کے بعد ہی مولانا اپنے اخباروں کے لیے روپیہ فراہم کرنے بڑودہ گئے اور حضرت قبلہ بمبئی تشریف لے گئے کیونکہ وہاں تجارت کا کاروبار ابھی پھیلا ہوا تھا۔

بمبئی میں کچھ دن قیام رہا اور وہی ہوا جو ہونا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کے حیدر آباد چلے جانے کے بعد بشیر صاحب ساکن بمبئی شریک کاروبار ہو گئے تھے اور کالبا دیوی روڈ بمبئی پر فرم قائم کی تھی۔ اُس کا حساب کتاب ختم کر کے اور دس پندرہ ہزار روپے کی رقم کھو کر حضرت قبلہ بدایوں تشریف لے آئے۔ جس کی سات پشت میں کسی نے تجارت نہ کی ہو اور جس کا آبائی پیشہ زمینداری رہا ہو وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

رفیقۂ حیات کے جدا ہونے کا اُن پر جس قدر اثر تھا اُس کا اندازہ اُن الفاظ سے لگایئے جو ایک خط میں انھوں نے مولانا محمد علی کو تحریر کیے تھے۔ فرماتے ہیں ۔

"دسمبر ۱۹۰۹ء کے پہلے عشرہ تک کی دلچسپیاں اور لطف اور اُس کے بعد کی بدمزگی، بے لطفی، خستگی اور کوفت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج اِس سر میں کچھ خیال نہیں، بسر خوش میں، سودا ہمیں، اس دل میں کوئی امنگ نہیں۔"

مولانا محمد علی نے جواب میں لکھا ۔

"تو برادرم، کیا تمہارے عشق و محبت میں تمہارا چھوٹا بھائی شریک نہ ہوتا تھا اور لطف اور دل فریبی کو دوگنا نہ کرتا تھا۔ اگر تم نے بدمزگی، بے لطفی، خستگی، اور کوفت میں شریک کیا ہوتا تو کیا یہ شرکت اِن سب کو آدھا نہ کر دیتی۔ دوستی کی ریاضی بھی عجیب ہے۔ خوشی کو دوگنا اور غم کو آدھا کر دیتی ہے۔ شرکتِ رنج میں غیریت صرف غیر کو ہوتی ہے۔ اپنوں سے بے گانگی صد حیف ہے۔ بھائی اب تمہاری ایک بیوی نہیں پانچ بیویاں ہیں، اور لطف یہ کہ ایک نہ ایک ہمیشہ جوان رہے گی۔ اُن سے غم غلط کرو۔ اُن کی دیکھ بھال کرو۔ اپنی بیوی کی شکل و صورت، سیرت و شمائل اِن ننھی جانوں میں پاؤ گے۔ اور ان کے خیال سے امید ہے کہ قوم کے بچوں کا خیال بھی دل میں جاگزیں ہوگا۔"

Marfat.com

والدۂ مرحومہ کے انتقال کے وقت حضرت قبلہ کی عمر صرف انتالیس سال تھی۔ ہر شخص نے چاہا اور کسی کسی نے تذکرہ بھی کیا کہ شادی کر لینی چاہیئے مگر انھوں نے نہایت سختی کے ساتھ انکار کیا۔ چونکہ اپنے والد کا انتہا سے زیادہ ادب و احترام کرتے تھے لہذا اس کا اظہار کر دیا کہ قبلہ و کعبہ حکم نہ دیں، مجھے تعمیل کرنی ہوگی، حالانکہ میں ایسے کسی واقعے کو اپنی موت تصور کرونگا قبلہ و کعبہ کو بھی پاسِ خاطر ملحوظ تھا لہذا انھوں نے کوئی تذکرہ نہ کیا اور یہ بات ایسی آئی گئی ہوئی کہ انھوں نے باقی ساری عمر ہم لوگوں کے لیے وقف کر دی۔ مولانا ظفر الملک کے کہنے سننے سے یہ تمام تر لکھنے پڑھنے میں صرف ہوا۔ بعد میں مولانا محمد علی نے اولاً "تو" کامریڈ" کلکتے سے نکالا۔ اس کے بعد دارالسلطنت کی منتقلی کے ساتھ وہ اُس کو لے کر دہلی آگئے۔ کچھ دن بعد طے کیا کہ "ہمدرد" بھی جاری کیا جائے۔ چنانچہ حضرت قبلہ کو دادا صاحب مرحوم سے جانے کی اجازت دلوانے کے لیے مولانا محمد علی بدایوں آئے۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں قبلہ و کعبہ نے دہلی پہنچ کر "ہمدرد" کے نکلنے کے انتظامات کو سنبھالا اور بالآخر اُس کو جاری کر کے تقریباً دو سال بعد بدایوں واپس آئے۔

والدۂ مرحومہ کی رحلت کو ابھی پانچ سال نہیں گزرے تھے کہ تیئس سال کی عمر میں میرے بڑے بھائی سید آلِ علی نے انتقال فرمایا۔ جوان بیٹے کی موت پر جو کچھ بھی غم نہ ہوا ہو تھوڑا ہے، مگر چونکہ دادا صاحب کا حکم ہوا کہ ـــــ "محفوظ علی! ہمارا بیٹا مرا ہے، تم کو رنج کرنے اور رونے دھونے کی ضرورت نہیں"۔ لہذا وہ حقیقتاً نہیں روئے اور بالکل خاموش ہو گئے۔ خاموشی اور ضبط کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک سال کے قلیل عرصے میں سر اور داڑھی کے سب بال ایک دم سفید ہو گئے۔ ۱۹۱۸ء میں دادا صاحب نے بھی داغِ مفارقت دیا۔ ان صدمات نے اُن کی زندگی کو انتہائی بے کیف اور تلخ بنا دیا اور پھر وہ بدایوں ہی کے ہو رہے۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اسلامی دنیا میں جو بھونچال آیا اُس کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں نے تحریکِ خلافت شروع کی۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی اُس کی روحِ رواں تھے۔ حضرت قبلہ نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس میں غیر نمایاں طور پر حصہ لیا۔ بدایوں میں تحریکِ خلافت کے سلسلے میں کئی معرکۃ الآرا جلسے ہوئے جن میں مولانا شوکت علی، چودھری

خلیق الزماں، مولانا فاخر الٰہ آبادی، حکیم اجمل خاں اور دوسرے بہت سے لیڈر بدایوں آئے اور غریب خانے ہی پر مقیم رہے۔ مولانا عبد الماجد بدایونی مرحوم سے اس سلسلے میں تعلقات شروع ہوئے اور بڑھے۔ مولانا ایک نہایت آتش بیان مقرر اور بہترین خطیب تھے۔ اُن کی سیاسی زندگی پر حضرت قبلہ کا بہت اثر رہا، کیونکہ کسی جلسے کی شرکت کے سلسلے میں باہر جانے اور حصّہ لینے سے پیشتر وہ قبلہ مرحوم سے تبادلۂ خیال کیے بغیر جاتے ہی نہ تھے[له]

اخبار" ہمدرد " کو اپنے پیروں پر استوار کر کے دہلی سے آنے کے بعد حضرت قبلہ کا قیام مستقل طور پر بدایوں ہی میں ہو گیا تھا۔ شیخوپور ضلع بدایوں کے رئیس شیخ وحید احمد صاحب فریدی انگلستان سے واپس آگئے تھے اور اُن کے برادر بزرگ خان بہادر سید محمد عرف میکو میاں اُن کو کسی کام میں لگا دینا چاہتے تھے۔ اِس خیال سے دونوں بھائی قبلہ وکعبہ کے پاس تشریف لائے اور اردو کے ایک ماہوار رسالے" نقیب " کا اجراطے ہو گیا۔ اس خیال نے عملی شکل اختیار کر لی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ رسالہ"نقیب" جب تک بھی نکلا اُس کا معیار بہت بلند رہا۔ " مُلا علی بودہامئوی" اور" ملائے آقِ سفال" کے فرضی ناموں سے حضرت قبلہ کے مضامین"نقیب" میں نکلتے رہے۔ وحید احمد صاحب خود گواہ ہیں کہ" نقیب"کی کامیابی اور ناموری بڑی حد تک حضرت قبلہ ہی کے ذوق وشوق کی رہین منت تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت قبلہ کے مضمون حاصل کرنے کے لیے وحید احمد صاحب کو کئی مرتبہ ایک ایک ہفتہ دیہات (زمینداری) تک میں ٹھہرنا پڑا جہاں قبلہ تحصیل وصول کرنے کی غرض سے تشریف لے جایا کرتے تھے۔"نقیب" میں مضامین نکلنے شروع ہوئے تو ظفر الملک مولوی اسحاق علی صاحب علوی نے" الناظر" (لکھنؤ) میں لکھنے پر مجبور کیا۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۲۸ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد مضمون نگاری قریب قریب بند ہو گئی۔

فروری ۱۹۳۳ء میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ سفر حجاز کے ارادے

له۔ مولانا عبد الماجد صاحب قادری سفر سے واپس آتے تو پہلے آستانۂ عالیہ اور اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں تشریف لاتے اور اس کے بعد میر محفوظ علی صاحب کے یہاں جاتے (مکتوب عبد الحامد بدایونی بنام مؤلف)

Marfat.com

کے وقت نہ تو وہ کسی کے قرضدار تھے اور نہ اُن کا کوئی پیسہ کسی پر واجب الادا تھا۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں موجود اور صاحبِ اولاد تھیں۔ اُن کے چچا زاد بھائی جو بہنوئی بھی تھے اور سالے بھی، کم و بیش تین۳ سال سے ناراض تھے۔ ایک دوسرے سے بول چال، آنا جانا، مطلب غرض کچھ نہیں تھا۔ جانے سے پیشتر اُن کے پاس گئے، معافی چاہی اور عرض کیا۔

"آپ بڑے ہیں، میں حج کرنے جا رہا ہوں، اجازت دیجیے"

چونکہ میں بہ سلسلۂ ملازمت حیدرآباد میں تھا اور مجھے رخصت نہ مل سکی اس وجہ سے بدایوں سے میرے پاس حیدرآباد تشریف لائے اور پھر حیدرآبادی قافلے کے ساتھ جہاز "رحمانی" پر حجاز تشریف لے گئے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں —— لامکاں والے قوی اور مہربان آقا نے اپنے ایک ناتواں مگر نافرمان غلام کو اُس کی نافرمانی سے درگذر فرماکر اور اپنی مہربانی کو کام میں لاکر اپنے دربار میں بُلایا اور چونتیس روز اپنے نگّی آستانے پر اور سترہ روز مدنی دولت خانے پر مہمان بنایا۔" فریضۂ حج سے فارغ ہوکر، رجون ۱۹۳۳ء کو بدایوں واپسی عمل میں آئی۔

حج کو جاتے وقت حضرت قبلہ نے زمینداری کا سارا کام کاج میرے چھوٹے بھائی سید سبطِ علی سلمہٗ کو سونپ دیا تھا۔ جب واپسی ہوئی تو اُس ذمہ داری کو بدستور انھیں کے ذمّے رکھا اور کام کاج اور علائق سے بالکل قطع تعلق کرلیا۔ دنیوی فرائض تو کچھ تھے ہی نہیں نماز، روزہ، اور تلاوت میں وقت صرف ہوتا۔ جو کچھ بچ جاتا وہ کتب بینی، اخبار بینی، یا احباب کے تشریف لے آنے پر اُن سے گفتگو میں صرف ہوتا تھا۔ دنیاداری چھوڑ کر انھوں نے اپنے کو جس کام میں لگایا بلکہ وقف کردیا وہ درسِ قرآن پاک تھا۔ حج سے واپس ہونے کے بعد ہی انھوں نے ایک بزم قائم کی جس میں فارغ التحصیل اصحاب کے علاوہ اسکول کے اساتذہ وکلا اور کچھ احباب شریک تھے۔ بعد مغرب یہ لوگ ہماری مردانہ رہائش گاہ پر جمع ہوتے اور ترجمہ اور تفسیر[1] کے ساتھ کلام پاک پڑھا اور دہرایا جاتا۔ حضرت قبلہ فارسی کے جیّد عالم تھے۔

---

[1] تفسیر حسینی اور تفسیر حقانی سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ مؤلف

Marfat.com

مگر عربی باقاعدہ طور پر نہیں پڑھی تھی۔ کلام پاک کے درس کا یہ فیض تھا کہ عربی قواعد اور کلام پاک کے معانی و مطالب پر آخر وقت جتنا عبور اُن کو تھا، اچھے سے اچھے مولوی بھی اُسی قدر جان سکتے تھے۔ کلام پاک ہی کا معجزہ تھا کہ مولوی اقبال احمد[1] مرحوم وکیل بدایونی، جنھوں نے عربی بالکل نہیں پڑھی تھی، آخر میں ایسے صاحبِ استعداد ہو گئے تھے کہ بسا اوقات جب سب لوگ کسی نکتے پر الجھ جاتے تو مولوی صاحب مرحوم ذہانت، طبّاعی، اور قابلیت کے ساتھ اُسے سلجھا دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلۂ درس قرآن دس سال قائم رہا۔

حضرت قبلہ و کعبہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ دونوں میں محبت نہیں بلکہ عشق تھا۔ ایک دوسرے کو "میاں" سے مخاطب کرتے تھے۔ دادا صاحب مرحوم حقّہ پیتے تھے۔ نوکر کو چلم بھر کر لانے کے لیے آواز دیتے تو قبلہ و کعبہ یہ چاہتے کہ میں چلم لے آؤں، مگر وہ اجازت نہ دیتے۔ کبھی موقع مل جاتا تو نوکر کے ہاتھ سے چلم لے لیتے اور حقّے پر رکھ دیتے۔ ایک مرتبہ دادا صاحب مرحوم بیمار ہوئے۔ حکیم فضلِ احمد صاحب نے فرمایا کہ رات بھر کا جمع شدہ قارورہ مجھے کل سویرے دکھایا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن قارورہ ہاتھ میں لیے آگے آگے خود اور پیچھے ملازم سڑک پر چلے جا رہے تھے کہ اُن کے دوست مولوی ریاض الدین فرشوری وکیل کے صاحب زادے اور میرے دوست اور ہم سبق مولوی وقار الدین وکیل راستے میں مل گئے۔ انھوں نے دیکھا اور دریافت کیا ــــــ "میر صاحب! کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں"۔ فرمایا "حکیم فضیلی کو میاں کا قارورہ دکھانے جا رہا ہوں"۔ وقار الدین نے کہا ــــــ "نوکر ساتھ ہے، قارورہ اسے دیجیے"۔ فرمانے لگے ــــــ "قارورہ ہے، ممکن ہے ملازم کراہت کرے۔ میں خود لیے جا رہا ہوں، میرا تو فرض ہے"۔ یہ بات اُس زمانے کی ہے جب ریاست خیرپور میں نائب وزیر، حیدر آباد دکن میں اعلیٰ عہدہ دار، اور بربرہ ہو مالی لینڈ افریقہ میں جج رہ چکے تھے۔ سعادت مندی کے اس واقعے کے بعد اولاد کے ساتھ شفقت کا تذکرہ والدۂ ماجدہ کی رحلت کے سلسلے میں آ چکا ہے کہ چونتیس ۳۴ سال تک ہم بہن بھائیوں کو "ماں" بن کر پالا۔ دوستوں کے ساتھ محبت اور وضع داری

---

[1] یہ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ سامنے رکھتے تھے۔ ان سے پہلے سبطین احمد صاحب قرأت کرتے تھے جس سے آغاز ہوتا تھا (مؤلف)

Marfat.com

کا یہ عالم تھا کہ قاضی غلام امیر صاحب امیر وکیل بدایونی سے بچپن کے تعلقات تھے، جو قاضی صاحب موصوف کے مرتے دم تک انتہائی خلوص اور الفت کے ساتھ قائم رہے صبح اور شام کی دو ملاقاتیں ہمیشہ ہوتی رہیں۔ دوستی کا تقاضہ اور وضعداری ہی تھی، جو مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی خاطر سومالی لینڈ کی اعلیٰ ملازمت چھوڑی، اپنا روپیہ لگا کر بمبئی میں تجارت شروع کی، اور دولت گنوائی۔

۱۸۹۵ء میں تعلیمی دور ختم ہوتے ہی ملازمت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو ۱۹۰۶ء میں ختم ہوا۔ بمبئی میں تین سال قیام کے زمانے میں رفیقۂ حیات نے داغ مفارقت دیا۔ اُس کے بعد بدایوں ہی میں قیام رہا تا آں کہ مولانا محمد علی دہلی لے گئے۔ کوئی دو سال بعد دہلی سے واپسی ہوئی اور پھر بدایوں کی سرزمین نے ایسا دامن پکڑا کہ وہیں کی خاک کا پیوند ہوئے ۱۹۱۸ء میں جناب دادا صاحب نے رحلت فرمائی۔ زمینداری کا کام اُن کی زندگی ہی میں شروع کر دیا تھا۔ علمی اور ادبی دلچسپی اور ساری عمر کے ماحول کے برعکس زمینداری کے کھسوٹ اور وصول باقی کی جمع بندیوں میں دلچسپی لے کر اس کام کو بھی ایسا انجام دیا کہ جو لوگ اس فن کے مردِ میدان تھے وہ بھی اعتراف کرتے تھے۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۴ء تک تین سال کا زمانہ زمینداری کے کام کے علاوہ کچھ مطالعہ اور مضمون نگاری میں، کچھ خانہ داری کے کاموں میں، کچھ دوستوں کے ساتھ علمی تذکروں اور بذلہ سنجی میں، اور آخری دس سال صرف قرآنِ پاک کی تلاوت اور نمازوں میں صرف ہوئے۔ میری والدہ، بڑے بھائی، اور دادا صاحب کے صدمات کے علاوہ حضرت قبلہ کی زندگی نہایت پرسکون، اطمینان بخش، اور فارغ البالی کے ساتھ گزری۔ اللہ کے فضل و کرم سے نہ فکرِ معاش تھی اور نہ کوئی اور پریشانی جو رؤسا اور لیڈر قسم کے لوگ اپنے دم کے ساتھ لگا لیتے ہیں۔

انتقال سے دو سال قبل میرے بے حد اصرار پر اور اس ارادے سے کہ دو چار سال قیام فرمائیں گے، میرے پاس حیدر آباد (دکن) تشریف لائے جہاں نواب معشوق یار جنگ بہادر، نواب فخر یار جنگ بہادر، اور مولوی عبد الحق (بابائے اردو) کی پر لطف صحبتوں میں وقت گزرا۔ مشکل سے ڈیڑھ سال قیام رہا ہوگا کہ دفعتاً وطن کی واپسی کا ارادہ کر دیا میں نے ٹھہرنے کے لیے بہت منت سماجت کی تو فرمایا ـــــ "ہم اس لیے نہیں کہنا چاہتے کہ

تمھیں تکلیف ہوگی، مگر اب ہم بالکل نہیں ٹھہریں گے، ہمیں اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جانا چاہیئے۔" غرض کہ میں کچھ نہ کہہ سکا اور وہ بدایوں آگئے۔

ایک سال نہیں گزرا تھا کہ چھوٹے بھائی سید سبطِ علی سلمہٗ کا تار پہنچا کہ قبلہ وکعبہ پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ اُسی شام حیدر آباد سے روانہ ہو کر بدایوں آگیا۔ پہلا حملہ بائیں شق پر پہلے ہفتے میں ہوا تھا۔ دوسرے ہفتے میں دوسرا، اور تیسرے ہفتے میں تیسرا حملہ ہوا۔ دوسرے ہفتے میں بریلی کے فوجی اسپتال سے ایک انگریز ڈاکٹر کو لے کر آیا جو امراضِ قلب ودماغ کا ماہر تھا۔ اُس نے اطمینان دلایا کہ یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ اُس کا کہنا تھا کہ حضرت قبلہ جیسا توانا دل اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تیسرے حملے کے بعد چوتھے ہفتے میں سرسامی کیفیت پیدا ہوئی اور بے ہوش ہو گئے۔ فالج اور سرسام میں بیر ہے۔ جب سرسام ہوا تھا تو گویا صحت ہو جانی چاہیئے تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک ہفتے کے قریب بالکل غافل رہے اور آنکھیں بند رہیں۔ نہ کوئی بات سنتے تھے اور نہ بولتے تھے، مگر کلام پاک کی تلاوت ہوتی تو بند پپوٹوں میں پتلیاں متحرک ہوتیں اور پلک ہلتے تھے۔ آخر کار ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو بعد نماز ظہر جانِ عزیز جانِ آفریں کے سپرد کی۔[1] یارائے مقال تو نہ تھا، لیکن زبانِ حال گویا تھی ؎

گر نثارِ قدمِ یارِ گرامی نکنم
گوہرِ جاں بچہ کار دگرم باز آید

مولانا ظفر الملک علوی گیارہ بجے دن کو لکھنؤ سے آگئے تھے۔ انھوں نے غسل دیا۔ مفتی محمد ابراہیم نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ سوگواروں میں عزیزوں کے علاوہ اُن بزرگوں کا طلال دیدنی تھا جو درسِ قرآن میں بصد نیاز وعقیدت شامل ہوتے تھے۔ اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کیے گئے جس کی ایک سمت ناصر شاہ کا باڑہ اور دوسری طرف حضرت سید احمدؒ (والد بزرگوار حضرت نظام الدین اولیا بدایونی ثم الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ) کی درگاہ ہے۔

مولوی شاکر حسین نکہت قاضی محلہ سہسوان، ضلع بدایوں سے خصوصی تعلقات تھے انھوں

---

[1] سبطین احمد صاحب کا کہنا ہے کہ ابن علی نے ایسی خدمت کی کہ اسپتال اور نرسوں کو مات کر دیا۔ مؤلف

Marfat.com

نے ۲ دو تاریخیں کہہ کر میرے پاس بھیجیں۔ اُن کے علاوہ بدایوں کے مشہور تاریخ گو مولوی قاضی خلیل الدین صاحب نوشہ عباسی نے کئی قطعات لکھے جن میں سے ۲ دو میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ چاروں قطعات آگے درج کیے جاتے ہیں۔

حضرت قبلہ کے سوگ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر "گدڑی کے لعل" کے سلسلے میں نشر کی جو ان کی تصنیف "گنج ہائے گرانمایہ" میں موجود ہے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے دسمبر ۱۹۴۳ء کے "معارف" میں اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے ۸ نومبر ۱۹۴۳ء کے رسالے "صدق" میں وفاتی مقالات تحریر فرمائے۔

علی گڑھ — سیّد ابن علی بدایونی

۸ مئی ۱۹۶۷ء

قطعاتِ تاریخِ وفات

(۱)

نتیجۂ فکر عالی جناب مولوی شاکر حسین صاحب نکہت سہسوانی بدایونی

آں سیّد مغفور کہ برشیوۂ تسلیم — آسودہ دل از زیست بخوابِ ابدی خُفت

آشفتگی و کاہش و اندوہ و الم شد — با مغز و تن و جان و دلِ عالمیاں جُفت

نکہت ز میاں رفت چو ۔ اُو ۔ خازن جنّت

آمد بہ جناں سیّد محفوظ علی ۔ گفت

۱۳۶۹ - ۷ = ۱۳۶۲ھ

فقرۂ تاریخ

الحاج سیّد محفوظ علی صاحب

۱۳۶۲ھ

رحلتِ سیّدِ مرحوم سے ہر سو نکہت　　دل ہیں سینوں میں تپاں تاب و تواں غائب ہے
ان کی فرقت کا یہ صدمہ ہے کہ ہر دشمن و دوست　　زیست سے سیر، اجل کا بہ خوشی طالب ہے
سن لیں گوش شنوا سے وہ الم کش جن پر　　فکرِ تاریخ میں تشویش عبث غالب ہے
مخبرِ سال ہے خود نام کہ "الحاج" کے بعد
جملۂ "سیّد محفوظ علی صاحب" ہے

۱۳۱۹ + ۴۳ = ۱۳۶۲ھ

ع

(۲)

نتیجۂ فکر جناب قاضی خلیل الدین صاحب نوشہ عباسی بدایونی

دریغا بدایوں ہوا آج خالی　　ادیبوں میں محفوظ کا ایک دم تھا
نشست اُس کی علمی مشاغل کی صحبت　　مکان اُس کا گھر علم و فضل و ادب کا
رہا مدرسہ رات کا ایک جاری　　شغف درس و تدریسِ مصحف میں رکھا
کوئی قابلیت کی کیا تھاہ پاتا　　کہ وہ بحرِ زخار تھا علم و فن کا
کتاب اُس کو از بر دماغ اس کا حاضر　　قوی حافظہ تھا خدا کا عطیا
ادیبِ لبیب اور محقق مورخ　　چھٹا علم کا کون سا اُس سے شعبا
اُسی نے نکالی تھی اردو گلا بی　　وہ اِس طرزِ انشا کا موجد تھا گویا
ادارت کا اہل اور سیاست میں کامل　　کہ جوہرؔ[۱] کا یہ دست و بازو رہا تھا

۱؎ مولانا محمد علی جوہر

Marfat.com

ہوئے پردے پردے ہی میں کام سب کچھ — ہزاروں کیے مردِ میدان پیدا
نمود اور شہرت سے نفرت تھی ایسی — کہ تا زندگی خود کو گمنام رکھا
مسلماں رہا عیشِ دنیا میں رہ کر — نواہی سے محفوظ اوامر کا بندا
یہ حاجی و زائر بھی تھا فضلِ رب سے — خدا و نبی کا دل و جاں سے شیدا
علالت میں بھی یادِ احمد تھی دل میں — سنا اس نے حامد[1] سے پڑھوا کے بُردا[2]
ہوا حکمِ باری سے دنیا سے رخصت — بجز صبر کے کیا ہے ہم سب کو چارا
مگر اُس کا غم کھائے جاتا ہے ہم کو — ہمہ داں ملے گا ہمیں اب نہ ایسا
زمانے کی رفتار بھی کہہ رہی ہے — کہ صدیوں تک ایسا کرے گی نہ پیدا

اگر فکرِ تاریخ رحلت ہے نوشہ
کہو = آہ فخرِ وطن آج اٹھا

۱۳۶۲ھ

دیگر

اُٹھ گئے مایۂ صد نازش و اعزازِ وطن
شورِ محشر کا کیوں آہ و فغاں سے اُٹھے
ہاتھ آیا مجھے تاریخ کا مصرع نوشاہ
میر محفوظ علی آج جہاں سے اُٹھے

۱۹۴۳ء

۱؎ مولانا عبد الحامد قادری بدایونی (متوفی کراچی ۱۹۷۰ء)
۲؎ قصیدہ بُردہ شریف

ذکرِ میر

تصنیف عشق معنی و ترکیب دیگرست
ما شرح نکتۂ ز صد افسانہ می کنیم

طالب علمی کا عہد تھا، اور بے فکری کا دور۔ یادش بخیر یہ قصّہ ہے جب کا کہ دنیا تقریباً ثلث صدی کے بقدر "جوان تر" تھی۔ اتفاقاً وطن کی کسی تقریبِ شادی میں شرکت کا موقع ہوا لوگ آتے جاتے اور بیٹھتے جاتے تھے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک مردِ معقول، قدرے پست قامت، وجیہہ صورت، کمال وقار و تمکین کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ اُن کا شگفتہ چہرہ، نورانی داڑھی، کشادہ پیشانی، اور متین انداز ایسا نہ تھا کہ آدمی دیکھے اور متاثر نہ ہو۔ حاضرین میں شاید ہی کوئی ہو گا جس نے پُر تپاک نظروں سے پزیرائی نہ کی ہو۔ متوجہ تو کم و بیش سب ہی ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ چار بھلے مانس جہاں مل بیٹھتے ہیں تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ حسبِ ضرورت نووارد نے بھی اس میں حصہ لیا۔ گفتگو کی لطافت اور حلاوت کا یہ عالم کہ جی چاہتا تھا کہ سو کام چھوڑ کر سنے ہی جائیے۔ یہ نووارد سید محفوظ علی صاحب تھے، جنھیں محبّت اور احترام سے سب "میر صاحب" کہتے تھے۔ میر صاحب کی بڑائی کے افسانے بچپن ہی میں گوش زد ہو چکے تھے۔ مگر وہ علم الیقین کے درجے سے آگے نہ تھے آج عین الیقین کا مرحلہ بھی طے ہو گیا حق الیقین کی منزل بعد کو آئی جیسا کہ آئندہ عرض کروں گا۔ اس واقعے نے شوق کو ابھارا اور ہمت بڑھائی چنانچہ ایک دن میر صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہوا۔ میر صاحب اپنے عالی شان اور خوش نما مردانہ مکان کے ایک بغلی کمرے میں قالین پر بیٹھے سلیٹ پر گاؤں کی آمدنی کا حساب کر رہے تھے۔ چند منٹ کے لیئے اخلاقاً معذرت اور حساب کے مکمل کر لینے کی اجازت چاہی۔ حساب کی میزان کو اپنے رجسٹر میں اتارنے کے بعد متوجہ ہوئے اور

Marfat.com

استفسار حال فرمایا۔ معمولی تعارف کے بعد نہایت اخلاق و الطاف سے پیش آئے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہو کر واپس آیا۔

پھر تو اکثر حاضری کا اتفاق ہوتا رہا، اور میر صاحب کی عنایت اور میری عقیدت میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔ جب کبھی وطن جانا ہوتا جس وقت تک میر صاحب سے نیاز حاصل نہ کر لیتا طبیعت ایک خاص خلا محسوس کرتی۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا حتیٰ کہ آخری مرتبہ عید کی تعطیل میں جب حاضری دی تو معلوم ہوا کہ میر صاحب پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ اور وہ حرکت کرنے اور بولنے سے بھی معذور ہیں۔ مغموم اور مایوس واپس آیا۔ علی گڑھ پہنچ کر کمال اندوہ و قلق سے سنا کہ باغِ وطن کی وہ بلبلِ خوش نوا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ میر صاحب کے حالاتِ زندگی کا مفصل جائزہ اور اُن کے ادبی کارناموں پر مکمل تبصرہ اُن کے سوانح نگار کا فرض ہے۔ راقم سطور کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ مختصر طور پر اُن چند ذاتی تاثرات کو قلمبند کر دے جو میر صاحب کی شخصیت کے قریبی مطالعے سے پیدا ہوئے۔

میر صاحب کی شباہت و وجاہت کا اندازہ اوپر کی سطور سے ہوا ہوگا۔ داڑھی کے سلسلے میں ایک قصّہ سننے کے قابل ہے، جو پر لطف بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ وہ خود بیان فرماتے تھے کہ طالب علمی کے زمانے میں جب کہ ایم' اے' او' کالج میں قیام تھا' وہ ایک مرتبہ کسی دوست کے ہمراہ ٹرین میں جا رہے تھے۔ گرمی کا موسم' دوپہر کا وقت' جلدی میں لوٹا یا گلاس بھی ساتھ نہ لیا تھا۔ اُدھر گاڑی سُرعت کے ساتھ دھوئیں اُڑاتی جا رہی تھی۔ اِدھر پیاس کے مارے جان لبوں پر آ رہی تھی۔ حُسنِ اتفاق سے قریب ہی میں ایک کوری صراحی نظر پڑی۔ بے اختیار پانی کی طلب میں ہاتھ بڑھایا۔ لیکن صراحی کے مالک نے جو صورت سے شریف' مہذب' اور ذی علم معلوم ہوتے تھے' صراحی ہٹالی۔ یہاں ضبط کا یارا کہاں' دوبارہ پانی کی التجا کی۔ انھوں نے عذر کیا اور بتایا کہ وہ غیر مسلم کو اپنا برتن نہیں دے سکتے۔ جب انھوں نے اپنا تعارف کرایا تو فرمایا کہ کیسے معلوم ہو کہ آپ مسلمان ہیں۔ وضع قطع تو اس کی تکذیب کرتی ہے۔ یہاں یہ حال کہ سر سے پیر تک انگریزی وضع اور داڑھی کی طرف سے فارغ البال۔ سخت شرم آئی اور اس روز سے داڑھی رکھنے کا عہد کر لیا۔ جس کو مدت العمر نباہا۔ غور کیجیے تو صرف یہی واقعہ میر صاحب کی سلامت طبع

کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک سطحی طبیعت والا اس برتاؤ سے شاید مشتعل ہو جاتا، مگر ان کے لیے یہی چیز بصیرت و عبرت کا ذریعہ بن گئی۔

ان کے طرزِ ماند و بود، وضع و لباس سب میں سادگی، صفائی، سلیقے اور بے تکلفی کے عناصر نمایاں تھے۔ وہ تحریکِ خلافت سے بھی پہلے کھدّر پہننے کے قائل و عامل تھے، اس پر صفائی کا اس قدر اہتمام کہ کبھی کپڑا یا کمرے کا فرش وغیرہ میلا نہ دیکھا گیا۔ سلیقے کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز وقت پر موجود اور قرینے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی ملتی تھی۔ دینے کو خدا نے ثروت بھی دی تھی اور عزت بھی۔ مگر مزاج میں غرور و خود نمائی چھو نہیں گئی تھی۔

مشن اسکول بدایوں سے مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد بریلی کالج میں زیرِ تعلیم رہے اس کے بعد ۱۸۹۵ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ تعلیم سے فراغ حاصل کر کے خیرپور، حیدر آباد (دکن)، اور سومالی لینڈ (افریقہ) میں ممتاز عہدوں پر سرفراز رہے۔ افریقہ سے آنے کے بعد مولانا محمد علی کے اصرار پر کچھ عرصے کے لیے "ہمدرد" نکالنے کی غرض سے دہلی جا کر رہے مدّت سے مکان پر قیام اور زمینداری کے معاملات کی نگرانی سے کام تھا۔

عادت و اخلاق کے بارے میں اس قدر لکھنا کافی ہے کہ وہ قدیم شرفا کے اوصافِ حسنہ کا صحیح نمونہ تھے۔ متانت، وضعداری، شائستگی اور معاملات کی صفائی ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھیں، لیکن ان کی زندگی کا نمایاں پہلو والدین کا ادب تھا جس کے لیے وہ تمام شہر میں ضرب المثل تھے۔ درحقیقت یہ وہ وصف ہے جو ہر اعتبار سے ہم سب کے لیے لائق تقلید ہے۔ صاحبِ اختیار و اقتدار ہونے کے باوجود، کافی بڑی عمر میں بھی وہ اپنے والد ماجد سے معمولی سے معمولی چیز تک اس طرح مانگتے تھے جیسے چھوٹے بچے مانگتے ہیں۔ اور اس کو اپنے لیے سرمایۂ شرافت اور وسیلۂ سعادت سمجھتے تھے۔ قرآنِ عزیز نے جہاں صالحین کے مراتب کا ذکر کیا ہے وہاں ارشاد فرمایا ہے — لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ۔

یعنی ہم اُن کو دنیا میں اچھا مقام عطا کریں گے، اور آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اس اطاعت و سعادت کا جو اجر مرحوم کو آخرت میں ملے گا وہ تو ملے گا۔ اتنا تو ہم نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ خدا نے اُن کو اولاد نہایت اطاعت شعار اور سعادت مند دی۔ اس کے ساتھ ان کو

Marfat.com

اولاد سے جو شغف تھا اس کی مثالیں بھی شکل سے ملیں گی۔ جس وقت میر صاحب کی شریکِ حیات کا انتقال ہوا ہے، خود میر صاحب کی عمر بہ مشکل انتالیس [۳۹] سے متجاوز ہو گی۔ کہنا چاہیئے کہ وہ اس وقت شباب ہی کی منزل میں تھے۔ اعزّہ نے انتظامِ خانہ داری کی اصلاح کی غرض سے عقد کا مشورہ دیا، مگر میر صاحب نے دوبارہ قیدِ علائق میں گرفتار ہونا گوارا نہ کیا۔ اور تقریباً چونتیس سال کی طویل مدت اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم کے مشاغل میں بسر کر دی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سانحہ کے بعد کسبِ معیشت اور طلبِ معاش کے تمام علائق سے بھی کنارہ کش ہو گئے کیونکہ نئی صورتِ حال میں اُن کا مکان پر قیام ناگزیر تھا، اور ملازمت میں یہ التزام متعذر۔ غرض کہ اپنی شریک زندگی کی یاد اور اس سے زیادہ مرنے والی کی زندہ یادگاروں کی پرداخت، یہی ان کا دن رات کا شغل تھا۔ سچ پوچھیے تو ایثار و قربانی کے یہ نمونے ہماری سوسائٹی میں "النادر کالمعدوم" کا حکم رکھتے ہیں۔

میر صاحب ایک مذہبی اور خدا پرست انسان تھے اور فرائضِ شرعیہ کے سختی سے پابند۔ چنانچہ نو سال کی عمر سے آخر وقت تک ان کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ ادائے نوافل میں وہ اخفا کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جاڑے کے موسم میں کچھ احباب شب کو اُن کے ساتھ مقیم تھے۔ طعام وکلام سے فارغ ہو کر جب سب سو گئے تو رات گئے میر صاحب دبے پاؤں اٹھے، حسبِ معمول ٹھنڈے پانی سے وضو کیا، تہجّد کی نیت باندھ لی۔ اتفاق سے ایک مہمان[۱] کی آنکھ کھل گئی تو یہ راز افشا ہوا!

وہ ایک سچّے مسلمان کی طرح ہادم اللذات (موت) کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ حج اور زیارت سے مشرف ہونے کے بعد اُس میں اور ترقی ہو گئی تھی۔ جب صبح کو کسی مہمان کے ہمراہ اپنے باغ کی سیر کو جاتے تو اکثر اپنے والد کے مزار پر حاضر ہوتے اور اُس کے بائیں اپنا نشانِ قبر دکھاتے تھے، اُن کے عقائد پر بعض ناواقف کار لوگ خواہ مخواہ کی بدگمانیاں کرتے تھے۔ میں اپنے ذاتی علم و بصیرت کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے، اور یادِ خدا، محبت رسول

۱؎ مولانا عبد الماجد دریابادی۔ مؤلف

Marfat.com

اور عظمتِ اصحاب و آل کو اپنا ایمان جانتے تھے۔ بدعات سے اجتناب اور نام نہاد تصوّف سے بیزاری کی بنا پر فتنہ پرداز اُن کو توہّب سے متّہم کرنے کی سعی بے جا کرتے تھے۔ مگر حاشا وہ اس سے کوسوں دور تھے۔ سچ ہے ــــ والناس کلّ حزب بمالدیہم فرحون ہ ــــ

قرآنِ حکیم سے اُن کو دلی ذوق تھا اور اُس کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا خاص شوق۔ قرآنِ مجید کا مطالعہ اگرچہ دیر میں شروع کیا، مگر آخر زمانے میں تو یہ اُن کا واحد دل پسند مشغلہ رہ گیا تھا۔ عربی کی باقاعدہ مکتبی تحصیل نہ ہونے کے باوجود ان کو قرآن کی آیات اور ان کے مطالب پر اس قدر عبور ہو گیا تھا کہ گفتگو اور تحریر میں وہ برمحل زبان و قلم پر آجاتی تھیں۔ قرآنی لٹریچر اُنھوں نے ایک علٰحدہ الماری میں جمع کیا تھا جس پر خود انھوں نے " فیہا کتبٌ قیمۃٌ " کا لیبل چسپاں کیا تھا اور احباب سے اس انتخاب کی داد چاہی تھی۔

قرآن کلاس[1] کا قیام بھی اسی شوق کا نتیجہ تھا۔ اس کا قصّہ بھی پُرلطف ہے۔ معمول اس کا یہ تھا کہ پندرہ بیس اصحاب بعدِ نمازِ مغرب میر صاحب کے یہاں جمع ہو جاتے اور گھنٹہ سوا گھنٹہ قرآن مجید کا درس ہوتا۔ طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص چند آیات تلاوت کرتا۔ دوسرے اشخاص باری باری سے کوئی ترجمہ یا تفسیر پڑھ کر سناتے۔ دراصل یہ اپنی نوعیت کا عجیب کلاس تھا جس میں متعلّم سب تھے معلّم کوئی نہ تھا۔ اس طریقِ عمل سے بہت کچھ فائدہ ہوا۔ جو اصحاب قرآن اور قرآن کی زبان سے یکسر بیگانہ تھے وہ عربی شناس اور قرآن فہم ہو گئے۔ اور جو لوگ تاش اور شطرنج یا سیر و شکار میں صبح سے شام کر دیتے تھے وہ دینی شغلے میں لگ گئے۔ کہنے والوں کی زبان کون روک سکتا ہے خُردہ گیروں نے اس پر بھی اعتراضات کی بوچھار کی۔ بہرحال یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا اور آخر میر صاحب کے مرض الموت میں ختم ہو گیا۔

ان کے حلقۂ احباب میں ہر عمر اور ہر طبقے کے افراد، طلبہ، اساتذہ، تجار، وکلا، زمیندار

---

[1] قرآن کلاس میں کم و بیش بیس اشخاص کا مجمع ہو جاتا تھا۔ جو حضرات مستقل حاضری دیتے تھے ان میں ممتاز قاضی مبشر الاسلام عباسی، قاضی غلام سجاد، مولوی سبطین احمد، مولوی محمد یحییٰ، مولوی اقبال احمد، اور قاضی سجاد حسین نمایاں تھے کالج اور یونیورسٹی کی تعطیلات گرما میں مولانا یعقوب بخش راغب مرحوم۔ پروفیسر ضیاء احمد اور مؤلف شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھی مولانا عبد الحامد بدایونی بھی آجاتے تھے۔ بابو رضا احمد بدایونی کبھی آتے اور کبھی غیر حاضر رہتے۔ مؤلف

Marfat.com

ملازمت پیشہ سبھی شامل تھے۔ ایک دن ایک صاحب کسی انگریز مصنف کی تعریف کرنے لگے جس کی شاہکار تصنیف تازہ ولایت سے آئی تھی اور جس میں کسی علمی مسئلے پر نہایت دل آویز بحث کی گئی تھی میر صاحب نے سن کر فرمایا ہمارے پاس بھی ایک کتاب آئی ہے جس میں بہت پہلے اس مسئلے کو دل آویز پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ حاضرین استعجاب و اشتیاق کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ میر صاحب اندر گئے اور قرآنِ مترجم اٹھا لائے۔ موضوعِ زیرِ بحث کو پڑھ کر سنایا۔ تمام حضار نے اعتراف کیا کہ واقعی قرآنِ مجید کا طرزِ استدلال اور پیرایۂ بیان کہیں زیادہ دلکش اور دلنشین تھا۔

دنیاوی اعتبار سے بھی وہ سوسائٹی کے ایک کامیاب رکن تھے۔ خوش اخلاقی، سلامت روی، وضع داری، اور راست بازی اُن کی طبیعت ثانیہ تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اُن کے اوصاف و خصائل کے قدرِ مشترک کو ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو اس کے لیے "اعتدال" موزوں ترین تعبیر ہوگی۔ کفایت شعاری اُن کو طبعاً مرغوب تھی، مگر ضروری مصارف میں کبھی تامل نہ کرتے تھے۔ گویا ان کا طریقِ عمل کان بین ذلک قواماً کی صحیح تفسیر تھا۔ مزاج میں متانت تھی مگر نہ اتنی کہ خشکی کی حد تک پہنچ جائے۔ طبیعت میں بزلہ سنجی تھی مگر نہ اس قدر کہ سفاہت کا الزام آئے۔ رزانتِ فہم اور اصابتِ رائے میں وہ اپنے اقران و اماثل میں بہت ممتاز تھے۔ خود کوئی قدم رکھتے تو بہت دیکھ بھال کر اور دوسروں کو مشورہ دیتے تو بہت سوچ سمجھ کر۔

عدالتی جھگڑوں سے اُن کو سخت نفرت تھی اور اس ڈر سے لوگوں کے معاملات میں پڑنا پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دو صاحبوں میں کچھ جھگڑا ہوگیا۔ دونوں ان کے نیازمند تھے، اور ان کے فیصلے پر بظاہر رضامند۔ میر صاحب نے خلافِ عادت محض رفعِ شر کی نیت سے مداخلت کی بلکہ اپنے اوپر کچھ مالی بار لینا بھی قبول کیا مگر معاملہ رو براہ نہ ہوسکا۔ بالآخر عدالت کی نوبت آئی اور ایک فریق نے میر صاحب کو شہادت میں طلب کرا دیا۔ یہ بات یقیناً میر صاحب کی طبیعت کے اور حیثیت کے سراسر منافی تھی۔ آخر وہ "روپوش" ہوگئے۔ دو ماہ تک مختلف مقامات میں وقت گزارنے کے بعد جب معاملہ فرو ہوگیا تو وطن واپس آئے۔

سیاسیات سے عملی طور پر وہ ہمیشہ مجتنب رہے اگرچہ نظری اعتبار سے مسائلِ سیاسی میں ان کا مطالعہ نہایت گہرا تھا۔ تحریکِ خلافت اور اس کے علم برداروں سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا مگر

سلامت روی کا اقتضا کہیے یا شہرت سے گریز کا کہ وہ کبھی کھل کر سامنے نہیں آئے۔ یہ اور بات ہے کہ نہ صرف شہر بلکہ ملک کے ممتاز ارکانِ خلافت ان کو اس تحریکِ ملی کا ہوا خواہ بلکہ روحِ رواں سمجھتے تھے۔ گویا اس سلسلے میں ان کا مسلک بے ہمہ و باہمہ کا مصداق تھا۔

یہ تو سب کچھ ہوا مگر مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں اب تک ان کی حیات کے ایک نہایت نمایاں رخ کو بے نقاب نہ کر سکا۔ میری مراد ان کی ادبی حیثیت سے ہے۔ یہ موضوع تو دراصل ان کے ناقد کا ہے۔ میں صرف چند گوشوں کو الٹنے کی کوشش کروں گا۔

ان کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر نہایت عمیق تھی۔ ان میں قوتِ آخذہ اور قوتِ حافظہ بلا کی تھی۔ جو کچھ پڑھا تھا اس کا خلاصہ یا لب لباب ہر وقت مستحضر کتابوں کے جمع کرنے اور پڑھنے سے انھیں عشق تھا۔ ان کے کتب خانے میں بہت بڑا ذخیرہ تو نہ تھا، لیکن جو کچھ تھا وہ منتخب تھا۔ کتاب دوسرے کو دینے میں احتیاط کرتے تھے۔ البتہ قدر دانوں سے دریغ نہ رکھتے تھے۔ راقم الحروف بھی ان چند خوش نصیب افراد میں تھا جن کو وہ کتاب مستعار دینا گوارا فرماتے تھے۔ جب کبھی تعطیل میں حاضر ہوتا تو جو تازہ کتابیں ان کے یا راقم کے مطالعے میں آتیں ان پر بحث و گفتگو ہوتی۔ وہ فارسی اور انگریزی کی بہت اچھی بلکہ کامل استعداد رکھتے تھے، اور اردو کے تو ادیب ہی تھے۔ ادب، لسانیات، سیاست، تاریخ خصوصاً تاریخِ اسلام میں ان کی دستگاہ کامل تھی۔ ان کے کتب خانے میں انگریزی، فارسی اور اردو کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو میر صاحب کے حواشی سے مزین نہ ہو۔ ان زبانوں کے ادب پارے ان کے نوکِ زبان رہتے تھے۔ تاریخ ایران کا مطالعہ جس قدر وسیع اور اس سے نتائج اخذ کرنے میں ان کی نظر جتنی گہری تھی اس کی مثالیں بہت شاذ ہیں۔ تاریخ یورپ تاریخِ ہند اور تاریخِ اسلام ان کے محبوب موضوعات تھے۔ وہ کسی موضوع پر جب بھی قلم اٹھاتے تھے تو بحث کا ہر گوشہ اور مسئلے کا ہر پہلو نکھر کر نظر کے سامنے آجاتا تھا۔ مطالعے کی وسعت کا یہ حال تھا کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ حد ہو گئی کہ ایک مرتبہ موسیقی کا ذکر چھڑ گیا تو اگرچہ میر صاحب کو اس سے مطلق رغبت نہ تھی، بلکہ کہنا چاہیئے نفرت تھی، لیکن موصوف نے اس کی اصطلاحات چھ راگ، چھتیس راگنیاں، کومل اور تیور سر، دادرا، ٹھمری، خیال وغیرہ گنا ڈالیں۔ تاہم جن موضوعات سے ان کو دلی شغف تھا وہ قرآن مجید اور مذہب کے بعد ادب، تاریخ اور سیاست تھے۔

Marfat.com

مطالعے سے قطع نظر، مشاہیر علم و ادب سے ذاتی و خصوصی تعلقات اور ادبی مذاکرات نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کافی حصّہ لیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد علی، مولوی عبدالحق مولوی عزیز مرزا، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالحلیم شررؔ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، وغیرہ سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ہر شخص اپنے اکتسابات ذہنی میں کسی نہ کسی آئیڈیل سے متاثر ہوتا ہے۔ ان کے آئیڈیل مولانا شبلی تھے، جس طرح ان کے دیرینہ رفیق عبدالحق (بابائے اردو) کے آئیڈیل خواجہ حالیؔ تھے۔ ان کی یہ پسند شروع میں غیر شعوری رہی ہوگی مگر رفتہ رفتہ شعوری بن گئی۔ وہ مولانا شبلی کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ جب براؤن کی تاریخ ادبِ فارسی کی پہلی یا دوسری جلد یورپ سے آئی تو میر محفوظ علی نے ہی ترجمہ کرکے مولانا کو سنائی۔ ان کے اسلوبِ تحریر میں جو شگفتگی اور دلآویزی ہے، ممکن ہے کہ اس میں وہ اپنے فاضل استاد سے متاثر ہوئے ہوں، تاہم جو طرزِ تحریر انھوں نے اپنایا اس کی انفرادیت خود ان کی طبع رسا کی دین ہے۔ ان کے طرزِ نگارش میں ایک خاص ادبی شان پیدا ہوگئی تھی، جس نے رفتہ رفتہ ان کو "سنجیدہ ظرافت" کا ایک صاحبِ طرز انشا پرداز بنا دیا۔ چھوٹے چھوٹے جملے، الفاظ کا حسن انتخاب ہلکا طنز، متانت آمیز شوخی، یہ وہ عناصر تھے جنھوں نے میر صاحب کے انداز میں انتہا کی گیرائی اور دلکشی پیدا کر دی تھی۔ عام لوگ ان کے اس وصف سے چنداں باخبر نہ تھے، مگر خواص جانتے تھے کہ وہ حقیقت میں اپنے دور کے ایک بڑے کامیاب اور صاحب طرز ادیب تھے۔

مولانا ظفر علی خاں ہوں یا مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی ہوں یا مولانا محمد علی مولانا عبدالماجد دریابادی ہوں یا مولانا ظفر الملک علوی، سب میر محفوظ علی کے اکتساب ادبی کے مداح تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب "طنزیات و مضحکات" میں موصوف کے طنزیہ مقالات کو بہت سراہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "پنچ کے دور کے بعد جس نے سب سے پہلے" پنچانہ رنگ کو ترک کرکے" اسپیکٹیٹر (SPECTATOR) سے قریب ہونے کی کامیاب اور مستحسن کوشش کی ہے اس میں سید محفوظ علی صاحب بدایونی، سلطان حیدر جوشؔ، مسبوق یا اولڈ بوائے کے کھلنڈرے تھے۔" مشہور ادیب مولانا اقبال احمد سہیل اپنی تصنیف "افکارِ سہیل" میں کہتے ہیں۔ "سنجیدہ ظرافت میں تو اب تک غالباً اردو کا کوئی ادیب سید محفوظ علی

کا ہم رتبہ نہ ہو سکا۔ یہ مولانا حمید الدین مرحوم اور ظفر علی خاں صاحب کے ہم درس رہ چکے ہیں اور علامہ شبلی کے فیض یافتہ۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے مجموعۂ مضامین میں ان کو اپنے رنگ کا امام ٹھہرایا ہے۔

انتخاب الفاظ میں تو ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کھانا کھا رہے ہیں کہ کوئی برمحل لفظ ذہن میں آیا۔ فوراً اٹھے، مضمون میں ترمیم کی اور پھر کھانے پر آ بیٹھے۔ اس کے ساتھ ترجمہ کے تو وہ بادشاہ تھے[1]۔ طبیعت موزوں پائی تھی، لیکن شعر گوئی ان کا مشغلہ نہ تھا۔ البتہ شعر کا برمحل ایراد ایسا ہوتا تھا کہ اہل ذوق عش عش کرنے لگتے تھے۔ یہ دراصل ان کے حسنِ انتخاب اور غیر معمولی حافظے کا ادنیٰ کرشمہ تھا جس سے میر صاحب سے عمر میں چھوٹے اور بعض ہم سن بھی استفادہ کرنے کے معترف تھے۔

ایک طرف تو انھیں خانہ زاری کے مشاغل اور زمینداری کے جھمیلے دم نہ لینے دیتے تھے، دوسری طرف وہ ٹھہرے گمنامی پسند۔ بقول شخصے وہ خود کو گمنامی ہی میں "محفوظ" سمجھتے تھے۔۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حتی الامکان لکھنے سے گریز کرتے تھے، گو مواد کی ان کے یہاں کوئی کمی نہ تھی۔ اگر کوئی دوست یا شناسا گدائے مبرم کی طرح پیچھے ہی پڑ جاتا تو مجبور ہو جاتے تھے۔ پھر بھی مقالات یا مضامین جو لکھتے ان پر اپنا نام نہ ڈالتے عموماً "معوذن العلیٰ" "سمعب"، "ملا بودھا مثوی"، "ملائے آقِ سفال، نقاش"، "یا شمع بے نور"، وغیرہ جیسے فرضی ناموں کی آڑ میں اپنی شخصیت کو چھپاتے۔ یہ دوسری بات تھی کہ پہچاننے والے ان کو "اندازِ فکر" سے پہچان جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں خواص کے

---

[1] ایک مثال رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے: گزشتہ جنگ عظیم کے سلسلے میں مولانا محمد علی کا ایک معرکۃ الآرا مضمون CHOICE OF THE TURKS شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جا رہا تھا۔ بحث یہ تھی کہ CHOICE کا اردو مترادف اس موقع پر کیا ہوگا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا تھا لیکن اطمینان کسی کو نہ ہوتا۔ بالآخر یہ مسئلہ سید صاحب سے رجوع کیا گیا۔ سید صاحب نے موقع محل دریافت کر کے فوراً بتایا 'چارۂ کار'۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر 'چارۂ کار' سے بہتر کوئی لفظ ہو نہیں سکتا۔ (رشید احمد صدیقی۔ گنج ہائے گراں مایہ)

Marfat.com

علاوہ دوسرے لوگ ان کے ادبی کمالات سے بے خبر رہے۔ مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر "دکن ریویو" شیخ وحید احمد مسعود ایڈیٹر "نقیب" بدایوں مولوی ظفر الملک ایڈیٹر "الناظر" لکھنؤ، نیز بعض مدیرانِ "علی گڑھ میگزین" اُن خوش نصیبوں میں تھے جو موصوف سے اپنے رسائل کے لیے مقالہ حاصل کرنے میں اکثر کامیاب ہو جاتے تھے۔ گو اس مقصد کی خاطر ان حضرات کو کافی مجاہدہ کرنا پڑتا تھا۔ ان ممتاز ادبی رسائل کے علاوہ انھوں نے مولانا محمد علی کے "ہمدرد" کی ادارت کے سلسلے میں "تجاہل عامیانہ" کے عنوان سے لکھا۔

ایک بار راقم نے ان سے استدعا کی کہ وہ عہدِ اکبری کے مشہور مؤرخ ملّا عبدالقادر بدایونی کے سوانح حیات مرتب فرما دیں کیونکہ اس کام کے لیے ان سے زیادہ موزوں کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کے جواب میں انھوں نے کسی انگریزی ناول کی ایک طویل داستان سنائی جس میں ایک شخص نے بندر کے غدود استعمال کیے تھے اور اس کے نتیجے میں اس میں بندر ہی کی اچھل کود پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سب سنا کر متبسم ہو کر فرمایا کہ اگر وہی دوا کہیں مل جائے تو شاید اس پیرانہ سالی میں جوانوں کی سی پھرتی نصیب ہو سکے۔

ان کے مضامین سے تاریخی معلومات، سیاسی طنز، لطیف ظرافت، نادر اسلوبِ بیان، اور زبان و محاورہ پر قدرت ہر جگہ آشکار رہے۔ کہیں کہیں آیاتِ قرآنی کی طرف اشارات، عربی فقرات اور خاص ترکیبات سے خطابت کا زور پیدا ہو گیا ہے۔ میر صاحب کے مضامین "خطاب" "لنگر" "نظامتِ بابِ ہند" "زوال سلطنت مغلیہ کے اسباب" "نقلِ مکان" "روٹیوں کا نزاع" "میاں" "شوہر کا شکار" "تلوّن" "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" اور "مسٹر صاحب دین" اپنے طرز کی بہترین تخلیقات ہیں: "زوال سلطنتِ مغلیہ" اور "نقلِ مکان" میں ادب کے ساتھ سیاست کا امتزاج نہایت دل پسند ہے۔ "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" کا تمثیلی انداز تعریف سے مستغنی ہے۔ "بلبلانِ اسیر کی رہائی" "محمد علی" اور "محمد علی کی یاد میں" باقاعدہ سیرت نگاری کے نمونے تو نہیں، لیکن مقالہ نگار کے ذاتی تاثرات نے ان تینوں مضامین کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جو سرمایۂ ادب انھوں نے اپنی یادگار چھوڑا ہے وہ بہت قلیل ہے تاہم جو کچھ ہے وہ ارادت کی آنکھوں سے لگانے اور عقیدت کے سر پر جگہ پانے کے قابل ہے۔ انھوں نے

جو کچھ لکھا وہ ان کی انفرادی شان برقرار رکھنے کو کافی ہے۔ یہ ایک اجمالی اور سرسری خاکہ ہے میر صاحب کے مقالات کا۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین اصل مقالات کو پڑھنے کے بعد اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ موصوف قدرت کی طرف سے انشا پردازی کی غیر معمولی صلاحیتیں لے کر آئے تھے اور جہاں انشاپردازی کے ساتھ ملّت کی دردمندی کے جذبات بروئے کار آتے ہیں وہاں شراب دو آتشہ ہوگئی ہے۔

تحریر کے ساتھ میر صاحب کو تقریر کے آرٹ میں بھی کمال حاصل تھا۔ پبلک تقریر تو سننے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا اور شاید وہ اس میدان کے مرد بھی نہ تھے۔ البتہ پرائیوٹ گفتگو میں وہ محفل پر چھا جاتے تھے۔ ذہانت، طلاقت، حاضر جوابی اور نکتہ سنجی میں کم لوگوں کو میں نے ان کا مماثل پایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے جو کچھ پڑھا ہے اس کے بہترین اجزا کو جزو دماغ بنا لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مختلف مطالب علمی کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے ذہن کے مختلف خانوں میں محفوظ کر رکھا ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے بے تکلف مطلوبہ نکتہ نکال کر پیش کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ ان کی محفل سے اٹھتے تھے تو کچھ حاصل کر کے اٹھتے تھے۔ پھر اندازِ بیان اس قدر پر لطف اور دلکش کہ سننے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ الحاصل وہ اس اعتبار سے ایسے باغ و بہار شخص تھے جن کے پاس بیٹھ کر پژمردہ طبیعتیں بھی شگفتہ ہو جاتی تھیں۔ افسوس کہ یہ باغ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو بادِ خزاں سے مرجھا کر رہ گیا۔ انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

ممکن ہے کہ سطحی نظر والے جو زندگی کی گراں مایہ حقیقتوں کو مادّی سود و زیاں کے پیمانے سے ناپنا پسند کرتے ہیں میر صاحب کی کوئی ضخیم علمی یادگار یا اہم سیاسی کارنامہ نہ دیکھ کر چیں بجبیں ہوں مگر ان بے چاروں کو کیا خبر کہ عرصۂ حیات اور اس کی تمام سرگرمیوں، کارگاہ زندگی اور اس کی تمام رعنائیاں اپنی ثقافت و سیاست اپنے فلسفے اور ادب کے سرمایہ کے ساتھ ایک طرف اور ایک مومن قانت کا ایمان باللہ اور عمل صالح ایک طرف۔ الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ۔ دراصل جو نیک نام (باقیات الصالحات) مرحوم نے اپنی یادگار چھوڑا ہے وہ ایک ایسا سدا بہار پھول ہے جو رہتی دنیا تک اپنی دلکشا مہک سے مشامِ جاں کو معطر اور فضائے گیتی کو معنبر کرتا رہے گا۔ اب اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔

Marfat.com

ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہنر دارد عشق
گفتم اے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں

دہلی
۲۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء ــــــــــ ضیا احمد بدایونی

Marfat.com

حدیثِ دیگراں

(۱)

خوش تر آں باشد کہ سِرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

باہر سے بدایوں تشریف لانے والے اصحاب اکثر یہ خیال دل میں لے کر آتے ہیں کہ وہاں کے قدیم مزارات اور تاریخی آثار کی بھی زیارت کریں گے۔ لیکن علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے جب اس خاکِ پاک کا قصد کرتے ہیں تو ملّا (عبدالقادر بدایونی) کی آرامگاہ اور جامع مسجد شمسی کو دیکھنے کی آرزو کے ساتھ انھیں اس تاریخی بستی کی ایک تاریخی ہستی سے ملنے کا شوق دامن گیر ہوتا ہے۔

"قریبۃ السادات" میں جس کو عرفِ عام میں "سید باڑہ" کہتے ہیں ایک تنگ گلی کے اندر آپ کو ایک چھوٹا سا مگر خوبصورت مکان نظر آئے گا جس کی "سادگی و پرکاری" مکین کی ثقاہت پوش شوخی کا پتہ دیتی ہے۔ دروازے کی پیشانی پر ایک آیۂ قرآنی کی موجودگی اور کمروں کے در و دیوار پر تصاویر کی غیر حاضری اسلامی معاشرت کی مظہر ہے قالین اور گاؤ تکیے مشرقی تمدن کے آئینہ دار۔ اساس البیت میں سب سے زیادہ یا کتابیں نظر آتی ہیں یا مصلّے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں وہ بزرگ رہتے ہیں جو بزعم خود بہت مستور ہیں مگر فی الحقیقت بہت مشہور۔ کسی قدر کوتاہ قامت گندمی رنگ، سفید ریش، لاغر بدن، صورت سے بہت بوڑھے مگر عمر زیادہ نہیں یہی ہیں میر صاحب جن کو اخباروں اور رسالوں نے تو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے لیکن عقیقے کے وقت شاہ دلدار علی مذاق بدایونی کے حسب الارشاد "صرف محفوظ علی" موسوم کیا گیا تھا۔

علی گڑھ میگزین جنوری ۱۹۳۹ء

سبطین احمد بدایونی[۱]

---

[۱] ۲۵ اگست ۱۹۷۱ء کو کراچی میں انتقال ہوا مصرعِ تاریخ وفات ہے ع گلشن خلد میں آباد ہیں سبطین احمد

مؤلف

Marfat.com

شاہ دلدار علی مذاقؔ ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے علم متوسط عربی و فارسی کی تکمیل فرمائی۔ اولاً طبع نظم گوئی کی طرف راغب ہوئی۔ آپ نے دہلی میں جاکر فنِ شعر گوئی میں خاقانیٔ ہند ابراہیم ذوقؔ سے تلمذ حاصل کیا۔ استاد نے آپ کی طبعِ موزوں اور کلامِ آبدار دیکھ کر آپ کا تخلص مذاقؔ رکھا۔

قریب چالیس برس کی عمر میں آپ کو علم باطنی کا شوق ہوا اور سفر آپ نے اختیار فرمایا۔ آپ مرید سلسلۂ قادریہ میں حضرت شاہ فضل غوث بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے ہوئے۔ انتہا درجے کا تقویٰ اور زہد آپ کے مزاج میں تھا۔ بعدہٗ آپ نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت شاہ جی عبدالرحیم شاہ مرحوم شاہجہانپوری سے کی اور مقام اجمیر شریف مزار پاک حضرت خواجہ بزرگ قدس سرہٗ پر عرصۂ دراز تک چلّہ کشی کی۔ اس دربار شاہی سے حضرت کو فیضِ کامل حاصل ہوا اور ایک دوسرے رنگ میں مولوی صاحب رنگ گئے۔

اوائل میں لباس عام لوگوں کا سا پہنتے تھے اور اب لباس فقیرانہ یعنی گیروا کپڑے آپ کا ملبوس تھا اور آپ جو کچھ نظم فرماتے تو صرف تصوّف کے اشعار کہتے۔ سابق کا کلام آپ کا عاشقانہ بہت کثرت سے مشہور و معروف ہے۔

تذکرۃ الواصلین ——————— محمد رضی الدین فرشوری بسمل بدایونی

یہ حضرت بدایوں میں "مذاق میاں" کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔

انھوں نے ایک سہرہ بھی لکھا تھا جو یوں شروع ہوتا ہے ؏

علیؓ نوشہ بنا سہرہ بندھا مشکل کشائی کا

یہ سہرہ برکت کے طور پر شادیوں میں پڑھا اور گایا جاتا تھا۔

بدایوں میں دو مراثی بڑے مقبول تھے۔ ایک بیہودہ کے نام سے پکارا جاتا تھا خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر وہ اپنی یاوہ گوئی اور سوانگ سے محفل کو ہنساتا تھا۔ دوسرا عباس نامی معمر مراثی تھا۔ عباس دعوتوں کی فہرستیں گھمایا کرتا تھا

اور ایک ایک خاندانی بزرگ کا نام لے کر اپنا حق مانگا کرتا تھا۔ عباسؔ مذاق میاں کا سہرہ بھی گا کر سنایا کرتا تھا۔ شکیلؔ بدایونی مرحوم نے اس کی وفات پر ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے ؎

ترے سر تھا ساری خدائی کا سہرہ
تو گاتا تھا مشکل کشائی کا سہرہ

جب سیّد محفوظ علی صاحب کی ولادت ۱۸۷۰ء میں ہوئی تو مذاقؔ میاںؒ کی عمر ۵۳ سال تھی۔ اس وقت مذاقؔ میاںؒ کے ذہن اور شاعری پر تصوّف کا گہرا رنگ چڑھ چکا تھا اور وہ مشکل کشائی کا سہرہ بھی لکھ چکے تھے۔ یہی مذاق میاں تھے جنھوں نے سیّد صاحب کا نام "صرف محفوظ علیؔ" تجویز فرمایا تھا۔

مؤلف ———

سیّد محفوظ علی خاص وضع و خیال کے آدمی تھے۔ ان میں قدیم روایات اور جدید خیالات ایک حد تک ساتھ چلتے تھے اور بس۔ مثلاً مغربی علوم کی تعلیم کے حامی تھے۔ وہ ان توہمات اور باطل خیالات کے مخالف تھے جو قدامت یا مذہب کے نام سے قوم میں مروّج تھے۔

زمانے کے تقاضوں کا پورا کرنا ضروری سمجھتے تھے کیونکہ جو قوم زمانے کا ساتھ نہیں دیتی وہ زندہ نہیں رہتی۔ انھوں نے انگریزی تعلیم پوری حاصل کی۔ علی گڑھ میں کئی سال رہے۔ لیکن کبھی اپنے لباس میں تبدیلی نہ کی۔ وہی اچکن اور پاجامہ، سر پر عمامہ یا معمولی ٹوپی یا کبھی کبھار ترکی ٹوپی پہن لیتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھیں کبھی استرے سے آشنا نہ ہوئیں۔ مذہب کے بہت پابند تھے۔ تمام ارکانِ اسلام احتیاط سے ادا کرتے تھے۔ آخر میں حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ پردے کے حامی تھے اور عورتوں کی آزادی کو جیسی کہ آج کل پائی جاتی ہے ناپسند کرتے تھے۔ اپنی زبانوں اور مذہب کی تعلیم کو مسلمانوں کی قومیت کے لیے لازم

خیال کرتے تھے۔ آرائش کی اشیا کو کبھی ہاتھ نہ لگایا۔ ان کا لباس، رہنا سہنا، نشست برخاست، ملنا جلنا سب قدیم طرز کا تھا۔ مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کے بڑے حامی تھے۔

پہلی نظر میں وہ قدیم وضع کے سنجیدہ بزرگ معلوم ہوتے تھے، لیکن وہ بڑے زندہ دل ظریف اور خوش طبع شخص تھے۔ بڑے مزے مزے کے لطیفے سنایا کرتے تھے، اور باتوں باتوں میں مزاح کی کوئی ایسی پُرلطف بات کہہ جاتے تھے کہ سننے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

(مضامین محفوظ علی) ——— عبدالحق

میر محفوظ علی مرحوم جن دنوں حیدرآباد میں ملازم تھے میں کم سن تھا مگر میرے ہوش سنبھالنے کے بعد ایک دفعہ وہ حیدرآباد پہنچے تو والد مرحوم سے ملنے کے لیے آئے اور میں نے زیارت کی۔ اس کے بعد دہلی میں بھی مجھے ان سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ نہایت ہی مخلص، قدیم وضع کے شریف بزرگ تھے طبیعت نہایت ہی مزیدار تھی۔ سادگی حد سے زیادہ اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آخری بار وہ تقسیم ملک سے دو تین سال پہلے حیدرآباد آئے تھے۔ اس کے بعد سے پھر ملاقات نہیں ہوئی، البتہ ان کے فرزند ابن علی سے دوستی رہی۔

نقوش، لاہور ——— تمکین کاظمی

اگست ۱۹۶۱ء

سرسید اور شبلی کا تذکرہ سید محفوظ علی بڑے احترام سے کرتے تھے۔ شبلی علی گڑھ میں ان کے استاد رہے تھے، لیکن وہ ان کے نڈر شاگرد تھے۔ اوّل تو دونوں کی عمروں میں کوئی تیرہ۱۳ سال ہی کا فرق تھا جب استاد تحقیق و حقائق کی کسی مشکل میں مستغرق ہوتے تو دور کی کوڑی محفوظ علی ہی لاتے تھے۔

تیسرے استاد کو کسی تازہ انگریزی تصنیف کا جائزہ لینا ہوتا تھا تو ترجمہ اکثر محفوظ علی ہی کرتے تھے۔

میر صاحب شبلی کے لطیفے بڑے مزے سے سناتے تھے۔ دو میرے ذہن میں رہ گئے ہیں وہ پیش کرتا ہوں۔ یہ اس وقت کے ہیں جب شبلی اور اکبر الہ آبادی ایک ہی جگہ تھے اور اکبر نے شبلی کو ان الفاظ میں دعوتِ طعام دی تھی ؎

بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی
آتا نہیں ہے مجھ کو قبلہ قبلی

شبلی نے کہا کیا خوب قافیہ نکالا ہے۔ "قبلی" کے علاوہ "شبلی" کا اور کوئی قافیہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اکبر ذرا سوچ کر بولے کیوں نہیں۔ شبلی نے کہا تو فرمائیے۔ اکبر نے کہا "لبلی"۔ شبلی بولے یہ کیا ہے۔ اکبر نے کہا سند پیش کروں۔ شبلی نے کہا "بے شک"۔ اکبر نے ایک شعر پڑھا جو کچھ اس طرح تھا ؎

تم بھی اس راہ پر چلے شبلی
عشق نے آبروئے غالب لی

شبلی سے کوئی صاحب اکبر کی موجودگی میں ملنے آئے اور نانا فرنویس کی تعریف کے پل باندھنے لگے۔ نانا فرنویس کی شان میں ان کا نثری قصیدہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ اکبر تنگ آکر بولے: "جناب! میرا مشورہ ہے کہ آپ نانا فرنویس پر ایک کتاب لکھیں تو میں اس پر بڑا عمدہ تبصرہ قلمبند کروں گا۔ وہ صاحب اکبر کی طرف متوجہ ہوتے۔ اکبر نے کہا "آپ اپنی کتاب کا نام 'النانا' رکھیں۔ میں تبصرے میں کہوں گا کہ خوبیوں کے اعتبار سے 'النانا' تو 'المامون' کا بھی باپ ہے۔" "المامون" کے مصنف شبلی ہنس پڑے۔

سیّد محفوظ علی صاحب کے لطیفے بے شمار ہیں، لیکن کسی نے ان لطائف کو محفوظ نہیں کیا۔

——— مؤلف

Marfat.com

حدیثِ دیگراں

(۲)

وہ باتوں باتوں میں مزاح کی کوئی ایسی پرلطف بات کہہ جاتے تھے کہ سننے والے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔ دلّی کی ایک مجلس میں جہاں حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور دوسرے اہلِ علم اور صاحبِ ذوق تشریف رکھتے تھے، مولانا نذیر احمد اور مولانا شبلی کے ذوق ادب پر بحث ہورہی تھی۔ اس بحث کے اثنا میں سید محفوظ علی نے چپکے سے کہا کہ اس بارے میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ دونوں بزرگوں کے ذوق کے نمائندے مولانا ابوالکلام آزاد اور جسٹس عبدالرحمٰن موجود ہیں۔ ان کے ذوق کا اندازہ کرلیجئے۔ یہ سنتے ہی ساری محفل پھڑک اٹھی۔

عبدالحق ——— (مضامینِ محفوظ علی)

میر صاحب، شیخ محمد سلیمان مرحوم، مولوی نہال الدین وکیل اور میں چاروں میں ایک بار میر صاحب کے گاؤں (زمینداری کے علاقے) میں گئے ہوئے تھے۔ میر صاحب نے دعوت کی تھی۔ سلیمان صاحب نے ازراہِ تفنن فرمایا۔ "میر صاحب اگر اکبر، جہانگیر یا شاہجہاں کے زمانے میں ہوتے تو ایک دوسرا ابوالفضل یا فیضی کا ہندوستان کی تاریخ میں اضافہ ہوتا۔" نہال الدین اس جماعت میں سب سے کم عمر تھے مگر میر صاحب کی شفقت نے انھیں قدرے بے تکلف کردیا تھا۔ انھوں نے سلیمان صاحب کو مخاطب کرکے کہا۔ "نہیں جناب۔ مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ میر صاحب اگر دورِ مغلیہ میں ہوتے تو زیادہ سے زیادہ کسی مسجد میں موذن ہوتے، یا درس دیتے ہوتے، یا لوٹے توڑتے دکھائی دیتے" میر صاحب بہت خوش ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "اس لڑکے نے مجھے بہت صحیح شناخت کیا۔"

مؤلف سے ایک ملاقات کے دوران بیان کیا (بابو) ضیا احمد بدایونی

Marfat.com

محترم سیّد محفوظ علی صاحب سے میری محض ایک مرتبہ کی ملاقات ہے۔ میں نے سید صاحب کی تحریریں بھی دیکھی تھیں اور اُن کی توصیف شیخ عبدالقادر صاحب سے بھی سنی تھی، پتلے دبلے سفید ریش کے منوّر ترین سید محفوظ علی سے بدایوں کے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ انہی کے مکان میں میرا دو دن اور دو رات قیام ہوا۔ مجھے تعجب ہوا کہ سید صاحب نے اپنے گھر پہنچتے ہی میری خاطر مدارات اس بے تکلفی سے سادہ طور پر فرمائی جیسے میں بھی کچھ "چیز" ہوں۔

میری مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ اپنی الماری سے "شاہنامۂ اسلام" کی پہلی جلد نکال لائے۔ میں نے اسے کھولا تو اس پر بہت سے مقامات پر "ص" کے نشان لگے ہوئے تھے۔ ولادتِ رسول پاکؐ کے اشعار پر ہر صفحہ پر "سبحان اللہ" لکھا ہوا تھا اس قدر افزائی پر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

ان دو دنوں میں سیّد صاحب کے دولت کدے پر دو گھریلو جلسے ہوئے اور سیّد صاحب بار بار ولادت رسولِ پاکؐ اور قطب الدین ایبک پر جو اشعار میں نے "شاہنامۂ اسلام" کی جلدِ اول میں لکھے ہیں، سنانے کی فرمائش کرتے اور بار بار "سبحان اللہ" اور "اللھم زد فزد" سے میرا دل بڑھاتے۔

یہ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ شمع جو بدایوں میں علمائے اسلام نے جلائی تھی، مغرب کی آندھیوں کے باوجود روشن تھی۔ بدایوں اہلِ علم و اہلِ فکر و بے باک اظہارِ رائے کا گھر تھا۔

مکتوب از لاہور بنام مؤلف ——— ابوالاثر حفیظ جالندھری

۱۱ راگست ۱۹۶۹ء

یہ میرے اوائل عمر کی بات ہے جب سید محفوظ علی صاحب کے مضامین "دکن ریویو" اور "ہمدرد" میں شائع ہوتے تھے۔ اس وقت میری عمر اتنی نہ تھی کہ میں ان مضامین کی ادبی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھ سکتا، مگر میرے لیے وہ بہت دلچسپی کے موجب ہوتے تھے

Marfat.com

اور اُن کے لطائف مدتوں ذہن میں تازہ رہے۔

مجھے مرحوم سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، لیکن اُن کے ملنے والوں سے ملا ہوں اور اُن کے اوصافِ حمیدہ اُن سے سنے ہیں۔ جدید تعلیم اور ظرافتِ طبع کے باوجود وہ نہایت نیک اور دین دار آدمی تھے۔

مکتوبات لاہور بنام مؤلف ———— سید ابو الاعلیٰ مودودی

۱۱ر۱۶ر اگست ۱۹۶۹ء

اس زمانے میں جب کہ میر صاحب تنخواہ نہ ملنے سے پریشان تھے ایک لطیفہ ہوا۔ ان دنوں اکبر الملک کوتوال بلدہ یعنی حیدر آباد کے پولیس کمشنر تھے۔ اُن کا تعلق صرف حیدر آباد کی پولیس سے تھا اور یہ حضور نظام کے خاص آدمی تھے۔ ان سے ہنکن صاحب کمشنر پولیس اضلاع سے بنتی نہ تھی۔ یہ ایک ہی عہدہ دار تھے جو یوروپین آفیسر سے ٹکر لے رہے تھے کیونکہ رزیڈنٹ بھی ان کا دوست تھا۔ ایک رات اکبر الملک کی طرف سے ایک عہدہ دار پولیس سواری لے کر محفوظ علی کے پاس پہنچا کہ کوتوال صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ بڑے حیران ہوئے کیوں کہ ان سے کوتوال صاحب کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ٹالنا چاہا تو یہ عہدہ دار جبر کرنے لگا۔ اس لئے مجبوراً سواری میں بیٹھ گئے اور اکبر الملک کے پاس پہنچے۔ اکبر الملک نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔ "محفوظ علی صاحب آپ اتنی مدت سے حیدر آباد میں ہیں اور اب تک آپ کو تنخواہ نہیں ملی۔ ہم ایک اخبار نکالنے والے ہیں۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کے لیے ایک آپ جیسے شخص کی ضرورت ہے۔ اگر آپ تیار ہیں تو آپ کو تین سو روپے ماہوار تنخواہ دی جائے گی۔ صرف اتنی پابندی کرنی ہوگی کہ میری مقررہ پالیسی پر اخبار نکالنا پڑے گا۔ اگر آپ پیشگی تنخواہ چاہیں تو کل ہی مل سکتی ہے؟"

میر محفوظ علی یہ سُن کر حواس باختہ ہوگئے اور انھوں نے بڑی لجاجت سے عرض کیا ———— "میں ہنکن صاحب کے دفتر میں ملازم ہوں۔ پھر میں بغیر اُن کی اجازت کے کس طرح آپ کے اخبار کا کام کر سکتا ہوں!"

Marfat.com

اکبرالملک نے بگڑ کر کہا ــــــ "ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہنکن صاحب کے دفتر میں ملازم ہیں، کام کر رہے ہیں مگر تنخواہ آج تک آپ کو نہیں ملی۔ ہنکن صاحب نے کچھ روپیہ آپ کو دینا چاہا تو آپ نے نہیں لیا۔ آپ خواہ مخواہ نوکر ہیں اور تنخواہ ندارد۔ کل سے آپ میرے پاس آ جائیے۔ تین سو روپیہ کل ہی مل جائے گا۔ اور یہ تنخواہ ہر مہینے ملتی رہے گی۔"

اس کا جواب میر صاحب نے دیا ــــــ "جناب عالی! اگر پسند کریں تو میں ہنکن صاحب سے اجازت لے کر آتا ہوں۔"

یہ سُن کر اکبرالملک گرم ہو گئے۔ کہنے لگے ــــــ "محفوظ علی! تم ہنکن کو بڑا آدمی سمجھتے ہو۔ میرے نزدیک وہ بڑا آدمی نہیں ہے۔ اور اگر تم اس سے اجازت لے کر آؤ تو میرے لیے کارآمد نہیں رہو گے۔"

اب تو میر صاحب کو واقعی چکّر آ گیا اور انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر کہا ــــــ "جناب عالی! خفا نہ ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ عالی جناب ہنکن صاحب کو ایک چٹھی لکھ کر مجھے وہاں سے اجازت دلوا دیں۔"

اکبرالملک نے خفگی سے کہا ــــــ "جائیے مجھے آپ کی ضرورت ہے نہ ہنکن کو لکھ کر آپ کو بلوانے کی حاجت ہے۔"

یہ کہہ کر کوتوال صاحب نے تو اجلاس برخاست فرما دیا اور محفوظ علی صاحب بغیر سواری کے سڑک ناپتے ہوئے اندھیری گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے گھر پہنچ کر رات بھر پریشان رہے۔ صبح نماز فجر پڑھ کر اٹھے بھی نہ تھے کہ ہنکن صاحب کے پاس کا آدمی آیا کہ صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ پہنچے تو ہنکن صاحب نے صورت دیکھتے ہی شاباش دی کہ رات تم نے بڑی مردانگی کا کام کیا۔ میری بات رکھ لی۔ شاباش۔

محفوظ علی حیران رہ گئے کہ حیدرآباد میں کیسے کیسے جنّات ہیں کہ کوئی بات ان سے چھپ نہیں سکتی۔ غرض چند ہی روز کے بعد منظوری آ گئی اور چٹھی ہوئی

Marfat.com

تنخواہ بھی مل گئی۔ مگر محفوظ علی کو اس ماحول سے ایک وحشت سی ہو گئی۔

——— تمکین کاظمی

نقوش۔ لاہور

اگست ۱۹۶۱ء

سید ابن علی صاحب نے قاضی غلام امیر صاحب امیرؔ کا ذکر کیا ہے۔ قاضی صاحب بدایوں کے رئیس، نغز گو شاعر، اور نقاد تھے۔ وہ غزلیں بھی کہتے تھے اور نظمیں بھی۔ ان دونوں اصنافِ سخن میں وہ بڑے صاف ستھرے خیالات، جذبات اور محاورات سے کام لیتے تھے۔ مرنجاں مرنج تھے اور معمر رسیدہ۔ اسی لیے مقامی مشاعروں کی صدارت کے لیے وہ ہر ٹولی کو منظور رہتے۔

جنگِ بلقان کے سلسلے میں جب ۱۹۱۲ء میں ترکی نے سرکاری ہنڈیاں جاری کیں تو ہندوستان میں ان کی فروخت کے لیے مولانا محمد علی نے بڑی جدوجہد کی۔ اسی سلسلہ میں قاضی صاحب نے ایک نظم "پھیری والے سوداگر کی صدا" کے عنوان سے لکھی تھی جو بڑی مقبول ہوئی اور بعد میں "ہمدرد" میں بھی شائع ہوئی۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

ترکی کے تمسکات لے لو لے لو

جنّت کے قبالجات لے لو لے لو

یہ ترکی کے لیے روپیہ جمع کرنے کی مہم میں بہت کام آئی۔

بدایوں میں شاعر تو ہمیشہ حشرات الارض کی طرح پھیلے رہے۔ ان کا تذکرہ محمد ایوب قادری صاحب تیار کر رہے ہیں۔ یہ شاعر عام طور پر مختلف ٹولیوں اور دھڑوں میں بٹے ہوتے تھے جو ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کے اکھاڑے خاص طور پر مشاعرے کی محفلوں میں جمتے تھے یا پھر ایکشن کے موقعوں پر فریقین کے درمیان پمفلٹ بازی میں ان کا فن کام آتا تھا۔ ہجو گوئی کا یہ عالم ہوتا کہ ان کے قلم کا داک رقم سے شہر کی دیواریں تک سیاہ پوش ہو جاتی

بقیس۔ چھپ چھپ کر ہجو و ہزل لکھنے والوں میں کفیل الدین عالی اور قمر الحسن قمر قابل ذکر ہیں۔ کبھی در پردہ اور کبھی منظرِ عام پر کہنے والے علی حاتم اس صنف کے مانے ہوئے مرد میداں تھے۔ ان کی شوخیٔ تخیل اور زہرناک قلم سے شاید ہی بدایوں کی کوئی درخورِ اعتنا ہستی بچی ہو، حتیٰ کہ میر محفوظ علی صاحب جیسے ثقہ بزرگ اور مقدس ہستی تک ان کی زد سے نہ بچ سکی۔ بات یہ ہوئی کہ میر صاحب کے ایک دیرینہ دوست اور ساتھی مولوی وزیر احمد[1] ٹونک والے کے پوتے سبط احمد کے لیے رشتہ درکار تھا۔ اس سلسلے میں میر صاحب نے بھی کچھ سعی فرمائی۔ علی حاتم کو بہانہ ہاتھ آیا۔

میر صاحب خود رعایتِ لفظی کے امام تھے، لیکن اس بارے میں علی حاتم نے ان کی شان میں جو گستاخی کی اس میں ذو معنویت کا حق ادا کر دیا۔ نقلِ کفر، کفر نباشد، انھوں نے کہا ؎

سبطِ احمد کے عقد کی خاطر
لوگ ہر ہر تلاش میں نکلے
میر صاحب نہا کے دھوبن کے
استری کی تلاش میں نکلے

استغفر اللہ۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں دراصل کہنا یہ چاہتا تھا کہ میں نے ایک مرتبہ میر صاحب کے سامنے شاعروں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اپنے مخصوص انداز میں وہ فرمانے لگے۔ "ایک زمانہ تھا کہ داغ دہلوی سے لے کر حافظ شیرازی تک

---

[1] یہ بدایوں کے پہلے مسلمان گریجویٹ تھے۔ دوسرے نمبر پر سید محفوظ علی تھے۔ تیسرے نمبر پر شوکت علی خاں فانی آتے ہیں۔ ان کے بعد ان گنت۔ وزیر احمد صاحب کے صاحبزادے ابن احمد بیرسٹر الہ آباد میں پریکٹس کرتے تھے۔
——— مؤلف

Marfat.com

شاعروں کے دیوان کے دیوان مجھے کم وبیش حفظ تھے، لیکن اگر آج مجھے ایک دن کی بادشاہت مل جائے تو بدایوں کے سارے شاعروں کو جیل میں بند کرادوں"
میں نے پوچھا —— "اور جناب یہ آپ کے قاضی غلام امیر صاحب کا کیا ہوگا" ؟
قدرے توقف کیا پھر مسکرا کر بولے —— "انھیں بھی جیل میں رکھوں گا —— لیکن صبح وشام خود جاکر ان کا بستر ٹھیک کروں گا اور انھیں کھانا کھلا آیا کروں گا مگر رکھوں گا انھیں جیل ہی میں۔"

میر صاحب ایک دن قبل "شمع بے نور" کی صراحت مجھ سے فرما چکے تھے جس کا ذکر میں اس تالیف کے شروع میں کرچکا ہوں۔ اس کی نقل اتارتے ہوئے، بدایوں کے شاعروں کے بارے میں ان کی باتیں سن کر میں نے کہا —— "مگر آپ کو شاعر بے نثر، تو بہت عزیز ہیں"۔ میرا مطلب فوراً سمجھ گئے۔ بولے —— "وہ تو ہمارا بیٹا ہے"۔ میری مراد "ا۔ ع" سے تھی جو "ابن علی" کا مخفف بنتا ہے۔

یہ سب توزیب داستاں کے لیے تھا۔ دراصل انھیں بے مقصد کی شاعری سے قطعی لگاؤ نہیں تھا، ورنہ وہ "سخن فہم" بھی تھے اور غالبؔ کے طرفدار" بھی۔ اچھی اور با مقصد شاعری کی کتابیں ان کی لائبریری میں ان کے اظہار تحسین کے نشانات اور ذاتی حواشی سے بھری پڑی تھیں۔

—— مؤلف

Marfat.com

حصّۂ اوّل

علی برادران کی رفاقت

Marfat.com

حدیثِ دیگراں

(۳)

میر صاحب کا طرزِ نگارش اور طریقۂ تحریر ایسا جاذبِ نظر تھا کہ مولانا محمد علی جوہر جیسا لکھنے والا فرد داد دیتا تھا۔ کاش آج "ہمدرد" اور ان رسالوں کے فائل میرے پاس ہوتے جس کے اندر میر محفوظ علی صاحب کے مضامین طبع ہوئے تھے تو ان سے اقتباس کرکے مضامین شائع کرتا۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی تحریکِ تنظیم کے سلسلے میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایونی علی برادران کو بدایوں لائے تو دونوں بھائی میر محفوظ علی صاحب کے یہاں گئے اور علی گڑھ کالج کے تعلقات کے تحت بے تکلفی کی باتیں شروع ہوگئیں اور دیر تک یہ دلچسپیاں جاری رہیں۔ مولانا شوکت علی نے اپنی ڈاڑھی کے بال اور میر محفوظ علی کی ڈاڑھی کے بال ملا کر باندھے اور مولانا شوکت علی نے میر محفوظ علی صاحب سے عہد لیا کہ وہ تحریکِ خلافت پر اپنی پوری توجہ مبذول رکھیں۔

میر محفوظ علی صاحب نے جس سال سفرِ حج بیت اللہ کیا تو ان کے حالات بالکل بدل گئے تھے۔ روانگی سے قبل ہی ان کی حالت صوفیانہ درویشوں کی سی ہوگئی تھی۔ بارگاہِ نبویہ کی حاضری نے تو ان کے قلب وجگر کو مسحور کردیا۔ میر صاحب جب مدینۂ پاک سے وطن واپس آئے تو سینہ برکاتِ نبوت کا خزینہ بن چکا تھا۔ بدایوں کی خصوصی مجالس عید میلاد النبیؐ میں سید صاحب جب شریک ہوتے اور مواعظ حسنہ میں جتنی دیر بیٹھتے آنکھوں سے آنسو جاری رہتے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ جتنی دیر محافل میں حاضر رہتا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینۂ پاک میں حاضر ہوں۔

مکتوب کراچی بنام مؤلف — عبدالحامد قادری بدایونی

۱۲ر اگست ۱۹۶۹ء

Marfat.com

ایک مرتبہ عید میلاد النبیؐ کے موقع پر میر صاحب کے اپنے ہاں شب بیداری کا پروگرام رہا۔ نشست مردانہ کوٹھی کے ہال میں ہوئی۔ حاضرین میں سب سے نمایاں ان کے قرآن کلاس کے شرکاء تھے۔ قاضی مبشر الاسلام، قاضی غلام سجاد، مولوی سبطین احمد، مولوی محمد یحیٰ، مولوی اقبال احمد، بابو رضا احمد، قاضی سجاد حسین وغیرہم۔ کچھ دیگر حضرات بھی شریکِ محفل تھے۔ رات بھر حمد و نعت کا شغل سعدیؔ، جامیؔ، قدسیؔ سے لے کر محسنؔ کاکوروی کا قصیدہ اور میلاد اکبر کے سلام تک سبھی کچھ پڑھا گیا۔ مسدس حالیؔ سے ذکر ولادتِ پاک کے بند ڈاکٹر امیر حسن[1] صدیقی نے سنائے جو "خلافت اور سلطنت" کے مقدمے پر ڈاکٹریٹ لے کر تازہ تازہ ولایت سے آئے تھے۔ بڑے شوق و جذبہ کے ساتھ شب گزری۔ فجر کی نماز کی امامت کے لیے پڑوس سے مولوی سید عنایت[2] احمد صاحب تشریف لے آئے اور ہال میں جماعت ہوئی۔ نماز کے بعد سب کی تواضع گرم چائے اور سوجی کے خستہ بسکٹوں سے ہوئی چائے کی تیاری میں قاضی مبشر الاسلام صاحب پیش پیش تھے۔ یہی بزرگ درس قرآن اور ترجمہ و تفسیر میں میر مدرسہ ہوتے تھے۔ دوسرا نمبر قاضی غلام سجاد کا تھا۔ خود میر محفوظ علی صاحب سنتے تھے لیکن بولتے بہت کم تھے۔ کبھی کبھی جب کسی مسئلے میں سب الجھ کر زچ ہو جاتے تھے تو یہ کہہ کر میر صاحب سمجھا دیتے تھے "اسے محفوظ علی بتائے گا۔ بات چیت میں جہاں کہیں کوئی اہم بات کہنی ہوتی تھی تو "واحد متکلم" کی جگہ اپنا نام لیتے تھے۔ مثلاً محفوظ علی نہ کہتا تھا" محفوظ علی کا خیال تو یہ ہے"۔ تبحر علمی کے باوجود انانیت انھیں ذرا بھی نہ چھو سکی۔ ـــــ مؤلف

اس (مولانا محمد علی) کے ایک دوست (سید محفوظ علی بدایونی) جو اسے بچپن سے جانتے تھے، اور جنھوں نے زندگی کی ہر منزل میں اسے دیکھا تھا اور اس کا ساتھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ ـــــ "محمد علی کو لیڈری نے تباہ کیا"۔

چند ہم عصر ـــــ عبد الحق

---

[1] سابق استاد جامعہ کراچی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ ـــــ مؤلف

[2] سید سبط نبی نقوی، سابق ڈائرکٹر جنرل، محکمۂ موسمیات، حکومت پاکستان کے والد ماجد۔

ـــــ مؤلف

Marfat.com

بلبلانِ اسیر کی رہائی

گہ شکر عشق گاہ شکایت شنیدہ ام
ایں قصہ را بہ چند روایت شنیدہ ام

(۱)

چھوٹا بچہ ۔ اوف فوہ ۔ بڑے زززور کی برات ہے ۔ اور چچا میاں کیا یہ سب براتی ہیں؟

نوجوان چچا ۔ ہاں سب براتی ہیں ۔ کیوں ۔ ہم نے نہ کہا تھا کہ بڑے زور کی برات دکھائیں گے ۔

بچہ ۔ کہا تو تھا ۔ اور آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ دولھا بھی دکھائیں گے ۔

چچا ۔ لو دیکھو ۔ وہ آگئے ۔ یہ دونوں جن کے گلے میں گوٹے اور پھولوں کے سہرے پڑے ہیں اور جو دونوں ہاتھوں سے سب کو سلام کرتے جاتے ہیں ۔ یہ دونوں اس برات کے دولھے ہیں ۔

بچہ ۔ کیا دو براتیں ہیں ۔ جو دو دولھے جا رہے ہیں ؟

چچا ۔ نہیں ۔ برات تو ایک ہی ہے ۔

بچہ ۔ واہ یہ خوب بات ہے ۔ برات ایک اور دولھے دو ۔ اور ان کی دولھن کہاں ہے؟

چچا ۔ دولھن گیا سب کے سامنے طباق سا منہ کھولے سپڑ سپڑ کرتی نکلتی ۔ وہ پردے میں ہو گی ۔

بچہ ۔ اچھا اس کا نام کیا ہے ؟

چچا ۔ دولھن کا نام (دھیمی آواز سے) بے ڈھب سوال ہے ۔ اس معصوم کو کیا نام بتاؤں (اونچی آواز سے) لو سنو ۔ دولھن کا نام ہے " قوم " ۔

بچہ ۔ واہ نئی طرح کا نام ہے ۔ باجی جان اور امی جان اور چھوٹی بہن کے نام تو ایسے

Marfat.com

نہیں ہیں۔

بچے کا باپ۔ (جو قریب کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا) بیٹے برات ورات کچھ نہیں ہے یہ دونوں جو ہار پھول پہنے موٹر میں جا رہے ہیں۔ بڑے پکّے مسلمان اور سچے ہندوستانی ہیں جنھیں دیکھنے اور سلام کرنے شہر کے سب مسلمان ہندو آئے ہیں۔

بچہ۔ ابا جان یہ کیا کام کرتے ہیں؟

باپ۔ یہ اس ملک کے ہندو مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔

بچہ۔ تو کیا جسے ضرورت ہو سودا سلف لا دیتے ہیں؟

باپ۔ ہماری محبت تو انھیں ایسی ہی ہے کہ اس کے لیے بھی تیار ہیں لیکن اصل میں یہ اور بڑے بڑے بھاری کام کرتے ہیں۔

بچہ۔ تو کیا یہ بوجھ اٹھاتے ہیں۔

باپ۔ (آنکھوں میں آنسو آ گئے) حقیقت میں بڑے بھاری بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں۔

بچہ۔ اچھا چھا۔ میں جان گیا۔ یہ حمّالی ہیں جب ہی ایسے موٹے تازے ہیں۔

باپ۔ (آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ) نہیں بیٹے۔ یہ ہمارے سردار ہیں۔ ہمارے ذمّے جو مشکل اور ضروری کام ہیں۔ جنھیں ہم کاہلی اور بزدلی سے نہیں کرتے یا نالائقی سے نہیں کر سکتے۔ انھیں یہ کرتے ہیں۔

بچہ۔ تو یہ آپ سے اور چچا جان سے زیادہ لائق ہیں؟

باپ۔ ہم اور تمھارے چچا جان تو ان کے جوتے کے تسمے کھولنے کی بھی لیاقت نہیں رکھتے۔ آج اس ملک میں کوئی بھی مسلمان ان کی قابلیت کو نہیں پہنچا۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو کتابوں میں ان کے نام اور ان کے کام پڑھ پڑھ کر خوش ہوا کرو گے کہ تم نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا اور جب تم بڈھے ہوگے۔ انشاء اللہ تو اسی زمانے کے جوان ان کے نام سے تمھاری عزّت کریں گے کہ تمھاری آنکھیں ان کی زیارت کر چکی ہیں۔

بچہ۔ ابّا جان تو ان کے نام کیا ہیں؟

باپ ۔ ان کے نام ہیں ۔ شوکت علی، محمد علی

بچہ ۔ شوکت علی، محمد علی ۔ شوکت علی، محمد علی ۔ شوکت علی، محمد علی ۔ اب کبھی نہیں بھولنے کا آپ جب چاہیں پوچھ لیں ۔

---

(۲)

ضعیفہ ۔ بیٹیو ۔ میری نگاہ موٹی ہے ۔ ذرا دیکھنا وہ آگئے ۔

ایک خاتون ۔ ابھی نہیں آتے ۔ مگر لوگوں کی ہمہمی سے معلوم ہوتا ہے اب آیا ہی چاہتے ہیں

دوسری خاتون ۔ اے لو حجن اماں ۔ وہ آگئے ۔ یہی ہیں نا ۔

حجن ۔ (دیکھ کر آہستہ سے) السلام علیکم ۔ اللہ عمر میں ترقی کرے ۔ دین میں درجے بڑھائے ۔ ہاں بیٹیو ۔ یہی ہیں ۔ میں تو انھیں رام پور میں دیکھ چکی ہوں ۔ یہ جو دھنے طرف بیٹھے ہیں ....

ایک خاتون ۔ جن کی داڑھی میں سفید بال ہیں ؟

حجن ۔ ہاں ہاں ۔ وہی وہی ۔ یہ شوکت علی ہیں ۔ اور ان کے برابر ان کے چھوٹے بھائی محمد علی ۔ شوکت علی وہ شخص ہیں جنھیں ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں سب سے پہلے کعبہ شریف کی خدمت اور غیروں سے اس کی حفاظت کا خیال ہوا اور انھوں نے کعبے کی انجمن بنائی ۔ آج سب نے دیکھ لیا کہ یہ کام کیسا ضروری تھا اور سارے مسلمانوں کو اس میں شریک ہونا چاہیئے تھا ۔ بیٹیو ۔ میں نے تو انھی دنوں رام پور جاکر انجمن میں نام لکھا لیا تھا ۔ دیکھ لو اس وقت یہی میرے کرتے کے گریبان پر نشان لگا ہوا ہے ۔ محمد علی نے اخبار نکالا اور اس کے ذریعے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ۔ چھ سات برس ہوتے جب سلطان روم سے اور عیسائیوں سے لڑائی ہوئی تھی ۔ محمد علی نے سارے ہندوستان سے چندہ جمع کیا اور ڈاکٹر انصاری کی ڈاکٹری جماعت کو مسلمان زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے بھیجا ۔ اب کی لڑائی چھڑنے کے بعد دونوں نظر بند کیے گئے ۔ ان کے کارخانے درہم برہم ہوگئے اور بڑے بڑے بیغیری دقت پڑے

Marfat.com

مگر آفرین ہے ان بندوں کی ہمت پر کہ ایمان میں ذرا فرق نہ آیا۔ بڑے پکے مسلمان ہیں۔

ایک خاتون ۔ بہن ہمارے تمھارے دینی بھائی اور باپ ہیں۔ تم نے دیکھا ان کے چہروں پر کیسا نور تھا۔

دوسری۔ نور۔ بہن ایک وقت کی نماز قضا نہ ہو۔ صبح کا قرآن ناغہ نہ ہو۔ جمعرات کا روزہ ترک نہ ہو۔ دل میں ہر وقت خدا کا خوف، رسول کا ادب، شریعت کا پاس رہے پھر ان کے چہروں پر نور نہ ہو تو کیا ان موؤں مرداروں نام کے مسلمانوں کے چہروں پر ہو جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کیا کہوں۔

تیسری۔ قدم لینے کے لایق ہے وہ نیک بی بی جس نے انھیں دودھ پلایا اور زیارت کے قابل ہیں وہ شریف لڑکیاں جنھیں ان کی بیویاں بننے کی عزت ملی۔

چوتھی۔ سنا ہے کہ بڑے بھائی صاحب کی بیوی مرچکی ہیں۔

پانچویں۔ ہاں مگر اللہ رکھے اولاد ہے۔

حجنؔ۔ میں تو ان کی والدہ سے مل چکی ہوں۔ وہ بھی حج کر آئی ہیں۔ کیا شیر دل بیوی ہے پچھلے دنوں جب سرکار نے شرطیں لگا کر انھیں آزاد کرنا چاہا تو ماں نے بیٹوں سے کھلے خزانے کہہ دیا کہ اگر دین اور ایمان کے رستے سے تل بھر بھی قدم ہٹایا تو یاد رکھنا نہ صورت دیکھوں گی نہ دودھ بخشوں گی۔

بہت سی خواتین ۔ (آب دیدہ ہو کر) سبحان اللہ۔ کیسا ایمان والی بی بی ہے۔ اللہ اسے دین دنیا میں سرخ رو رکھے۔ الہٰی اس کے اور اس کے بچوں پر حضرت بیویؓ کے آنچل کا سایہ۔

حجنؔ ۔ بڑے بھائی کی بیوی کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا چھوٹے بھائی کی بیوی نے میاں کی نظر بندی کے زمانے میں جس ہمت اور حوصلے سے کام لیا تم نے سنا ہوگا۔ میاں کے سامنے کے نوکر چاکر لگے بندھے سب بدستور رکھے میاں کے کام دھندے اور حساب کتاب کی دیکھ بھال رکھی۔ جس جس محتاج اور مستحق کو میاں جتنا اور جس جس وقت دیتے تھے برابر دیا۔ جس پر سنا کہ مصیبت آئی۔ آفت پڑی۔ منی آرڈر بھیج بھیج کر

امداد کی۔

ایک دولت مند خاتون۔ جبھی تو ایسی خوش نصیب بھی ہے جو میاں ایسا ملا۔

دوسری خاتون۔ نصیب تو بہن تمھارا بھی چاند سا ہے۔ تمھارے میاں بھی تو بڑے رئیس ہیں۔

دولت مند خاتون۔ نوج، کوئی ان جیسا ہو۔ دن رات ناپاک پانی پیئے، بھوت بنے پڑے رہتے ہیں اور جب ہوش آتا ہے تو خطاب حاصل کرنے کی دھن بندھتی ہے۔ نہ دین سے غرض نہ ایمان سے مطلب جس وقت سے سنا کہ یہ بھائی آرہے ہیں۔ ان کی زیارت کیسی اپلا منہ چھپانے کی فکر پڑ گئی۔ یہاں تک کہ رات سوتے جمعے چپ چپاتے کلکتہ بھاگ ہی گئے۔

---

(۳)

سر اسمٰعیل جی ولی بھائی۔ کہیئے دستور صاحب' علی برادرس سے کبھی ملے۔

نیروز جی مرزبان دستور۔ امرت سر میں بہت تھوڑی دیر ملاقات ہوئی۔ استقبالوں سے انھیں ذرا فرصت ملے تو ارادہ ہے کہ رام پور جا کر لمبی چوڑی ملاقات کروں لگھاٹے تم تو مل لیے۔

مسٹر لکشمن راؤ لگھاٹے۔ مل لیا۔ بھئی میں تو ایک ہفتے لگاتار ان کی خدمت میں رہا۔ رام پور سے دہلی کے جلوس تک برابر انھیں کے ساتھ تھا۔ مجھے تو ان سے ایسی دلی محبت ہوگئی ہے کہ اگر ہم سگے بھائی ہوتے تو شاید ہی اس سے زیادہ ہوتی۔ پریکٹس کی وجہ سے ان کے پاس زیادہ رہ کر ملک کی خدمت نہیں کرسکتا۔ پھر بھی آپ لوگ تعجب نہ کریں اگر کسی دن جی پر آ بنے اور میں سب کام دھندا چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو لوں۔

سیٹھ مول جی کلیان جی جیٹھا۔ بھئی جس روز تم نے یہ ارادہ کیا اسی دن میں بھی بزنس کا چارج رتن کو سونپ کر تمھارے اور ان کے ساتھ ہو لوں گا۔ دھن بھاگ جو آریہ ورت کے ایسے سپوتوں کے ساتھ نیشنل کام کرنے کا موقع ملے۔

دیوان ٹیون مل واٹر مل منگھرانی۔ ملک کی اور قومی خدمتوں اور استقلال اور سچائی کے

Marfat.com

علاوہ اخلاقی خوبیاں ان میں اس قدر جمع ہیں اور ایک ایسا جادو یا مقناطیس ان کی شخصیت میں ہے کہ آدمی بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ میں کئی دفعہ دونوں بھائیوں سے ملا ہوں۔ ہر دفعہ یہی جی چاہتا ہے کہ ان سے اور بہت زیادہ ملیئے۔

میاں چندوڑے شاہ۔ آپ صاحبوں کی واقفیت تو غالباً ان کی پبلک لائف شروع ہونے کے بعد سے ہوگی۔ مجھے محمد علی سے اس زمانے سے نیاز حاصل ہے جب وہ بڑودہ میں ملازم تھے۔ اور ریاستی کام سے ہر مہینہ بمبئی آیا کرتے تھے۔ ٹائمس آف انڈیا اور بمبئی گزٹ میں ان کے مضامین اور ان کی کتاب " موجودہ بے چینی پر خیالات" پڑھ کر مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ اسی عرصے میں ڈاکٹر اقبال آئے ان کی وساطت سے ملاقات ہوئی۔ سردار اس دن تم بھی تو تھے؟

سردار لہنا سنگھ۔ وہ ملاقات اور اس کی لذت ابھی تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ محمد علی کی زبردست شخصیت اس کے علم کی وسعت اور جوش کی کثرت کا اسی دن میرے دل پر گہرا نقش ہوگیا تھا۔ اس کے بعد تو ملّا علی کے یہاں اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ کیوں بھائی جان یاد ہے نا؟

ملّا علی[1]۔ ارے بھائی سب یاد ہے۔ ایک روزانہ انگریزی اخبار نکالنے کا منصوبہ تو انھوں نے بیبی کا کا بلڈنگ ہی میں بیٹھ کر سوچا تھا جو عملی جامہ پہن کر کامریڈ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش ہوا۔ ہمدرد کے ٹائپ کے لیے مصر و بیروت کی کتابوں اور اخباروں کی دیکھ بھال تو مریم بین کے اسٹیشن کے پاس سمندر کے کنارے بھی بیٹھ کر ہوا کرتی تھی جہاں محمد علی گنڈیریاں کھاتے تھے اور میں پان۔

پنڈت اقبال بہادر رائے زادہ۔ محمد علی سے میری پہلی ملاقات بانکی پور میں ہوئی۔ نام تو بہت پہلے سے سنا تھا مگر ملاقات سے قبل یہ خیال تھا کہ لیڈری آدمی ہیں خاموش اور خشک مزاج ہوں گے۔ مگر پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہوگیا کہ نہایت خوش گپ اور

---

[1] یعنی سید محفوظ علی بدایونی۔ مؤلف

Marfat.com

شگفتہ مزاج ہیں۔ اس کے بعد مسٹر مظہر الحق کے یہاں شوکت علی سے کبھی ملاقات ہوئی۔ بے تکلفی کے بعد دونوں کے دل و دماغ اور اعلیٰ قابلیت کے جوہر کھلے۔ ان کی قابلیت اور جوش اور اسلامی مسائل میں دلچسپی و سرگرمی دیکھ کر طبیعت بہت للچاتی تھی کہ مادر ہند کے ایسے قابل اور پرجوش اور سرگرم فرزندوں کو گاندھی، تلک، نہرو اور مالوی کے دوش بدوش کانگریس پلیٹ فارم پر موجود ہونا چاہیئے۔ گزشتہ سات آٹھ برس سے یہ خیال برابر میرے دماغ میں چکر کھاتا تھا جو اس وقت محض خیالِ خام معلوم ہوتا تھا مگر اس دفعہ جب شوکت علی محمد علی نے امرت سر کانگریس میں آکر ڈیلیگیٹوں کی فہرست میں نام لکھایا اور گاندھی، تلک، نہرو اور مالوی کے دوش بدوش کانگریس پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر تقریریں کیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور پنڈال کے دروازے پر شوکت علی محمد علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ آج کے مقدس دن نے میری ہشت سالہ خواب کی تعبیر حرفاً حرفاً پوری کر دی۔

بہ زنار مغان بستند عرفی را میاں۔ آرے
میانے این چنیں شایستہ بے زنار کے ماند

بابو رجنی کانت چیٹرجی ــ صاحبو۔ میں ایک پروپوزل پیش کرتا ہوں امید ہے کہ آپ منظور کریں گے۔ جب ہماری انجمن کے ہر ممبر سے علی برادرس کی ملاقات بلکہ گہری دوستی ہے اور ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو دوستی کے علاوہ ان کی نیشنل سروس کا اعتراف اور ان کی سچائی اور سیلف سیکری فائس کی قدر نہ کرتا ہو تو کیوں نہ ہم اس انجمن کی طرف سے انھیں انوائٹ کریں اور درخواست کریں کہ وہ انجمن فرزندان ہند میں تشریف لاکر ہمارا ایڈریس قبول فرمائیں۔

سر مکوپٹی ایرن نا ــ مسٹر چیٹرجی۔ میں سب ممبروں کے اتفاق رائے سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے یہ تجویز پیش کرکے ہمیں اپنی ایک نہایت ضروری ڈیوٹی کی طرف توجہ دلائی۔ علی برادرس کی تشریف آوری یقیناً ہماری انجمن کے لئے باعث فخر ہے اور ہم نہایت خوشی سے مستعد ہیں کہ مادرِ ہند کے ان سپوتوں اور ملک و قوم کے ان سچے

Marfat.com

خادموں کا اس سے زیادہ جوش و مسرت سے استقبال کریں جتنا کہ اب تک کسی شہر میں کیا گیا ہو۔

ممبر صاحبان۔ کیا آپ مجھے اختیار دیتے ہیں کہ میں بہ حیثیت صدر انجمن علی برادرس کو تار دوں کہ انجمن فرزند ہند جس میں اس وسیع براعظم کے ہر خطے اور ہر مذہب و ملت کے نمائندے شریک ہیں آپ سے استدعا کرتی ہے کہ جس تاریخ آپ کو آسانی ہو تشریف لا کر اور ایڈریس قبول فرما کر ممبران انجمن کی عزت افزائی کریں۔

سب ممبر۔ (یک زبان ہو کر) بے شک، بے شک۔

---

(۴)

نواب دولت باز خان۔ ارے میاں مرزا صاحب، یہ کیا ہنگامہ ہے؟

مرزا صاحب۔ حضور، شوکت علی، محمد علی چھوٹ کر آ گئے۔

نواب۔ بھئی یہ شوکت علی، محمد علی کون صاحب ہیں اور چھوٹ کر کہاں سے آتے؟

مرزا صاحب۔ اصطبل سے ملا ہوا جو مکان ہے اس میں ایک ماسٹر صاحب آ کر رہے ہیں وہ فرماتے تھے کہ یہ مسلمانوں کے سردار اور بڑے پکے دین دار ہیں۔ سرکار نے کسی شبہے پر نظر بند کر دیا تھا۔ اب پانچ برس بعد رہا ہوتے ہیں۔

منّے آغا۔ پیر و مرشد ہمارے مرزا صاحب تو ہمیشہ بے پر کی اڑاتے ہیں۔ اب اگر یہی بات ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ سرکار نے انھیں مشتبہ اور بد چلن سمجھ کر قید کر دیا تو وہ مسلمانوں کے سردار اور پکے دین دار کیسے رہے۔ اور جب سرکار نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تو آج رعایا میں کس کی مجال اور کس کا جگر ہے جو ان کی رہائی پر اتنی خوشی کر سکے۔ حضور اصل حال غلام سے سنیئے۔ خدا بخش جو خود جنگی لاٹ راپٹ صاحب کا خانساماں رہ چکا ہے مجھ سے کہتا تھا کہ یہ دونوں سرکار کی اس فوج کے سردار ہیں جو لڑائی جیت کر آئی ہے اور اسی لیے ان کی اس قدر آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ سنا ہے ڈھاکہ بنگالے کے رہنے والے اور گھر کے بڑے تعلقدار ہیں۔

Marfat.com

طرّہ بازخان ۔ حضور، ہمارے منّے آکا تو بمبو گزٹ کی خبریں لایا ہی کرتے تھے ۔ تعجب ہے کہ خان صاحب بھی ان کے چھینٹوں میں آکر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ۔ اصل بات وہی ہے جو میں نے عرض کی ۔ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا ۔ جس میں پڑھ کر وہ فرماتے تھے کہ دونوں حقیقی بھائی ہیں ۔ اصل وطن رامپور رہے ۔ اور سید احمد صاحب کے مدرسے کے پڑھے ہوئے ہیں ۔ بڑے بھائی کسی گورنمنٹی اعلیٰ عہدے پر تھے اور انگریزوں کے برابر تنخواہ پاتے تھے ۔ چھوٹے بھائی ولایت پاس کر آئے ہیں ۔ انھوں نے بھی شروع شروع میں کسی ریاست میں نوکری کر لی تھی اور بعد میں دہلی سے ایک بڑا زوردار اخبار نکالا ۔ پہلے دونوں بھائی وضع قطع، تراش خراش، نشست برخاست میں پورے "صاحب لوگ" تھے ۔ لیکن دل میں اسلام کی محبت کا ذرّہ اس زمانے میں بھی چمکتا تھا ۔ یہی ذرّہ بڑھ کر آفتاب ہو گیا اب دونوں بھائی نہایت پکّے دین دار اور خدا و رسول کی محبت میں سرشار ہیں ۔ لڑائی شروع ہونے پر سرکار نے خدا جانے کس شبہے پر نظر بند کر دیا تھا اب جا کر کہیں چھوڑا ہے ۔

نواب ۔ بھئی اگر یہ سچ ہے تو ہماری یہ بات بھی یاد رکھو کہ جو لوگ ان سے ملنے ملانے آتے اور ان کی رہائی پر اس قدر خوشی مناتے ہیں ان سے سرکار دولت مدار بہادر دام اقبالہٗ خوش تو ہو نہیں سکتی ۔

منّے آکا ۔ اے سبحان اللہ، کیا دور کی بات فرمائی ہے حضور نے ماشاء اللہ کیسا نکتہ رس دماغ پایا ہے ۔ سنیے مرزا صاحب یہ بڑی گہری اور پکّی بات ہے ۔ اگر سرکار بہادر انھیں قید فرما چکی ہے تو وہ رعایا کی اس بے جا خوشی اور بے موقع اچھل کود سے کیسے خوش ہو سکتی ہے ۔

مرزا صاحب ۔ حضور، گستاخی نہ سمجھی جائے تو عرض کروں ۔

نواب ۔ کہیے کہیے شوق سے بلا تکلف کہیے ۔

مرزا صاحب ۔ یہ گورنمنٹ کی توہین ہے کہ ایسی تنگ دلی اور چھچھورپن کا خیال اس کی طرف

منسوب کیا جائے۔ مسلمان اور ان کے ساتھ ان کے ہندو بھائیوں نے اس پانچ برس میں برابر ان کی رہائی کے لیے لگاتار کوششیں کیں۔ ملک کے ہر گوشے میں جلسے کیے۔ تار دیئے۔ محضر بھیجے اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ ہمارے خیال میں یہ بے گناہ ہیں اور ہمیں ان کی گرفتاری کا سخت صدمہ ہے۔ اگر گورنمنٹ ہماری خوشی چاہتی ہے تو یا تو انھیں فوراً آزاد کر دے یا ان پر مقدمہ چلائے اور بھری کچہری میں صاف الزام اور بیّن قصور ان کے سر ثابت کر دے جب تک یہ نہ ہوگا ہمیں چین اور قرار نہ آئے گا۔ اب جب کہ گورنمنٹ نے انھیں آزاد کیا ہے تو پہلے یہ اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے کہ ہمارے اس فعل سے ہماری رعایا نہال اور باغ باغ ہو جائے گی اور اس کی پانچ سال کی مراد بر آئے گی۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کام سرکار نے محض اپنی رعایا کو خوش کرنے ہی کی غرض سے کیا ہو اس پر رعایا کے خوش ہونے سے ناخوشی کے کیا معنی۔ ماسٹر صاحب کہتے تھے کہ امرت سر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے جلسوں میں جب یہ خبر پہنچی کہ شوکت علی، محمد علی آزاد ہو گئے تو بلا مبالغہ لاکھوں آدمیوں نے جن میں ہر طبقے اور درجے کے ہندو مسلمان تھے خوشی کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پھر جب یہ دونوں بھائی امرت سر گئے تو راستے کے ہر اسٹیشن پر اور خود امرت سر میں اور اس کے بعد دہلی میں اس زور کا استقبال ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہیں کے راجے مہاراجے نواب بادشاہ آتے ہیں۔ ماسٹر صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ اخباروں میں چھپ گیا ہے کہ ان دونوں بھائیوں نے ہندوستان کے معزز ہندو مسلمانوں کے ساتھ حضور والسرائے بہادر کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک محضر پیش کیا اور حضور والسرائے بہادر نے ان سے ملاقات فرمائی اور ہاتھ ملایا۔ اب اگر سرکار ان بھائیوں سے ملاقات کرنے پر لوگوں سے ناخوش ہوتی تو خود حضور والسرائے بہادر ایسے مجمع سے ملاقات ہی کیوں فرماتے جس میں یہ دونوں بھائی شامل ہیں۔ اور وہ محضر ہی کیوں قبول فرماتے جو انھوں نے تیار کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ سرکار خوب اچھی طرح سے واقف ہے کہ

Marfat.com

مسلمان ان دونوں بھائیوں کو اپنا مذہبی مقتدا اور ہندو مسلمان اپنا سیاسی رہنما مانتے اور جانتے ہیں ۔ لہذا ان کی رہائی پر خوشی کرنے اور ان کا استقبال جوش و خروش سے کرنے میں ہندو مسلمان بالکل حق بجانب ہیں ۔

---

(۵)

روشن خیال ۔ آیئے جناب یہ آپ ہانپتے ہانپتے کہاں سے آ رہے ہیں ؟

تاریک خیال ۔ شوکت محمد آئے ہیں ۔ ان سے ملنے گیا تھا ۔ آپ ملے ؟

روشن خیال ۔ نہیں ، میں مجبوریوں کی وجہ سے نہ جا سکا اور یہ تو جانتے ہی ہو کہ میرے ان کے پولیٹیکل عقاید میں کس قدر اختلاف ہے ۔

تاریک خیال ۔ کیا عقاید بھی پولیٹیکل ہونے لگے ۔ جل جلالہ ۔ اس ترقی کے زمانے میں جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے ۔ شوکت محمد کے عقاید تو بحمد اللہ اسلامی ہیں ۔ تمھارے عقاید اگر ارتقائی مدارج طے کر کے پولیٹیکل ہو گئے تو مبارک ہو ۔

روشن خیال ۔ بھئی ، تم پر تو ملائیت ایسی چھا گئی ہے کہ تمھاری منطق بھی اندھی ہو گئی ۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میرے ان کے سیاسی نقطۂ نظر میں فرق ہے ۔

تاریک خیال ۔ نظر کیا ۔ دل میں بھی فرق ہے اور اس کا علم مجھے کیا ہندوستان کے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں تک کو ہے ۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ دونوں لفظوں میں کتنے فٹ یا کتنے گز کا بُعد و فصل ہے ۔

روشن خیال ۔ آپ مجھے بنا رہے ہیں ۔

تاریک خیال ۔ مجھے حسن تقریر سے اس قدر کم حصہ ملا ہے کہ احباب کو میرے مزخرفات پر اکثر یہی دھوکا ہوتا ہے آپ ایسا خیال نہ فرمائیں ۔

روشن خیال ۔ خیر آپ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل سیاسی امور میں جو روش مسلمانوں کے اس خاص طبقے نے اختیار کر رکھی ہے جس میں شوکت علی ، محمد علی ہر دلعزیز ہیں ۔ وہ سر سید علیہ الرحمۃ کے نقش قدم پر ہے ؟

تاریک خیال۔ بے شک نہیں ہے۔

روشن خیال۔ میں پوچھتا ہوں کیوں نہیں ہے؟

تاریک خیال۔ تبدیلیٔ زمانہ، اختلاف، حالات اور تقاضائے وقت کے لحاظ سے۔

روشن خیال۔ بس، بس، یہی اختلاف ہے۔ ہمارے ان کے نقطۂ نظر میں جس کے فرق کو آپ گزوں سے ناپنے بیٹھے تھے۔ یہ تبدیلی کیوں کی گئی اور یہ تقاضائے وقت کی رٹ کیوں لگائی گئی؟

تاریک خیال۔ خدارا انصاف۔ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام اور آئمہ عظام رضی اللہ عنہم کے تعامل کو تو آپ حسب اقتضائے وقت تاویل طلب ماننے میں باک نہ کریں۔ مذہبی اوامر و نواہی میں ایسی ترمیم کردیں کہ پرانی بنی ہوئی فہرست اور آپ کی نئی بنائی ہوئی فہرست میں ایک عنوان بھی مشترک نہ رہے۔ نص قطعی میں سے جتنے حصے کو آپ چاہیں مختص الوقت اور مختص المقام کہہ کر منسوخ العمل قرار دیدیں۔ چاہے آپ پر افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض والی وعید بھی کیوں نہ عاید ہوتی ہو اس میں کچھ مضائقہ نہیں مگر سرسیّد کی سیاسی تعلیم کو آپ جف القلم بما ہو کاین مانیں اور اس میں ایک نقطے کی کمی بیشی کو گناہِ عظیم اور موجب عذاب الیم جانیں۔

جناب اب یہ بحث اس قدر فرسودہ ہو چکی ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ خاکسار کو تاریک خیال سمجھیں مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کا بھی شمار اہلِ ظلمت میں سے نہ ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا سرسیّد نے مسلمانوں کو سیاسیات میں حصہ لینے سے ہر حالت میں اور ہر زمانے کے لیے قطعی ممانعت کردی تھی یا ان کے نزدیک ان کے زمانے میں اس کا وقت نہ تھا۔ پہلی بات تو ہو نہیں سکتی۔ اب رہی شق آخر۔ سو ان کے بعد اہل الرائے مسلمانوں نے طے کردیا کہ اب وقت آگیا کہ مسلمان دیگر اقوام کے دوش بدوش سیاسیات میں پورا حصہ لیں۔ میں تو کس شمار قطار میں ہوں مگر اہل بصیرت تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی سیاسی ابجد خوانی بہت

Marfat.com

دیر میں شروع ہوئی۔ اب تک تو انھیں فارغ التحصیل ہونا چاہیئے تھا۔ دنیائے سیاست میں ایک منٹ کی دیر برسوں پیچھے ڈال دیتی ہے ؎

ماندم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

بھائی صاحب اب ہوا اور چلنے لگی ہے اور اس کے جھونکے اب ڈرائنگ روم اور کونسل ہال سے گزر کر مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں اور تکیوں تک میں پہنچ گئے اور اب ان کی جنبش سے ترکی ٹوپیوں کے پھندنے بھی نہیں ہلتے بلکہ عماموں کے شملے اور عباؤں کے دامن اور گدڑیوں کے چیتھڑے تک لہرا لہرا کر جھنڈیوں کا کام دینے لگے۔ اب یہ ہوا نہ تمھارے بوتے تھم سکتی ہے نہ خان بہادروں اور آنریبلوں کے روکے رک سکتی ہے۔ جی چاہے تو چادریں تاننے اور پردے لگانے کی کوششیں کر کے دیکھ لو۔ ع

"چراغ رہ گزار باد کا انجام روشن ہے"

ہندو بھائی تو منزلوں آگے بڑھے ہوتے ہیں میں کہتا ہوں کہ کوئی مسلمان نہیں جسے تعلیم اور حالات گرد و پیش نے اور کچھ نہیں تو سرنگ کے رستے ہی اپنی جگہ سے کوسوں آگے نہ پہنچا دیا ہو۔ بے چارے شوکت علی محمد علی یا ان جیسے رہنوردانِ بادیۂ عشق تو کھلے میدان پر چلنے کی وجہ سے بدنام ہیں ؎

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں
بازی پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

قصور معاف، اور تو اور خود جناب بھی اس نشاۃ الاخرے سے متاثر و متکیف بلکہ متمتع و متلذذ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کھانے اور غرانے کی تو اور بات ہے لیکن کیا یہ آنریبلی مسلمانوں کی سیاسی جد و جہد ہی کا ثمر بیش رس نہیں ہے جس سے جناب کے ہندو و نمائش کے کام و دہاں لذت اندوز ہو رہے ہیں۔۔۔

روشن خیال۔ ارے بھائی تم تو بھرے آئے تھے کہ ایک زبان میں کیا کچھ کہہ گئے۔

ابلق خیال۔ السلام علیکم۔

روشن خیال ۔ وعلیکم السلام۔ آئیے آئیے، آپ ہی کی کمی تھی۔

ابلق خیال ۔ (تاریک خیال سے) کہو بھئی شوکت علی، محمد علی سے ملے۔ میں نے بھی اسٹیشن پر دیکھا تو تھا مگر بات چیت نہ ہو سکی۔

تاریک خیال ۔ ہاں میں تو مل آیا۔

روشن خیال ۔ سنا ہے شوکت علی پہلے سے بھی زیادہ موٹے تازے ہیں۔

تاریک خیال ۔ جی ہاں "صید از ذوق گرفتاری بخود بالیدہ است"۔

ابلق خیال ۔ کچھ قید فرنگ کے مصائب بھی بیان کرتے تھے؟

تاریک خیال ۔ وہ سماں دیکھنے کے قابل تھا جب شوکت سے ایک دوست نے پوچھا "کہو بھئی کیسی گزری" اور انھوں نے جھوم کر، سر کو ایک مستانہ اور پرکیف جنبش دے کر نیم باز آنکھوں سے تکتے ہوئے کہا ع

مستی آن ساغر سرشارتا دائیم و دل

روشن خیال ۔ اور محمد علی کا کیا حال ہے؟

تاریک خیال ۔ ان کا جوش تلزم آشامی ابھی العطش العطش ہی پکارتا ہے۔

آں قدر زخمے کہ دل می خواست درپیکان نہ بود

ابلق خیال ۔ بھئی میں ان کا خیر طلب ہوں۔ ملاقات ہوئی تو کہوں گا بس اب خاموش بیٹھو۔

تاریک خیال ۔ برا نہ مانو تو کہوں۔

ابلق خیال ۔ کہو برا کیوں مانوں گا۔

تاریک خیال ۔ آپ ان کے کہنے سے حصول خطاب کی کوشش سے دست بردار ہو جائیں گے جو وہ آپ کے کہنے سے حصولِ ثواب کی کوشش سے دست بردار ہو جائیں۔

مرا بہ ترک تو تعلیم می کند ناصح

گرچہ خود نتوانست ترک دنیا کرد

ابلق خیال ۔ یار عجیب آدمی ہو۔ میں ان کی بھلے کی کہہ رہا تھا یا برے کی۔

تاریک خیال ۔ میں نے بھی تو تمھارے برے کی نہیں کہی۔ تمھیں ایک چیز پسند ہے انھیں

دوسری چیز۔ اپنی اپنی طبیعت اور اپنی اپنی ہمت سے

ہر کس بقدر ہمت خود خانہ ساختہ
بلبل بہ باغ جغد بہ ویرانہ ناختہ

ابلق خیال ۔ تو ہم جغد ہوئے ؟

تاریک خیال ۔ نہیں یہ لفظ شوکت کے بہت زبان زد ہے اور وہ لوگ ویرانہ پسند بھی ہیں۔ بہرحال جو چاہو سمجھ لو۔

روشن خیال ۔ بھائی میں اتنی دیر سے یہی بک رہا تھا کہ بہتر ہو اب دونوں بھائی اپنی قابلیتوں کو مفید کاموں میں صرف کریں۔

ابلق خیال ۔ نہیں غیر مفید کام تو اب تک بھی نہیں کیئے۔ محمد علی نے اخباروں کے ذریعے مسلمانوں کی بہت کچھ خدمت کی مگر دلّی آ کر ان کا قلم گستہ مہار ضرور ہو گیا تھا۔

تاریک خیال ۔ اگر گستہ مہاری سے آپ کی مراد اعلان حق اور اعلائے صدق ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انھوں نے دلّی آنے سے بہت پہلے بجائے قلم کی زبان پر قط رکھنے کے اس کی ناک پر قط رکھ دیا تھا تاکہ مہار ڈالنے کی جگہ ہی نہ رہے۔ بندہ پرور جس حالت کو آپ گستہ مہاری کہتے ہیں اسی مقام کو حضرت آشفتہ سران تفتہ جگر زیدہ اللّٰہ جنو نہم اپنی اصطلاح میں دعوت سنگباری سے موسوم فرماتے ہیں۔ اسی لئے دعوت ہی کا اہتمام تو تھا جو محمد علی قطب مینار پر چڑھ چڑھ کر پکارتے تھے۔

طفلان شہر بے خبر ند از جنون ما
یا ایں جنوں ہنوز سزاوار سنگ نیست

ابلق خیال ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں بھائیوں کے استقبال ملک کے عرض و طول میں اس زور و شور اور جوش و خروش سے ہوتے اور ہو رہے ہیں کہ مشکل سے کسی اور کو نصیب ہوئے ہوں گے۔ امرتسر، رامپور، مراد آباد، دہلی، میرٹھ، آگرہ، کانپور، علی گڑھ، لکھنؤ، ہر جگہ ہندو مسلمان آنکھیں بچھا رہے ہیں۔

تاریک خیال ۔ اب تو آپ کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ جناب والا۔ یہی چٹخارے تو ہیں ۔ جو نظر بندی اور جیل کی تلخیوں کو مغلوب کر دیتے ہیں ۔

عاشقی بدنامئے دارد ولے کارے خوش است

ـــــــــ ملائے آقِ سقال

نقیب، بدایوں

جنوری ۱۹۲۰ء

Marfat.com

حدیثِ دیگراں

(۴)

ایک طرف چاندنی کے فرش پر، سکوت اور متانت کے ساتھ ایک بزرگ دو زانو بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ چھوٹا ساقد، مختصر جسم، کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی سفید گول مختصر سی داڑھی، آنکھوں میں بچوں کی سی معصومیت، جوانوں کی تازگی، اور صاحبِ کرامات کی تب و تاب، لیکن بحیثیت مجموعی مہر و وفا کی نرمی و نزاکت۔ میں ٹھٹک سا گیا۔ ارد گرد کا سارا ہنگامہ دل سے محو ہو گیا۔ یہ میر محفوظ علی تھے۔

(گنج ہائے گرانمایہ) ــــــــ رشید احمد صدیقی

سیّد محفوظ علی بدایونی صاحب کے بارے میں چند معلومات مولانا محمد علی جوہر کے حوالے سے ملتی ہیں۔ بدایونی صاحب مولانا محمد علی سے سینئر تھے اور ان کی طالب علمی کے زمانے میں ان کی قدرے سرپرستی بھی کرتے رہے تھے وہ مولانا محمد علی کے لڑکپن اور طالب علمی کے حالات کے بہترین ماخذ ہیں۔

"کامریڈ" کا اجرا بھی ایک حد تک بدایونی صاحب کی تحریک سے ہوا اور وہ اس کے منیجر مقرر ہوئے۔ جب "ہمدرد" نکلا تو اس کے منیجر بھی وہی ہوئے۔ "کامریڈ" اور "ہمدرد" مالی دشواریوں اور مولانا محمد علی کی سیاسی مصروفیات کے باعث زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکے، لیکن جتنے روز نکلے اس میں محفوظ علی بدایونی صاحب کے انتظام و انصرام کو کافی دخل تھا۔

مکتوب لاہور بنام مؤلف ــــــــ ڈاکٹر سید عبداللہ

۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء

Marfat.com

"ہمدرد" کے اجراء سے پہلے مولانا محمد علی کے ذہن میں اس کا تصور کیا تھا؟ اس کا اندازہ کرنے کے لیے "کامریڈ" میں ان کے اس مضمون کا مطالعہ ضروری ہے جو انھوں نے "ہمدرد" کے بارے میں لکھا۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ میں ایک ایسا اوّل درجے کا اردو روزنامہ جاری کرنا چاہتا ہوں جس میں سجاد حیدر یلدرم، عنایت اللہ، مولوی عبدالحق، خواجہ غلام الثقلین، شیخ عبدالقادر، محفوظ علی بلکہ علامہ اقبال بھی ارکانِ ادارہ ہوں۔

صحافت ــــــــ عبدالسلام خورشید

پاکستان و ہند میں

"سیرت محمد علی" میں رئیس احمد جعفری مرحوم لکھتے ہیں ــ "میر محفوظ علی صاحب سا ادیب بے مثل، جو تفریحاً مضمون نگاری فرماتے تھے، دراصل مینجر تھے۔" اسی سیرت میں وہ ایک اور جگہ کہتے ہیں ــ "میر محفوظ علی، اردو زبان کے صاحب طرز ادیب، محمد علی کے محبوب و مطلوب"۔

آیئے میر صاحب کی ذات کے ان پہلوؤں کو ان خطوط کی روشنی میں دیکھیں جو خود مولانا محمد علی نے میر صاحب کو تحریر فرمائے۔

ــــــــ مؤلف

سارا خط تمھارا میں نے پڑھا اور خوش ہوا، مگر بتاؤ وہ کون سا فقرہ تھا جس نے وجد کی حالت طاری کر دی۔ سوچو، غور کرو۔ اگر یاد نہ ہو تو پڑھو۔ "عجب نہیں کہ مئی کی ابتدائی تاریخوں میں تم مجھے نوساری میں دیکھو۔" ہائے اس فقرے نے وہ صحبتیں یاد دلا دیں، جنھوں نے اب عرصے سے بستی مجھ سے چھڑا دیا ہے۔ ارے کمبخت آ اور جلد آ۔ ع

بیا بیا کہ مرا طاقتِ جدائی نیست

خدایا وہ دن کب آئے گا کہ ایک جوان بھائی کے موٹے موٹے چکنے چپڑے

گٹھے ہوتے گال ایک بوڑھے بھائی کی چپٹی داڑھی سے وابستہ ہوں گے

؎ خوشا وقتے و خرّم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصلِ یارے

ظالم بس اب ظلم نہ کر۔ آ، کیوں نہیں آتا۔ آتشِ شوق شعلہ افگن ہے۔ آج سے ہر روز تیرا انتظار رہے گا۔ اگر ۱ مئی کو نہیں آیا تو ۲ مئی کو ضرور آجانا۔ اپریل سے بیزار مئی کا منتظر تیرا ہمدرد بھائی۔

مکتوب نوساری بنام سید محفوظ علی ——— محمد علی جوہر

۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء

(خطوطِ محمد علی)

بارے خدا کا شکر ہے کہ کل شب کو دورے میں ایک خط ملا جس کے لفافے پر تو کسی بے گانہ کا خط مگر اندر چار لڑیوں کا موتیوں کا ہار یعنی چار صفحے پر وہی آشنا خط تھا جس نے آنکھوں کو پھر مدت کے بعد روشنی بخشی۔

مکتوب نوساری بنام سید محفوظ علی ——— محمد علی جوہر

۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء

(خطوطِ محمد علی)

"کالج پر اس قدر سخت مصیبت آئی ہے اور تم علی گڑھ تک نہ گئے" اور نہ اب تک اس قلم سے کام لیا جس کا ملانا ازل سے تمھیں بہتر آتا ہے"۔ یہ مولانا محمد علی نے اپنے مکتوب بڑودہ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۱۰ء میں لکھا۔ میر صاحب کو یہ اس بستی کا فراخ تحسین تھا جس کے بارے میں ایچ جی ویلز نے کہا "محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، اس کا قلم میکالے کا قلم تھا، اس کی زبان برک کی زبان تھی۔

——— مؤلف

Marfat.com

محمد علی کی یاد میں

محمد علی کا اور میرا ساتھ سب سے پہلے ۱۸۸۸ء میں ہوا جب ان کی عمر دس برس کی تھی اور وہ ذوالفقار بھائی، نوازش مرحوم اور شوکت اپنے ان حقیقی بھائیوں اور امتیاز اور امجد اپنے عزیزوں کے ساتھ بریلی اسکول میں پڑھنے آتے اور بورڈنگ ہاؤس میں میرے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر مقیم ہوتے۔ دو برس بعد وہ شوکت کی معیت میں علی گڑھ چلے گئے جہاں ۱۸۹۳ء میں میں بھی پہنچا اور پھر ساتھ ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں میں فارغ ہوکر علی گڑھ سے چلا آیا اور دو تین سال بعد انھوں نے بی اے کیا ولایت گئے اور واپس آئے۔ ۱۹۰۶ء میں جب وہ بڑودہ میں تھے ہم دونوں پھر ملے اور عرصے تک بمبئی میں ہر پندرھویں بیسویں دفعہ ایک دن ایک ہی جگہ قیام ہوتا رہا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۲ء سے یعنی جب سے کامریڈ دہلی آیا، نظر بندی کے وقت تک تو برابر چوبیس گھنٹے یکجائی رہی۔ لہٰذا میں کہہ سکتا ہوں کہ محمد علی کی کتابِ زندگی۔ اول کے دس اور بیچ کے دس گیارہ ورق چھوڑ کر، پوری میرے پیشِ نظر ہے بلکہ اس کے اکثر باب میرے سامنے لکھے گئے ہیں۔ لیکن میں یہاں نہ اس کتاب کی تلخیص لکھنا چاہتا ہوں نہ اس پر تقریظ و تبصرہ بلکہ اپنے ایک نہایت ہی عزیز بھائی کی تربت پر محبت کے پھول چڑھانا چاہتا ہوں

محمد علی اوائل عمر میں بظاہر ان جذباتِ عالیہ سے بیگانہ نظر آتے تھے جنھوں نے آگے چل کر محمد علی کو محمد علی بنا دیا مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرّہ جو بیابان اور وہ قطرہ جو سمندر بن کر ساری دنیا کو اپنے حدود کی پہنائی اور اپنے ساحل کی آغوش میں سمیٹ لینے والا تھا شروع ہی سے ان کے دل کے کسی غیر آباد گوشے میں خاموش پرورش پا رہا تھا۔

Marfat.com

جب وہ ولایت کو روانہ ہوئے تو ان کے دماغ پر عقلِ مآل اندیش کا قبضہ تھا مگر ان کے دل پر عشقِ مصلحت ناشناس کا غلبہ تھا اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں دونوں کی رقابت و مناقشت کارفرما تھی۔ عقل کی رائے تھی کہ وہ مسٹر ایم علی۔ آئی۔ سی۔ ایس بنائے جائیں مگر عشق کی صلاح کہ رئیس الاحرار مولانا حاجی محمد علی بنیں۔ عقل کی مرضی تھی کہ وہ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں مگر عشق کی خوشی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انھیں سزا دینے کا طریقہ مگر عشق نے سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے ان کے لیے جج کا چُغہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کُرتا اور حج کا احرام پہنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریڈلا اور انگرسال کے زمرۂ شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ اویسؔ اور بلالؔ کے حلقۂ غلامی میں آئیں۔ غرض کہ عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید مگر عشق کا فتویٰ کہ شہید ہوں۔ اس کشاکش میں، بپایانِ کار، عشق ہی کامیاب ہوا۔ یعنی محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے۔ یہ اس میدان کی پہلی فتح اور اس مکتب کا پہلا سبق تھا۔ آگے آگے دیکھیے۔ اندک اندک عشق درکار آورد بیگانہ را۔

آپ سمجھے یہ کس کا عشق تھا؟ ابتدا میں شاید خود محمد علی بھی نہ سمجھے ہوں گے یہ عشق تھا اسلام کا۔ خدمت و نصرتِ دین کا۔ امتِ مرحومہ کی حفاظتِ ناموس کا۔ اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور سود و بہبود کا۔ اسی کے ایک معمولی اشارے نے بڑودہ کی ملازمت سے پہلے برداشتہ خاطر اور پھر بیزار کیا۔ مجھے اس کی تفصیل عرض کرنے دیجیے انگریزی گورنمنٹ کے ایک سابق اعلیٰ عہدہ دار اور ملک کے مشہور مصنف، ادیب اور سیاسی مورخ برادرِ وطن، بڑودہ کے رکنِ حکومت مقرر ہو کر پورب دیس سے آئے۔ ایک موقع پر دورانِ گفتگو میں سلطنتِ مغلیہ کا تذکرہ چھڑا۔ رکنِ حکومت نے اسی کوتاہ نظری بلکہ بے بصری سے جو یورپی مورخوں کی بنائی ہوئی عینک کا خاصہ ہے مارشمین اور الفنسٹن کے ہدفِ مطاعن اورنگ زیب علیہ الرحمہ کے ظلم و تعصب کے افسانے گنانے شروع کیے۔ محمد علی کو جو علامہ شبلی مرحوم کے "مضامینِ عالمگیر" پڑھ چکے تھے، یارائے

Marfat.com

ضبط کہاں۔ فوراً الجھ پڑے اور متکلم و مخاطب کے تفاوتِ درجات کو ٹھکرا کر وہ دنداں شکن بحث کی کہ مخالف کو نہ صرف خاموش ہونا بلکہ قبولنا پڑا کہ اس کی دست رس اصل فارسی تاریخوں تک نہیں جو اس مبحث پر سب سے زیادہ قابلِ وثوق و استدلال ہیں۔ (محمد علی نے چاہا تھا کہ اورنگ زیب کے عہد کی مفصّل تاریخ یا کم از کم ان کی سوانح عمری لکھیں۔ چنانچہ کچھ مواد بھی فراہم کیا اور نوٹ بھی لکھے مگر سیاسیات کی آندھی میں یہ سب تنکے اڑ گئے)۔

بحث کی تلخی سے دونوں میں اس درجہ بدمزگی بڑھ گئی کہ رکنِ حکومت کی کدورت اور محمد علی کی بددلی میں یوماً فیوماً اضافہ ہی ہوتا رہا جس کا اظہار مرحوم اکثر کیا کرتے تھے۔ میرے پاس ان کے خطوط کا اچھا خاصا سرمایہ تھا جس کا زیادہ حصہ میری عمر کی طرح بے پروائی کی نذر ہو گیا۔ اب جو تھوڑے[1] سے رہ گئے ہیں وہ بہت زیادہ عزیز و قابلِ قدر ہیں۔

۱۴؍ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"تمھارے جانے کے بعد یہ ہوا کہ کونسل نے بالاتفاق رائے فیصلہ کیا کہ افیون کی کاشت میں کمی کے مسٹر محمد علی کسی طرح جوابدہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی۔ ٹالم ٹولا ہوتی رہی۔ اس عرصے میں مسٹر ڈت کا نزول ہوا۔ افنگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ان کی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی۔ اس لیے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس عرصے میں ٹائمز آف انڈیا میں چند مضامین میرے شائع ہوئے جن میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی اور مسٹر گوکھلے کی دوستی نما دشمنی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ مسٹر ڈت سخت ناراض ہوئے اور میرا جواب طلب کیا۔ میں نے جواب اس قدر دنداں شکن دیا کہ کچھ بن نہ پڑی۔ کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا سوائے

---

[1] یہ خطوط بالآخر جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانے میں "محمد علی میوزیم" میں شامل کر دیے گئے۔ ان کی نقل "خطوط محمد علی" مرتبہ پروفیسر محمد سرور، میں موجود ہے۔ مؤلف

Marfat.com

اس کے کہ ایک عام سرکلر شائع کیا جائے ورر وہ بھی خفیہ کہ سرکاری عہدیداروں
کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں ہیں۔ جن کی وجہ سے مختلف مذاہب و
اقوام میں مخالفت پیدا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ریاست سے سخت بیزار ہوں۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوکری سے بیزار ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موت سے پہلے
آدمی غم سے نجات پائے کیوں"۔

آپ دیکھ رہے ہیں! ریاست سے بیزاری۔ نوکری سے بیزاری۔ یہاں تک کہ زندگی سے بیزاری! آخر یہ دنیا سے برداشتہ خاطری کیوں؟ کیا صاف نظر نہیں آتا کہ کوئی مصلحتِ ناشناس تعلقات کی بیڑیوں کو کاٹ کر۔ معلوم، متعارف و مستعمل شاہ راہ سے جبراً ہٹا کر کسی نامعلوم و نادیدہ راستے پر چلانا۔ اور کسی نئی جگہ پہنچانا چاہتا ہے؟ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را۔

یہ خط مجھے وطن میں ملا تھا۔ چونکہ اصرار اور تقاضے سے بلایا تھا لہٰذا نوساری پہنچا ملاقات ہوئی۔ وہی دکھڑا۔ وہی ملازمت سے بیزاری ورر وہی رکنِ حکومت کے خلاف شکوۂ مسلم آزاری۔ ان جدید کوششوں اور نئی امیدوں کے متعلق بھی گفتگو ہوئی جو نظر کے سامنے پھول کھلا رہی تھیں اور جن کا خط میں تذکرہ تھا۔ نوساری سے بمبئی آئے ٹائمز کے دفتر میں گئے۔ ایڈیٹر نے ان کے مضامین کی داد دے کر کہا "مسٹر محمد علی آپ اپنے قلم سے کام لیتے اور ہمیں مدد دیتے رہیں۔ یہ تو ہم کیسے کہہ سکیں کہ آپ ہمارے اسٹاف پر آجائیں مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں رہیں ہمیں قلمی امداد دیتے رہیں۔ ہم خدمت کو حاضر ہیں"۔ آفس سے باہر نکل کر کہنے لگے۔ " بھائی! سنا کیا کہتا تھا؟" میں نے جواب دیا "ہاں سنا۔ جب نوکری سے اتنے بیزار ہو تو چھوڑ چھاڑ کر اپنا اخبار کیوں نہیں نکالتے؟"

خدا جانے یہ الفاظ قبولیت کا وقت تاک کر اور اجابت کا وعدہ لے کر آئے تھے کہ ادھر زبان سے نکلے، اُدھر دل میں بیٹھ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے دل میں پہلے ہی سے یہ خیال ہو۔ بہرکیف راستے بھر یہی باتیں رہیں کہ مذہب و ملک کی خدمت کا ایک

Marfat.com

زبردست اور موثر ذریعہ اخبار نویسی ہے۔ اور جب قلم پر پوری قدرت اور طبیعت کو مناسبت بھی ہے تو اسی ذریعہ سے خدمت کیوں نہ کی جائے۔ گھر پہنچ کر بھی سونے کے وقت تک یہی باتیں رہیں۔

دوسری صبح کو دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی یہ منصوبہ بھی خیال کے احاطے سے باہر نکل کر عمل کی سرحد میں داخل ہوگیا۔ یعنی ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے اخراجات کا اندازہ کرنے کے لیے جان ڈکنس کمپنی کے یہاں گئے۔ اسی شام کو مسٹر محمد علی اپنے عزم راسخ میں دنیاوی بہشت کو دوزخ میں ڈال کر اپنی ہستی کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر چکے تھے۔ کامریڈ تو عرصے کے انتظار اور پورے انتظام کے بعد کہیں کلکتے سے نکلا مگر مجھے فخر ہے کہ مذہب و ملک کی خدمت کے میدان میں محمد علی کا سب سے پہلا قدم جو اٹھا وہ غریب خانہ ہی سے اٹھا' یعنی انگریزی اخبار نکالنے کے عزم کی تصمیم وہیں ہوتی۔

اس کے بعد ملازمت سے بوضعِ تنواہ رخصت لی جو استعفےٰ کی محض نظر فریب شکل تھی۔ مذہب و ملک کی خدمت کے لیے کمر باندھی۔ کلکتے گئے کامریڈ نکالا۔ دہلی آئے کامریڈ کے ساتھ ہمدرد جاری کیا۔ جنگ طرابلس میں چندہ فراہم کیا۔ جنگِ بلقان میں طبی مشن بھیجا۔ انجمن خدام کعبہ کی بنا ڈالی مسجد کانپور کے سلسلے میں ولایت گئے۔ نظر بند ہوئے قید ہوئے۔ اخبار بند کرایا۔ گھر بار لٹایا، حاجی ہوئے اور آخر میں دارالکفر میں جان دے کر دارالامان اور مدینۃ الانبیا میں زندگیٔ جاوید پائی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح۔

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را۔

بڑودہ، بمبئی، کلکتہ اور دہلی میں مرحوم خفیف سی علالت میں بھی دیار غیر سے دور مار کر بیکسی کی شرم رکھ لینے پر، غالب کے الفاظ میں خدا کا بشگی شکر ادا کیا کرتے تھے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ موت دیارِ غیر ہی میں آئی جہاں بیکسی کی شرم رہ گئی۔ کیونکہ سوئے چند خاص عزیزوں کے نہ وہاں ہم نشیں تھے، نہ ہم زباں؛ ورنہ تیماردار تھے نہ نوحہ خواں مگر اس دیارِ غیر میں عاشق کا جنازہ جس دھوم سے نکلا تھا اور شہید کے کفن کے بناؤ پہ

جس چاؤ سے وہاں حوروں کی آنکھ پڑتی تھی اسے دیکھ کر تو شاید اکثر رفقائے سفر کو غبطے کے ساتھ اس ضد کا سخت شکوہ بھی پیدا ہوا ہو کہ جب آتے بن نہ رہے گی تو پھر آج ہی کیوں نہ آگئی۔

اسلام کی نصرت کا جذبہ مرحوم کی طبیعت میں پہلے شوق بنا، پھر ولولہ ہوا، آخر میں جنون، یہی جنون تھا جو کامریڈ کے صفحوں پر اور جامع مسجد کے منبر پر قلم سے اور زبان سے اہلِ احتساب کو دعوت گیر و دار دیتا تھا۔

طفلانِ شہر بے خبر انداز جنونِ ما
یا ایں جنوں ہنوز سزاوارِ سنگ نیست

جنون کی سرکار سے سب سے بڑا انعام خلعتِ سہ پارچہ جو عطا ہوا وہ عزم ارادے میں پہاڑ کا سا استقلال، عزم طبیعت میں دریا کا سا بہاؤ اور عزم جذبات میں طوفان کا سا جوش تھا۔ اسی کی بدولت تو تھا کہ خدمتِ مذہب کی جو نوعیت ذہن میں آئی اس کی بجا آوری پوری استقامت و استقلال نہایت تیزی و روانی اور شدید جوش و انہماک سے کی۔

قید و بند کی جو جو سختیاں جھیلنی پڑیں وہ نہ تو کسی دوسرے شخص کے اعمال و افعال کی پاداش میں تھیں نہ ناگہانی آفتادیں کہ بلا علم و اطلاع بختِ شوم پر آپڑی ہوں بلکہ خود ان کی اپنی ہی تحریروں اور تقریروں کے جرائم کی سزا میں تھیں اور یہ جرم وہ تھے جن کا ارتکاب انھوں نے کسی فوری جوش یا وقتی اشتعال کی حالت میں نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح جان بوجھ کر کیا تھا۔ چنانچہ ہر سزا بھگتنے اور ہر کڑی جھیلنے کے بعد ان کا ڈھنگ رنگ یہی یکساں تھا۔ ع

آں قدر زخمے کہ دل می خواست در پیکاں نبود

اور یہ آج میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ایک دیوانہ اب سے بارہ برس پہلے یہی الفاظ ان کی رہائی کے دن کہہ چکا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود انھوں نے اسی مطلب

کو لطیف تر پیرایے میں ادا کیا ہے ؎

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد[1]

خدا کے خوف کے ساتھ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بےخوفی۔ ایک مسلمان کی خصوصیت امتیازی اگر آج نہیں تو پہلے کسی زمانے میں تو تھی۔ دنیا کی بڑی طاقت سے ان کی بے خوفی کے واقعات تو دنیا بھر کے علم و ذہن میں ہوں گے مگر خدا کے خوف کے متعلق یہ آنکھیں آج اور اس وقت گواہی دینے کو موجود ہیں کہ۔ ماضیٔ قریب میں نہیں جب کہ محمد علی کی ہیئت کذائی خشوع و خضوع کی قد آدم تصویر بن گئی تھی، بلکہ ماضیٔ بعید میں جب کہ سوٹ بوٹ، منڈی، ڈاڑھی اور قیصری مونچھیں بظاہر خدا سے بے خوفی کا پورا مجسمہ پیش کرتی تھیں۔

فجر کی قضا نماز کے بعد سجدے کی جگہ کو تر ہوتے، دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو کانپتے، سائل کو دینے کے لیے جیب سے رقم کے ساتھ آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھا ہے۔ دل کے اسی گداز نے دکھا دیا کہ دنیا کے خریدار مسٹر محمد علی تو معمورۂ لندن سے خالی ہاتھ آئے مگر دین کے طلب گار، مولانا محمد علی خرابۂ مہرولی سے جھولی بھرے گئے ؎

بستند رہ جرعۂ آبے بہ سکندر

دریوزہ گر میکدہ صہبا بہ کدو برد

---

[1] یہ مصرعہ مولانا حالی کا ہے۔ پورا شعر یہ ہے ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنی نظر بندی کے زمانے میں جو غزل اس زمین میں کہی تھی اس کا شعر یہ ہے ؎

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں

آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

علی برادران مرتبہ رئیس احمد جعفری

Marfat.com

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ عجیب خوش نصیب شخص تھے۔ جنھیں جینا بھی خوب آتا تھا اور مرنا بھی خوب آیا۔ جو عملاً دکھا گئے کہ زندگی چاہے شروع اپنے ذاتی عیش ہی کے خیال سے کی جائے مگر ختم دوسروں کے آرام کی خاطر ہونی چاہیئے۔ جن کی قسمت میں ایک سچے خدا پرست مسلمان کی زندگی لکھی تھی اور ایک مجاہد کی موت جو اللہ کے عاشق تھے۔ اللہ کے رسول صلعم کے عاشق تھے۔ رسول صلعم کی اُمت کے عاشق تھے۔ اُمت کے ہر فرد کے عاشق تھے اور اسی لیے ساری دنیا کے مسلمانوں کے محبوب سردار، رسول اللہ کے مخصوص خادم اور اللہ کے مرحوم بندے تھے۔ واللہ یختص برحمتہ من یشاء۔ واللہ ذو الفضل العظیم۔

الہ العالمین! صدقہ اپنے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلّم کا محمد علی کی مغفرت کر۔ انھیں اپنے جوارِ قرب میں جگہ دے۔ انھیں اپنے مقبول بندوں کے ساتھ محشور کر۔ مجھ نامہ سیاہ سراپا گناہ کا خاتمہ بخیر کر اور ہم سب مسلمانوں پر رحم فرما۔ آمین یارب العالمین۔

جیم، لکھنؤ ——— محفوظ علی

الامان، دہلی ۱۹ فروری ۱۹۳۱ء

العدل، بدایوں، ۲۶ فروری ۱۹۳۱ء

سرگزشت، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۳۱ء

ہمت، لکھنؤ، ۸ مارچ ۱۹۳۱ء

علی گڑھ میگزین، جنوری ۱۹۳۹ء

Marfat.com

حدیث دیگراں

(۵)

مولانا محمد علی کو سید صاحب سے جو دلی شغف تھا وہ شروع سے آخر تک قائم رہا۔ "کامریڈ" اور "ہمدرد" کا خواب دونوں نے مل کر دیکھا تھا اور اس کی تعبیر و تشکیل میں دونوں شریک رہے۔ ایک صحرا کو نکل گیا، دوسرا بدایوں کے گلی کوچوں میں بھی رسوا نہ ہوا۔ مولانا محمد علی کے مزاج میں جو بے پایاں شدت و حرارت تھی جس نے ان کو ہمیشہ نعل در آتش رکھا، جس کی وجہ سے کوئی شخص مولانا کے ساتھ یکسوئی اور استقلال کے ساتھ کام نہ کر سکتا تھا، اور جس بیش و طوفان کے بالآخر وہ خود نذر ہو گئے، اس نے سید محفوظ علی کو کبھی متزلزل نہ کیا۔ سید محفوظ علی نے اس مہر نیم روز سے روشنی اور حرارت بھی اکتساب نہ کی۔ محفوظ علی اپنے نظامِ شمسی خود تھے!

گنج ہائے گرانمایہ ——— رشید احمد صدیقی

اس زمانے کے اکابر اور مشاہیر میں کیا کچھ تو تو میں میں نہیں ہوئی ———

مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں میں خوب اَن بَن رہی۔

مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ظفر الملک میں خوب چلی۔

مولانا ظفر الملک اور مولانا محمد علی میں بھی اختلاف رائے ہوا۔

مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد میں چوٹیں ہوئیں۔

مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی میں خفگی ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی میں چپقلش رہی۔

مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی میں خوب ٹھنی۔

Marfat.com

خواجہ حسن نظامی نے ایک وقت علامہ اقبال پر بحثپراؤ کیا۔
علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی میں اختلاف رائے ہوا۔
ان سب ہستیوں سے سیّد محفوظ علی صاحب کی گہری جان پہچان تھی، لیکن سیّد صاحب ہر تنازعہ میں صرف "سخن فہم" رہے۔ وہ نہ کبھی غالب کے طرفدار بنے، نہ مغلوب کے وہ ان تمام عظیم ہم عصروں کی نظروں میں بہ یک وقت انفرادی اور اجتماعی طور پر قابلِ تکریم و احترام گردانے گئے۔ سچ فرمایا رشید احمد صدیقی نے ــــــ "محفوظ علی اپنے نظامِ شمسی خود تھے۔"

ــــــ مؤلف

"ہمدرد" کے دفتر کی آب و ہوا بھی کچھ عجیب تھی۔ وہ صحبتیں اور دل کی امنگوں کی خواہشیں، اقبال کی نظمیں اور شوکت علی بھائی کا ترنم، (راجہ) غلام حسین مرحوم کے دھیمے مذاق، محفوظ علی بھائی کی شیریں گفتاری کہ ہر لفظ دہانِ موزوں سے نکلتا تھا گویا ایک برکتِ فلک سیر سے کم نہ ہوتا تھا۔
مزاح نگاری کا ایک ایسا معیار "ہمدرد" نے قائم کیا جس کا اس سے پہلے اردو صحافت میں کوئی وجود نہ تھا۔ ببوق اور محفوظ علی (دونوں علی گڑھ کے) اس فن کے استاد مانے گئے اور آج بھی جو اچھے مزاح نگار ہیں انھوں نے "ہمدرد" کی روایات سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

سیرت محمد علی ــــــ قاضی عبد الغفار
اور
علی برادران

شوکت علی اور محمد علی کے طالب علمی کے زمانے کا لطیفہ "سگ باش" اور "خر باش" سے متعلق جو سید محفوظ علی صاحب نے اپنے اگلے مضمون میں تحریر فرمایا ہے، اس کی آواز بازگشت مدت بعد دلی کی ایک دعوت میں سنی گئی۔ اس کا بیان مولانا رازق الخیری کی زبانی سنیئے۔

——— مؤلف

مولانا محمد علی جوہر مرحوم علامہ (راشد الخیری) مغفور کو "دکھیا" کہتے تھے۔ ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ان کی رہائش گاہ اور دفتر اسی مل والے مکان میں تھا جہاں کسی زمانے میں دفتر "مخزن" رہ چکا تھا اور جہاں سے "عصمت" جاری ہوا تھا۔ علامہ مغفور بھی کبھی مولانا سے ملنے چلے جاتے تھے اور کبھی سڑک پر ملاقات ہوتی تو مولانا محمد علی دیر تک کھڑے باتیں کرتے۔ جاڑوں میں ایک دفعہ علامہ مغفور اپنے احباب کو نہاری کھلاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء میں ایک دن صبح مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی شوکت علی کو ابا جان نے نہاری پر بلایا۔ دونوں بھائیوں اور ان کے ساتھیوں نے دلی کی نہاری مزے لے لے کر کھائی۔ مولانا محمد علی نے اپنے ہاتھ سے تین نلیوں کا گودا نکالا۔ تیسری نلی ختم کر رہے تھے کہ مولانا شوکت علی نے کہا — "محمد علی! ذرا روٹی اٹھانا۔" ان کا ہاتھ روٹی کی طرف بڑھا اور ادھر مولانا شوکت علی نے ہاتھ بڑھا سارا گودا جو مولانا محمد علی نے نلیوں سے جھاڑا تھا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ مولانا محمد علی نے ان کی طرف دیکھا، مسکرائے، اور فرمایا۔ "سگ باش برادرِ خرد مباش"۔

——— رازق الخیری

سوانح عمری علامہ راشد الخیری
عصمت سالگرہ نمبر
جولائی ۱۹۶۴ء

Marfat.com

محمد علی

اللہ تعالیٰ محمد علی کی مغفرت فرمائے ان کے بچپن کی صورت اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ چھریرا بدن ہونے کے باعث قد باعتبارِ عمر کسی قدر لانبا۔ پیشانی بالوں سے دبی ہوئی۔ ناک ستواں۔ کان کی لویں زیادہ ڈھلکی ہوئیں۔ آنکھیں کسی قدر چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئیں۔ ہونٹ پتلے، اوپر کی دونوں کچلیاں دانتوں کی قطار سے نیچے نکلی ہوئی جو بولتے یا ہنستے وقت دکھائی دیتی تھیں۔ (یہ کچلیاں ولایت میں دنداں ساز سے رتوا کر برابر کرائی گئی تھیں۔) عموماً سپید کرتہ، پاجامہ، بہت زیادہ چوڑی گوٹ کی سپید دو پلی رامپوری وضع کی ٹوپی۔ آواز بھرائی ہوئی۔ گفتگو میں ضرورت سے زیادہ تیزی، جس کے باعث الفاظ زبان سے آدھے پونے ادا ہوتے تھے (شوکت سے تصدیق کی جائے) ضعفِ مثانہ کی شکایت، جس نے ذیابیطس کی شکل میں آخر دم تک ساتھ دیا، بچپن ہی سے تھی۔ چنانچہ اکثر صبح کو بستر کی نمی سخت سرزنش کا باعث ہوا کرتی تھی۔ طبیعت میں نقالی کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ اس وقت دو مثالیں ذہن میں ہیں۔

۱۔ بھائی ذوالفقار علی خاں ازل سے حسن پرست دل اور عشق پرور دماغ لے آئے تھے، ایسے دل و دماغ کو شاعری سے جتنا زیادہ لگاؤ ہو تھوڑا ہے۔ داغ جیسا یگانۂ روزگار شاعر رامپور میں موجود۔ لہٰذا داغ کے شاگرد ہوتے اور گوہر تخلص کیا۔ محمد علی نے ہوش سنبھالا تو شعر و شاعری کا گھر میں چرچا سنا۔ فوراً بڑے بھائی کی دیکھا دیکھی اور انھیں کے تخلص کی رعایت سے نو دس برس ہی کی عمر میں اپنا تخلص جوہر رکھ لیا۔ بریلی کے بورڈنگ ہاؤس کے بڑی عمر کے طلباء مزاحاً پوچھتے ۔" بھائی محمد علی صاحب آپ کا تخلص کیا ہے؟" تو لکھنوی شاعرانہ انداز میں جواب دیتے" خاکسار کو جوہر کہتے ہیں"۔ کسی قدر اصرار

Marfat.com

پر کچھ نکیں بھی سناتے تھے، جو افسوس کہ یاد نہیں۔

۲۔ بورڈنگ ہاؤس بریلی میں ہم مسلمان طلباء نے ایک انجمن قائم کی تھی جس میں انٹرنس کلاس سے بی اے تک کے طلباء شامل تھے۔ چونکہ اس زمانے میں بورڈنگ ہاؤس میں آنولہ، گورکھپور اور بجنور کے چھوٹے بچّے بھی تھے، لہٰذا محمد علی نے اپنے ہم سن بچوں کی ایک جداگانہ انجمن بنائی، جس کے سیکرٹری وہ خود ہوئے۔

ایک دن صبح کے وقت میں نے دیکھا کہ محمد علی کاغذ کا ایک پرزہ لیے پھاٹک پر کھڑے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اس پرزے کو اونچی جگہ گوند سے چسپاں کریں۔ میں نے کہا لاؤ میں لگادوں۔ دیکھا تو انگریزی میں انھیں کے ہاتھ کا لکھا نوٹس تھا کہ جلسہ گیارھویں تاریخ ہونے والا ہے۔ گیارھویں کو انھوں نے 11st لکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیا؟" "ٹن فرسٹ (TEN FIRST)۔" میں نے آہستہ سے کان گرم کیے اور اصلاح کردی۔

جب شوکت نے بنارس سے "اولڈ بوائے" نکال کر کسی موقع پر مضامین کا تقاضا کرتے ہوئے اپنی مدیری قلم کی نوک سے مجھے چرکے دیئے تو زمانہ طالب علمی کے کچھ حالات بیان کرتے ہوئے اس واقعہ کو فروری ۱۹۱۱ء کے اولڈ بوائے میں بالفاظ ذیل یاد دلایا گیا تھا "...... یہ وہ زمانہ تھا جب گیارھویں تاریخ کو ٹن فرسٹ لکھنے پر محمد علی کی گن بچّی ہوئی تھی، نہ اب کا زمانہ کہ مسٹر محمد علی بی اے آکسن کلکتہ جیسے ولایت شہر میں کامریڈ نکال کر اچھے اچھوں کی گوشمالی کرنے والے ہیں۔" محمد علی اسے پڑھ کر بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ "جس نے میرے کان کھینچے تھے، میں اس کی چٹّی ڈاڑھی کھینچوں گا اور فوراً کہنے لگے! مگر ویسے ہی جیسے چھوٹے بچے کھینچتے ہیں۔

بریلی ہی میں بلا کے ذہن مگر کم محنت تھے۔ استاد سب خوش رہتے تھے۔ مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی بہت تھی، مگر شرارت جس سے بڑوں کی طبیعت کو تکدر ہو نام کو نہ تھی۔ شوکت خوش گپ اور یار باش ہونے کے ساتھ کاہل اور خوگر حکمرانی ہو چلے تھے۔ طالب علموں کے مجمع میں بیٹھے۔ "محمد علی پانی پلاؤ۔ پان لاؤ۔ کتاب اٹھاؤ۔ اچکن رکھ آؤ۔"

Marfat.com

کہا کرتے تھے۔ ایک دن خطیب جی (مولوی سخاوت حسین مرحوم اسسٹنٹ انسپکٹر مدراس) نے محمد علی کو "سگ باش برادرِ خرد مباش" کے معنی سمجھائے۔ میں نے کہا ایک دوسرا جملہ بھی ہے "خرباش برادرِ بزرگ مباش"۔ خطیب جی نے اس کے معنی بھی سمجھا کر کہا: "تو محمد علی تم سگ ہوتے اور شوکت خر"، محمد علی نے ہانپتی ہوئی آواز اور کانپتے ہوئے لہجہ میں فوراً جواب دیا۔ "جناب میں تو سگ بننا پسند کر دوں گا مگر شوکت بھائی کا خر بننا پسند نہ کر دوں گا"۔ خطیب جی نے کہا۔ "شاباش!

علی گڑھ نے محمد علی کو پہلے ایک باادب مراہق اور پھر ایک مہذّب نوجوان دیکھا جو قابلِ رشک اہلیت کے ساتھ کلاس میں لیکچر سنتے، فیلڈ میں کرکٹ کھیلتے اور یونین میں تقریر کرتے تھے۔ شوکت تو لاابالی، خوش گزراں اور ہنگامہ پسند طبیعت کے آدمی تھے جنھیں کچھ دنوں اپنے کمرے کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ محمد علی کی نگہداشت زیادہ تر کپتان عبداللہ مرحوم کے زیرِ نظر ہوئی جن کی محبتوں اور خوبیوں کو یاد کر کے محمد علی اکثر ان کی بے وقت موت پر متاسف ہوا کرتے تھے۔

بی۔ اے میں شاید یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے تھے (کلنڈر سے تصدیق کرلی جائے)۔ مسٹر گوکھلے کی وفات پر دہلی کے ٹاؤن ہال کے میدان میں جلسہ ہوا تو پنڈت مدن موہن مالوی یا سر یندر ناتھ بنرجی نے بیان کیا کہ گوکھلے نے اکیس سال کی عمر میں بی۔ اے کیا اور یونیورسٹی میں امتیازی جگہ حاصل کی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ گوکھلے علم و قابلیت کا مجسمہ تھے۔ ان کے لیے یہ امور باعثِ فخر نہیں۔ آپ کا یہ نیازمند جو گوکھلے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ بیس سال کی عمر میں یونیورسٹی میں اوّل آچکا ہے۔ یہ سن کر حاضرین منہ تکنے لگے اور پہلے مقرر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

علی گڑھ کالج میں کامیابی کے بعد ۱۸۹۰ء میں محمد علی ولایت گئے جہاں ان کی علمی کوششوں کا ماحصل سول سروس کے امتحان کی تیاری اور اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی

سے بی۔ اے کی امتیازی سند کا حصول ہی نہیں ہے، بلکہ ان کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب و انشا، مصطلحات و محاورات، طرزِ ادا و طریقۂ بیان پر اس درجہ تبحّر و عبور حاصل کیا کہ ان کے قلم و زبان دونوں کو جاہلوں سے لے کر عالموں، گنواروں سے لے کر شہریوں، فقیروں سے لے کر امیروں اور مزدوروں سے لے کر وزیروں تک کے الفاظ و عبارت کے ادا کرنے پر یکساں کامل قدرت و مہارت حاصل تھی۔ ملاحوں کے سرود انھیں یاد تھے، اناؤں کی لوریاں انھیں یاد تھیں، لیمرک (LIMERICK) کی وہ ہزلیات منظوم جو THERE WAS سے شروع ہوتی ہیں۔ انھیں یاد تھیں بُل (BULL) انھیں یاد تھے، معمّے اور چیستان انھیں یاد تھے۔ اسی کے ساتھ انگریزی متقدمین، متوسطین، اور متاخرین شعرا و مصنفین کے بہترین علمی اور ادبی جواہر پارے ان کی زبان پر یا ان کی نظر میں تھے۔ انجیل کی کتاب عتیق و جدید پر ان کی نگاہ تھی۔ سینکڑوں علمی لطیفے ان کے نوکِ زبان تھے۔ طبیعت پر چونکہ بذلہ سنجی، ظرافت، اور شوخ نگاری کا رنگ غالب تھا لہٰذا اس صنف میں ایسا بے ساختہ اور اتنا بہتر لکھ سکتے تھے کہ بسا اوقات ان کی اور لندن پنچ کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز ہو سکتا تھا۔

یہ ایک جاہل اور ہندی ہمچداں کا والہانہ خیال نہیں، بلکہ بڑے بڑے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدارانہ رائے ہے۔ جب تک محمد علی کا نام گورنمنٹ کے معتوبوں کی فہرست میں موٹے حرفوں میں نہ لکھا گیا۔ انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد کامریڈ کی خریدار اس کے مضامین کی عاشق اور اس کے طرزِ نگارش کی مداح تھی۔ وائسرائے کی بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ٹیلیفون پر دریافت کراتی رہتی تھیں کہ کامریڈ کس وقت تک چھپ کر ان کے پاس پہنچ جائے گا۔

سر فلیٹ وڈ ولسن (SIR FLEETWOOD WILSON) ہندوستان کے وزیر مالیات جب ولایت جانے لگے تو محمد علی ان سے ملنے گئے۔ باتیں کرتے کرتے وہ محمد علی کو اس کمرے میں لے گئے جہاں ان کا سامانِ سفر بندھ رہا تھا۔ ایک صندوق کو جس کا اوپر کا تختہ کیلوں سے جڑا جا رہا تھا، کھلوا کر کہنے لگے "محمد علی! دیکھو اس میں کیا

Marfat.com

ہے؟" دیکھا تو کامریڈ کے پرچے تھے۔ کہنے لگے۔ "میں لندن پنچ کے ایڈیٹر کو یہ تحفہ لیے جارہا ہوں۔" محمد علی بولے۔ "پنچ کے ایڈیٹر کو تو کامریڈ برابر جاتا ہے"۔ کہنے لگے۔" وہ اور بات ہے مگر میں اپنے دوست سر اوین سیمین (SIR OWEN SEAEMAN) ایڈیٹر پنچ کو ان کے مذاق کے لائق اس سے بہتر ہدیہ ہندوستان سے نہیں لے جا سکتا۔ تمھاری اور ان کی طرزِ تحریر میں جو یکرنگی ہے کہ بعض اوقات تمھاری اور ان کی تحریر میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ اس کی داد وہی دے سکتے ہیں۔"

محمد علی کی چلبلی شوخ طبیعت سادہ الفاظ اور آسان طرز ادا کی جگہ غالب کی طرح کسی قدر پیچدار طرز ادا کی دلدادہ تھی۔ وہ مذاق میں الفاظ اور اسماء کو اپنے رنگ میں کہنے کے عادی تھے۔ بمبئی کے محلے میں ایک ریلوے اسٹیشن چرچ گیٹ (CHURCH GATE) ہے جسے وہ "باب کلیسا" کہتے تھے۔ میرین لین (MARINE LANE) جسے عوام مریم لین کہتے ہیں وہ "صفوف بحریہ" کہتے تھے.......... کا نام رکھا تھا "شارع عطیہ" اس میں جو تلمیح و لطافت ہے اس کے اظہار کا موقع نہیں، مگر اکثر احباب مثلاً ڈاکٹر علامہ سر اقبال اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ جیکب سرکل (JACOB CIRCLE) کا نام رکھا تھا "دائرۂ یعقوبی"۔ ان کے ایک ملاقاتی کا نام تھا "چندر ہنس" جسے وہ "مہبط" کہتے تھے (چندر = مہ، ہنس = بط)[1]

محمد علی نے ۱۹۱۱ء میں کامریڈ کے صفحات "پر گپ" کے نام سے ادب لطیف کا جوانبار لگایا تھا بہت کم لوگوں کو شاید اس کا علم ہو کہ اس جنسِ نظر فروز کا نمونہ وہ ۱۹۰۷ء میں اس وقت دکھا چکے تھے جب انھوں نے الہ آباد سے ایک چھوٹی تقطیع کا رسالہ "گپ" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ شاید انھوں نے خود فرمایا تھا کہ اس محنت میں کنور جگدیش پرشاد (موجودہ چیف سکریٹری گورنمنٹ صوبہ متحدہ) ان کے شریک تھے۔ "گپ" کے صرف دو ہی پرچے نکلے (پہلا پرچہ[2] حاضر خدمت ہے، دوسرا باوجود تلاش نہ مل سکا)۔ پہلے صفحے کے بالائی

---

[1] ایک دوکان کا نام CATCH POLE تھا۔ اسے مولانا محمد علی پکڑ ڈنڈا کہتے تھے۔ مؤلف

[2] یہ پرچہ بالآخر جامعہ ملیہ دہلی کے "محمد علی میوزیم" کی زینت بنا۔ مؤلف

Marfat.com

حصے پر جو تصویر ہے اس کی دونوں آنکھیں اور ناک مل کر GLP کا املا پیش کرتی ہیں یہ تخیّل محمد علی ہی کا ہے۔

افسانہ از افسانہ می خیزد۔ خاکے، نقشے اور تصویر کے متعلق ان کا مذاق اس درجے صحیح تھا کہ مجھے تو اپنے جہل کا یہاں بھی اعتراف ہے۔ بڑے بڑے ماہر اور مبصر ان کے مذاق کی صحت کے قائل تھے۔ دلّی کے ایک شہزادے روغنی تصویریں بناتے تھے۔ غالباً بے چارے کا ذریعۂ معاش یہی تھا۔ محمد علی کو انھوں نے دلی کی جامع مسجد کی تصویر پیش کی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چونکہ گداگروں کی موجودگی بھی ایک لازمی بات ہے لہذا مصوّر نے بھی نقل کو اصل کر دکھانے کی غرض سے ایک سیڑھی پر ایک عورت کی تصویر بنائی جو ایک پھٹا چیتھڑا برقع اوڑھے دو ننگے بچوں کی انگلی پکڑے کھڑی تھی۔ نیچے لکھا تھا "جامع مسجد دہلی"۔ محمد علی نے تصویر دیکھ کر کہا "میں تصویر لینے اور اپنی طرف سے ہدیہ دینے کو حاضر ہوں بشرطیکہ الفاظ "جامع مسجد دہلی" مٹا کر جو فقرہ میں عرض کروں درج فرمادیں۔ شاہزادہ صاحب نے منظور کیا۔ محمد علی نے پنسل سے ایک کاغذ پر لکھ دیا "HER FATHERS BUILT IT"۔ اب وہ تصویر بجائے جامع مسجد کے معمولی نقشے کے آلِ تیمور کا ایک مرقعِ عبرت ہوگئی۔ محمد علی کے ڈرائنگ روم میں جو صاحب نظر اُسے دیکھتا تھا، ممکن نہ تھا کہ ایک گرم آنسو یا ایک ٹھنڈی سانس اسے بطورِ خراج پیش نہ کرتا۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے ساتھ مسلم لیگ کی بنیاد پڑی اس موقع پر باوجودیکہ اسلامی ہند کی دماغی قابلیت کا عطر موجود تھا مگر مسلم لیگ کے نظام کی درستی اور قواعد و ضوابط کی تیاری کا سارا کام محمد علی ہی نے کیا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے وقت کے مناسب چند مضامین انگریزی میں لکھ کر اخبار میں چھپوائے تھے۔ ان مضامین کو غالباً نومبر ۱۹۰۷ء میں خاکسار نے ایک جا کر کے بمبئی گزٹ کے مطبع میں (THOUGHTS ON PRESENT DISCONTENT) کے نام سے چھپوا کر شائع کیا۔ کوئی کاپی کہیں مل جائے تو اس پر ناشر کا نام M. A. BASHIR & Co لکھا ہوگا۔ M. A. ہی

خاکسار ہے اور بشیر[1] ایک دوسرا شریک کار۔

بمبئی ہی میں جب اخبار نکالنے کا قصد مستحکم ہوا تو یہ بھی طے ہوا تھا کہ محمد علی ایڈیٹر ہوں اور یہ ہیچمیرز منیجر۔ اس کے بعد محمد علی کو برائے چندہ بروده جانا پڑا اور مجھے تجارت کے کاروبار کو آگ لگا کر مستقلاً گھر آنا پڑا۔ اگرچہ ان کی طلبی پر بروده اور بمبئی بار بار گیا

سنہ ۱۹۱۰ء کے آخر میں جب کلکتہ سے اخبار نکالنا طے ہو گیا تو محمد علی نے لکھنؤ سے تار دیا۔ میں فوراً پہنچا اور خیال کو عمل میں لانے کے لیے مشورہ کیا گیا جس میں مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم بھی شریک تھے۔ یہاں مجھے پھر وعدہ کرنا پڑا کہ کلکتہ آ کر شریک خدمت ہوں گا۔ مگر اس عرصے میں میرے ذاتی معاملات میں اتنا پھیلاؤ ہو گیا تھا کہ میرے ضعیف العمر والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ انھیں اکیلے سنبھال نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا اس وقت مکان سے غیر حاضری میرے امکان میں نہ تھی۔

۱۴ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا۔ طلبی کا تقاضا تو بہت پہلے ہی سے تھا اب اس میں سختی شروع ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں سختی تلخی سے بدلی اور لکھا جانے لگا: "بس زانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد۔" ۵ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کو تار آیا کہ تیار رہو تمھاری گرفتاری کے لیے کل بدایوں آتا ہوں۔ چنانچہ ۷ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کو بدایوں تشریف لائے۔ جناب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض معروض کی۔ انھوں نے اپنی ضعیفی اور تنہائی کے باعث جائداد کے انتظام کا بار اٹھانے سے مجبوری ظاہر کی۔ مگر محمد علی کب ماننے والے تھے۔ خوشامد کی ہاتھ جوڑے اور آخر مرحوم و مغفور سے وعدہ لے ہی لیا کہ حالات ساز گار ہوئے تو ان شاء اللہ اجازت دے ہی دی جائے گی۔

ابتدا ہی سے طے ہوا تھا کہ محمد علی (ریا اصلاح) کی آواز مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے ایک

---

[1] جب سید محفوظ علی نے اس تجارتی کاروبار کو بند کرنا چاہا جو مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ شروع کیا تھا اور مولانا ظفر علی خاں حیدرآباد واپس بلا لیے گئے تو ان صاحب نے کاروبار کو سمیٹنے میں مدد دی۔ مؤلف

Marfat.com

اردو اخبار اور مسلمانوں کی آواز گورنمنٹ تک پہنچانے کے لیے ایک انگریزی اخبار نکالا جاتے۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ اردو اخبار کی اڈیٹری مولوی عبدالحق بی۔ اے (موجودہ سیکرٹری انجمن ترقی اردو) کریں گے اور ان کے مددگار مولوی احتشام الدین بی۔ اے دہلوی اور سید ہاشمی فرید آبادی ہوں گے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے آخر میں آنے سے معذوری ظاہر کی اور اپنی جگہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ میں ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کو بدایوں سے لکھنؤ گیا اور انھیں آنے پر رضامند کیا۔

کلکتہ سے کامریڈ کا آخر پرچہ ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا۔ اس کے بعد کارخانہ دہلی آگیا۔ میں بھی بدایوں سے دہلی پہنچ گیا۔ جہاں سے پہلا پرچہ کامریڈ کا ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو نکلا۔ اردو اخبار جس کا نام ہمدرد تجویز ہو چکا تھا ابھی نکلنے نہ پایا تھا کہ مولانا شرر مرحوم جو دو تین مہینے سے مقیم د مشاہرہ یاب تھے۔ اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر وطن واپس گئے۔ اس کے بعد سید ہاشمی بھی چلے گئے۔ ہمدرد کے اجراء میں دیر کا سبب یہ تھا کہ بیروت سے ٹائپ بہت کم مقدار میں آسکا تھا جو پورے اخبار کو چھاپنے کے لیے کسی طرح کافی نہ تھا۔

ایک روز حکیم اجمل خاں رحمۃ اللہ علیہ تشریف لاتے اور دریافت کیا کہ ہمدرد کے اجراء میں کتنی دیر ہے۔ محمد علی نے کہا ابھی تک پورے اخبار کے لیے ٹائپ نہیں آسکا ہے۔

---

۵۱ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ایم۔ اے پاس تھے۔ لغت کے ماہر اور اعلیٰ پایہ کے مترجم تھے۔ شاعر بھی تھے۔ ناداں تخلص کرتے تھے۔ ان کے کلام میں حد درجہ حلاوت اور بے پناہ روانی ہے مشکل سے مشکل قافیوں پر انھیں عبور حاصل تھا جنھیں وہ بڑی خوبی سے شعر میں سمو دیتے تھے۔ ان کے کلام میں مثنوی کا اعلیٰ رنگ جھلکتا ہے۔ خوشی محمد ناظر کی نظم "جوگی" بہت مشہور ہوئی۔ انھوں نے بھی ایک تمثیلی نظم "جوگن" کہی تھی جو اپنے مخفی پلاٹ اور ظاہر اسلوب بیان میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مادہ تاریخ بڑا اچھا نکال لیتے تھے۔ اعداد نکالنے کے لیے نہ جمع کی ضرورت ہوتی نہ تفریق کی۔ حافظ پیران کی تصنیف "مطالعہ حافظ" اپنے زمانے میں بڑی مشہور ہوئی یکم جون ۱۹۴۵ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ شان الحق حقی ان کے فرزند ہیں۔ مؤلف

فرمانے لگے آج کل خبروں کی بہم رسانی کی سخت ضرورت ہے۔ اگر پورا اخبار نہ نکل سکے تو صفحہ دو صفحہ ہی کا نکال دیجئے۔ آمدنی بھی ہوگی اور پبلک کی خدمت بھی۔ محمد علی نے اس رائے کو پسند کیا اور ہمدرد کا وہ خاص سلسلہ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے جاری ہوا جسے عام طور پر نقیب ہمدرد کہتے تھے۔ یہ پرچہ روزانہ ایک ورق پر چھپتا اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔ ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء سے اسے چار صفحہ کا کیا گیا جو ۳۱ مئی ۱۹۱۳ء تک رہا۔ یکم جون ۱۹۱۳ء سے ہمدرد پورے آٹھ صفحے پر ٹائپ میں چھپنے لگا۔ جولائی ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کا قضیہ شروع ہوا۔ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں مسجد کانپور کے متعلق مقالۂ افتتاحیہ بھی ہے اور وہ مراسلت بھی جو محمد علی اور سر جیمس مسٹن میں مسجد کانپور کے متعلق ہوئی تھی۔

ڈاکٹر جانسن کے متعلق باسویل یا کہیں اور دیہات گانوں[له] میں کتاب کہاں ادیکھا تھا جس کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں ہے، کہ ایک دن کوٹھی کے برآمدے میں سر جوشو اور دوسرے دوستوں بلکہ نیازمندوں کے زمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ یکایک اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر سب نے انتظار کیا، اس کے بعد فکر ہوئی کہ یہ دفعتہً اٹھ کر کہاں گئے۔ مگر جانسن کے احباب جتنی ان سے محبت کرتے تھے اتنا ہی ڈرتے بھی تھے۔ لہٰذا دفعتہً اندر نہ گئے بلکہ باہر ہی سے کواڑ کے شیشوں سے جھانکنے لگے۔ دیکھا تو ڈاکٹر صاحب کمرے کے اندر اکیلے کودتے جاتے ہیں اور کھِلکھلا کھِلکھلا کر ہنستے جاتے ہیں۔ سب دبے پاؤں لوٹ آئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب بھی آگئے اور تو کسی کو ہمت نہ پڑی، باسویل نے جو بہت منہ چڑھے نیازمند تھے جسارت کر کے پوچھا کہ حضرت یہ کیا حرکت تھی۔ فرمانے لگے بھئی ایک بات یاد آگئی تھی جس سے طبیعت کو خوشی ہوئی، اور چونکہ ہم اپنے جذبات کو ضبط کرنا نہیں چاہتے، لہٰذا کمرے میں جا کر خوب ہنسے اور کودے۔ سب کے سامنے یہ حرکت اس لیے نہیں کی کہ تم کہتے جانسن پاگل ہوگیا۔

محمد علی مرحوم بھی جذبات کا مجموعہ تھے اور اسے خامی کہو یا خنگی کہ اکثر اوقات وہ اپنے

له زمینداری کے سلسلے میں سید صاحب دیہات میں مقیم تھے۔ وہیں یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ مؤلف

Marfat.com

جذبات کو ضبط نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے انبساطی اور انقباضی دونوں حالتوں میں دیکھا۔ اگر وہ اپنے جذبات کو ضبط کرتے بھی تو بڑی کوشش اور سخت طاقت کے ساتھ۔ آپ ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء والے خط میں دیکھیں گے کہ "خوشی میں خوب ناچا اور کودا اور رمنا (آمنہ دختر محمد علی) کو اس میں شریک کیا۔" آپ فرمائیں گے یہ محض مبالغہ اور استعارۃً لکھا ہے۔ شاید ایسا ہو۔ مگر میں نے واقعات دیکھے ہیں کہ وہ خوشی کی حالت میں بھی آپے سے باہر ہو گئے ہیں اور غصہ یا رنج کی حالت میں بھی۔ ایک مرقع پیش کرتا ہوں جس میں اتفاق سے دونوں منظر ایک ساتھ کھنچ گئے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں قیصر باغ میں جلسہ ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی کے متعلق (پنجابی ارباب صحافت کے محاورہ میں) "نرم" اور "گرم" جماعت میں تصادم آراد تھا۔ راجہ محمود آباد "نرم" جماعت کے قائد تھے۔ اور محمد علی "گرم" جماعت کے روح رواں۔ مگر شب درمیاں، صبح کو ان کی رائے میں "نرمی" آگئی۔ اس پر الہلال[۱] مرحوم نے "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے ایک دھواں دھار مضمون لکھا۔ جس میں (الہلال کی غیر موجودگی میں حافظہ پر بھروسہ کرکے لکھتا ہوں) شب تار اور تاراجِ متاع کا سماں باندھ کر آخر میں یہ چبھتا ہوا شعر لکھ دیا ؎

معشوقِ ما بہ مذہب ہر کس مطابق است[۲]

باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

محمد علی کہیں باہر گئے تھے۔ واپس آکر جب یہ مضمون دیکھا تو چونکہ (ان کے خیال سے) واقعات کو الٹ پھیر کرکے دکھایا گیا تھا لہٰذا غصے سے عجب حالت تھی۔ کہنے لگے۔ "محفوظ! اس کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ۔"

میں نہ شاعر ہوں نہ شعرا کے کلام کا حافظ۔ بھلا ایک منٹ میں شعر کیا بتا سکتا تھا، مگر ان کی حالت دیکھ کر کہہ دیا۔ "اچھا ابھی بتاتا ہوں"۔ اتفاق کی بات، سعدی کا ایک شعر ذہن میں آگیا۔ اگرچہ بہ تکلف مناسب موقع ہو سکتا تھا، مگر اس وقت اقتضائے مصلحت یہی تھا کہ شعر پڑھ دیا

۱؎ یعنی مولانا ابوالکلام آزاد، مدیر "الہلال" کلکتہ۔ مؤلف

۲؎ اصل مصرع یوں ہے ؏ معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است۔ مؤلف

Marfat.com

جائے۔ چنانچہ میں نے کہا ؎

برکفے جام شریعت، برکفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

یا تو وہ حالت تھی کہ غصے میں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے یا دفعتہً منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ مسکرائے ہنسے، قہقہہ لگایا، پھڑک اٹھے، اور جوش میں آکر مجھے گود میں اٹھا کر سارے ہال میں گھومتے پھرے۔ لاہور سے کسی جلسہ میں شرکت کی دعوت آئی تھی، جس کا جواب دفتر سے جا رہا تھا کہ کام کی کثرت کے باعث شرکت سے معذوری ہے۔ شعر سننے کے بعد فوراً حکم دیا کہ وہ جواب نہ دیا جائے بلکہ تار دیا جائے کہ آج شام کو چل کر کل لاہور پہنچوں گا۔ چنانچہ جلسے میں پہنچ کر دوران تقریر میں الہلال کے الزام کا نہایت مشرح، مسکت جواب دیا۔ اپنی بظاہر تبدیلی کی توجیہہ کی اور معشوق والا شعر پڑھ کر اس کے جواب میں سعدی کا شعر نہایت مزے لے کر پڑھا اور کہا ہم پر الزام دیا جاتا ہے کہ ہم نے دونوں فریق کا جی رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس طرح دونوں رائیوں میں تطابق کیا اور جام و سنداں کو لڑا کر ترنم پیدا کیا، ہر ہوسناک کا دماغ نہیں کہ اسے سمجھ بھی سکے۔

اس کے ساتھ ارادہ کی مضبوطی اور رائے کے استقلال کا یہ عالم تھا کہ جو بات غور و فکر کے بعد اپنے نزدیک صحیح سمجھ کر طے کرلی، پھر اس سے تجاوز کرنا بعید از امکان تھا۔ اس کی ایک مثال تو کامریڈ و ہمدرد کا اجرا ہے کہ کوڑی پاس نہیں، مگر اتنے بڑے کام کو شروع کر دیا دو اور مثالیں ذہن میں ہیں۔

(۱) کامریڈ کے دہلی آنے کے بعد ہی جب سیّد امیر علی اور سر آغا خاں کے بکری تار آنے شروع ہوئے کہ ترکوں کو لڑائی (جنگِ بلقان) میں سب سے زیادہ ضرورت طبی مدد کی ہے تو ڈاکٹر انصاری نے چاہا کہ وہ ہندوستان سے ایک طبی وفد لے جائیں اور لڑائی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرکے ترکوں کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ انھوں نے بطور خود ایک تخمینۂ اخراجات بھی تیار کیا اور سیّد امیر علی اور نیز اپنے ان ہندوستانی احباب (ڈاکٹر عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر فیضی وغیرہ)

Marfat.com

سے جو ولایت میں طبی تعلیم ختم کر چکے تھے اس بارے میں مراسلت کی۔ اسی دوران میں انھوں نے یہ تجویز محمد علی کے سامنے پیش کی، جسے محمد علی نے بہت پسند کیا اور ہر قسم کی مدد دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ دہلی میں ترکوں کی امداد کے لیے ایک انجمن ہلال احمر قائم ہوئی تھی۔ اس کے جلسے میں محمد علی نے اس تجویز کو پیش کیا۔ انجمن نے اتفاق کیا اور پندرہ ہزار کی رقم جو عثمانی کونسل جنرل مقیم بمبئی کو بھیج دی تھی، تار کے ذریعے واپس مانگی تاکہ طبی وفد کے اخراجات میں لگا دی جائے مگر دوسرے ہفتے کے جلسے میں اپنی رائے بدل دی اور طے کیا کہ ان کی رقم کونسل جنرل ہی کے ذریعے ترکی وزیر اعظم کی خدمت میں بھیج دی جائے۔ محمد علی نے بہت سمجھایا مگر جب دہلی والوں نے اپنی رائے میں تبدیلی نہ کی تو جلسے ہی میں مجھ سے پوچھا۔ "ہمارے پاس کتنی رقم ہے؟" میں نے کہا۔ "اتنے ہزار اتنے سو روپے"۔ کہنے لگے۔ "الحمد اللہ ہمارے پاس کافی رقم ہے۔ انصاری! میں نے طے کر لیا ہے کہ انشاء اللہ مشن جائے گا اور ضرور جائے گا۔ میرے پاس دس روپے ہوتے تب بھی ہمت نہ ہارتا۔ اور اسی دہلی سے بھیک شروع کر کے سارے ہندوستان سے رقم فراہم کرتا۔ اب تو خدا کے فضل سے اس قدر موجود ہے۔ تم اللہ کا نام لے کر انتظام کرو، رقم کی فراہمی میرے ذمے"۔

اسی رات کو اس عرب شاعر کی طرح جس نے اپنے لڑکے سے کہا تھا۔ یا ذلیلہ آج ذرا چراغ میں تیل زیادہ ڈال دینا۔ فلاں قبیلے کی ہجو لکھ کر تیار کرنا ہے" انھوں نے اپنے خدمت گار محمد حسین سے کہا۔ "جا کر میرے کمرے میں لیمپ تو جلا دے" (اس وقت تک بجلی کے تار کمروں میں نہ لگ سکے تھے) کمرے میں جا کر کامریڈ کے لیے مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے طبی مشن کے چندے کے لیے وہ دل ہلا دینے والی اپیل کی جس نے کامریڈ کے دفتر میں روپیوں کی بارش کر دی۔ کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے وصول ہوئے اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈروں اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے۔

(۲) لندن ٹائمس میں ایک مضمون "چوائس آف دی ٹرک" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں ترکوں کو دھمکیاں دے کر سمجھایا بلکہ حکم دیا گیا تھا کہ اس جنگ میں جو شروع ہوئی ہے غیر جانبدار رہیں ورنہ ان کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ اس زمانے میں بیگم محمد علی سخت علیل تھیں۔ محمد علی کو مریضہ کی تیمارداری میں رات رات بھر جاگتے گزرتی تھی۔ حکیم اجمل خاں صاحب (مرحوم) اور ڈاکٹر انصاری بار

Marfat.com

بار بار آ کر دیکھتے تھے۔ اسی حالت میں محمد علی نے ٹائمس ہی کے عنوان سے وہ مضمون لکھا جو ان کی زندگی کے دریا کا رخ بدل دینے والا ثابت ہوا۔ محمد علی کے مدراسی زود نویس (اسٹنو گرافر) مسٹر ایئر نے راجہ غلام حسین مرحوم سب اڈیٹر کامریڈ سے چپکے سے کہہ دیا کہ محمد علی صاحب ایک نہایت سخت اور تلخ مضمون لکھ رہے ہیں۔ راجہ مرحوم نے مضمون دیکھ کر حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ میری رائے نہیں کہ اس وقت ایسا مضمون شائع کیا جائے ڈاکٹر صاحب نے بھی مضمون پڑھ کر اور حکیم صاحب نے اس کا مطلب سن کر یہی رائے دی کہ مضمون اس وقت ہرگز نہ شائع کیا جائے، مگر محمد علی کب ماننے والے تھے۔ راجہ بے چارے نے گھبراہٹ میں مجھے بدایوں تار دیا کہ فوراً آؤ۔ میں پہنچا اور نرم الفاظ میں اپنی ہچکچاہٹ ظاہر کی رائے دی۔ مگر محمد علی نے ایک نہ سنی۔ جب میں نے زیادہ کہا تو کہنے لگے۔ "میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کیے ہیں، مگر اب میں رائے قائم کر چکا، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

محمد علی بالطبع سست نہ تھے، مگر کاہل ضرور تھے۔ وہ خود تو اپنے آپ کو کام چور کہتے تھے لیکن کام چور نہ تھے تو کام ٹال تو یقیناً تھے۔ منٹوں کا کام دنوں بلکہ ہفتوں نہیں کرتے تھے مگر جب کرنے پر آجاتے تھے تو ہفتوں کا کام منٹوں میں نہیں تو گھنٹوں میں تو ضرور کر ڈالتے تھے۔

دہلی آ کر کامریڈ کبھی وقت پر نہ نکلا۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد محمد علی پوری سنجیدگی اور سچی نیت کے ساتھ کام کرنے یعنی مضمون لکھنے بیٹھتے ہی تھے کہ چپراسی نے اطلاع کی فلاں صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہ صاحب آکر بیٹھے ہی تھے کہ سر فلاں بھی تشریف لے آئے۔ اب مجلس گرم ہو گئی۔ دوپہر ہو گئی۔ کبھی کھانے میں شریک ہوئے، کبھی ویسے ہی چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا شروع ہوا، کوئی سلسلہ چھڑ گیا تو سہ پہر کی چائے پر ختم ہوا۔ باہر جانے کا وقت ہوا۔ غالب کے الفاظ میں فلاں صاحب کا "ایک آنا دینا ہے"۔ تشریف لے گئے اور کھانے کے وقت واپس تشریف لائے۔ ہم غصے میں بھرے منہ تمتمائے بیٹھے ہیں۔ پہلے تو خیال نہ ہوا۔ پھر فرمانے لگے۔ "بھائی صاحب یہ آج مزاج کا پارہ کیوں چڑھا ہے۔ کسی نے زبان چلائی ہو زبان نکال لوں، آنکھ دکھائی ہو آنکھ پھوڑ دوں، ناک چڑھائی ہو ناک توڑ دوں، کان ہلائے ہوں کان کاٹ دوں" اب ہمارے ضبط کا پیالہ چھلک گیا اور جو کچھ منہ میں آیا بکنا شروع کیا۔ "محمد علی تم کاہل ہو یا توپی

بیکار ہو، کمپازیٹر اور پریس مین مفت کی تنخواہ پا رہے ہیں، تمہارا نقصان ہو رہا ہے، کامریڈ کے وقت پر نہ نکلنے سے بدنامی ہو رہی ہے۔ آخر اوور ٹائم دے کر پرچہ چھاپنا پڑے گا۔" اسی سلسلے میں زبان سے نکل گیا۔" کام وام تو کرتے نہیں، آرام کرسی پر پڑے انگڑائیاں لیتے رہتے ہو۔" انگڑائی" کا لفظ سنتے ہی کہنے لگے۔" بھائی ہمارا نظام رامپوری کہتا ہے، دیکھو کتنا بانکا شعر ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

ہائے ظالم نے کیا تصویر کھینچ دی ہے۔" ہم " بھاڑ میں جائے تمہارا نظام" کہتے ہوئے جلے بھنے اٹھ آئے اور اپنے کمرے میں جا کر سو رہے۔

صبح کو ناشتہ پر بلائے گئے۔" بھائی جان کچھ غصہ کم ہوا؟"۔ خاک کم ہوا۔ وصول کم ہوا اب ہم بدایوں جاتے ہیں۔" "بھائی خفا کیوں ہوتے ہو۔ یہ تو مضمون لو گے یا کسی کی جان" یہ کہہ کر ایک پلندا پھینک دیا۔ دیکھا تو کامریڈ کے پیپے" گپ" کا ایک نہایت ہی چٹپٹا دار مضمون تھا۔

کامریڈ کی ضبطی ضمانت کے سلسلے میں محمد علی نے دہلی کی عدالت میں خود بحث کی۔ دوران بحث میں دہلی کے وکیلوں اور بیرسٹروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ اور ہر شخص ہمہ تن گوش تقریر کا حرف حرف دل کے کانوں سے سن رہا تھا۔ باہر نکلے تو ہر ہندو مسلمان بیرسٹر کے منہ سے بیک وقت یہی جملہ نکلا۔" مسٹر محمد علی کاش آپ بیرسٹر ہوتے"! محمد علی نے جواب دیا۔" اب بھی جو کچھ ہوں اس کی کون سی قدر ہو رہی ہے جو بیرسٹری میں ہوتی۔"

صبح، لکھنؤ ——— محفوظ علی

الامان، دہلی، ۱۹ فروری ۱۹۳۱ء

العدل، بدایوں، ۲۶ فروری ۱۹۳۱ء

سرگزشت، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۳۱ء

ہمت، لکھنؤ، ۸ مارچ ۱۹۳۱ء

علی گڑھ میگزین، جنوری ۱۹۳۹ء

حصّۂ دوئم

طنز و مزاح

Marfat.com

حدیثِ دیگراں

(۶)

بہرحال ہم دہلی پہنچے۔ "ہمدرد" کی ادارت کے لیے مولوی عبدالحق سے مایوسی کے بعد ان کی نظر میر محفوظ علی پر گئی۔ وہ عرصے سے وعدہ کر رہے تھے۔ کبھی کبھی چند روز کے لیے آجاتے تھے پھر چلے جاتے تھے، مگر اس دفعہ ایسے گئے کہ نہ آتے ہیں نہ خط لکھتے ہیں۔ محمد علی نے مجھے حکم دیا "جاؤ محفوظ علی کو پکڑ لاؤ، بھاگ گیا ہے۔"

میں بدایوں پہنچا۔ اُدھر محمد علی کے تاروں کا تار بندھا ہوا تھا۔ ہر تار میں ملّاحیاں سناتے تھے اور تاکید کرتے تھے کہ فوراً آؤ۔ میر صاحب نے میری پذیرائی گرم جوشی سے کی۔ کئی پرتکلف دعوتیں کیں۔ پھر آبائی زمین کے سلسلے میں مقدمات کا ذکر فرمایا اور کہا ان سے فارغ ہوتے ہی دہلی کا رخ کروں گا۔ میں نے آکر محمد علی کو صورتِ احوال سے مطلع کر دیا۔

(علی برادران) ——— سیّد ہاشمی فرید آبادی

جب گورنمنٹ آف انڈیا کلکتہ چھوڑ کر دلّی آگئی اور دلّی پھر ایک بار سلطنت کی راجدھانی قرار پائی تو مولانا محمد علی بھی کلکتہ کا قیام ترک کر کے دلّی آگئے اور یہاں سے انھوں نے اردو کا ایک ہفتہ وار اخبار "ہمدرد" جاری کیا۔ اس میں سید صاحب بھی پکڑے گئے۔ اس میں ان کے بعض مزاحی مضمون نکلے جو لوگوں نے بڑے شوق سے پڑھے۔ مگر یہ جم کر دلّی میں نہ رہے۔ کسی نہ کسی ترکیب سے بدایوں جا پہنچتے۔ مولانا محمد علی بہت جھنجھلاتے، خط لکھتے، آدمی بھیجتے، مگر یہ مشکل سے ہاتھ آتے، جو کوئی انھیں "پکڑنے" جاتا اسے لطیفے اور حکایتیں سنا کر خوب خوش کرتے اور کہتے تم چلو میں ایک آدھ روز میں ضروری کام سے فارغ

ہو کر پہنچ جاؤں گا۔ عدالت میں صرف ایک پیشی کا کام رہ گیا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی مجھے پہنچا جانو۔

مضامینِ محفوظ علی ——— عبدالحق

کالم نویسی کی سب سے مشکل صنف مزاح نگاری ہے کیونکہ اس کے لیے جو اوصاف درکار ہیں ان میں بنیادی اہمیت طبعی میلان کو حاصل ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو تربیت سے سکھائی جا سکے۔

دوسرے اوصاف میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کالم نویس کو زبان و بیان پر انتہائی عبور حاصل ہو۔ کلاسیکی اور جدید ادب کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہو اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ سنجیدہ بات کا مضحک پہلو بھانپ سکے، اس پر تبصرہ کرے، مناسب اور دلچسپ تشبیہات اور تلمیحات سے اس پہلو کو اجاگر کرے اور ہو سکے تو تقابل سے بھی مضحک پہلو کو نمایاں تر کرے لیکن مضحک پہلو بھانپ لینا مشکل ہے اور اس کے بعد اسے نمایاں کرنے میں بھی طبعی میلان ضروری ہے۔ یہ نہ ہو تو تصنع پیدا ہوگا، اور تصنع مزاح کا قاتل ہے۔

مزاحیہ کالم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حالات حاضرہ کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے۔ یہ مقصد بھی ناجائز نہیں کہ اپنے سیاسی مخالفین کا مضحکہ اڑایا جائے، لیکن کوئی غلط بیانی نہ کی جائے، کسی کی دل آزاری نہ کی جائے۔ اس طرح مزاح پیدا کیا جائے کہ جو اس کا نشانہ ہو وہ بھی لطف اٹھائے۔

فنِ صحافت ——— عبدالسلام خورشید

سیّد محفوظ علی صاحب کے اگلے آٹھ مضمون "ہمدرد" کے مزاحیہ کالم "تجاہل عامیانہ" میں شائع ہوئے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اردو صحافت کالم نویسی کے فن سے تقریباً ناآشنا تھی۔ سیّد محفوظ علی نے اس صنف کی جانب توجّہ

کی۔ان کی مزاحیہ کالم نگاری کا اسلوب انگریزی اخبارات یا جرائد کے عائد کردہ معیار کا ہم پلہ ہے۔ اگر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے مندرجہ بالا اصولوں کو سمجھانے کے لیے مثالوں یا نمونوں کی ضرورت ہو تو سید محفوظ علی کے آٹھوں مضمون ہر پہلو سے ان پر پورے اترتے ہیں۔اس باب میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خیالات بھی ملاحظہ فرمایئے۔

———— مؤلف

مولانا محمد علی "کامریڈ" کا دفتر کلکتہ سے اور سید محفوظ علی کو بدایوں سے دلّی لائے۔ اس زمانے میں "ہمدرد" میں مضامین کا ایک سلسلہ "تجاہل عامیانہ" کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوا جس کے مصنف سید صاحب تھے۔ یہ مضامین اس زمانے میں اخباری طنز و ظرافت کا اعلیٰ نمونہ قرار دیئے گئے۔ مولانا محمد علی اور ولایت علی بمبوق کے مضامین دیکھنے کے لیے لوگ جس طرح "کامریڈ" کے لیے بیتاب رہتے تھے، "تجاہل عامیانہ" کے مطالعے اور پذیرائی کے لیے "ہمدرد" کے منتظر و مشتاق رہتے تھے۔ "تجاہل عامیانہ" میں اس زمانے کے سیاسی اور معاشرتی مسائل پر بڑی لطیف تنقید ہوتی تھی۔ "تجاہل عامیانہ" کی تقلید میں مدتوں مضامین لکھے گئے اور سید صاحب کا یہ تصرف عرصے تک ہمارے انشا پردازوں کے ذہن و قلم پر کارفرما رہا۔

گنجہائے گرانمایہ ———— رشید احمد صدیقی

محمد علی مرحوم نے جب "ہمدرد" نکالا تو دوسرے اچھے لکھنے والوں کے ساتھ ان (سید محفوظ علی) کو بھی اس اخبار میں زبردستی کھینچا۔ "تجاہل علمیانہ" کے نام سے علی گڑھ کے معاملات اور حاجی نواب اسحاق خاں مرحوم کے خلاف جو مزاحیہ مضمون نکلا کرتا تھا، وہ مرحوم (سید محفوظ علی) ہی کی

Marfat.com

جدتِ قلم کا نتیجہ تھا۔

یادِ رفتگان ——— سید سلیمان ندوی

مجتبیٰ صاحب آپ کی بجائے کام کر رہے ہیں مگر ایک دو زیادہ وزنی کام ہیں، ان کے سپرد نہیں کر سکتا۔ دوسرے وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ موجودہ تنخواہ سے زیادہ ہی کام ہے۔ سید ہاشمی ایک ہفتے سے آپ کا سخت منتظر ہے اور چونکہ "ہمدرد" کے تقریباً تمام کاروبار کا انحصار آپ کی ذات پر ہے، اس لیے اس کا وقت دراصل بے کار ہے اور رائیگاں جارہا ہے۔ تمام وہ خطوط رسل و رسائل آپ جو "ہمدرد" کے متعلق لکھتے لکھاتے ہیں، آپ کی تحت میں ہونے کی وجہ سے جوں کے توں پڑے ہیں۔

مکتوب ڈھاکہ ——— محمد علی جوہر

بنام سید محفوظ علی

۱۹ اگست ۱۹۱۲ء

خطوط محمد علی

سید محفوظ علی، "ہمدرد" کے منیجر ہی نہیں تھے بلکہ اکثر اس کے اداریے رقم فرماتے تھے اور "شذرات" کا کالم تو خود انھیں کے تخیل اور شوخیٔ طبع کی پیداوار تھا۔ بحیثیتِ مجموعی وہ "ہمدرد" کی "مشاطگی" کے ذمہ دار تھے۔ اس بارے میں مہدی افادی کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

——— مؤلف

جس طرح سانولی صورت جس میں نمک ہو ویسی مذاق ہے، رنگ کو گورا چٹا ہونا چاہیے، میں "ہمدرد" کو اس لیے پسند کرتا ہوں کہ یہ اپنی سج دھج اور خوش

وضعی کے ساتھ نک سک میں بھی اوروں سے مختلف ہے۔ یہی امتیاز اس کی روحِ رواں ہے۔ وہ کسی طرح مدِ معمولی میں نہیں آتا۔ اردو اخبار اتنا تو ہو کہ میز پر رکھتے ہوئے شرم نہ آئے۔

افاداتِ مہدی ــــــــــ مہدی افادی

"کامریڈ" اور "ہمدرد" کے قیام کے لیے سیّد محفوظ علی نے مولانا محمد علی کا ہاتھ بٹایا۔ ان کے مقالہ جات، سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں نے چاروں طرف خراجِ تحسین حاصل کیا۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں صرف وہ محمد علی سے ٹکر لیتے تھے۔

مولانا محمد علی ــــــــــ اللہ بخش یوسفی
(انگریزی)

Marfat.com

پر اسرار جلسہ

یکم اکتوبر کو بہت سے لوگ اسٹیشن پر اس امر کی ٹوہ لینے پہنچے کہ جلسہ کہاں ہوگا کیونکہ کئی خبریں اس کی نسبت مشہور تھیں۔ ایک تو یہ تھی کہ مسلمان ڈولینڈ ہوٹل میں ٹھہرائے جائیں گے اور جلسہ حکیم اجمل صاحب کے مکان میں ہوگا۔ دوسری یہ خبر تھی کہ ٹاؤن ہال میں ہوگا۔ تیسری خبر یہ تھی کہ روشن آرا باغ میں ہوگا اور چوتھی خبر یہ تھی کہ رام باغ میں ہوگا۔ لوگ بھٹکتے بھٹکتے اس تلاش میں پھرتے رہے تھے۔ وقت کے متعلق بھی پریشان تھے کہ کس وقت اور کہاں ہوگا۔

بالآخر بعض اصحاب کو معلوم ہوا کہ رام باغ میں بوقت گیارہ بجے یہ جلسہ شروع ہوگا۔ چنانچہ کچھ آدمی وہاں کی نیت سے چلے۔ حاضرین میں جو نواب صاحب رام پور کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے ایک کافی تعداد تھی۔

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے نواب صاحب رام پور تشریف لائے اور کرسیٔ صدارت پر متمکن ہوئے صاحب موصوف نے ایڈریس پڑھا۔ نواب صاحب کا ایڈریس نہایت معقول تھا۔ اس کے بعد آنربیل رضا علی صاحب نے ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا کہ میرے نزدیک اس جلسے میں بعض سچے قومی لیڈر، تمثیلاً نواب وقار الملک بہادر، راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ مدعو نہیں کیے گئے ہیں اور اس لیے اس جلسے کی کارروائی کو تمام مسلمانوں کی کارروائی نہیں سمجھنی چاہیئے اور نہ یہ جلسہ تمام مسلمانوں کی نیابت کرتا ہے۔ اس لیے میری رائے یہ بھی ہے کہ اس کی تمام کارروائی ملتوی کی جائے اور کسی دوسری تاریخ میں یہ جلسہ منعقد کیا جائے اور اس کی نسبت ایک باضابطہ نوٹس شائع کیا جائے اور تمام ہندوستان سے سربرآوردہ لوگ اس میں مدعو کیے جائیں۔

Marfat.com

اس کے بعد حامد علی خاں بیرسٹر کھڑے ہوئے اور انھوں نے فرمایا کہ میں نواب وقارالملک اور راجہ صاحب محمود آباد کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، مگر یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ جس جلسے میں یہ صاحبان نہ ہوں اس جلسے میں کوئی کارروائی بھی نہ کی جائے۔ یہ لوگ ہر جلسے کا دم چھلّا نہیں ہو سکتے۔ میں نہایت ایکسٹریمسٹ ہوں مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان لوگوں کا یا کسی کا مقلد بھی ہوں۔

اس کے بعد مسٹر اظہر علی وکیل لکھنؤ نے تقریر فرمائی اور مسٹر حامد علی خاں کی تقریر کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ درست نہیں ہے کہ جس جلسے میں تمام سربرآوردہ مسلمانوں کے ممبر نہ ہوں اس میں کوئی کارروائی کی جائے اور اس جلسے کو عام مسلمانوں کی آواز اور ان کی قسمت کا فیصلہ کہا جائے۔

اس کے بعد مسٹر محمد یعقوب وکیل نے ایک نہایت مدلل اور معقول تقریر کی جس میں فرمایا کہ میری رائے میں ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ حضور نواب صاحب جیسے والیان ملک ہمارے ان معاملات میں دخل دیں جن میں ہم بغیر ان کے کارروائی کر سکتے ہیں۔ یہ بہت قبل از وقت ہے کہ جلسہ نواب صاحب رامپور کی طرف سے منعقد کیا جائے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ جلسہ ملتوی کیا جائے۔

اس کے بعد سربلند جنگ حمید اللہ خاں بیرسٹر الہ آباد نے تقریر کی اور فرمایا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر راجہ محمود آباد اور نواب وقار الملک اس جلسے میں شریک نہیں کیے گئے ہیں تو اس جلسے میں کوئی کارروائی بھی نہ کی جائے ہم سب لوگ بھی قوم کے سربرآوردہ لیڈران میں سے ہیں اور اس امر کا حق رکھتے ہیں کہ جو مقاصد ہم لے کر یہاں جمع ہوئے ہیں ان پر فیصلہ کریں۔

ان صاحب کی تقریر نہایت لمبی چوڑی تھی۔ اس لیے تمام حاضرین گھبرا اٹھے۔ نواب سربلند جنگ کی تقریر نے حاضرین کو کچھ اس قدر اکتا دیا تھا کہ ہر شخص ایک دوسرے سے گفتگو کر رہا تھا، اور یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی میٹنگ ہو رہی ہے۔ اس قدر گڑبڑ شروع ہو گئی تھی کہ کمرے میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی

Marfat.com

اس دوران میں نواب سربلند جنگ بٹھا دیے گئے اور دو چار تقریریں بھی ہوگئیں جو کسی نے سنیں اور کسی نے نہیں سنیں۔ نواب مزمل اللہ خاں، کرنل عبدالحمید وغیرہ کی تقریریں اسی دوران میں ہوئی تھیں۔ اس لیے ہم ان کے سننے سے قاصر رہے۔

اس کے بعد آنریبل محمد شفیع نے ایک مختصر تقریر میں یہ بیان کیا کہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ سب صاحبان کا منشا بظاہر یہ ہے کہ ایک اور جلسہ اس کارروائی کے متعلق منعقد کیا جائے اور اس میں مختلف جگہ کے مسلمانوں کو مدعو کیا جائے۔ اس پر رضا علی صاحب نے فرمایا کہ اس کو رزولیوشن کی طرح پیش کیا جائے تو مناسب ہے۔ اس پر باجازت صاحب میر مجلس یہ رزولیوشن پیش کیا گیا۔

اب جھگڑا اس بات پر شروع ہوا کہ مدعو کون کرے اور داعی کس کو بنایا جائے۔ بہت سے اصحاب کی رائے تھی کہ نواب صاحب رام پور مدعو کریں۔ اس پر رضا علی صاحب نے فرمایا کہ نواب صاحب رام پور اور راجہ صاحب محمود آباد دونوں کی طرف سے بلاوے بھیجے جائیں۔ اس پر نواب صاحب رام پور نے فرمایا کہ میری رائے میں داعی ایک ہونا چاہیئے خواہ آپ لوگ راجہ صاحب محمود آباد کو بنائیں یا مجھے مقرر کردیں۔ میرے تعلقات راجہ صاحب محمود آباد سے بہت گہرے ہیں اور اگر آپ لوگ انھیں داعی بنائیں گے اور وہ مجھے مدعو کریں گے تو میں ضرور اس جلسے میں شریک ہوں گا۔ اس پر اظہر علی صاحب نے یہ بات پیش کی کہ اگر نواب صاحب رام پور راجہ صاحب محمود آباد کو اپنے ساتھ شریک کرنا نہیں چاہتے ہیں تو میں نواب وقار الملک بہادر کو پیش کرتا ہوں۔

اس وقت بھی کچھ ایسی گڑبڑ ہو رہی تھی کہ کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ۔ اس پر ایک دم نواب محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سیکرٹری علی گڑھ کالج کھڑے ہوئے اور وہ اس قدر غصے میں بھرے ہوئے تھے کہ باوجود نہایت تیز آواز کے

Marfat.com

ان کی تقریر کا اصل مفہوم سمجھنے سے لوگ قاصر تھے۔ جو دو ایک فقرے سمجھ میں آسکے وہ یہ تھے کہ اتنا بڑا آدمی تمھارے جلسے میں شریک ہوتا ہے اور تمھارے معاملات میں دلچسپی لیتا ہے اور تم لوگ اس طرح اس کی توہین کرتے ہو پھر نواب صاحب رام پور سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر یہ لوگ آپ کی نہیں سنتے ہیں تو بس آپ بھی تشریف لے چلیئے اور میں بھی چلتا ہوں۔ اس پر چونکہ رضا علی صاحب بھی بار بار کھڑے ہو کر کچھ فرماتے رہے تو آنریبل محمد شفیع اور حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب نے رضا علی صاحب سے کچھ کان میں گفتگو کی اور ان کو باہر علیحدہ لے گئے۔ اس کے بعد رضا علی صاحب پھر کمرے میں واپس آئے اور نواب محمد اسحٰق خاں صاحب سے ان کی غصّہ بھری تقریر میں مداخلت کرتے ہوئے جو برابر جاری تھی، یہ کہا کہ آپ مجھ سے علیحدگی میں ایک بات سن لیں اور یہ دونوں صاحب باہر چلے گئے اور پھر جب یہ صاحبان واپس آئے تو کسی نے یہ بات پیش کی کہ چلیئے فیصلہ ہو گیا کہ نواب صاحب رام پور پریذیڈنٹ اور داعی بنائے جائیں اور راجہ صاحب محمود آباد سیکرٹری۔

اس کی مخالفت عبدالعزیز صاحب منیجر "پیسہ اخبار" اور مولوی انشاءاللہ صاحب ایڈیٹر "وطن" نے کی اور نہایت جوش وخروش سے دونوں نے ہم زبان ہو کر کہا کہ ہم ہرگز اس بات کو منظور نہیں کریں گے اور ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر بالآخر غل غپاڑے کے بعد یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ نواب صاحب رام پور پریذیڈنٹ اور داعی بنائے جائیں اور راجہ صاحب محمود آباد سیکرٹری اور آئندہ بہت جلد کسی موقع پر جلسہ کیا جائے۔

اس کے بعد نواب صاحب رام پور باہر برامدے میں تشریف لے گئے جہاں کچھ کھانے پینے کا سامان نہایت سلیقے سے میزوں پر چنا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں کچھ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، اور آنریبل رضا علی صاحب، مسٹر محمد یعقوب صاحب نے اپنی موافقت کے دوش سردار بہادر صاحب سے

Marfat.com

لکھوائے اور سر بلند جنگ نے بھی فرمایا کہ میں جن جن باتوں کا مخالف رہا ہوں ان کو ضرور لکھوں گا۔

اسی عرصے میں "وطن" کے ایڈیٹر صاحب اپنے تیہے میں مغلوب میز پر جھپٹے اور ان کاغذات پر جن میں رزولیوشن لکھے گئے تھے اور ووٹس لکھنے میں سردار بہادر صاحب مصروف تھے "وطن" صاحب نے ہاتھ رکھ کر نہایت تحکمانہ لہجے میں پوچھا کہ ۔" جلسہ ختم ہو گیا ہے آپ کس قاعدے سے لکھ رہے ہیں؟ وہ بے چارے ہکا بکا ان کی صورت دیکھتے رہے اور آنکھوں آنکھوں میں تہذیب کی الف بے گو یاد دلا رہے تھے۔ مگر وطن صاحب نے کاغذات اٹھا لیے اور بالآخر اسے پھاڑنے لگے۔ مگر ایک تماشائی نوجوان نے ان کو چراغ پا کر دیا۔ پھر سب لوگ باہر برآمدے میں آئے اور ٹی پارٹی کا لطف اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

ہمدرد، دہلی —— نامہ نگار "ہمدرد"

۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء

دلی کے "پر اسرار" جلسے کا حال اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ سر سید رضا علی نے بھی اس جلسے کے بارے میں ایک رپورٹ "ہمدرد" میں درج کرائی۔ وہ اس جلسے میں ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ سید محفوظ علی نے اس جلسے کے شرکا اور اس کی کارروائی پر جو پھبتیاں "ہمدرد" کے فکاہی کالم" تجاہل عامیانہ" میں رقم فرمائی تھیں وہ ان کے اگلے مضمون میں ملاحظہ فرمایئے

سید صاحب نے اس مضمون میں چند افراد اور چند اخبارات کے نام پہیلیوں کے انداز میں پیش کیے ہیں۔ جس زمانے میں یہ مضمون شائع ہوا تھا اس وقت سمجھنے والے ان پہیلیوں کو آسانی سے بوجھ گئے تھے اور اس پردے میں جو معشوق پنہاں تھے انھیں پہچان گئے تھے۔ آج جب ان

Marfat.com

پہیلیوں کا اتا پتا وقت کی بھول بھلیوں میں کھویا جاچکا ہے، ان کی شرح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے:

(ل) جناب حاجی وفادار خاں معتمد جونام کے اعتبار سے ابراہیم صاحب کے خلفِ اکبر ہیں اور جنھیں کسی بڑے آدمی کی فرضی توہین پر بھی اس قدر جلد غصّہ آجاتا ہے کہ جلسۂ عام میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

مراد ہے خان بہادر حاجی نواب محمد اسحٰق خاں سے جو علی گڑھ کالج کے آنریری سیکرٹری تھے۔ یہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے فرزند اور نواب اسمٰعیل خاں مرحوم کے والد تھے۔

(ب) سابق آنریبل وحال حاجی جاں نثار خاں مدیر، جونام کے اعتبار سے ابراہیم صاحب کے خلفِ اصغر ہیں اور جو مرغیوں کی سوانح عمری لکھتے اور اخباروں میں وفاداری پر مضمون چھاپتے ہیں۔

حاجی نواب اسماعیل خاں شیروانی رئیس دتاولی، علی گڑھ تحریک کے حامی و مددگار، کچھ عرصے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مدیر رہے۔ معارف، افادہ اور العزیز پرچے نکالے کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں تربیت الدجاج خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۱۹۲۳ء میں آگرہ میں انتقال ہوا۔

(ج) منلیٰ نواب جن کا باوجود "بالسٹر" اور علما ہونے کے ٹرائی میں ہمیشہ سر بہت اونچا رہتا ہے۔

مسٹر حمید اللہ خاں صاحب سر بلند جنگ بیرسٹر الہ آباد سے مراد ہے

(د) گورنمنٹی نواب جو باوجود رئیس و جاگیردار ہونے کے کمل پوش ہیں

مراد خان بہادر نواب سر مزمل اللہ خاں والیٔ بھیکم پور علی گڑھ سے ہے یہ دولت مند ہونے کے باوجود بے حد

Marfat.com

سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور بہت ہی سادہ لباس پہنتے تھے۔

(۵) آنریبل خان بہادر بالسٹر جو پانچ ندیوں سے سینچے ہوئے باغِ وفا کا ادھ کچرا میوہ ہیں۔

مراد آنریبل خان بہادر میاں سر محمد شفیع، بیرسٹر پنجاب سے ہے۔

(۶) آنریبل حاجی نواب خاں جن کا سر تو سرخ ہے مگر چہرہ کسی اور رنگ کا ہے۔

سرخ کا ہم معنی لفظ "شہاب" ہے۔ مراد آنریبل سر شہاب الدین وکیل لاہور سے ہے جو پنجاب کی مجلس قانون ساز کے صدر اور لاہور کارپوریشن کے میئر بھی رہے۔ رنگ ان کا بہت کالا تھا۔

(۷) خان بہادر شیخ الرئیس جو اردو کو انگریزی میں بولتے ہیں۔

مراد خان بہادر نواب عبدالغفار آنریری مجسٹریٹ رئیس شیخوپور بدایوں سے ہے۔ ان کے بارے میں بدایوں میں مذاق میں کہا جاتا تھا کہ نواب صاحب اردو کو انگریزی میں بولتے ہیں۔ یہاں اشارہ ایک اور واقعے کی طرف بھی ہو سکتا ہے جو آنریبل راجہ سر محمد علی خان بہادر، کے سی آئی ای، والئ محمود آباد سے متعلق ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔ راجہ صاحب نے مسجد کانپور کے سلسلے میں مسلمانوں کے قائدین کے ایک وفد کی قیادت یو۔ پی کے لیفٹننٹ گورنر سر جیمس مسٹن کے روبرو گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ میں فرمائی۔

Marfat.com

مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی اس وفد میں شامل تھے۔ اصل خطبہ جو اوّلاً اردو میں تیار کیا گیا تھا اسے راجہ صاحب نے انگریزی میں ادا کیا تھا۔ سر جیمس کا جواب تو انگریزی میں ہوتا ہی تھا۔ اس کا ترجمہ اردو میں ان کے مترجم خان بہادر مولا بخش نے کیا تھا۔ یہ ۱۶ راگست ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے، یعنی "پراسرار جلسہ" سے تقریباً دو ماہ قبل۔

(ح) بالسٹر صاحب سابق متعلق کانگریس، حال مصنف کتاب طبیؔ

مسٹر حامد علی خاں، بیرسٹر، لکھنؤ سے مراد ہے۔ انھوں نے "پراسرار جلسہ" میں راجہ صاحب محمود آباد اور نواب وقار الملک کو جو جلسے میں موجود نہیں تھے "دم چھلا" کہہ دیا تھا۔

(ط) اخبار پول سیاہ

"پول سیاہ" فارسی میں "پیسہ" کو کہتے ہیں۔ مراد "پیسہ اخبار" سے ہے۔ اس اخبار کو منشی محبوب عالم نے ۱۸۸۷ء میں فیروز والہ ضلع گجرانوالہ سے ہفتہ وار جاری کیا۔ پھر یہ لاہور منتقل ہوا اور انیسویں صدی کے آخر میں روزنامہ بن گیا۔ اس اخبار سے مستقبل کے کئی جلیل القدر مدیر منسلک رہے۔ ان میں منشی محمد دین فوق مدیر "کشمیری میگزین" اور "پنجۂ فولاد" اور سید جالب دہلوی کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ "پیسہ اخبار" کے منیجر منشی عبدالعزیز "پراسرار جلسہ" میں موجود تھے۔

Marfat.com

(ی) اخبار مرزبوم

"مرزبوم" کے معنی "جنم بھوم" یا "وطن" کے ہیں۔ یہاں اخبار "وطن" لاہور سے مراد ہے۔ یہ ۱۹۰۲ء میں لاہور سے ہفت روزہ جاری ہوا اور ۱۹۱۵ء میں روزانہ ہوگیا۔ اس کے مدیر مولوی انشاء اللہ خاں تھے جو خود "پراسرار جلسہ" میں شریک تھے اور جنھوں نے اچھا خاصہ ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔

(ک) اخبار دو شاخہ

فارسی زبان میں "شاخ" "سینگ" کو کہتے ہیں اور سینگ کو عربی میں "قرن" کہتے ہیں۔ یہاں مراد بدایوں کے اخبار "ذوالقرنین" سے ہے۔ اس کے بانی، مالک اور مدیر مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی تھے جو مولانا حالی کے شاگرد تھے۔ یہ اخبار ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا تھا۔ نظامی صاحب کے بعد ان کے صاحبزادے مولوی احید الدین نے اسے چلایا اور یہ آج تک ہفتہ وار نکلتا ہے۔ نظامی صاحب کے کلام کا مجموعہ "تجلیاتِ سخن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

(ل) اخبارِ مخالفِ قبلہ

قبلہ مغرب میں ہے اور مغرب کا مخالف مشرق ہے۔ یہاں مراد اخبار "مشرق" گورکھپور سے ہے جسے حکیم برہم نکالتے تھے۔ حکیم صاحب اپنے زمانے کے کامیاب صحافیوں میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت ریاض خیرآبادی کے پرچے "ریاض الاخبار" اور "صلح کل" میں بھی کام کر چکے تھے۔ بعد میں خود اپنا اخبار "مشرق" نکالا۔ حکیم صاحب مولانا محمد علی جوہر سے زیادہ تر برہم رہے۔ یہاں مولوی عبدالحق کے الفاظ جو انھوں نے سید محفوظ علی کے بارے میں کہے یاد آتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "وہ اخباروں کا ذکر کرتے ہوئے اخبار "مشرق" کا نام نہیں لیتے بلکہ اسے اخبارِ مخالفِ قبلہ

Marfat.com

کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو لوگ اس وقت کے اس اخبار سے واقف ہیں وہ اس میں پر لطف خفیف طنز محسوس کریں گے۔

(۴) جن صاحب نے ہماری اردو میں خیال کی ہوئی تقریر کو انگریزی میں چھاپ دیا ان کے نام سے پایا جاتا ہے کہ وہ بم چھوڑا کرتے ہیں اور ترئی بجایا کرتے ہیں، کیا معنی کہ بمبوق ہیں۔

یہاں مراد بارہ بنکی کے وکیل ولایت علی سے ہے۔ یہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور مولانا محمد علی کے عزیز ترین رفقا میں سے تھے "بمبوق" کے نام سے کامریڈ میں "گپ" کا کالم اور دیگر مضامین بڑی پیاری انگریزی میں لکھتے تھے۔ ان کی شوخی اور بزلہ سنجی ذاتیات سے مبرا ہوتی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں ہیضہ کے عارضے میں تبیس ۳۲ سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہوئے۔ برصغیر کی تقسیم کا خیال پیش کرنے والوں میں یہ اولین کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔

سید محفوظ علی رعایت لفظی کے بادشاہ تھے اور یہی صفت ان کے یہاں کمال کو پہنچ کر ان کی تحریر میں پہیلیوں کا رنگ بھر دیتی ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں کے علاوہ خود ان کے فرضی ناموں میں بھی یہ چیستاں بازی اور شعبدہ طرازی موجود ہے جس کی تشریح میں "حرفِ آغاز" میں کر چکا ہوں۔ میرا قیاس تو یہ ہے کہ جو بچے ہوش مندی اور دانش وری کے عناصر اپنے خمیر اور جبلت میں لیے ہوئے اس دنیا میں آتے ہیں اور ان کا واسطہ شروع ہی میں کسی اللہ والے صوفی صافی سے پڑ جاتا ہے وہ بڑے ہو کر اپنی جذب کی کیفیت کا اظہار چیستاں گوئی کے انداز میں کرتے ہیں۔

سب سے پہلی مثال جو اس بارے میں ذہن میں آتی ہے وہ حضرت امیر خسروؒ کی ہے ان کا نام تو ابوالحسن تھا لیکن ان کی نیک سیرت ماں نے انھیں امیر خسرو کہہ کر پکارا۔ ان کی پیدائش کے بعد ہی جب ان کے والد خرقے میں ڈھانپ کر امیر خسرو کو

کسی مجذوب کے پاس لے گئے تو مجذوب نے دور ہی سے دیکھ کر کہا "یہ وہ بچہ ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا"۔ حضرت امیر خسروؒ نے فارسی شاعری میں جو مقام پیدا کیا وہ اظہر من الشمس ہے لیکن ان کی دقیقہ رسی اور چیستاں گوئی میں نہ جانے ان مجذوب کی توجہ کا کہاں تک دخل تھا۔

دوسری مثال حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی کی ہے۔ ان کا نام حبیب اللہ تجویز ہوا تھا لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جب اس بچے کے کان میں اذان دی تو ان کے منہ سے اس کا نام "مومن خاں" نکلا جس نے اصلی نام کو محو کر دیا معلوم نہیں کہ مومنؔ کے کلام میں جو پیچیدہ اور شعبدہ ساں اشعار ملتے ہیں ان کی تخلیق میں شاہ صاحب کی کرامات کا کس قدر عمل تھا مومنؔ کے اس رنگِ کلام کی نہایت دلچسپ مثال اس مادۂ تاریخ میں ملتی ہے جو مومنؔ نے خود شاہ صاحب کی وفات پر کہی تھی ؎

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

مصرعِ ثانی کے سارے الفاظ سے اول و آخر حروف نکال کر باقی کے اعداد کے مجموعے سے ۱۲۳۹ھ جو شاہ صاحب کا سالِ رحلت ہے صاف نکلتا ہے۔

خود سیّد محفوظ علی کو پیدائش کے بعد ہی شاہ دلدار علی مذاقؔ سے واسطہ پڑا جن کا ذکر پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ مذاق میاں بڑے عابدِ شب زندہ دار تھے اور ادب و شعر کے کوچے سے بھی گزر چکے تھے۔ ان گیروا پوش درویش سے بچے کے نام کے لیے التجا کی تو فرمایا "صرف محفوظ علی"۔ نہ جانے اس "صرف" میں کیا رازِ درون پردہ تھا اور ان بزرگ کی توجہ خاص نے اس بچے میں کیا جذب پیدا کر دیا جو چیستاں کے رنگ میں بعد میں ظاہر ہوتا رہا۔

یہ مسئلہ بجائے خود تفصیلی تحقیق کا متقاضی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس لیے اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔

_______ مؤلف

Marfat.com

غیر معمولی جلسہ

کیا نام کہ بڑا بھاری سرقہ ہوگیا۔ اور اگر سرقہ نہیں تو الہام ہوگیا۔ مگر چونکہ ہم اس کے قائل نہیں کہ انگریزی لکھنے پڑھنے والوں کو الہام ہوتا ہے اس لیے منطق کی رو سے سرقہ ہی ہوا۔ کیا معنی کہ ہم نے اپنے "خیال" میں یہ طے کرلیا تھا کہ آج کل جب ہر طرف جلسے ہو رہے ہیں چنانچہ بریلی میں جہاں کی میز کرسیاں اور مولوی ابوالکمال صاحب مشہور ہیں اور بمبئی میں جہاں حاجیوں کا مسافر خانہ اور مسلم لائل ایسوسی ایشن واقع ہے اور لندن میں جہاں منشی وزیر حسن اور منشی محمد علی اور زمیندار کے مدیر مسئول گئے ہوئے ہیں اور دہلی میں جہاں امیر خسرو رہتے تھے جن کی خالق باری مشہور ہے اور ایڈنبرا میں جہاں بہت سے مسلمان ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں اور پٹنہ میں جہاں مولوی خدا بخش خاں مرحوم کتابیں چھاپتے یا جمع کرتے تھے اور بدایوں میں جہاں کے پیڑے اور ملا عبدالقادر مشہور ہیں جنھوں نے اپنی کتاب میں اکبر بادشاہ کی ہجو لکھی ہے اور لکھنؤ جہاں کی چنگی نے ایک دفعہ کبابوں پر ٹیکس (جسے لائسنس کہتے ہیں) لگانا تجویز تھا اور کلکتے میں جہاں مولوی شبلی کی نظم ضبط ہوگئی یا ہونے والی تھی جلسے ہوتے اور دیگر مقامات میں بھی ہوتے اور ہو رہے ہیں جن میں لوگ تقریریں کرتے ہیں جو اخباروں میں چھاپی جاتی ہیں اور بعض تقریریں تو ایسی بھی چھپتی ہیں جن کا ایک لفظ بلکہ ایک حرف بھی کبھی زبان سے ادا نہیں کیا گیا تھا۔ جب ہر جگہ جلسے ہوگئے اور ہو رہے ہیں تو کیا وجہ کہ ہم بھی جلسہ نہ کریں۔ پس اندریں حالات ہم نے خیال کیا کہ ہم بھی جلسہ کریں۔ جسے انگریزی میں میٹنگ کہتے ہیں۔

ہم پہلے کسی موقع پر کہہ چکے ہیں کہ ہم خاں بہادروں اور خطاب داروں کو برا نہیں کہتے نہ برا جانتے ہیں۔ کیا معنی کہ یہ لوگ خطاب خود تھوڑا ہی چھین لیتے ہیں بلکہ صاحب لوگ اپنے حکم سے

دیتے ہیں جسے گزٹ کہتے ہیں اور صاحب لوگ بھی مفت نہیں دیتے بلکہ کسی شئے کی قیمت کے معاوضے میں دیتے ہیں چاہے وہ شئے وفاداری ہو یا نمک حلالی اور چاہے ایمان ہو یا ڈالی۔ بہرحال دیتے کسی شئے کی قیمت کے معاوضے میں ہیں اور ہر گاہ جو شئے کسی قیمت میں خریدی جائے وہ نہ سود ہے اور نہ رشوت بلکہ تجارت ہے اور تجارت کسی مذہب اور ملک میں بری نہیں۔ کیا معنی کہ صاحبان انگریز خود تجارت سے سلطنت پر فائز ہوتے ہیں۔ فلہٰذا ہم خطاب داروں کو برا نہیں سمجھتے بلکہ تاجر جانتے ہیں۔ اس لیے ہمارا ارادہ تھا کہ تمام "سی عیسائی" "سیاہی ای" "خان بہادر" "خان صاحب" اور دیگر خرد و کلاں خطاب داران زمانۂ ماضی وحال واستقبال و مضارع بلکہ احتمالی و تمنائی تک کو مدعو کریں اور ان اخباروں کے مدیرین مسئول اور محررین خصوصی کو بھی دعوت دیں جن کی نسبت ہمیں یقین تھا کہ ہماری دعوت کو باعثِ امتیاز و افتخار سمجھیں گے۔ اور ہر پہلو سے جلسے کی خواہ مخواہ تعریف و توصیف ہی کریں گے اور جلسے میں اگر کچھ خرابی ہوئی تو ہرگز ظاہر نہیں کریں گے اور نیز کے انعقاد کی خبر اپنے ناظرین اخبار کو پہلے سے نہ دیں گے چاہے یہ ان کا کتنا ہی اہم اخلاقی فرض کیوں نہ ہو۔ جن خطاب داروں اور بڑے آدمیوں کو ہم بلانے والے تھے ان میں سے چند چوٹی کے آدمیوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ جناب حاجی وفادار خاں معتمد۔ جو نام کے اعتبار سے ابراہیم صاحب کے خلف اکبر[۱] ہیں اور جنھیں کسی بڑے آدمی کی فرضی و خیالی توہین پر بھی اس قدر جلد غصہ آجاتا ہے کہ جلسۂ عام میں آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔

۲۔ سابق آنریبل وحال نواب حاجی، جاں نثار خاں مدیر۔ جو نام کے اعتبار سے ابراہیم صاحب کے خلف اصغر[۲] ہیں اور جو مرغیوں کی سوانح عمری لکھتے اور اخباروں میں وفاداری پر مضمون چھاپتے ہیں۔

۳۔ مغلئی نواب جن کا باوجود "بالسٹر" اور "علما" ہونے کے لڑائی میں ہمیشہ صر

---

[۱] یہ سہو قلم معلوم ہوتا ہے۔ "اکبر" کی جگہ "اصغر" ہونا چاہیے ـــــــ مؤلف

[۲] "اصغر" کی جگہ "اکبر" ہونا چاہیئے۔ ـــــــ مؤلف

Marfat.com

بہت اُونچا رہتا ہے۔

۴۔ گورنمنٹی نواب جو باوجود رئیس وجاگیردار ہونے کے "کمل پوش" ہیں۔

۵۔ آنریبل خان بہادر بالسٹر جو پانچ ندیوں سے سینچے ہوتے باغِ دغا کا ادھ کچرا میوہ ہیں۔

۶۔ آنریبل حاجی نواب خاں جن کا سر تو سرخ ہے مگر چہرہ کسی اور رنگ کا ہے

۷۔ خان بہادر شیخ الرئیس جو اردو کو انگریزی میں بولتے ہیں۔

۸۔ بالسٹر صاحب سابق متعلق کانگریس وحال مصنّف کتاب طلبی جو باوجود ایک سطری مست ہونے کے راجہ سر محمود آباد کو "دُم" اور نواب وقار الملک کو "چھلا" جس کے معنی چھل والا یعنی فریبی یا انگلی میں پہننے کی گول مول چیز ہیں بتاتے ہیں۔ حالانکہ نواب صاحب کسی معنی میں چھلا نہیں ہو سکتے۔

جن اخباروں کے مدیرین مسئول کو ہم دعوت دینے والے تھے ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ اخبار پول سیاہ

۲۔ اخبار مرز بوم

۳۔ اخبار دو شاخہ

۴۔ اخبار مخالفِ قبلہ

ہم نے جلسے کا اپنے "خیال" میں سب انتظام سوچ لیا تھا کہ نواب حاجی وفادار خاں اور ان کے رُفقا نے ہمارا "خیال" چرا لیا۔ اور ایک دوسرے صاحب نے جنھیں ہم اس جلسے میں بلانے والے نہ تھے ہماری وہ تقریر جو ہم جلسے میں کرنے والے تھے اور جسے ہم نے اپنے دماغ میں اردو میں تصنیف بھی کر لیا تھا۔ انگریزی میں چرا کر ۴ر اکتوبر کے کیانام اخبار "کامریڈ" میں اپنے کوچۂ چیلان واقع ہندوستان سے منشی محمد علی جو ولایت میں ہیں چھاپ کر شائع کرتے ہیں اگرچہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جب منشی محمد علی "ہمدرد" کو ہر روز اور "کامریڈ" کو ہر ہفتہ کوچۂ چیلاں میں چھاپتے اور شائع کرتے ہیں۔ جیسا کہ دونوں اخباروں کے آخری صفحے کے نیچے لکھی ہوئی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے تو وہ ولایت میں جسے انگریزی میں لندن کہتے ہیں کیسے موجود ہو سکتے ہیں فلہذا

Marfat.com

منشی محمد علی کوچۂ چیلاں ہی میں موجود ہیں) صفحہ ۲۳۷ پر چھاپ دی. جن صاحب نے ہماری اردو میں خیال کی ہوئی تقریر کو انگریزی میں چھاپ دیا ان کے نام سے پایا جاتا ہے کہ وہ بم چھوڑا کرتے اور ترئی بجایا کرتے ہیں۔ کیا معنی کہ بم بوق ہیں۔

غلہذا ہمیں بہت افسوس ہے کہ اتنا بڑا سرقہ ہوگیا اور جب ہم تھانے میں رپٹ لکھانے اور استغاثہ کرنے گئے تو تھانے والوں نے رپٹ نہ لکھی اور مال مسروقہ کی ملکیت کا ثبوت مانگا اور کہا کہ پہلے یہ ثابت کرو کہ یہ خیال پہلے تمھارے دماغ میں آیا تھا۔ ہم ثبوت نہ دے سکے اس لیے نکال دیئے گئے

اب ہم یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ہم سب ممبر آپس میں چندہ کر کے ایک "آلۂ صوت نویس" اور ایک "آلۂ خیال نویس" خریدیں. ہمیں معلوم ہے کہ "آلۂ صوت نویس" ایجاد ہو چکا ہے جو چاندنی چوک میں بکتا ہے اور جسے انگریزی میں کیا نام کہ "فونی گراف" یا گرامیفون" کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ ابھی تک آلۂ خیال نویس بھی ایجاد ہو چکا ہے یا نہیں اور اسے انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔ اگر ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے تو ہم کیا نام ڈاکٹر انصاری احمد کو جو قسطنطنیہ کی لڑائی میں ہو آتے ہیں لکھیں گے کہ آلۂ موصوف الصدر کو بہ سرعت ممکنہ ایجاد کرادیں۔ اس آلے کا یہ فائدہ ہوگا کہ ہمارے دل میں جو آیندہ خیال آیا کرے گا وہ فوراً لکھا جائے گا۔ اس کے بعد اگر پولیس ہم سے ثبوت مانگے گی تو ہم پیش کردیں گے۔ آلۂ صوت نویس کا یہ فائدہ ہوگا کہ جو ممبر تقریر کرے گا۔ اس آلے کے اندر منقوش ہو جایا کرے گی اور پھر محکمۂ "سیاسی" کے کسی نوکر کو موقع نہ ملے گا کہ تقریر کو غلط سلط نوٹ کرے مگر اس میں لفظ کا تلفظ لکھ جایا کرے گا۔ املا اور معنی نہیں لکھے جائیں گے۔ حالانکہ املا اور معنی ضروری چیزیں ہیں جن کے نہ ہونے سے "محکمۂ سیاسی" والوں کو غلطی ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک محکمۂ سیاسی والے نے لفظ "محفوظ" کو "مہفوز" لکھا تھا۔ جب اس سے معنی پوچھے گئے تو اس نے کہا "شاید اس کے معنی خطرناک کے ہیں"۔ اس پر ایک شخص نے کہا تھا کہ "اسم اور مسمیٰ تو دونوں بے ضرر اور بے خطر ہیں۔ پھر خطرناکی کہاں سے آئی"۔

امر واقع کو پیش نظر رکھ کر ہمیں چاہیئے کہ سرکار کو لکھیں کہ محکمۂ سیاسی میں جو نوکر رکھے جائیں انھیں کم ازکم غیاث اللغت اور چیمبرس ڈکشنری تو حفظ یاد ہونی چاہیئے۔

حاجی صاحب کی تقریر ختم ہونے پر ذیل کے رزولیوشن پیش اور پاس ہوئے۔

Marfat.com

زمانۂ ماضی میں ایک لڑائی نواحِ دہلی میں درمیان کورو اور پانڈو یعنی علم اور جہل کی ہوئی تھی جس میں علم نے جہل پر فتح پائی اور جس کے حالات کتاب مہا بھارت میں درج ہیں۔ زمانۂ حال میں بھی ایک لڑائی نواحِ دہلی میں درمیان غریبوں اور رئیسوں یعنی صدق و کذب کے ہوئی۔ جس میں صدق نے کذب پر فتح پائی۔ چونکہ ازبس ضروری ہے کہ اس آخری لڑائی کے حالات بھی کسی نظم رزمیہ میں منتظم اور منضبط ہوں اور یہ نظم اس پایہ کی ہو کہ ہومر کی ایلیڈ ورجل کی اینڈ ویاس کی مہابھارت۔ والمکی کی رامائن اور فردوسی کے شاہنامہ کے پہلو بہ پہلو جگہ پا سکے۔ لہٰذا یہ جلسہ عام اشتہار دیتا ہے کہ جو شاعر خواہ وہ کسی اقلیم اور کسی ملک کا باشندہ ہو اور دنیا کی کسی زبان کا ناظم ہو اس لڑائی کے حالات بہترین پیرایے میں نظم کر دے۔ اس کی خدمت میں بہ حساب فی شعر ایک سکہ نِکل صلہ پیش کیا جائے گا۔

محرک ——— ملا علی کاتب بودھاموی

مؤید ——— آغا صادق لنگرانی

(۲)

آنریبل سید رضا علی بی۔ اے ال ال۔ بی وکیل ہائیکورٹ چونکہ مجالس و مجامع کی کالسکہ رواں میں سنگریزہ اندازی کے عادی ہو گئے ہیں یعنی بعض مجالسِ سرکاری میں بیٹھ کر بلاخطر چشم نمائی اور بکمال شجاعت و بے جگری سوالاتِ طویل و عریض کا ایسا سلسلہ لامتناہی چھیڑ دیتے ہیں جو ارباب حل و عقد کے سوئے مزاج کا باعث ہوتا ہے اور بعض مجامع نیم سرکاری میں بطور مہمان ناطلبیدہ پہنچ کر بلا خوف لومۃ ولائم اور بکمال شوخ چشمی و خیرہ سری ایسا بیان مبہم فرماتے ہیں جو لیڈرانِ مقتدر کے اشتعالِ طبع فوری کا سبب ہوتا ہے۔ لہٰذا جلسۂ ہذا سرکار سے ملتجی ہے کہ آنریبل ممدوح کو عبرتاً و تادیباً کسی اسلامی دارالعلوم کا سیکرٹری یا کسی ہندو ریاست کا مدارالمہام بنا دیا جائے۔ تاکہ موصوف الصدر کی قرار واقعی دھان دوزی اور کما حقہ زبان بندی ہو جائے۔

محرک ——— پروفیسر قطرب

مؤید ——— قاضی رطلبوتی

Marfat.com

(۳)

یہ جلسہ اڈیٹر صاحبان "ہمدرد" سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے "پروف ریڈر" کو ہدایت فرمادیں کہ وہ ناظرینِ اخبار کے حواس خمسہ اندرونی و بیرونی پر رحم فرمادیں اور بیّن اور فاش غلطیوں کو درست کردیا کریں۔ اگر پروف ریڈر صاحب اس ہدایت کے بعد بھی نہ مانیں تو رسائل طغراء کا فقرہ ذیل (بادنےٰ تصرف) ان سے ساٹھ مرتبہ لکھوایا جائے۔"

دریں اخبار مصحح را زیادہ از اڈیٹران دخل است"!

محرک ——— آغا صادق لنگرانی

موئید ——— لالہ خوش وقت رائے

رویداد جلسہ محررہ فقیر حقیر ملّا علی کاتب بودھا مئوی۔ حسب الحکم جناب حاجی صاحب صدر جلسۂ تجاہل عامیانہ۔

ہمدرد، دہلی ——— ملّا علی کاتب بودھا مئوی

کاروائی جلسہ

یکم نومبر کو رات کے بارہ پر دو بجے ایک عظیم الشان جلسہ صدر دار الجہل میں منعقد ہوا۔ چونکہ اکثر عہدیداران سرکاری کی آمد کا خیال تھا لہٰذا نشست کے لیے فرش بےبہائے بوریا کا اہتمام کیا گیا۔ صدر انجمن کے لیے ایک کمبل سیاہ ساختۂ مشت پشم از پشت میش قیمتی ایک روپیہ بچھایا گیا۔ اس پر کھاروے کے غلاف کا ایک تکیہ جس میں تراشۂ کامریڈ بھرا تھا رکھا گیا۔ روشنی کے لیے صدر انجمن کے پیچھے ایک مشعلچی کھڑا کیا گیا جس کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں تیل کی کپّی تھی۔ وسط جلسہ میں کہیں چیکٹ اور زنگ لگے برنجی فتیلہ سوز اور کہیں تیل میں بھیگے بنولے مٹی کے پیالوں میں بھرے قرینے سے جا بجا رکھے تھے۔ جب یہ مشعل اور چراغ روشن ہوئے تو سارا ہال بقعہ نور بن گیا اور روغن سرشف کی بوئے عنبر بیز مشام جان کو معطر کرنے لگی۔ ٹھیک دو بجے جناب حاجی صاحب مع اپنے عرف و لقب کے زینت بخش گلیم صدارت ہوئے اور ہائے و ہو کے شور و شغب کے درمیان

Marfat.com

انھوں نے تقریر ذیل شروع کی ۔

کیا نام گورنمنٹ آف انڈیا جسے لاٹ صاحب کا دفتر کہتے ہیں۔ یہاں آگیا یا اب آنے والا ہے۔ فلہٰذا جلسۂ تجاہل کی رونق بڑھ جائے گی اور اکثر جلسے ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم کیا نام قانون اخفائے واردات کے ڈر سے اکثر جلسوں کے حالات شائع نہ کریں۔ کیا نام ہم ان گورمنٹی صاحبوں کے ممنون ہیں جو اس واسطے یہاں آئے ہیں کہ جلسۂ تجاہل میں شریک ہوکر اپنے علم میں اضافہ کریں۔ آج کے جلسے میں دو باتیں ہیں جن سے ہم اسے ذو وجہین سمجھیں گے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آج کی تاریخ ذوشہرین ہے۔ کیا معنی کہ آج شمسی قمری مہینے بغلگیر بلکہ مدغم ہوتے ہیں یعنی یہ کہ آج نومبر کی پہلی ہے اور ذی الحجہ کی بھی پہلی۔ فلہٰذا دونوں مہینے مدغم ہو گئے۔ جیسا کہ ہم نے ثابت کردیا۔ دوسری یہ بات کہ آج جو صاحب تقریر کریں گے وہ ذو مذہبین ہیں کیا معنی کہ پروفیسر قطرب صاحب جیسا کہ خود ان کے بیان سے مستنبط ہوتا ہے چھ مہینے مسلمان رہتے ہیں اور چھ مہینے ہندو۔ فلہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ان کا تعارف کرادیں جسے انگریزی میں "عنتر ڈیوٹ" کہتے ہیں کس واسطے کہ جلسۂ تجاہل میں ماورا ان اصحاب کے جو پہلے سے اعضائے تجاہل ہیں۔ آج بہت سے نئے صاحبان آئے ہیں جو بڑے لاٹ صاحب اور چھوٹے لاٹ صاحب کے دفتر میں چپراسی سے لے کر سکتر تک ہیں جنھیں حیدرآباد میں معتمد کہتے ہیں۔ پس اندریں حالات لابد آیا کہ ہم پروفیسر قطرب کا "عنتر ڈیوٹ" کردیں کیونکہ کسی عقلا کا قول ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ کیا نام پروفیسر قطرب میں ایک برائی ہے جسے ہم پہلے کہے دیتے ہیں۔ کیونکہ کوئی ہم پر بزبان مستقبل بصیغۂ واحد غائب حرف گیری نہ کرنے پائے اور اگر کرے تو باطل ہوا اور وہ برائی یہ ہے وھو ہذا۔

"یعنی وہ ڈاڑھی منڈاتے ہیں۔ واضح ہو کہ ڈاڑھی منڈانا اگرچہ فعل متعدی ہے تاہم اس میں فعل لازمی بھی شامل ہے۔ جیسے قانون میں ذکور میں مونث بھی شامل ہوتا ہے یعنی یہ کہ وہ ڈاڑھی کبھی حجام سے منڈواتے ہیں اور کبھی خود بھی مونڈ لیتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں پر غصہ آتا ہے اور کبھی ہنسی بھی آتی ہے جو ڈاڑھی منڈاتے ہیں اور اس کے ساتھ کالر اور گلوبند بھی لگاتے ہیں۔ کیا معنی کہ اگر کالر اور گلوبند سے یہی غرض ہے کہ سردی میں اپنے گلے کی حفاظت

کریں اور پسینے یا میل سے کوٹ یا شیروانی کے گلے کو بچائیں تو ڈاڑھی ان خدمات کو بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ یعنی جب کوٹ یا شیروانی پہننی چاہیں تو پہلے ڈاڑھی کو کنگھی یا انگلیوں سے خوب پھیلالیں اور اپنے گلے پر اس طرح بچھالیں جیسے چھپر پر گھاس بچھاتے ہیں۔ اس کے بعد کوٹ یا شیروانی پہن کر گلے کا بٹن یا ہک جلدی سے اس طرح لگالیں کہ ڈاڑھی اندر ہی دب کر رہ جائے۔ اس طریقے سے نہ جاڑوں میں گلے کو ہوا اور سردی لگے گی۔ نہ گرمیوں میں پسینہ یا میل سے کوٹ یا شیروانی کا گلہ خراب ہوگا۔ یہ اسراف ہے کہ ہم اپنی ڈاڑھی کو جو خاص حیوان ناطق کی اون ہے بیکار پھینک دیں۔ اور بھیڑ بلکہ گدھے بلکہ کتے اور خدا جانے کس جانور کا ہو صرف مجہول کو گلے لگائے پھریں جو بالکل بے ہودہ بات ہے۔ ہمارا یہ جبہ جو تم ہمارے جسم پر دیکھ رہے ہو ہم نے اپنی ڈاڑھی کے ان بالوں کو تراش کر بنوایا ہے جو کمشت دو انگشت سے زیادہ تھی۔ فلہذا ہم نے ثابت کر دیا کہ ڈاڑھی منڈانا علم الاقتصاد کی رو سے فضول خرچی میں داخل ہے اور فضول خرچی چاہے وہ بلل برابر ہی کیوں نہ ہو بری بات ہے ہم نے منشی شوکت علی رامپوری۔ تم الکوچہ چیلانی سے جو علی گڑھ کی "مجلس اطفال کہنہ" کے معتمد ہیں یہی بحث کی تھی اور یہی کہا تھا کہ جب آپ روئی کا کاروبار کرتے ہیں جو اون کی ہم زلف ہے تو ڈاڑھی کو جو خود اون ہے ضائع کرنا یعنی چہ۔ پس اس پر انھوں نے ڈاڑھی چھوڑ دی۔ ڈاڑھی رکھنے میں اکیلا ایک یہی نفع نہیں کہ آدمی فضول خرچی سے بچ جاتا ہے جیسا کہ منشی محمد علی نے رجو منشی شوکت علی کے بھائی حقیقی ہوتے ہیں۔ اور جو کہ ڈاڑھی کی کاشت اور نگہداشت میں اپنے بھائی سے سر مو کم نہیں ہیں) ایک موقع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میں ڈاڑھی دار تھا اور میرا رفیق شرمیلا لہذا ہم پر گمان فضول خرچی بے جا ہے" بلکہ اور بھی بہت سے خفیہ اور علانیہ فائدے ہیں جنھیں ہم پھر کبھی مو بہ مو بتائیں گے بلکہ ایک انجمن بنام "مجلس دفاع لحیہ" بنانے والے ہیں جس کا صدر انجمن منشی عبداللہ جان صاحب کو بنائیں گے۔ اس میں ڈاڑھی کے متعلق بڑی بڑی موشگافیاں کریں گے۔ دریں ولا ہم پروفیسر قطرب کا "عنتر دیوث" بیان کرتے ہیں و ہو ہذا۔ یعنی یہ کہ وہ مدرسہ مسلمانان علی گڑھ اور ہندو کالج بنارس میں جملہ علوم و فنون مثلاً کیمیا و ریمیا و سیمیا و اقلیمیا و قدیمیا و سرسیا پڑھ کر ولایت گئے جسے انگریزی میں لندن

کہتے ہیں اور جہاں حال ہی میں منشی سر آغا خاں و منشی امیر علی و منشی وزیر حسن صاحبان میں درباب مسلم لیگ (جو کانگریس کی بنتِ عم ہے) کچھ گفت و شنید ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے۔ لندن جا کر پروفیسر قطرب نے مختلف السنہ مثلاً جرمنی (جہاں ڈاکٹر ضیاء الدین پڑھتے تھے) اور فرانسیسی (جہاں اخلاقاً ہر شخص زیادہ سے زیادہ دو بچے پیدا کر سکتا ہے) اور بنگالی (جو بندے ماترم کا وعظ کہا کرتے تھے جس پر شاید سرکار خفا ہو گئی تھی) اور چینی (جو چانڈو اور افیوم چھوڑنے کا اب ارادہ کر رہے ہیں جو خدا جانے کتنی صدیوں میں ہو پاتے گا) اور سمرقندی (جسے ایک دفعہ خواجہ حافظ صاحب کسی ہم کے بدلے ایک شیرازی لڑکے کو بخشنے والے تھے) اور طبقات الارض اور علاج مویشیان اور کسور اعشاریہ اور مقیاس الحرارت اور جرِ ثقیل اور گرامیفون اور موٹر کار وغیرہ سیکھ کر بی۔ اے پاس اور مڈل پاس کا امتحان دیا اور واپس آئے اور پھر سیاحی کے لیے ہردوا گنج اور سداما گنج اور دار جلنگ اور یوگنڈہ اور جزیرہ فلفل سیاہ اور کالکا دیوی اور کمسکٹکا اور جابلسا اور جابلقا اور کالے پانی تک ہو آئے اور اب دار الحکومت کے بین الاقوامی کالج کے پروفیسر ہیں اور ہمارے تجاہل عامیانہ کے ممبر ہیں۔ ختم شد واللہ اعلم بالصواب۔

مکرر آں کہ پروفیسر قطرب میں ایک اور برائی ہے اور وہ بھی ہم یہاں لکھے دیتے ہیں وھو ہذا۔ یعنی یہ کہ وہ جلسے میں تقریریں لمبی کرتے ہیں اور سارا وقت کیا نام تو طیہ و تمہید و مخلص و تشبیب ہی میں صرف کر دیتے ہیں۔ ہم نے اس لیے ان سے کہہ دیا ہے کہ اگر انھوں نے بہت جلد اپنی تقریر ختم نہ کر دی تو ہم اپنے حکم سے کہ کیا نام اس جلسے کے صدر انجمن ہیں جسے انگریزی میں پریزیڈنٹ کہتے ہیں سارے چراغ یک دم گل کرا دیں گے والسلام خیر ختام۔

مکرر ثانی آں کہ ہماری یہ تقریر جسے انگریزی میں اسپیچ کہتے ہیں اور کبھی کبھی لیکچر بھی کہتے ہیں۔ کل اخباروں کے مدیرین و مسئولین اور محررین خصوصی نہایت غور کے ساتھ پڑھیں اور پروفیسر قطرب کی تقریر پر نوٹ کریں ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے۔ اور کیا نام پریس ایکٹ کی سختیاں دور کرنے کے لیے سرکار دربار میں ابداً سفارش نہ کریں گے جو ہم عنقریب کرنے والے ہیں۔ زیادہ چہ عرض نمودہ آید۔

مکرر ثالث آں کہ اگر مدیرین مسئول ہماری یا پروفیسر قطرب کی تقریر نقل کرنی چاہیں تو

Marfat.com

ہم ان پر سرقہ بالجبر کا الزام نہیں لگائیں گے۔ چونکہ بالفعل ان تقریروں کا حق تالیف محفوظ نہیں کیا ہے۔ وتمت بالخیر۔"

حاجی صاحب کی تقریر ختم ہوتے ہی ہائے وہو کا غلغلہ پھر بلند ہوا جس کے فرو ہونے سے پہلے پروفیسر قطرب جو ایک نہایت وجیہہ وشکیل وعریض وطویل نوجوان ہیں تقریر کرنے کھڑے ہو گئے۔ ان کی تقریر کو آغا صادق نگرانی اردو شارٹ ہینڈ میں حرفاً حرفاً نوٹ کرتے گئے جسے آغائے موصوف نے خوشخط لکھ کر مرحمت فرمایا ہے۔

نوشتہ قلم کا واک رقم فقیر حقیر ملا علی کاتب بودھا متوی۔

ہمدرد، دہلی ———— ملا علی کاتب بودھا متوی

حدیثِ دیگراں

(۷)

مہدی افادی اور محفوظ علی بدایونی نے اگرچہ مزاح نگاری کے میدان میں سنجیدگی سے قدم نہیں رکھا تاہم ان کی انشا میں مزاح کی ایک باریک سی درخشندہ لکیر "اودھ پنچ" کے بلند اور خیرہ کن شعلوں سے قطعاً علیحدہ نظر آتی ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ اردو نثر کے اس دور میں طفلانہ قہقہوں پر بلوغیت متانت آمیز تبسّم نے اپنا تسلط قایم کرنا شروع کر دیا ہے۔

مہدی افادی کی بہ نسبت میر محفوظ علی کی تحریروں میں مزاح کے نقوش زیادہ واضح ہیں، ان کی مزاح نگاری زیادہ تر اسٹائل کی رنگینی، شگفتگی، اور بے ساختگی سے پیدا ہوتی ہے۔ غالب کی خطوط نویسی کا انداز محفوظ علی بدایونی کی شگفتہ طرزِ نگارش اور دورِ جدید میں فرحت اللہ بیگ کے اسٹائل کی خوش مذاقی دراصل ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ غالب مرحوم کی طرح محفوظ علی بدایونی نے بھی نہ صرف اپنے اسٹائل کی شگفتگی سے مزاح پیدا کیا بلکہ اپنے مزاح کے نقوش اس گھریلو ماحول کے پس منظر پر ابھارے جو اُن کے تصورات و خیالات سے بہت قریب تھا۔

محفوظ علی بدایونی مزاح نگار سب سے پہلے ہیں کہ وہ طنز نگار کی طرح ماحول سے نفرت کو تحریک نہیں دیتے۔ چنانچہ اُن کی تحریروں میں جہاں کہیں طنز موجود ہے اس کی نشتریت اس قدر کند کر دی گئی ہے اور یہ اسٹائل کی شگفتگی میں کھو کر اس قدر معتدل ہو گئی ہے کہ ہم اسے مزاح سے علیحدہ کر کے دکھانے میں دقّت محسوس کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کی طنز کا یہ نمونہ قابلِ غور ہے جو "پروفیسر قطرب" کی تقریر کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح ——— وزیر آغا

Marfat.com

سید صاحب خالص مزاح نہیں لکھتے تھے بلکہ وہ سنجیدہ لکھنے والوں میں ہیں مگر چونکہ اُن کی طبیعت میں شوخی تھی اس لیے اُن کے وہ مضامین جو ظریفانہ شمار کیے جاتے ہیں اُن میں ظرافت پر سنجیدگی غالب ہے اور ظرافت میں بھی طنز کو دخل ہے۔ وہ سیاسی لیڈر جن کے نظریات سے وہ متفق نہیں تھے، جب وہ اُن پر طنز کرتے ہیں تو اس طنز میں ایک آرٹ ہوتا ہے۔ حاجی بغلول اور پروفیسر قطرب میں ان کا ہدف افراد نہیں بلکہ سماج ہے۔

اردو ادب میں ——— غلام احمد فرقت کاکوروی
طنز و مزاح ———

ہندو مسلم اتحاد کے وہ صرف اسی قدر قائل تھے کہ یہ دونوں فرقے حصول آزادی کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور انگریز کے مقابلے میں میدانِ سیاست میں شانہ بہ شانہ مل جل کر کام کریں۔ وہ اس بارے میں "بدہ وبستان" کے اصول کو اسی حد تک مانتے تھے کہ یہ عمل دو طرفہ ہو اور اس سے مسلمانوں کے ایمان اور بنیادی عقائد پر کسی طرح آنچ نہ آئے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے پرانے اخبارات سے ہندو مہا سبھا اور اس کے ساورکر اور مونجے جیسے لیڈروں کے اقوال و بیانات اسلام اور مسلمانوں کے خلاف، مع ضروری حوالہ جات کے جمع کروائے۔ یہ کام پایۂ تکمیل کو تو نہ پہنچ سکا لیکن جتنا بھی مواد اکٹھا ہوا تھا اسے دیکھ کر فرمانے لگے۔ "اگر یہ شائع کر دیا جائے تو سروں پر بم کی طرح گر جائے گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ جب مولانا محمد علی تک ہندو مسلم اتحاد کی تحریک اور "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے نعرے کی رو میں بہہ گئے تھے، اس وقت بھی سید محفوظ علی صاحب مشترک قومیت اور ثقافت کے بالکل قائل نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک کے شاخسانہ کے طور پر منظر علی سوختہ کے ذہن میں یہ تجویز ابھری کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بچوں کے ملے جلے نام رکھنے چاہئیں

Marfat.com

تاکہ "ہندلمان" قومیت کے نظریے کو تقویت پہنچے۔ خیال تھا کہ اس تجویز کو کھلے بندوں ایک بھرے جلسے میں پیش کیا جائے۔ مولانا محمد علی متفکر تھے کہ جب ہندو مسلم اتحاد کی مہم میں وہ برابر کے شریک تھے تو منظر علی سوختہ کی تجویز کی برسرِعام کیوں کر مخالفت کر سکیں گے۔ بالآخر معاملہ سیّد محفوظ علی صاحب کے روبرو پیش ہوا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اس قسم کی کوششیں پہلے بھی ہو چکی ہیں لیکن بے سود۔ ہر دفعہ ہندو مسلم امتزاج کی جگہ کوئی تیسری چیز ظہور پذیر ہوئی مثال میں اکبر کے دینِ الٰہی اور گورونانک کے سکھ مت کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا محمد علی کو استدلال کے لیے ایک نکتہ مل گیا اور انھوں نے منظر علی سوختہ کو قائل کیا کہ اپنی تجویز کو پیش کرنے سے باز آئیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک ناموں کے بارے میں میر صاحب نے "پروفیسر قطرب کی تقریر" میں "رجب علی" اور "راجہ بلی" جیسے ہم آہنگ نام کے پردے میں ایک بھرپور طنز پیش کی ہے۔

—— مؤلف

Marfat.com

پروفیسر قطربؔ کی تقریر

حضرات! میں ممنون ہوں کہ آپ نے تقریر کی اجازت دے کر میری عزت بڑھائی میں جس مضمون پر آپ کی سامعہ خراشی کرنا چاہتا ہوں وہ وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے جس پر کچھ دن سے ہندوستان کے نامی اخبار اور مقتدر اصحاب اظہارِ خیالات فرما رہے ہیں، لیکن اس بحث پر کچھ عرض کرنے سے پہلے بتانا چاہتا ہوں کہ میں خود کون ہوں۔

میرے قد و قامت اور رنگ و روغن سے جناب نے مجھے ایرانی یا افغانی سمجھا ہوگا، اگرچہ میرے لہجے نے جناب کو پھر شک میں ڈال دیا ہوگا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جیسے میں کُل آریہ ورت کو اپنا جنم بھوم سمجھتا ہوں ویسے ہی سرزمین عرب کو اپنا مَولَد و مُوطن جانتا ہوں، میری رگوں میں ما رِ زمزم بھی ہے اور گنگا جل بھی۔ میری پیشانی جیسے سجدے کے نشان سے منوّر ہے ویسے ہی چندن کی تلک سے مزیّن۔ میرے داہنے ہاتھ میں عقیق البحر کی تسبیح ہے اور بائیں میں مدّ راچھ کی مالا۔ میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی ایک بولتی چالتی تصویر اور ایک چلتی پھرتی نظیر ہوں۔ صاف لفظوں میں سنیئے کہ میرے والد سبزواری ہیں اور میری ماتا ہردواری۔ قطربؔ میرا اصلی نام نہیں بلکہ اس نام سے میں اخبارات و رسائل میں مضامین لکھتا ہوں۔ میرا حقیقی نام عربی النسل بھی ہے اور ہندی الاصل بھی۔ جناب کو تعجب ہوگا کہ ایسا کون نام ہو سکتا ہے، سُنیے میرا نام عربی النسل ہونے کی وجہ سے "رجب علی" ہے اور ہندی الاصل ہونے کی حیثیت سے "راجا بلی" میری اسی خصوصیت پر نظر کر کے جناب حاجی صاحب نے بلیغ طرزِ ادا میں فرمایا تھا کہ میں چھ مہینے مسلمان رہتا ہوں اور چھ مہینے ہندو۔ ایسی حالت میں جناب تسلیم فرمائیں گے کہ سب سے زیادہ خوشی جس شخص کو ہندو مسلمانوں کے اتفاق سے ہوگی وہ میں ہوں۔ کیونکہ ان دونوں قوموں کا اتفاق میری ددھیال اور ننھیال کا اتفاق ہے۔ اسی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ پر کسی فریق کے طرفدار ہونے کی بدگمانی نہ فرمائیں گے۔ چونکہ وقت تنگ ہے اور حاجی صاحب

نے طولِ تقریر کی سزا سخت تجویز کی ہے، لہذا اپنا مافی الضمیر مختصراً عرض کرتا ہوں۔

حضرات! ہندو مسلمانوں کے اتفاق کا سوال نیا نہیں۔ جو دو قومیں کم وبیش آٹھ سو سال سے بدوش بدوش رہتی آئی ہوں، جن کی حالت پچھلے ڈیڑھ سو سال سے بوجہ ایک ہی سلطنت کی رعایا ہونے کے یکساں ہو، جن میں سے کسی کو کبھی ملک چھوڑ جانے کا خیال تک نہ ہو، جن کے بہت سے اغراض وحقوق مشترک ہوں، اُن کے دماغ میں اتفاق باہمی کا خیال بار بار اور پے در پے نہ آنا ان کی صحتِ دماغی میں شبہ ڈالتا ہے۔ میں جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ خیال بار بار آیا مگر ہمیشہ دائرۂ تخیل ہی میں رہا۔ میدانِ عمل میں نہ آیا۔ آپ میرے فحوائے کلام سے یہ نہ سمجھیئے کہ ہندو مسلمان اس سے پہلے چھُری کٹاری رہتے تھے اور کبھی صلح وسازگاری سے بسر ہی نہ کرتے تھے۔ معاف کیجیے اگر اس فرسودہ خیال کا اعادہ کروں جو دونوں قوموں کے بڈھوں کی زبان پر اب تک اکثر آتا ہے۔ اس سے پہلے ہندو مسلمان برابر ایک دوسرے کے شریک رنج وراحت رہتے تھے۔ عید، بقرعید، محرم بھی آتے تھے اور ہولی، دیوالی، دسہرے بھی آتے تھے۔ سنکھ بھی بجتے تھے، اذانیں بھی ہوتی تھیں۔ ہندو مسلمانوں پر رنگ ڈالتے تھے۔ مسلمان ہندوؤں سے عید ملتے تھے۔ اس نئی پود نے نئی تعلیم پاکر دونوں قوموں میں ایسا سیہی کا کانٹا رکھ دیا ہے کہ آئے دن بات بات پر سر پھٹول رہتی ہے۔

حضرات! ہندو مسلمانوں کی نئی پود پر الزام لگانا بے سود ہے۔ میں حالت موجودہ کو ناگزیر سمجھتا ہوں۔ نئی پود پیدا ہونے والی تھی اور اس میں نئی تعلیم کی اشاعت ہونے والی تھی اور وہ ہو کر رہی۔ نئی پود آئی، وہ نئی تعلیم بغل میں لائی تو نئی امنگیں اور نئی خواہشیں دلوں میں آئیں۔ قومیت اور عصبیت کے خیالات پیدا ہوئے۔ قومی حقوق اور قومی فرائض کا احساس ہوا۔ ملی مدافعت اور مذہبی محافظت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اور یہ سب وہ باتیں ہیں جو ہونی چاہیئے تھیں اور بن ہوئے رہ نہیں سکتی تھیں۔ انفرادی اور بعض موقع پر جماعتی اتفاق اب بھی ہے جہاں ایک دوسرے کے ذاتی یا قومی معاملات اس کے مقتضی ہیں یا جہاں تعلیم وخیالات جدیدہ کا بالکل اثر نہیں یا بہت کم پہنچا ہے۔ مگر ہم جس اتفاق کو مطمح نظر قرار دیتے ہیں وہ اتفاق من حیثیت القوم ہے اور اس میں شک نہیں کہ اتفاق من حیث القوم ہندو مسلمان میں اس ڈیڑھ سو برس میں تو ہوا نہیں اور نہ ہو سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ ایسا اتفاق اب ہو سکتا ہے، یہ دونوں فریق میں وجود استعداد وعدم استعداد پر منحصر ہے۔

Marfat.com

خود ستائی نہ سمجھیئے اگر میں یہ عرض کروں کہ میں نہ صرف کل ہندوستان میں عرضاً طولاً کئی دفعہ سفر کر چکا ہوں بلکہ ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ، رہوڈیشیا کی تفصیلی سیر کر آیا ہوں۔ دوران سیاحت میں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور نہ صرف رعایا اور سلطنت کے تعلقات کا مشاہدہ کیا بلکہ مختلف الاقوام رعایا کی بین الاقوامی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور سلطنتوں کے اتفاق، اتحاد اور ائتلاف کی تدریجی تاریخ پڑھی ہے۔ اس سیر و مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب کہ چھوٹوں اور بڑوں، کمزوروں اور زبردستوں، بے وقوفوں اور عقلمندوں میں آئے دن نت نئے معاہدے اور صلح نامے ہر جگہ مرتب اور مدوّن ہوتے ہیں جن میں بڑا، زبردست، اور عقلمند حریف اپنے چھوٹے، کمزور، اور بیوقوف فریق سے من مانی اور بیسوں بسوے اپنے فائدے کی شرطیں لکھوا کر انصاف کی آنکھوں میں خود غرضی کی خاک جھونکتا ہے، کسی فرد یا کسی قوم میں حقیقی، مستقل، اور دلی اتحاد اس وقت تک ناممکن ہے ــــــ

۱۔ جب تک کہ ہر فریق کو ایک دوسرے کے مساوی القوت ہونے کا یقین نہ ہو۔

۲۔ جب تک ہر فریق اتحاد کی اہمیت کو یہاں تک نہ سمجھ چکا ہو کہ عدم اتحاد کو اپنے لیے موجب خطر جانتا ہو۔

۳۔ جب تک ہر فریق کچھ لینے کی خاطر کچھ دینے کو مستعد نہ ہو۔

مسلمان اب تک مردم شماری، تموّل، اور تعلیم کے اعتبار سے ہندوؤں سے بہت گھٹے ہوئے ہیں۔ ہندو اس واقعے سے واقف اور مسلمان ناواقف نہیں ہیں۔ اس وجہ سے اب تک یہ نہ ہو سکا کہ ہندو اتفاق کا داہنا ہاتھ مسلمانوں کی طرف بڑھائیں یا مسلمان اتحاد کا لفظ زبان پر لائیں۔ مگر پچھلے دو تین سال میں "خدا شرّے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد" کچھ ایسے گوناگوں واقعات متواتر پیش آئے جن کا تعلق مسلمانوں سے تھا اور جن میں مسلمانوں کے باہمی اتفاق، استقلال، قوت فیصلہ اور طرز عمل سے یہ امر ہندوؤں کے ذہن نشین ہو چکا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ مسلمان مر نہیں گئے بلکہ بایں ہمہ نیم جانی وہ ابھی بہت دنوں زندہ رہنے والے ہیں۔ یہی وہ باعث ہے جس سے ہندوؤں نے اس تنگ نظری اور تنگ ظرفی سے کام نہ لیا جس سے وہ عموماً اپنے مسلمان بھائیوں کی تواضع کرنے کے عادی تھے۔ اور یہی وہ خیال ہے جس نے ۲۹ ستمبر کے اخبار ہندوستانی لکھنؤ کے کالموں

Marfat.com

ہیں ایک ہندو نامہ نگار کے قلم سے یہ الفاظ لکھوائے ـــــ

"ضرور ہے کہ ہندو مسلمان ایک قوم اور متحد الخیال ہو کر ہندوستان میں رہیں۔ مسلمان کسی دھمکی اور جبر سے راضی ہونے والے نہیں۔ وہ ایک زندہ اور زبردست قوم ہیں۔ پہلے ہم ان کی پولیٹیکل اہمیت کے اپنے لیڈروں کے بہکانے سے قائل نہ تھے۔ مگر واقعات نے بخوبی ثابت کر دیا کہ وہ زندہ قوم ہیں، اور ہندوستان میں پولیٹیکل اہمیت کا اعزاز اُن کو حاصل ہے۔ وہ ایک زبردست زندہ قوم ہیں ۔۔۔۔ گورنمنٹ کے لیے سخت مشکل ہے کہ وہ ایک زندہ زبردست قوم پر ایک مُردہ اور کمزور قوم کی خاطر اپنے کو مصیبت میں ڈالے۔ وہ ہندوؤں جیسی مردہ قوم کے واسطے مسلمانوں سے بگاڑنا بھی پسند نہ کرے گی۔۔۔"

عبارت بالا کو پڑھ کر شبہ ہوتا ہے کہ نامہ نگار موصوف نے اپنے مضمون کو ترسول بنا دیا ہے۔ یعنی ایک طرف تو مسلمانوں کو زندہ و زبردست قوم کہہ کہہ کر اُس کی مدحِ ہجو آمیز جسے ہجوِ ملیح کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کی ہے۔ دوسری طرف ہندوؤں کو مُردہ اور کمزور قوم کہہ کر ان کے سمندِ غیرت کو وقفِ مہمیز بنایا ہے۔ اور تیسری طرف گورنمنٹ کو بزدل اور ڈرپوک ظاہر کر کے اس کی آتشِ سطوت کو تیز کیا ہے۔ مگر ہمارا شیوہ سوءظن نہیں۔ لہذا ہم ان کے الفاظ کے ظاہری معنے لیتے ہیں۔

اب اگر ان الفاظ اور جنگِ بلقان اور واقعۂ کانپور کے متعلق ہندوؤں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ہم یقین کر لیں کہ ہندو آئندہ سے مسلمانوں کو اپنے مساوی القوت ماننے اور عدم اتحاد کے حال کو اپنے لیے موجبِ خطر جاننے کو تیار ہیں تو آؤ دیکھیں کہ وہ "بستان دبدہ" (GIVE AND TAKE) کے اصول پر کہاں تک مستعد ہیں۔

ہندوؤں نے اتفاق کی شرط نہایت بلند آہنگی سے بتا دی ہے کہ ہم مسلمانوں سے اتفاق کرنے کو موجود ہیں اگر وہ گائے کی قربانی چھوڑ دیں جس سے ہماری دل آزاری ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ گائے کا ذبیحہ محض قربانی ہی کے لیے نہیں ہوتا ہے بلکہ خوراک کے لیے بھی جس میں انگریز بھی ہمارے ساتھ شریک "جرم" ہیں۔ مگر ہمارے بھائیوں کی کمالِ مصلحت میں

Marfat.com

ہے کہ قربانی کے سوال ہی کو آگے بڑھایا ہے اور اس کے متعلق سربرآوردہ مسلمانوں سے اپیل کی ہے۔ اس لیے ہم بھی قربانی کے سوال ہی سے بحث کرتے ہیں، گاؤ خوری سے بحث نہیں کرتے۔

اس مقدمے میں اگر کوئی مجوّز امورِ تنقیحات طلب قائم کرے تو مجھ جیسے قانون داں شخص کی رائے میں اسے تنقیحاتِ ذیل قائم کرنی ہوں گی ــــــ

۱۔ آیا مسلمان گائے کی قربانی کرکے ہندوؤں کی دل آزاری کرتے ہیں؟

۲۔ آیا مسلمانوں کو قربانی کا حق حاصل ہے؟

۳۔ آیا ہندوؤں کو انسدادِ قربانی کا حق حاصل ہے؟

ہر جرم کے اجزائے ترکیبی دو اور صرف دو ہیں، نیّت اور فعل۔ ان میں سے جب کوئی ایک بھی مفقود ہو تو نہیں کہا جا سکتا کہ جرم کا ارتکاب ہوا۔ مسلمان بے شک گائے کی قربانی کرتے ہیں، لیکن کوئی ہندو ہے جو اپنے ایمان دھرم سے کہہ سکے کہ مسلمانوں کی نیت دل آزاری کی ہوتی ہے؟ اگر ہے تو یقیناً وہ غلط گو ہے یا ناواقف۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ قربانی کے وقت کسی مسلمان کے، چاہے وہ عالم ہو یا جاہل، حاشیۂ خیال میں بھی دل آزاری کا خفیف سے خفیف پہلو نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مسلمان قربانی کی خالص اور بے لوث نیّت کے سوا کسی دوسرے خیال سے قربانی کرے، چاہے وہ خیال دل آزاری کا ہو، یا نمود و نمائش کا، یا جلبِ منفعت کا، تو ایسی قربانی ہرگز ہرگز قبول نہ ہوگی، اور یہ فرض اُس کے ذمّے بدستور رہے گا، اور کون مسلمان ہے جو محض دل آزاری جیسے گناہ بے منفعت کے لیے اپنا روپیہ خرچ کرے گا۔ جب مسلمانوں کی نیّت دل آزاری کی نہیں تو وہ قربانی کرنے سے دل آزاری کے گناہ کے مرتکب ہرگز نہیں ہوتے۔ اگر اس حالت میں بھی ہندو گائے کی قربانی کو جو مسلمانوں کا ایک مقدس مذہبی فرض ہے خواہ مخواہ باعثِ دل آزاری سمجھ لیں جو مسلمانوں کا ہرگز منشا نہ تھا تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے ہندو بھائی باوجود وفورِ تعلیم و خواہشِ اتفاق ابھی تک جہل و نفاق کی ظلمت سے نہیں نکلے ہیں۔ وہ گائے کی تعظیم و تقدیس کرتے ہیں شوق سے کریں، مگر انھیں کیا حق ہے کہ اُس قوم سے جو گائے کو کسی تعظیم و تقدیس کا مستحق نہیں جانتی جبراً گائے کی تعظیم و تقدیس کرائیں۔ ہندو دیومالا میں ایک گائے نہیں بہت سے اور جانور متبرک اور مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ کل کو ہندو کہیں گے کہ اگر مسلمان ان سب جانوروں، دریاؤں،

پہاڑوں، اور شہروں کو مقدس نہ سمجھیں گے تو ہندو اسے باعثِ دل آزاری سمجھیں گے۔ اگر یہی کیفیت ہے تو مسلمان کھلے خزانے کہتے ہیں کہ ہندوؤں کی بت پرستی اور باطل پرستی اور کفر و شرک سے مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوتی ہے، کیونکہ یہ ٹھیٹ وہی باتیں ہیں جن سے خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی دنیا کو پاک و صاف کرنے کے لیے اسلام کی تبلیغ ہوئی ہے۔

میری رائے ناقص میں یہ امور کہ مسلمانوں کو اخلاقاً، عرفاً، اور قانوناً گائے کی قربانی کا مذہبی حق بجا طور پر حاصل ہے اور ہندوؤں کو اس کے انسداد کا کوئی حق حیلتاً و صریحتاً نہیں ہے، مسلم الثبوت اور مستغنی عن الدلیل ہیں۔ اب بفرضِ محال اگر مسلمان اپنے اس مسلمہ حق سے دست برداری پر راضی ہو جائیں تو ہندو اس کے معاوضے میں کیا دیتے ہیں۔ اب تک تو جو کچھ سننے میں آیا ہے یہی ہے کہ — "تم ہمارے گھر آؤ گے تو کیا لاؤ گے اور ہم تمہارے گھر آئیں گے تو کیا کھلاؤ گے۔" اس داد و ستد میں مسلمان اپنے بھائیوں کو جو کچھ دیں گے اسے یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے —

اتفاق + گائے کی قربانی سے دست برداری

اس کے مقابلے میں ہندو اپنے مسلمان بھائیوں کو جو کچھ دیں گے اسے یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

اتفاق + کچھ نہیں

اب اس میں سے حصۂ مشترک نکال دیں تو مسلمانوں کو گائے کی قربانی کے حق سے دست برداری کے معاوضے میں "کچھ نہیں" ملا۔

کیا اس امر کو وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ ہندو بھائی "بستان و بدہ" کے اصول میں سے صرف جزو اول ہی پر کاربند ہونے کو تیار ہیں اور جزو ثانی کا ذکر نہیں۔

اب مسلمانوں کے سامنے ایک چھوٹا سا سوال ہے اور وہ یہ ہے — کیا محض اتفاق کی خاطر مسلمان گائے کی قربانی کے حق سے دست بردار ہو جائیں گے؟

میں اس بھرے مجمع میں صاف پکار کر کہتا ہوں اور امید ہے کہ میری کمزور آواز جو آپ کی سامعہ خراشی کر رہی ہے، سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے کان تک پہنچا دی جائے گی کہ اس وقت جب کہ گزشتہ واقعات کی وجہ سے مسلمانوں کا دماغ پُرخروش ہے وہ اس چھوٹے سے مگر نہایت ہی اہم اور مہتم بالشان سوال کا فوری اور تعجیلی جواب نہ دے بیٹھیں بلکہ نہایت چھان پھٹک، سوجھ بوجھ

Marfat.com

دیکھ بھال، جانچ پڑتال سے معاملے کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیں تب جواب دینے کا خیال کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو آگے چل کر خود اُن کی نسلوں بلکہ عجب نہیں ہے خود اُنھیں کو تاسف ہو اور یہ تاسف شاید اس نقصان کی تلافی نہ کر سکے جو اُن کی جلدبازی سے اُن کے حقوق ملی و مذہبی کو پہنچ چکا ہو۔ مسلمان یاد رکھیں کہ وہ چند لمحے یا زیادہ سے زیادہ چند دن جو اس سوال کے جواب دینے اور اس مسئلے کے حل کرنے میں صرف ہوں گے مسلمانوں کے سالہا سال کے مستقبل کے باب ہوں گے۔ ہندوؤں کے لیے گائے کا ذبیحہ ہی صرف اہم اور واحد نزاعی معاملہ نہیں بلکہ سرکاری نوکریاں، اردو ہندی کا سوال، کونسلوں اور بورڈوں کا انتخاب، اور اسی قسم کے بہت سے امور ہیں جو نزاعی ہیں۔ پہاڑی راستے کی طرح ایک چوٹی پیچھے چھوڑتے ہی دوسری اتنی ہی اونچی چوٹی آگے آجاتی ہے۔ ابھی تو بہت سے امور "ہندو مسلم اتفاق کے لیے اہم اور واحد شرط" کا لیبل لگا کر پیش کیے جائیں گے لیکن مسلمانوں کے لیے قربانی کا معاملہ ایک اصولی معاملہ ہے اور ایسا ہی اصولی اور اہم ہے جیسا کانپور کا معاملہ۔ اس کے علاوہ اس امر کی کیا ضمانت و ذمہ داری ہے کہ وہ اتفاق جس کا قربانی سے دست برداری کے بعد وعدہ کیا جاتا ہے ایک مستحکم اور حقیقی اور مستقل اور دلی اتفاق ہوگا اور ایک حق سے دست برداری کے بعد مسلمان دوسرے حق سے دست بردار ہونے کے لیے مجبور نہ کیے جائیں گے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اگر کبھی مسلمان قربانی کے استحقاق سے دست برداری کا بفرضِ محال خیال بھی کریں تو اُنھیں پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ نہ ان کے افلاس کی حالت اُس کی مقتضی ہے نہ فریقِ ثانی نے اُن کے دل میں گھر کر لیا ہے اور نہ وہ استحقاق فی نفسہٖ ایسا کم قیمت ہے کہ دست برداری بذریعہ ہبہ کی جائے بلکہ جب کبھی ایسا خیال کریں تو دست برداری بذریعہ بیع کریں جس میں زرِ ثمن کی مجرائی محسوبی نہ ہو بلکہ کھنا کھن اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ حاشا کہ زرِ ثمن اور کھنا کھن نقد سے میرا مطلب یہ نہیں کہ چند قراضہ ہائے سیم کے بدلے اس حق سے دست برداری کی جائے بلکہ زرِ ثمن سے میری مراد شئے مبیعہ ہی کی قسم و جنس کے حقوق ہیں جو اس قسم کی دست برداری کے معاوضے میں ہندوؤں سے ملنے چاہئیں۔

میں نے بہت دیر تک آپ کی سامعہ خراشی کی جس کی معافی چاہتا ہوں۔

Marfat.com

نوٹ: پروفیسر قطرب نے یہ اسپیچ (SPEECH) یکم نومبر کو دی تھی۔ اُس وقت انھیں خیال بھی نہ تھا کہ مشتری کی گارڈزوری انتقال سے پہلے ہی اس حق پر ۱۰ نومبر کو اجودھیا میں قبضہ و دخل مخاصمانہ کرے گی۔

—— ملّا علی کاتب بودھامٹوی

ہمدرد۔ دہلی

سنہ ۱۹۰۴ء

خطابات

چونکہ نوروزِ عالم افروز (یکم جنوری ۱۹۱۴ء) کی آمد قریب ہے جب کہ سرکاری لنگرخانہ دولت سے مستحقین و محتاجینِ نام و نمود کو خطابات کے حصّے تقسیم ہوں گے اس لیے خطابات کے متعلق اہم امور پر غور کرنے کے لیے تجاہل عامیانہ کا ایک خاص جلسہ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۳ء کو وقت طلوع آفتاب عالمتاب "صدر دار الجہل" میں منعقد ہوا۔ نشست کا انتظام حسب دستور قدیم فرش بوریائے بے بوریا پر تھا۔ اگرچہ دروازہ خانہ کھل جانے کی وجہ سے روشنی کی ضرورت نہ تھی (اور تجاہلِ عامیانہ جیسے ضیا پاش اور نورانگن جلسے میں کسی وقت بھی روشنی کی ضرورت نہیں) تاہم مشعل بردارِ تجاہلِ عامیانہ اپنی دلاوری کا ثبوت دینے کے لیے چراغ بکف کھڑا تھا۔ ٹھیک وقت پر عالی جناب حاجی صاحب مع اپنے لحم و شحم اور لحیہ و سوارب کے رونق افزائے گلیم صدارت ہوئے اور دو زانو بیٹھتے ہی فرمانے لگے۔

کیا نام کہ ہمارے ایک دوست کے یہاں ایک تقریب تھی جس کی وجہ سے ہمیں کئی رات جاگنا پڑا۔ جاگنے سے ہماری طبیعت کیا نام کسلمند ہو گئی اور کسلمندی بڑھتے بڑھتے علالت تک پہنچ گئی۔ فلہذا ہم اپنی تقریر قلمبند نہ کرسکے تو کیا نام کہ نوک زبان کیسے کر لیتے۔ یعنی جب لکھ نہ سکے تو یاد کیسے کر لیتے؟ اور جب یاد نہیں تو اس وقت آپ کو کیا سنائیں۔ فلہذا آج ہم تقریر مطلق نہ کریں گے۔ ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے کیا نام تقریر نہیں کرتے و ھو ہذا۔ زمانۂ ماضی میں ہم نے ملک یا اپنے وطن یا اپنے محلے یا اپنی گلی یا اپنے گھر کے اور نیز گورنمنٹ (جس سے مراد کیا نام بڑے لاٹ صاحب خواہ منجھلے لاٹ صاحب خواہ چھوٹے لاٹ صاحب سے ہے) یا ڈپٹی کمشنر صاحب یا کلکٹر صاحب یا ڈپٹی صاحب یا تحصیلدار صاحب یا پٹواری یا چپراسی صاحب کی اور نیز اپنے مذہب والوں یا برادری والوں یا کنبے والوں یا اپنے گھر والوں کی کبھی کنایتاً یا صراحتاً کوئی ایسی خدمت ہرگز ہرگز نہیں کی جس کی قیمت میں ہمیں کوئی چھوٹا یا بڑا یا منجھولا خطاب ملا ہو۔ اس جلسے کے صدر ہونے کے کیا نام حیثیت سے آجکل جو خدمت کر رہے ہیں، بعض

Marfat.com

حضرات اسے بھی کسی خطاب کی قیمت نہیں سمجھتے۔ فلہذا زمانۂ حال میں بھی ہمیں کسی خطاب کے ملنے کا کھٹکا نہیں رہا اور زمانۂ آئندہ میں تو اس کا ہمیں مطلق خوف نہیں ہے کیونکہ کسی عقلمند کا شعر ہے۔

مترس از بلائے کہ شب درمیان است

اندریں حالات ہمیں آج کے جلسے میں جو خطابات کے متعلق مشورہ کرنے کو منعقد کیا گیا ہے کوئی تقریر کرنی نہیں ہے۔ ہاں یکم جنوری ۱۹۱۴ء کے گزٹ میں ہمیں خطاب مل گیا تو ہم گزٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایک لمبی چوڑی تقریر کریں گے جس میں عہدیدارانِ سرکاری کی تعریف میں نثری قصیدہ سنائیں گے۔ نظر بہ حالتِ موجودہ کارروائی جلسہ فوراً شروع ہو۔ حاجی صاحب کی تقریر (جسے صاحب موصوف تقریر ہی نہیں مانتے) ختم ہوتے ہی شور ہائے وہو بلند ہوا۔ اس کے بعد جلسے کے ایک مقتدر ممبر شمس العلما خان بہادر منشی چنن الدین نے ذیل کا رزولیوشن پیش کیا۔

چونکہ دیسی خطابوں کی حالت بہ اعتبار کیفیت وکمیت محتاج ترمیم ہے لہذا یہ جلسہ معطیان خطاب کی خدمتِ عالی میں بہ کمال ادب ملتجی ہے کہ اس اہم معاملے پر بہ سرعت ممکنہ توجہ فرمائیں۔ اور جلسہ ہذا کی تجاویز کو شرف قبول بخشیں تاکہ سال آئندہ کے نوروزی تقریب پر ان کا عمل درآمد ہو سکے۔ اس رزولیوشن کو پیش کرتے وقت خان بہادر نے فرمایا۔

حضرات! اس جلسے میں بہت سے خطاب دار صاحبان موجود ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جنہیں ابھی تک یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی ہے مگر ہر نوروز اور سالگرہ کے موقع پر بہ کمال بے قراری منتظر اور متوقع خطابات ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو ہر جائز و ناجائز کوشش سے اپنے آپ کو مستحق خطاب بنا رہے ہیں اور جن کے مساعی بہت جلد مشکور ہوں گے (ہر طرف سے انشاء اللہ انشاء اللہ) ایسے ایسے حضرات کے سامنے اس نہایت اہم اور اشد رزولیوشن کا پیش کرنا امید ہے کہ ناموزوں نہ ہو گا (ہر طرف سے نہیں نہیں) حضرات! انگریزی خطابات کیا بلحاظ نوعیت اور کیا بہ لحاظ اہمیت دیسی خطابوں سے بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے ہماری خواہش ہرگز بے جا نہیں ہے کہ دیسی خطابات کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ آج کل جب کہ دنیا تدریجی ترقی کر رہی ہے ہندو

ہے کہ ہر چیز درجہ بدرجہ ایک دوسرے سے گھٹی بڑھی رہے ۔ آپ ملاحظ فرماتے ہیں کہ بازار میں عینکیں ہر نمبر کی ہوتی ہیں ۔ موزے ہر نمبر کے ہوتے ہیں ۔ کارتوس ہر نمبر کے ہوتے ہیں ۔ جوتے ہر نمبر کے ہوتے ہیں ۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ خطابات کے جو عینکوں ، موزوں ، کارتوسوں اور جوتوں سے بدرجہا فائق ، بدرجہا قیمتی اور بدرجہا کارآمد ہیں نمبر نہ ہوا کریں ۔ فرض کرو کہ ایک رئیس حاکموں کے سلام کو ہر مہینے چار دفعہ حاضر ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے رئیس آٹھ دفعہ حاضری دیتے ہیں تو ضروری نہیں کہ دونوں کو ایک ہی نمبر اور قسم کا خطاب ملے ۔

دیسی خطابات کی موجودہ فہرست میں ایک اور خرابی ہے یعنی ہندوستان کی دو "جلیل القدر" قوموں کے خطابات میں نہایت درجہ عدم مساوات ہے جس کی وجہ سے ایک جلیل القدر قوم کی دلشکنی ہوتی ہے ۔ میں اس بھرے مجمع میں بلاخوف اہالیانِ خفیہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں عام شکایت ہے کہ ان کے قومی اور تفریقی خطابات بہ مقابلہ اُن کے ہمسر و ہم دوش ہندوؤں کے بہت کم ہیں ۔ چنانچہ ملاحظہ ہو فہرست خطابات ۔

مسلمان خطابات	ہندو خطابات
. . . .	۱ ۔ مہاراجہ بہادر
۱ ۔ نواب بہادر	۲ ۔ راجہ بہادر
۲ ۔ نواب	۳ ۔ راجہ
. . . . . .	۴ ۔ دیوان بہادر
. . . . . .	۵ ۔ دیوان
۳ ۔ خان بہادر	۶ ۔ راؤ بہادر
. . . .	۷ ۔ رائے بہادر
۴ ۔ خان صاحب	۸ ۔ راؤ صاحب
. . . . .	۹ ۔ رائے صاحب

فہرست بالا پر ایک نظر بلکہ چہار نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ نو ہندو خطابات کے مقابلے میں صرف چار مسلمانی خطابات ہیں ۔ اگر اس کے جواب میں وہی مردم شماری والی پرانی اور پٹنٹ

وجہ پیش کی جائے تو میں بہ کمال ادب یہ عرض کروں گا کہ جناب حاجی صاحب صدر انجمن جلسۂ ہذا کی بلیغ اور جامع تشریح کے مطابق خطاب تو مفت نہیں بلکہ کسی شئے کی قیمت کے معاوضے میں ملتا ہے چاہے وہ شئے وفاداری ہو یا نمک حلالی اور چاہے ایمان ہو یا ڈالی۔ اب اگر بازاری خرید وفروخت پر بھی مردم شماری کے اعداد وشمار کا اثر پڑا تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جب ہندو گھاس والے کو گھاس کے ایک گٹھے کی قیمت تین آنے ملتی ہے تو مسلمان گھاس والے کو اتنے ہی بڑے گٹھے کی قیمت ایک آنہ ملنی چاہیئے اور جب وہ یہ کہے کہ میرا مال اتنا ہے جتنا ہندو گھاس والے کا تو اسے سمجھا دیا جائے کہ چونکہ تمہاری آبادی ہندوستان میں ہندوؤں سے کم ہے لہذا تمہیں اسی نسبت سے قیمت دی جاتی ہے۔ یہ منطق مسلمانوں پر کوہِ ہمالیہ سے بھی زیادہ سخت وگراں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مصیبت ہے کہ ہندو اپنے نو خطابات کے تنہا اور بلا شرکتِ احدے مالک ہیں مگر مسلمانوں کے چار خطابوں میں چار شریک ہیں۔ شاید آپ لوگ باوجود مالکِ خطاب، مستحقِ خطاب اور متمنیٔ خطاب ہونے کے اس کا مطلب نہ سمجھے ہوں گے۔ لیجیے میں اپنے الفاظ کی شرح کرتا ہوں۔ ہندوؤں کے نو خطابوں میں ایک بھی نہیں جو غیر ہندو کو دیا جاتا ہو مگر مسلمانوں کے خطاب پارسیوں، یہودیوں، اور دیسی عیسائیوں کو بھی دیئے جاتے ہیں اور تینوں آخر الذکر اقوام اور کسی موقع پر نہیں مگر صرف خطاب یابی کی غرض سے مسلمانوں میں داخل النسب ہو کر علیہم ما علیہم کی مستحق ہوتی ہیں۔ بنا بریں جلسۂ ہذا سفارش کرتا ہے کہ دیسی خطابات کی ترتیب آئندہ سے بہ اضافہ خطابات جدید اس طرح ہو۔

مسلمان خطابات	ہندو خطابات
۱۔ لیبار نواب بہادر	۱۔ مہاراجہ بہادر
۲۔ نواب بہادر	۲۔ مہاراج بہادر
۳۔ نواب	۳۔ راجہ
۴۔ فوجدار بہادر	۴۔ دیوان بہادر
۵۔ فوجدار	۵۔ دیوان
۶۔ خان بہادر	۶۔ راؤ بہادر

Marfat.com

ہندو خطابات	مسلمان خطابات
۷۔ رائے بہادر	۷۔ خام بہادر
۸۔ راؤ صاحب	۸۔ خان صاحب
۹۔ رائے صاحب	۹۔ خام صاحب
۱۰۔ راؤ	۱۰۔ خان
۱۱۔ رائے	۱۱۔ خام
۱۲۔ ر (رائے مہملہ)	۱۲۔ خ (خائے معجمہ)

اس فہرست کے متعلق مجھے چند جملے عرض کرنے ہیں (۱) نواب بہادر اور راجہ بہادر باعتبار درجہ مساوی ہیں۔ مہاراجہ بہادر ان دونوں سے بڑھا ہوا ہے جن میں جزو زائد صرف "مہا" ہے۔ چونکہ یہ کلمہ تعظیم و تفخیم ہے اس لیے فارسی میں اس کا ہم معنی یا قریب المعنی لفظ "بسیار" ہے جو نواب میں لگا دیا اور بسیار نواب بہادر مہاراجہ بہادر کے برابر ہوگیا۔

(۲) دیوانی کے مقابلے کا لفظ فوجداری ہے۔ چنانچہ منصف کو حاکم دیوانی اور مجسٹریٹ کو حاکم فوجداری کہتے ہیں۔ ایسی حالت میں دیوان کے جوڑ کا لفظ فوجدار ہوا جو مفرد اور مرکب دونوں حالتوں میں درج کیا گیا۔

(۳) راؤ بہادر کے مقابلے کا خطاب خان بہادر مسلمہ ہے۔ رائے بہادر کے مقابلے کا خطاب اب تک مسلمانوں کے لیے نہ تھا مگر راؤ اور رائے میں جو فرق ہے وہ صرف آخر کے حروف میں ہے یعنی اول الذکر میں واؤ مجہول اور آخر میں یائے تحتانی ہے۔ اس لیے خان کے مقابلے کا جو لفظ ہو اس میں یہی فرق صرف حرف آخر میں ہونا چاہیے۔ لہذا ایسا لفظ "خام" تجویز کیا گیا۔

(۴) آخر میں ایک نہایت ہی چھوٹا خطاب بڑھا دیا گیا ہے جسے خطابوں کی دنیا میں جزو لاتیجزی کہنا چاہیے۔ اس کا نمبر ۱۲ ہے اور یہ اُس شخص کو محض بغرض ہمت افزائی ملنا چاہیے جو خطاب کا متمنی ہو مگر بجز اس کے اور کچھ نہ کر سکا ہو کہ چھٹے چھ ماہے صاحب کو سلام کر آتا ہو۔

Marfat.com

اب ہم دوسرے قسم کے خطابوں کا ذکر کرتے ہیں۔

اولاً شمس العلما اب تک صرف اکیلا اور بہ محاورۂ اہلِ پنجاب "واحد" خطاب ہے جو سرآمد علما و فحول علامہ شبلی نعمانی مدظلہٗ سے ہے کہ میاں بھی باد اللہ تک ہر اُس مسلمان کو جسے الٹی سیدھی نماز یاد ہو (لفظِ نماز میں نمازِ جنازہ شامل نہیں ہے جو بہت سے متوسط العلم "ممزوت"[۱] مولویوں کو نہیں آتی، ملتا اور مل سکتا ہے اس کے مختلف نمبر ہونے چاہئیں۔ مثلاً جو عالم ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ کے پرخچے اڑا سکتا ہو اور جس کی قدردانی گورنمنٹ کو محض بہ خیال سرپرستی علم وفن کرنی چاہیئے اسے اور خطاب دے اور اس میاں جی کو جسے آمدنامہ۔ مامقیماں۔ دستور العبیان سے زیادہ پڑھانا نہ آتا ہو مگر جسے گورنمنٹ بجلدوئے خدمات مخفیہ نوازنا چاہے اسے اور خطاب دے۔ لہٰذا اس طبقے میں خطاباتِ ذیل ہونے چاہئیں۔

۱۔ شمس العلماء

۲۔ قمر العلماء

۳۔ نجم العلماء

۴۔ ذرۃ العلماء

۵۔ دیقیر اطیس العلماء

(بلکہ تحقیقات تازہ کے لحاظ سے اس سے بھی کمتر درجے کا برقیۃ العلماء بھی ہونا چاہیئے۔ تجاہل)

ثانیاً۔ اطبائے یونانی کو گورنمنٹ کی طرف سے جو خطابات حاذق الملک اور شفاء الملک کے مل چکے ہیں وہ بجائے خود نہایت موزوں اور مناسب ہیں اور انہی حضرات کو ملے ہیں جو ہر طرح اہل ہیں مگر ایسے بھی نام کے طبیب ہیں جو محض پڑیاں ہی باندھنا جانتے ہیں۔ یا ایسے عطائی ڈاکٹر حکیم الحکماء ہیں جو طاعون اور دوسرے وبائی امراض کے موقعوں پر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اور گورنمنٹ کسی وجہ سے ان کی قدر افزائی کرنا چاہتی ہے ایسے لوگوں کو حاذق الملک اور شفاء الملک تو ملنے سے رہے

---

[۱] یعنی گزشتہ بہ وقت خطاب یابی۔ مصنف

Marfat.com

آخر ان کی اشک شوئی کس طرح ہونی چاہیئے۔ لہٰذا اس طبقے کے لوگوں کو یہ خطابات ملنے چاہئیں۔

۱۔ حاذق الملک

۲۔ شفاء الملک

۳۔ دواء الملک

۴۔ داء الملک

۵۔ وباء الملک

۶۔ بلاء الملک

ثالثاً۔ "سر" کا انگریزی خطاب کیونکہ بہت بڑا وقیع ہے لہٰذا گورنمنٹ بجز خاص خاص ہندوستانیوں کے جن کی خدمات اس خطاب کا کافی صلہ و معاوضہ ہوں معمولاً عام ہندوستانیوں کو دینے میں مضائقہ کرتی ہے جس سے اہلِ ہند کی حق تلفی ہے اس لیے میں سفارش کرتا ہوں کہ جس طرح گورنمنٹ نے قیصرِ ہند کے تمغے کے لیے سونے چاندی کی تفویق سے کالے گورے کی تمیز کر دی اسی طرح سر سے نیچے درجے کے دو اور خطاب بھی جاری فرمائے اور پوری فہرست یوں ہو

۱۔ سر

۲۔ شکم

۳۔ قدم

مثلاً۔ یادش بخیر ہمارے جلسئہ تجاہل کے ممتاز ممبر بلند خاں صاحب کو ان کی وفاداری کے جلدو میں گورنمنٹ خطاب دینا چاہے، لیکن ان کی خدمات کو سر کے لائق نہ سمجھے تو "شکم" یا "قدم" کا خطاب عطا فرمائے اور وہ "شکم بلند خاں" یا "قدم بلند خاں" ہو جائیں (جلسے میں ہر طرف آمین آمین کا شور بلند ہوا) اس آمین بالجہر کو سن کر عالم دینِ حسنی کو غصہ آ گیا مگر اس خیال سے کہ مسجد نہیں دارالجہل ہے خاموش ہو گئے ورنہ قریب تھا کہ رفع یدین ہونے لگے۔

رابعاً۔ بعض خطاب داروں کو مجسٹریٹی کے اختیارات بھی منجانب گورنمنٹ عطا ہوئے ہیں مگر اُن میں یکسانی نہیں ہوتی۔ بعض نواب بہادروں کو بھی اختیارات درجہ اول حاصل ہیں۔ بعض خان بہادروں کو بھی۔ بعض خان بہادروں کو درجہ دوم کے اختیارات ہیں۔ اس خلفشار کو دور کرنے

کے لیے ہماری رائے ہے کہ عطائے اختیارات بہ ترتیب ذیل ہو۔

(۱) بسیار نواب بہادر۔ مہاراجہ بہادر۔ نواب بہادر۔ راجہ بہادر۔ چونکہ بڑے پایے کے حضرات ہوتے ہیں اس لیے انھیں اپنے تعلقے اور جاگیر یا زمینداری میں اسپیشل اختیارات ملنے چاہئیں۔ جن میں پچاس برس کی قید اور ایک لاکھ روپے جرمانہ اور سو ضرب تازیانے کی سزا دینے تک کا اختیار ہو۔ اگر ضرورت ہو تو ان خاص اختیارات کی خاطر تعزیرات ہند و ضابطۂ فوجداری میں بھی ترمیم کی جائے۔

(۲) نواب۔ فوجدار بہادر۔ فوجدار۔ راجہ۔ دیوان بہادر۔ دیوان کو اختیارات مجسٹریٹ درجہ اول عطا کیے جائیں جن کی صراحت ضابطۂ فوجداری میں موجود ہے۔

(۳) خان بہادر۔ خام بہادر۔ راؤ بہادر۔ رائے بہادر۔ کو اختیارات درجہ دوم۔ صراحت ضابطہ فوجداری میں موجود ہے۔

(۴) خان صاحب۔ خام صاحب۔ راؤ صاحب۔ رائے صاحب کو اختیارات درجۂ سوم صراحت ضابطہ فوجداری میں موجود ہے۔

(۵) چونکہ مجسٹریٹی درجہ سوم سے نیچے کے اختیارات فوجداری کی حد بندی ہنوز نہیں ہوئی ہے لہٰذا ہماری رائے ہے کہ فوراً ایک درجہ مجسٹریٹی کا قائم کیا جائے جس کا نام ہو مجسٹریٹی خام۔ اس کے اختیارات میں حسب ذیل سزائیں ہوں۔

الف۔ کان پکڑوانا۔ شدید و خفیف گوشمالی جس میں کھینچ اور مروڑ دونوں شامل ہیں۔

ب۔ چپت لگوانا۔ جس میں لطمہ۔ سیلی۔ گردنی۔ طپانچہ (آچھ۔ طپانچہ) تھپڑ۔ دھول وغیرہ اپنے شدید و خفیف درجے میں شامل ہیں۔

ج۔ کھڑا رکھنا جس میں دھوپ یا سایے میں یا تپائی پر دیوار کی طرف منہ کر کے کم دیر یا بہت دیر تک جس کی مقدار دو گھنٹے سے زائد نہ ہو شامل ہیں۔

د۔ ملامت کرنا جس میں ایسے الفاظ کہنا جو دائرۂ تہذیب و انسانیت و ثقاہت سے باہر نہ ہوں یا جو محاورات و مصطلحات زبان کے اعتبار سے اہل زبان کے نزدیک ٹکسال سے باہر نہ ہوں۔

جن حضرات کے خان۔ خام۔ راؤ۔ رائے کے خطابات ہیں انھیں مجسٹریٹ خام کا درجہ عطا

Marfat.com

کیا جائے۔

(۶) ہرگاہ یہ قرین مصلحت نہیں ہے کہ اُن حضرات کو جنھیں خ (خانِ معظم) یا رائے مہلہ کا خطاب دیا جائے۔ اس وقت تک اختیار کیا جائے جب تک وہ کسی عملی درجے پر ترقی نہ کرلیں۔ لہٰذا اُن کے لیے کسی اختیار کی سفارش نہیں کی جاتی۔

خامساً۔ صرف شمس العلماء کا خطاب پانے والے حضرات کو اب تک مبلغ ایک سو روپے سالانہ مرحمت فرمائے جاتے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ پوری فہرست عطایائے سرکاری حسب ذیل ہو۔

۱۔ شمس العلماء۔ ایک سو روپے سالانہ۔ جس کے مبلغ آٹھ روپے پانچ آنے چار پائی ماہوار ہوئے۔

۲۔ قمر العلماء۔ پچھتر روپے سالانہ۔ جس کے مبلغ چھے روپے چار آنے ماہوار ہوئے۔

۳۔ نجم العلماء۔ ساٹھ روپے سالانہ جس کے مبلغ پانچ روپے ماہوار ہوئے۔

۴۔ ذرۃ العلماء۔ اڑتالیس روپے سالانہ۔ جس کے مبلغ چار روپے ماہوار ہوئے۔

۵۔ دیقیر طیس العلماء۔ چوبیس روپے سالانہ۔ جس کے مبلغ دو روپے ماہوار ہوئے۔

سادساً۔ جب بڑے خطابات میں خطاب دار کو خلعت ملتا ہے تو چھوٹے خطاب میں اسی نسبت سے کوئی اور پارچہ پوشیدنی جو بڑے خطاب سے بہ اعتبار جسامت وقیمت کم ہو ملنا چاہیئے۔ شمس العلماء کو چونکہ عبا ملتی ہے۔ قمر العلماء کو کوٹ ملنا چاہیئے۔ نجم العلماء کو واسکوٹ۔ ذرۃ العلماء کو قمیص اور دیقیر اطیس العلماء کو بلکی بنیائین۔ اس طرح بسیار نواب بہادر اور مہاراجہ بہادر سے لے کر خانِ معظم اور رائے مہلہ کی تعین اور تخصیص ہو جائے۔

سابعاً۔ جو حضرات ہندوؤں اور مسلمانوں کے یکساں خیر طلب یا اُن دونوں قوموں سے تعلق رکھنے والے یا ہندو مسلم اتفاق میں جانفشانی سے کوشش کرنے والے ہیں انھیں دونوں خطابوں کا مجموعہ ملنا چاہیئے۔ مثلاً بسیار نواب۔ راجہ۔ فوجدار۔ دیوان۔ خام رائے وغیرہ

حضرات میں نے آپ کا بہت وقت صرف کیا مگر مجھے امید ہے کہ اہمیت مبحث پر لحاظ فرما کر آپ میری سمع خراشی کو معاف فرمائیں گے۔

Marfat.com

اس رزولیوشن کی تائید شمس العلماء خان بہادر ابو ظفر اور خان صاحب چودھری چند دے نے نہایت پرزور الفاظ میں کی اور بہ اتفاق آراء یہ طے ہوا کہ نقل رزولیوشن مع تجاویز پیش کردہ شمس العلماء خان بہادر منشی جنن الدین بخدمت عہدیداران متعلقہ روانہ کی جائے راجہ لام سین سے استدعا کی جائے کہ وہ اپنی بہترین انگریزی میں تجاویز پیش شدہ بذریعہ چٹھی انگریزی روانہ فرما دیں۔

تکلیم صدارت کے شکریے کے بعد جلسہ منتشر ہو گیا۔ فقط

ملا علی کاتب بروعا مومیٰ

ہمدرد، دہلی

حدیثِ دیگراں

(۸)

راجہ غلام حسین پنجاب کے رہنے والے تھے۔ وہ مشہور اُس وقت ہوئے جب علی گڑھ میں زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے اسٹرائک میں حصہ لیا۔ اُس کے بعد انھوں نے وہیں سے ڈگری لی اور "کامریڈ" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے۔ اُس زمانے میں مسلمان صحافیوں کا اس قدر قحط تھا کہ راجہ غلام حسین کے انتقال کے بعد مولانا محمد علی کو سارے ہندوستان میں ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا مسلمان نہ مل سکا جو صحیح معنوں میں اُن کا جانشین بنتا۔ جب تک راجہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض ادا کرتے رہے مولانا کو ایک گونہ اطمینان تھا۔ انھوں نے سب کام سنبھال رکھے تھے۔ اُن کی انگریزی اتنی اچھی تھی کہ اُن کی تحریروں پر خود مولانا کی تحریروں کا گمان ہوتا تھا۔ میر محفوظ علی بدایونی جوابدار سے منیجر کی حیثیت سے "کامریڈ" اور "ہمدرد" سے وابستہ تھے، مولانا اور راجہ کو انگریزی انشا پردازی کا "آفتاب و مہتاب" کہا کرتے تھے۔ الہ آبادی لوگ راجہ کو "چھوٹا کمریٹ" کہا کرتے تھے۔ "بڑے کمریٹ" محمد علی تھے۔

عظمت رفتہ ——— ضیاالدین احمد برنی

چھوٹے کامریٹ صاحب کی "پابندی"

کیا مام کہ ہم کہتے تھے کہ کامریٹ صاحب ایک نہ ایک دن ضرور گرفتار کیے جائیں گے۔ فلہذا ویسا ہی ہوا۔ کیا معنی کہ چھوٹے کامریٹ صاحب عرف راجہ "غلام حسین[1]" کا عقد ہوگیا۔ یعنی کہ گرہ لگ گئی۔ فی الواقعی یہ پھندا ایسا وسیع اور نسل انسانی کے لیے بجلی سے زیادہ کشش رکھنے والا ہے کہ اس سے کسی کی گردن نہیں بچی اور نہ بچے گی کیا معنی کہ اس روز سے لے کر جب باوا آدم کی گردن میں طوق تکریم ڈالا گیا تھا آج تک پیر وجوان' بالغ ونا بالغ۔ حاجی وغیر حاجی۔ راجہ و پرجا۔ سب اس میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ کہنے والے کہتے تھے کہ نوجوان جو ہر بات میں آزادی کا راگ گایا کرتے ہیں۔ اس پھندے سے بھی جان چرائیں گے مگر حاجی صاحب نے پہلے ہی روز فرما دیا تھا کہ یہاں کسی آزاد خیال نوجوان کی پیری نہیں چل سکتی۔ چنانچہ وہی ہوا۔

آج صبح کو حاجی صاحب آنکھیں ملتے اٹھے تو سرہانے ایک۔ کارڈ دھرا تھا۔ واضح ہو کہ حاجی صاحب ہر ایسے کارڈ کو جس میں ریوڑیوں کے دانے سے لے کر بریانی کی قاب تک کسی چیز کے ملنے کی امید ہو ہمیشہ سرہانے رکھ کر سویا کرتے ہیں۔ فلہذا شرکت کی دھن سوار ہوئی۔ البتہ یہ خیال وہ ردکرتا تھا۔ یعنی کہ یہ شادی اور اس کی شرکت "سٹدیشن" کی حد تک تو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ اس میں مسٹر کامریٹ کلاں صاحب اور مولانا ہمدرد صاحب مع اپنی اپنی ذریات کے شریک ہی نہیں بلکہ کارکن ہوں گے۔ مگر اس تمام پس وپیش کے بعد آخر کار حاجی صاحب اپنے بشرہ شریف کو جھاڑ پونچھ کر جا ہی دھمکے۔ مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہاں پر حاجی صاحب نے محض "شتر الہ بے مہار" کو ہی نہیں پایا بلکہ کئی ایک "ڈبل روٹیاں" اور متعدد "حاجی صاحبان" بھی جلوہ فرما تھے۔ ڈاڑھیوں کی کئی اقسام خشخاشی، یک مشتی، چہار انگشتی۔ حاجی شاہی، جھاڑ شاہی، دہلوی، الوری وغیرہ وغیرہ گرمی کے مارے

---

[1] یعنی راجہ غلام حسین۔ محی الدین۔

پسینے کے موتی ٹپکا رہی تھیں اور مونچھوں کے تمام فیشن۔ شرعی۔ غیر شرعی۔ گنجان۔ دہانہ پوش۔ ایک ثلث۔ اکالی نما۔ جرمن شاہی۔ سینڈونما نظروں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ سن ہیٹ سے لے کر قمقمۂ شاہی اور طرہ پوش سرگوش تک زیب سر تھیں اور تلاؤزی پائجامے سے لے کر شلوار و پتلون تک تمام لباس زیب تن تھے۔ صیغۂ کلاہ کے بہت سے افراد شریکِ برات تھے مگر صیغۂ برقعہ کے بھی دو تین اصناف نوشہ کے ہم رکاب تھے۔ برات روانہ ہونے سے قبل براتیوں کو ناقابلِ برداشت گھمس کا پورا پورا لطف اٹھانا پڑا۔ اس لیے کہ نوشہ صاحب یعنی کامریٹ صاحب ہی المکلف تھے۔ فلہٰذا اگر وہ براتیوں کو اپنے انتظار کی کافی تکلیف نہ دیتے تو وہ سچے المکلف نہ کہے جا سکتے تھے۔ کیا نام کہ اُن کا قول و فعل یکساں ہے پس انھوں نے اپنے آپ کو عملاً بھی المکلف ثابت کر دیا۔

جب المکلف صاحب مع خاکسار ملّا علی کاتب کے تشریف لائے تو خدا خدا کر کے بارات خراماں خراماں روانہ ہوئی کیا نام کہ اگرچہ نوشہ صاحب کا سرنگ اُن کے قبضے میں اس وقت صرف اس قدر تھا جس قدر پریس ایکٹ کے قبضے میں "پائنیر" صاحب ہیں تاہم وہ سواری کے تمام اصناف سے مثلاً زین سواری، کاٹھی سواری، کمبل سواری، بے رکاب سواری، برہنہ پشت سواری (جس کو اردوئے معلّیٰ میں حضرتِ داغ نے مجرّد سواری کے نام سے یاد فرمایا ہے) کماحقہ واقف تھے۔

اس قدر تاخیر کے بعد بھی جلوسِ بارات جس وقت عروس کے مکان پہنچا تو صرف نو بجے تھے (کیا اس داخلے کا ترجمہ انگریزی میں اسٹیٹ انٹری کیا جا سکتا ہے) کیا معنی کہ ٹھیک وقت پر پہنچا بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ المکلف صاحب کامریٹ تھے۔ فلہٰذا اُن کے تمام کام "ریٹ" ہوتے ہیں۔

دوسری جانب سے یعنی عروس کی طرف سے انتظام نہایت اچھا تھا۔ اور جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ درختوں کے نیچے جو پلنگ بچھائے گئے تھے وہ باراتیوں کے بوجھ کا پورا پورا اندازہ کر کے بچھائے گئے تھے۔ کیا معنی کہ ایک ایک پلنگ پر کئی کئی وزنی حاجی صاحبان تشریف فرما تھے مگر کیا ممکن کہ کسی پٹی نے چوں بھی کی ہو۔ ان پلنگوں کی لکڑی کا پتہ و نشان اگر دریافت کرنا ہو تو دارو غہ زینت محل صاحبہ سے دریافت ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری آخر وقت میں تشریف لے آئے تھے اور اطمینان ہو گیا تھا کہ طبی امداد بھی موجود ہے۔ مگر بفضلہ نوشہ صاحب سے لے کر براتی گروہ تک کسی صاحب کو ضرورت نہیں ہوئی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ قیام کم تھا کس واسطے کہ محض نکاح تھا اور

Marfat.com

دواغ نہیں تھی۔ کیا نام کہ یہ طریقہ نہایت اچھا ہے کیوں کہ ملازمت سرکاری میں بھی ایک دم مستقل نہیں بنایا جاتا بلکہ پہلے انتخاب اس کے بعد عیوضی اس کے بعد سب پر دم ٹ اور اس کے بعد مستقل اسی سلسلے کا لحاظ شادی میں بھی رکھا جائے تو نہایت موزوں ہوگا کیا معنی کہ تعزیرات ہند میں بہت دفعہ اس کی بابت ہدایت کی گئی ہے۔ کیا نام کہ بغیر کام دیکھے مستقل کر دینے سے دھوکے کا اندیشہ ہے۔ فلہذا پہلے نسبت پھر نکاح۔ اور سب کے بعد میں رخصت۔ پس معلوم ہوگیا کہ فی الحال نوشہ صاحب سب پر دم ٹ بنائے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا ہے۔ کیا نام کہ وہ اس سے پیشتر مستقل ہوکر مستعفی ہوگیا ہو۔ یا مختلف اوقات میں پورے اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا ہو۔ کیا نام کہ اس کے کام کی زیادہ جانچ پڑتال کی ضرورت نہ ہو۔ پس نظر بریں وجوہات تقریب دواغ صرف ایک مہینے کے انتظار کے بعد عمل میں لائی جائے گی۔ نوشہ صاحب اپنی خاموشی کے عالم میں غالباً اسی معاملے پر غور کر رہے ہوں گے۔ اگرچہ بعض صاحبان کا خیال تھا کہ وہ سفر یجٹ فرقے پر یا ہوم رول بل کے متعلق کچھ سوچ رہے تھے واللہ اعلم بالصواب اتنے میں مبارک اور آمین کا غل شروع ہوا اور سب سے زیادہ موثر دعا جو حاجی صاحب کے کان تک پہنچی کہ "الٰہی بیٹا پانیر کا اڈیٹر ہو" کیا معنی کہ اس دعا کی داد کامریڈ صاحب کلاں نے بھی دی۔ آن واحد میں سب کو معلوم ہوگیا کہ راجہ صاحب غلام بنا دیئے گئے۔ مگر اُن کو بذات خود کوئی گھبراہٹ نہیں تھی اس لیے کہ وہ اس کوچے سے بفضلہ نابلد نہیں ہیں۔ بقول مرزا صاحب ابن مفلسی میں بھی دو کو مار رکھا ہے۔ جو کچھ بھی ہو اب وہ اسیر ہیں۔ پھنسے اور آفکار پھنسے۔ سچ کہا ہے مرزا غالب مرحوم نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب شاہنامہ[1] میں ۔

بہ آدم زدن بر شیطان طوق لعنت

سپردند از رہ تکریم و تذلیل

ولیکن در اسیری طوق آدم

گراں تر آمد از طوق عزازیل

ملا ملی کاتب بود خاموشی

محمد رزد دہلی

[1] تجاہل عامیانہ کی رعایت سے یہ دانستہ سہو روا رکھا گیا ہے۔
محی الدین

Marfat.com

حدیث دیگراں

(۹)

نثر میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی صاحب بی اے ساکن بدایوں ہیں۔ اُن سے زیادہ نیچرل اور بے ساختہ چلبلی اور از سرتاپا مرصع ظرافت کوئی نہیں لکھتا یا میرے علم میں نہیں ہے۔

چٹکیاں اور گُدگدیاں — خواجہ حسن نظامی

۱۹۱۱ء کے دربار میں جارج پنجم نے اعلان فرمایا تھا کہ آئندہ کلکتہ کی بجائے دلّی ہندوستان کا دارالسلطنت ہوگا۔ اس اعلان پر مولانا محمد علی اپنے انگریزی ہفت روزہ "کامریڈ" کا دفتر دلّی لے آئے جو سال ڈیڑھ سال سے کلکتہ میں نکل رہا تھا۔ دلّی میں مولانا نے کوچہ چیلاں کے اس مکان[ا] کو اپنا دفتر بنایا جس میں چار پانچ سال قبل تک "مخزن" کا دفتر تھا۔ اور مولانا نے طے کیا کہ اردو کا روزنامہ اخبار "ہمدرد" بھی جاری کروں گا۔ اس کی ایڈیٹری کے لیے مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اور مینجری کے لیے محفوظ علی بدایونی بلائے گئے، اور اسسٹنٹ مینجری کے لیے سید حامد حسین بیدل شاہجہاں پوری۔ میں مولانا عبدالحلیم شرر سے لکھنؤ میں اُن کے گھر جا کر مل چکا تھا۔ مولوی محفوظ علی سے ملاقات "ہمدرد" کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا شہرہ تھا، اور مولوی محفوظ علی کے مضامین کی دھوم تھی۔ مولوی محفوظ علی کا ادیبوں میں ایک مقام ہے۔

میرا افسانہ اور میرے زمانے کی دلّی — ملا واحدی

(قلمی نسخہ)

[ا] کبھی اس مکان میں کارخانہ تھا۔ اس لیے یہ بِل والا مکان کہلاتا تھا۔ مؤلف

محفوظ علی بدایونی کی لطیف اور شستہ ظرافت کے بعد خواجہ حسن نظامی کی چٹکیوں اور گدگدیوں کا تذکرہ ایسا ہی ہے جیسا ایک جوئے رواں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یک لخت ایک طرف کو ہٹ کر کسی ٹھہرے ہوئے تالاب کے پاس آجانا۔ محفوظ علی بدایونی کی تحریروں میں جو روانی اور آمد موجود ہے اور اُن کی ظرافت میں وسعت، شگفتگی اور نفاست کے جو عناصر شامل ہیں ان کے مقابل خواجہ حسن نظامی کی ظریفانہ تحریروں میں بالعموم لفظی صنعت گری اور آورد کا رنگ پایا جاتا ہے۔

اردو ادب میں — وزیر آغا
طنز و مزاح

خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، اور ڈاکٹر وزیر آغا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ "ہمدرد" کے "تجاہلِ عارفانہ" والے دور سے متعلق ہیں جب مولانا محمد علی بڑے جتن کر کے سید محفوظ علی کو بدایوں سے دلّی کھینچ لائے تھے اور یہ دونوں کوچہ چیلان میں ساتھ رہتے تھے۔ اس وقت کا کوچہ چیلاں کیسی کیسی باکمال ہستیوں کی جلوہ گاہ تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر دلّی کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ ہے تو کوچہ چیلاں کی تاریخ دلّی کی تاریخ ہے۔

ضیاءالدین احمد برنی فرماتے ہیں:— دہلی کا ایک مشہور محلہ ہے 'کوچہ چیلاں' یہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک زمانے میں اس میں زیادہ تر مسلمانوں ہی کی آبادی تھی۔ یہ وہی محلہ ہے جہاں غدر سے پہلے دہلی کالج مرحوم کے مشہور پروفیسر مولوی امام بخش صہبائی رہا کرتے تھے۔ یہ وہی محلہ ہے جہاں منشی ذکاءاللہ کی کوٹھی واقع تھی۔ یہ وہی محلہ ہے جہاں سے مولانا محمد علی "کامریڈ" اور "ہمدرد" نکالتے تھے۔ اسی محلے کے ایک حصے میں وہ مکان ہے جہاں سر سید پیدا ہوئے تھے۔ یہیں گلی مومن خاں کے بالمقابل نواب شرف الدین خاں کی حویلی تھی جو سرسید احمد خاں کے ماموں زاد بھائی تھے:

میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اس زمانے میں علامہ راشد الخیری اور ملّا واحدی کی رہائش گاہیں بھی کوچہ چیلاں ہی میں واقع تھیں۔ وہیں مل والے مکان میں کبھی شیخ سر عبدالقادر، جو "بڑے شیخ صاحب" کہلاتے تھے اپنا رسالہ "مخزن" شیخ محمد اکرام، جو چھوٹے شیخ صاحب کہلاتے تھے، کی نگہداشت میں نکالتے تھے۔ اسی مکان سے "کامریڈ" اور "ہمدرد" شائع ہوئے اور وہیں سے بعد میں رسالہ "عصمت" نکلا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ملّا واحدی صاحب کے مکان پر خواجہ حسن نظامی آ ٹھہرے تھے اور سیّد محفوظ علی مولانا عبدالحلیم شرر اور بیدل شاہجہان پوری کبھی کبھی شام کو خواجہ صاحب کا "آنا" دینے اور ان سے خوش گپیاں لڑانے واحدی صاحب کے مکان پر پہنچ جاتے تھے۔ آج واحدی صاحب بیسویں صدی کے ثلث آخر کی ڈگر پر انیسویں صدی کے ربع آخر کے مسافر ہیں، لیکن اس وقت ان کا سن تیس سے کم تھا مگر سیّد محفوظ علی چالیس سے اور خواجہ حسن نظامی تیس سے تجاوز کر چکے تھے

سیّد محفوظ علی سے خواجہ حسن نظامی کی پہلی ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی جب خواجہ صاحب ایک زائر کی حیثیت سے بدایوں میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے والد حضرت سیّد احمدؒ، دادا حضرت علی بخاریؒ اور نانا حضرت سید عربؒ کے مزارات پر حاضری دینے گئے تھے۔ اس وقت سیّد صاحب کی عمر چونتیس سال اور خواجہ صاحب کی چھبیس سال تھی۔ ملاقاتوں کا دوسرا دور ۱۹۰۷ء کا ہے جب سیّد صاحب بمبئی میں تجارت کرتے تھے اور خواجہ صاحب وہاں سیّاح کی حیثیت سے گئے تھے۔ اس سنہ کے "سفرنامے" میں خواجہ صاحب نے سیّد صاحب کا تذکرہ کم سے کم باون مرتبہ کیا ہے۔ اسی موقع پر سیّد صاحب نے خواجہ صاحب کی پہلی ملاقات مولانا محمد علی سے کرائی، انھیں تاج ہوٹل اور پانی کے جہاز کی سیر کرائی اور مصلّے خریدوائے۔ اپنے "سفرنامے" میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:- "سیّد محفوظ علی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ واہ

Marfat.com

واہ۔ آہ آہ۔ کشفی نزول اس زور سے شروع ہوا کہ نہال ہو گئے اور پھر ویسی ہی پر اسرار باتیں"۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔" سید محفوظ علی کی دکان پر گئے۔ نماز مغرب یہیں پڑھی۔ مگر واہ کیا مزیدار نماز۔" خواجہ صاحب کے اس "سفرنامے" کے اقتباسات میری مدد کے واسطے مولانا غلام رسول مہر مرحوم اس تالیف کے لیے مرتب فرمارہے تھے۔ وہ میرے نام اپنے مراسلے ماہور مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء میں تحریر فرماتے ہیں :۔" میرے ذہن میں ان اقتباسات سے سید صاحب کی شخصیت کا جو نقشہ قائم ہوا وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو پہلے تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم کے اس دور کی تحریری تصویر بھی اس میں مل گئی جب وہ ریاست بڑودہ میں بہت بڑے افسر تھے"۔ سید صاحب اور خواجہ صاحب کی ملاقاتوں کا تیسرا دور دلی میں رہا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ بعد میں ۱۹۲۴ء میں خواجہ صاحب بدایوں ایک تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں پھر آئے جس میں نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، خان بہادر شیخ عبداللہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، وغیرہ شامل تھے۔ اس موقع پر خواجہ صاحب نے سید محفوظ علی کے یہاں حاضری دی اور کانفرنس میں "من ور دیا اور وھن ور دیا" پر تقریر فرمائی۔ یہ خواجہ صاحب اور سید صاحب کی ملاقاتوں کی آخری کڑی معلوم ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب اپنے "روزنامچہ" مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۴ء میں فرماتے ہیں : " بعد مغرب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے ہمراہ حضرت خواجہ سید احمد صاحبؒ والد ماجد حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ آج شب برات ہے، رات کے وقت جب کہ جنگل میں چاند چمک رہا تھا اس درگاہ کا دل پر عجب اثر ہوا"۔ اسی موقع پر نواب صاحب نے زور دیا تھا کہ بدایوں کو بدایوں شریف کہنا چاہیئے۔

المختصر بدایوں میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے والد ماجد کی درگاہ اور سید محفوظ علی کی ذات کا خواجہ صاحب کے دل پر بے حد اثر تھا۔ خواجہ

Marfat.com

صاحب کی جو ملاقاتیں سیّد محفوظ علی سے وقتاً فوقتاً ہوتیں ان کا نقش خواجہ صاحب کے دل و دماغ پر مرتسم رہا۔ وہ اپنے مراسلات میں سیّد محفوظ علی کو "خواجہ خضر" کے القاب سے مخاطب کرتے تھے۔ سیّد محفوظ علی کے انتقال کے چھ سال بعد اور اپنی وفات سے پانچ سال قبل وحید احمد صاحب سابق ایڈیٹر "نقیب" بدایون کے نام اپنے مراسلے مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۵۰ء میں خواجہ صاحب رقم طراز ہیں: "بہرحال میں تو اب سیّد محفوظ علی کے پاس جانے والا ہوں جن کے آپ شروع سے رفیق کار تھے، اور آپ کو اپنی جانشینی دینی چاہتا ہوں۔"

——— مؤلف

سلہ نقوش، لاہور مکاتیب نمبر۔ مؤلف

حاجی صاحب کی تقریر
اور
کارروائی جلسہ

کیا نام کہ "ہمدرد" اب سے پتھر پر چھپا کرے گا۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کامریٹ صاحب نے کاغذ کی جگہ پتھر کیوں پسند کیا۔ کیا نام جس زمانے میں ہم کشف و کرامات کا علم سیکھتے تھے تو ہم نے تواریخ میں دیکھا تھا کہ زمانہ قدیم میں اینٹوں پر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ ایک کتاب خشت الجراب تک مشہور ہے۔ ہم نے یہ بھی پڑھا ہے کہ اگلے زمانے میں راجے کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے اپنے فرمان پتھر کی چٹانوں پر کھدواتے تھے۔ چنانچہ الہ آباد میں جہاں کے اکبر اور رام ور مشہور ہیں اور نیز دہلی میں جہاں۔ ابھی گزشتہ "کو تجاہل عالمانہ" کا زور شور کا جلسہ ہوا تھا پتھر کی لاٹ صاحب پر اب تک فرمان لکھے ہیں۔ پتھر کی لاٹ کو ہم نے تعظیماً 'صاحب' کہا ہے اس لیے کہ اسے صوبے کے اعلیٰ حاکم کے ساتھ اشتراک لقب کا افتخار حاصل ہے۔ ہاں تو اس زمانے میں اینٹوں اور پتھروں پر جو فرمان لکھے جاتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کاغذ مشکل سے ملتا تھا۔ لیکن اب تو کاغذ کی بہتات کی یہ حالت ہے کہ صاحب لوگوں کے غسل خانے میں ڈھیروں پڑا رہتا ہے۔ للہذا اس زمانے میں ہمدرد کا پتھر پر چھپنا بالکل بے کار فعل ہے پھر یہ بات ہے کہ یہ پتھر پر چھپ کر خریداروں کے پاس مشکل سے جائے گا۔ اخبار کی تہ نہیں ہو سکے گی۔ ڈاک کا محصول بہت بڑھ جائے گا۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ ایک پتھر کئی کئی من کا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکیے جنھیں پوسٹ ماسٹر کہتے ہیں تھیلوں میں ڈال کر تقسیم کیسے کر سکیں گے۔ خریدار آرام کرسی پر لیٹ کر اسے پڑھ کیسے سکیں گے۔ سب سے زیادہ یہ کہ کامریٹ صاحب پر اس کی وجہ سے خرچ بہت بڑھ جائے گا۔ جب یہ اخبار کاغذ پر چھپا کرتا تھا تو ڈاک گھر تک لے جانے کے لیے کئی کئی گھوڑا گاڑیوں اور تانگوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب ہم نے سنا ہے کہ کامریٹ صاحب نے بمبئی سے پتھر ڈھونے کے چھکڑے منگوائے ہیں جنھیں کھٹارا کہتے ہیں ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ

Marfat.com

کامریڈ صاحب کے بھائی منشی شوکت علی کی رائے ہے کہ بڑے بڑے جہاز بنوائے جائیں جو کوچہ چیلان سے اسٹیشن تک اخبار بھی لیجاسکیں اور حاجیوں کو جدہ تک پہنچا آئیں۔

منشی محمد علی اور ان کے محرروں نے اس تبدیلی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ اخبار اب تک جس خط میں اور جس طرز پر چھپتا ہے لوگ اسے اچھی طرح پڑھ نہیں سکتے تھے۔ مگر ہم اس وجہ کو صحیح نہیں مان سکتے۔ کیا معنی کہ اوّل تو پڑھنے میں نہ آنا کیا معنی اس لیے کہ ہم حاجی لوگوں کو لکھنے پڑھنے سے کم تعلق ہے لیکن جب ہم تک اسے اٹک اٹک کر پڑھ لیتے ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے زیادہ پڑھنے لکھنے کے عادی ہیں فر فر پڑھ سکتے ہوں گے اور بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جو ہم سے بھی بہت کم پڑھے لکھے ہوں اور اس پر بھی اخبار کے شوقین ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لوگ اسے پڑھ نہیں سکتے تھے تو یہ کیا ضرور تھا کہ ان کا کہنا خواہ مخواہ ہی مان لیا جاتا اور ان کے نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے اخبار کی صورت شکل بدلنی پڑتی۔ مثال کے طور پر "پانیر" صاحب ہیں جو اپنا اخبار انگریزی میں نکالتے ہیں۔ اب جو لوگ انگریزی نہیں جانتے اگر وہ پانیر صاحب کو لکھیں کہ ہم آپ کے اخبار کو پڑھ نہیں سکتے فلہذا آپ مہربانی کر کے آئندہ سے اپنے اخبار کو اردو میں نکالیے تو کیا پانیر ان کا کہنا مان لیں گے۔ ہرگز نہیں۔ فلہذا یہ وجہ ہماری نظر میں صحیح و درست نہیں معلوم ہوتی۔ اگر آپ لوگوں میں کسی کو کوئی درسہ معلوم ہو تو بیان کیجیے۔"

اس پر پروفیسر قطرب کھڑے ہوئے اور نہایت اونچی آواز سے پروفیسرانہ لہجے میں فرمایا،
'جناب حاجی صاحب و صاحبان۔ میں نے نہایت معتبر ذریعے سے سنا ہے کہ منشی محمد علی صاحب نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اخباری دنیا میں سائنسی اجتہاد سے کام لیں اور اپنے اخبار کو موالید ثلاثہ پر نکالیں (اس پر حاجی صاحب نے قطع کلام کیا اور پوچھا کہ موالید ثلاثہ کیا چیز ہوتی ہے اور کہاں سے آتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے اس کی تشریح کی) حکماء و عقلاء نے موجوداتِ عالم کو تین اقسام پر منقسم کیا ہے۔ یعنی نباتات۔ جمادات اور حیوانات۔ یہی اقسام سہ گانہ موالید ثلاثہ کہلاتے ہیں۔ منشی محمد علی صاحب نے اب تک اخبار کو نباتات یعنی کاغذ پر جو گھاس پھوس درختوں کی چھال اور گودے اور نیز روئی سے بنتا ہے نکالا۔ اب وہ جمادات یعنی پتھر پر نکال رہے ہیں اور آگے چل کر حیوانات پر نکالیں گے۔ اس پر حاجی صاحب نے فرمایا

Marfat.com

کیا نام کہ حیوانات کی معرفت تو اب بھی نکالتے ہیں۔

پروفیسر قطرب کی تقریر کے بعد خان بہادر شمس العلماء مولوی ابوالخیر صاحب اپنی کرسی سے اٹھے اور فرمانے لگے:

"صاحبان یہ اخبار خطاب داران کو موقع بے موقع صاف صاف سناتا تھا اور چونکہ اکثر صاحب کرامات بزرگوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی غرض سے خان بہادروں کے فرقے میں آکر پناہ لی ہے لہذا میرا خیال تو یہ ہے کہ کسی اہل حال کو اس کی صاف گوئی گراں گزری ہے اور اسی کی دعا کا اثر ہے کہ یہ اخبار کاغذ سے پتھر کا ہو گیا۔ اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے ہیں کہ کسی صاحب دل کی توجہ سے دیکھتے دیکھتے گوشت پوست کا آدمی پتھر کا ہو گیا۔ چنانچہ سنا ہے کہ گل بکاؤلی پتھر کی ہو گئی تھی۔

شمس العلما کی تقریر کے بعد رائے مہلہ لالہ اشرفی لال چھدمی لال مصنف "مد و جزر دولت" "توازن دخل و خرچ" وغیرہ اپنی جگہ سے اٹھے اور حاضرین سے یوں مخاطب ہوئے:

"میاں صاحبو میں اس بات کے کہنے سے بالکل نہیں جھجکتا کہ میں پہلے کنگال آدمی تھا میری ماں چرخہ کاتتی اور میری بیوی چکی پیستی تھی۔ مگر آج آپ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ میں پرمیشور کی کرپا سے اس دلی میں دو کاٹن ملز میں حصہ دار اور ڈائرکٹر اور ایک فلور مل کا مالک ہوں جو آدمی اپنے خرچ کو گھٹاتا اور آمدنی کو بڑھاتا ہے وہ آگے چل کر جلد مالدار ہو جاتا ہے۔ کامریٹ والے صاحب نے خرچ گھٹانے کے خیال سے بدل سدل کیا ہوگا۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ دلی کے مسلمانوں کو شاعری اور پتنگ بازی کی لت ہے جس کے سبب سے کاغذ مہنگا ہو گیا ہے اور پرانی عمارتوں کی ٹوٹ پھوٹ سے پتھر سستا ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ طلاقی دروازے کی پرانی اینٹیں کوڑیوں کے مول بک رہی ہیں اس لیے ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کامریٹ والے صاحب نے اس میں فائدہ سمجھا ہوگا کہ اخبار کو کاغذ کی جگہ پتھر پر چھاپیں۔

رائے مہلہ کے بیٹھتے ہی بسیار نواب بہادر رازدار خاں نے کرۂ اثیر کو اپنی جریب قامت سے ناپا اور الفاظ ذیل میں حاضرین کی سامعہ نوازی فرمائی۔

"جناب حامی صاحب و حضار جلسہ ہذا۔ میں نے ایک نہایت معتبر خطاب دار سے جو میری طرح

حضور پرس ہے یہ روایت سنی ہے (روالعہدۃ الراوی) کہ ہمدرد کی تبدیلی ہئیت کذائی کا باعث اصلی یہ ہے کہ سرکاری عہدیداروں دائرۃ التراجم نے مجموعاً اور مشترکاً ایک رپورٹ پیش کی تھی جس کا ملخص یہ ہے۔

اول تو اخبارات ہمدرد و زمیندار کی متما نواز اور چینیاں پرور انشا پردازی علی العموم ہماری اسکولی و کالجی علمیت اور ہماری ترجمہ آفرینی کی قابلیت سے قدم قدم پر معنی فہمی کا اعتراف اور مطلب مدانی کا اقبال کراتی رہتی ہے اس پر مستزاد یہ ہے کہ اخبار ہمدرد کی حفاظت کی ندرت وغرابت اور نیز قاریان پروف کے فقدان لیاقت نے اپنی بوقلموں مشکلات میں بے حد و پایاں اضافہ کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادبیات اردو کی ان تماثیل سحر آور کا استحسان اور ان کی صوری لطافتوں اور معنوی نزاکتوں کا استقصا ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہے لہذا یا تو اخبار آخرالذکر کی ہئیت انطباعی میں تبدیلی کا ایما فرمایا جائے ورنہ اس محبوبہ مشرقی نژاد کو پیرایہ مغربی سے ہرمفت کرنے کا خوشگوار مگر قابلیت آزما کام قابل ترین قلم کاران چابک دست کے تفویض فرمایا جائے۔ واجب جان کر عرض کیا۔

سنا ہے کہ بر بنا اس رپورٹ کے منشی محمد علی صاحب کو ہدایت ہوئی تھی کہ یا تو روزانہ سارے اخبار ہمدرد کا انگریزی ترجمہ معہ فرہنگ و صحت نامہ الفاظ پیش کیا کیجیے ورنہ طرز طبع میں تبدیلی فرمائی جائے چنانچہ منشی محمد علی نے اہون البلیتین کو لیا اور اخبار کو پتھر پر چھاپنا شروع کیا۔

بسیار نواب بہادر کے سپرد کرسی ہونے پر حاجی صدر نے تقریر شروع کی۔

"کیا نام آپ لوگوں نے جو وجوہ بیان کیے ہیں وہ صحیح نہیں معلوم ہوتے اور اگر صحیح ہوں تو درست نہیں معلوم ہوتے۔ ہم اس بارے میں خود منشی محمد علی یا ان کے کسی چپراسی سے گفتگو کر کے اصل وجہ معلوم کر لیں گے۔ ایک بات ہم اور کہنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اگرچہ ہم اس تبدیلی کو پسند نہیں کرتے مگر ہم خوش ہیں کہ ایسا ہوا اور ملک فرانسیس کا سابق بادشاہ

Marfat.com

اور اگر وہاں کوئی بادشاہ نہیں ہے جو پٹیل یا پٹواری یا چودھری یا مقدم یا نمبردار کی جگہ کام کرتا ہے مگر وہ بھی خوش ہے کہ ایسا ہوا۔ پہلے ہم ملک فرانسیس کے سابق بادشاہ یا پٹیل یا پٹواری یا چودھری یا مقدم یا نمبردار کی خوشی کا سبب بتاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ اس اخبار کے کمپازیٹروں نے اس کا نام بہادل نگر رکھ دیا تھا جس سے ولایت میں اس کی بڑی ہنسی اڑی تھی کہ سارے فرانسیس کا بادشاہ یا پٹیل یا پٹواری یا زمیل کار یا چودھری یا نمبردار ہو کر وہ ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست کا رئیس بنا دیا گیا۔ یہ بات اسے بری معلوم ہوئی تھی اور ہم نے سنا ہے کہ اس نے دہلی کے اہالیان جنگی سے اس امر کی شکایت بھی کی تھی کیا عجیب بات ہے کہ یہ تبدیلی اس کی شکایت کا اثر ہو۔ جس سے وہ اب خوش ہوا ہے ایسی ایک وجہ ہماری ناراضی کی اور اس کے بعد اب خوشی کی ہے۔ کیا معنی انھیں کمپازیٹروں نے ۲۰ رجون کے کامریڈ میں سب سے آخر صفحے پر ہمارا نام "بغلول" لکھ دیا ہے۔ مقام غور ہے کہ ہم جیسے موقر اور معزز حاجی کو جسے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں سے ذاتی نیاز حاصل ہونے کا فخر حاصل ہے کمپازیٹر جیسے ذرہ جیسے لوگ یوں خفیف کریں کہ ہمارے نام سے ایک دم بائیس کی تخفیف کر ڈالیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں سے ذاتی نیاز حاصل ہونے کا راز غصے میں ہماری زبان سے افشا ہو گیا ورنہ ہماری عادت نہیں کہ اوچھے اڈیٹروں کی طرح ہم جا بے جا اور موقع بے موقع تذکرہ ٹھونستے پھریں کہ ہمیں فلاں ملک کے بادشاہ سے یا ہندوستان کے بڑے لاٹ صاحب یا منجھلے لاٹ صاحب یا چھوٹے لاٹ صاحب سے ذاتی نیاز ہو چکا ہے۔ ۲۰ رجون کے کامریڈ میں ہمارا نام نہایت بے وقری سے لکھا گیا ہے جس کا ہمیں رنج تھا۔ بے وقری کے علاوہ ہمیں ڈر بھی تھا یعنی یہ کہ ہمارے نام پر ویسے ہی کیا نام متواتر تخفیف کیا کم چل چکی ہے جو اب گھٹایا جائے ہمارا نام حاجی بلغ العلی تھا جو گھٹتے گھٹتے حاجی بغلول رہ گیا۔ جسے ۲۰ رجون کے کامریڈ نے بغلول کر دیا۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر اس سے زیادہ تخفیف کی جاتی تو "غول" رہ جاتا یا "بول" جو معنی کے [illegible] سے دونوں ہم جیسے معزز حاجی کے شایان نہیں۔ ہم خوش ہیں کہ جن کمپازیٹروں نے ہمارے نام کی توہین کی تھی وہ اب اخبار سے علیحدہ ہو گئے۔ اب اگلے جلسے میں ہم منشی محمد علی کو چند نصیحتیں کریں گے اور وہ اصول بتائیں گے جن پر انھیں اخبار کو چلانا چاہیے۔

ہمدرد دہلی ——— ملا کاتب علی بودھا موفی

حدیث دیگراں

(۱۰)

ہمدرد کی ادارت کے سازوسامان جس پیمانے پر شروع ہوئے، وہ اس زمانے میں اردو اخبارات کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھے۔ بدایوں کے ادیب جلیل میر محفوظ علی بی۔ اے (علیگ) کسی زمانے میں محمد علی کے نیم استاد رہ چکے تھے، وہ اس وقت مالک و مدیر "ہمدرد" کے مشیرِ خاص تھے۔ انھیں کے مشورے سے ایڈیٹری کے لیے پہلے تو مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سے مراسلت رہی، لیکن پہلا تقرر بالآخر اس عہدے پر اردو زبان کے نامور ادیب و ناول نویس مولانا عبدالحلیم شرر کا ہوا۔

محمد علی

ذاتی ڈائری کے چند اوراق ۔۔۔۔۔۔عبدالماجد دریابادی

سید محفوظ علی اپنے دور کے بڑے اچھے لکھنے والوں میں تھے اور شوخ نگاری و ظرافت کے ایک طرزِ خاص کے موجد تھے۔ ظرافت ذرا اونچے اور علمی قسم کی تھی۔ عوام کی سطح سے بلند۔ قلم اور طینت دونوں کا جوہر خاص شرافت تھی۔ ہر ایک کے ہمدرد و غم خوار، بڑے صلح جو، ذاتی زندگی میں سخت متشرع اور پختہ دین دار۔

۱۹۲۴ء میں جب راقم کا جانا بدایوں ہوا تھا تو میزبانی میر صاحب ہی نے کی تھی اور اس وقت اپنے خاندانی قبرستان میں لے جاکر اپنے والد ماجد کے پائیں میں اپنی قبر کی جگہ بتائی تھی۔

بچپن میں محمد علی کے استاد شفیق رہے اور جب وہ بڑے ہوئے تو ان کے رفیق علی برادران کے حلقے کی ایک ممتاز شخصیت اور ان کے دور کی ایک

اہم یادگار دنیا سے رخصت ہوگئی۔

صدق ـــــــــ عبدالماجد دریابادی

۸ر نومبر ۱۹۴۳ء

الحمدللہ کہ مرحوم کی یاد زندہ رکھنے والے ابھی آپ کے جیسے لوگ موجود ہیں۔ مرحوم بڑے ہی مخلص، بڑے ہی شریف، وضعدار اور سچے دین دار تھے۔ اور ساتھ ہی بڑے محتاط ادیب وصاحب قلم اور نکتہ رس ومتوازن نقاد اور بڑے ہی خوش ذوق بذلہ سنج، چہرہ ایسی مولویانہ کہ کسی کو گمان بھی ان کے گریجویٹ ہونے کا نہ ہوتا۔

مکتوب دریاباد، بارہ بنکی بنام مؤلف ـــــــــ عبدالماجد دریابادی

۱۴ر اگست ۱۹۶۹ء

Marfat.com

حاجی صاحب کی تقریر

کیا نام کہ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے جلسے میں منشی محمد علی کو اخبار کے متعلق کچھ نصیحتیں کریں گے مگر ہم اس وعدے کے پابند نہیں ہیں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو ہم 'پابند' ہو ہی نہیں سکتے۔ کیا معنی کہ ہم خدا نخواستہ کوئی اونٹ یا گھوڑا نہیں کہ ٹانگ باندھ کر خدا نخواستہ کھیت میں چرنے کو چھوڑ دیے گئے ہوں۔ ہم تو آدمی ہیں جیسے ہم ثابت کر سکتے ہیں اور یہ بات ہے کہ ہم حاجی صاحب واقع ہوئے ہیں۔ اب رہے اصطلاحی معنی سو اس کی یہ کیفیت ہے کہ چونکہ اس آزادی کے زمانے میں کوئی آدمی کسی بات کا چاہے وہ وعدہ ہو یا عقیدہ اور چاہے شادی ہو یا نوکری کبھی پابند نہیں ہوا کرتا۔ فلہٰذا ہم بھی جو آدمی ہیں کسی وعدے کے کیسے پابند ہو سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی مصلحت کو دیکھ کر وعدہ پورا کر دیں۔ آج کل یہی ہوتا ہے کہ بڑے بڑے آدمی اور بڑی بڑی سلطنتیں وعدہ تو سب کچھ کر لیتے ہیں لیکن پورا جبھی کرتے ہیں جب ان کی کچھ مصلحت ہو ورنہ کچھ ضروری نہیں۔ مگر ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے لیکن ہم آپ کو ایک خبر سناتے ہیں، وھو ہٰذا یعنی یہ کہ:

کیا نام کہ بہت بڑا واقعہ فارہ بیش آگیا یعنی کامریڈ صاحب کے قلم کی تیز روزبان اور ہمارے تجاہل کے زبردست عضو "راجہ لام سین" کا یکایک اور دفعتاً کل تاریخ ۱۹ر جولائی ۱۹۱۴ء مطابق ۲۴ر شعبان ۱۳۳۲ھ بوقت نو بجے کے نکاح ہو گیا۔ اس واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ راجہ صاحب جب ایک چھوڑ دو دفعہ مزکز ہونے کے بعد بھی آزاد ہو گئے تو ان کے ظریف دوست نے ان کو سمجھایا کہ ایک دفعہ کی خطا معاف ہوتی ہے دو دفعہ کی خطا معاف ہوتی ہے مگر تیسری دفعہ کی خطا معاف نہیں ہوتی۔ اگر اب کے بھی تم نے شادی کی اور خدا نخواستہ بی بی قضا کر گئیں تو جس طرح پولیس میں دختر کشی اور مویشی کشی کے عادی مجرموں کے نام لکھے جاتے ہیں اور پکڑ دھکڑ ہوتی ہے اسی طرح تمہارا نام زوجہ کشی کے عادی مجرموں کی فہرست میں لکھا جائے گا اور گرفتار ہو جاؤ گے۔

چونکہ راجہ صاحب اپنی جرأت کو لیاقت میں منتقل کر چکے ہیں جیسے کہ ریاضی کے سوال نکالنے والے مہینوں کو دنوں میں یا روپوں کو آنے میں یا مردوں کو عورتوں میں منتقل کر لیتے ہیں۔ اس لیے وہ ڈر گئے اور ارادہ کر لیا کہ آئندہ خلیع العذار و گستہ مہار چھٹے پھرتے رہیں گے لیکن اس عرصے میں چند واقعات پے در پے اور یکے بعد دیگرے پیش آئے جن سے انھیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ ایک دن ایک مشہور اور بہ محاورہ پنجاب "ایک سنسنی خیز مقدمہ" غبن کے متعلق کامریٹ میں حالات لکھ کر اور عہدے دار ذمہ دار کو رقم مغبونہ کو اس کی عدم توجہی پر آڑے ہاتھوں لے کر جب گھر واپس آئے تو دیکھا کہ ساڑھے تین آنے کے پیسے اور دھیلے کی کوڑیاں جو چھلے کے بازو پر ڈال کر چلے گئے تھے وہ ندارد ہیں۔ ایک روز میونسپلٹی کی روشنی کی بد انتظامی کے متعلق اخبار میں ایک زبردست شکایت کا نوٹ لکھ کر مکان پہنچے تو دیکھا کہ چراغ میں تیل تک نہیں۔ کالج کے ڈائننگ ہال کے نقائص کی طرف منتظمین کالج کو متوجہ کرنے کے بعد گھر جا کر کھانا کھانے بیٹھے تو دال میں دونا چوگنا نمک پایا۔ ایک مرتبہ ہندوستان میں ہلال احمر کے قیام اور مسلمان مریضوں کے آرام کے متعلق ایک زبردست اپیل شائع کر کے گئے تو رات کو بخار آ گیا مگر گھر پہ نہ پانی پلانے والی تھی نہ پاؤں دابنے والی۔ اس لیے کہ نوکر رات کو اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ان تجربوں کے بعد راجہ صاحب کو اپنی تکالیف کی ستر پوشی کا انتظام منسوبات ازدواجی ہی کا نظر آیا۔ یہی وجہ تھی بتاریخ مذکور وقت مذکورہ انھوں نے اپنی شادی کر ڈالی۔

نکاح کے بعد ہم نے امیدواران مناکحت کے افادے کے لیے وہ فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جو اگر ضبط تحریر میں آ جاتا تو اس کا شمار (بالفاظ ہمارے زمیندار دوست[1] کے) ادبیات اردو کے بہترین معجزات میں ہوتا۔ اب ہمیں ذہول ہو گیا کہ ہم نے کیا کیا موتی بکھیرے تھے مگر جو کچھ کہا تھا اس کا ملخص یہ ہے۔

شادی کن اے رفیق[2] و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

---

[1] یعنی مولانا ظفر علی خاں، مدیر "زمیندار" لاہور۔ محی الدین

[2] کیا نام کہ ہمیں معلوم ہے کہ کامریٹ کے معنی عربی یا مصری زبان میں رفیق کے ہیں۔ فلہٰذا ہم نے کامریٹ صاحب کو رفیق لکھا۔ امید ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کو ہماری علمیت کا اس سے ثبوت مل گیا ہوگا۔ (مصنف بطور تجاہل عامیانہ)

Marfat.com

جو کچھ پند و نصیحت جس قدر ترغیب و تحریص ہم اپنے ناکتخدا حاضرین کو نثر میں کرنی چاہتے تھے وہ مولانا" زلیخا" نے اس شعر میں نظم کردی ہے یہ شعر ہمیں اتفاق سے یاد آگیا ورنہ سالہا سال کی پڑی ہوئی دستور الصبیان کا سبق اب کیسے یاد رہ سکتا ہے۔ خیر تو مقصد اس ہمارے کہنے کا یہ ہے کہ ہم نے بڑے بڑے معتبر اور ثقہ لوگوں سے سنا ہے کہ سب سے پہلا نکاح جو دنیا میں ہوا ہے وہ تھا جو باوا آدم نے اماں حوّا کے ساتھ کیا۔ آج کل کی تہذیب کی رو سے ہم پر لازم ہے کہ کسی جنٹلمین کا نام لیں تو مسٹر اور کسی لیڈی کا نام لیں تو مسز کا لفظ نام سے پہلے لگادیں اور اگر ایسا نہ کریں تو ہم پر ازالۂ حیثیت کا الزام عاید ہوسکتا ہے جو فوجداری جرم اور قابل سماعت مجسٹریٹ درجہ اوّل ہے۔ مگر چونکہ وہ جنٹلمین اور لیڈی جن کا نام ہم نے ابھی لیا ہمارے اپنے رشتہ دار ہیں فلہٰذا کسی ایسے شخص کو جو ان کے ساتھ اتنا ہی تعلق رکھتا ہو جتنا ہم رکھتے ہیں ہم پر الزام قائم کرنے کا حق نہیں۔ ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ سب سے پہلا نکاح دنیا میں وہ تھا جو باوا آدم نے اماں حوّا سے کیا اور چونکہ آج کل معمولی معمولی آدمیوں کی یادگار قائم ہورہی ہے فلہٰذا ضروری ہے کہ ان دو بڑے اور تاریخی لوگوں کی بھی یادگار قائم کی جائے اور چونکہ باوا آدم اور اماں حوّا کا کوئی کارنامہ اس سے بڑھ کر نہیں ہے کہ انھوں نے باہم نکاح کرلیا جس سے اولاد کی اس قدر ریل پیل ہوئی فلہٰذا باوا آدم اور اماں حوّا کی جو بہترین یادگار قائم کرنی چاہیئے وہ یہی ہے کہ شادی کی جائے۔ فلہٰذا ہر شخص جو اپنے آپ کو باوا آدم اور اماں حوّا کی اولاد میں کہتا ہے لازم ہے کہ ان دو جلیل القدر تاریخی بزرگوں کی یادگار قائم کرے۔ مگر ہم ایک بات بتائے دیتے ہیں یعنی یہ کہ شادی میں سہرا باندھنا مقنع ڈالنا کنگنا باندھنا اچھے اچھے (بلکہ بڑے بھی) کپڑے پہننا۔ ڈھول تاشہ بجانا اور برات کا کھانا کھلانا یادگار میں داخل نہیں۔ کس واسطے کہ اس شادی میں جس کی یادگار ہم قائم کرتے ہیں ان چیزوں میں سے ایک کا بھی وجود نہ تھا۔ آپ لوگ ہم پر اعتراض کریں گے کہ جب باوا آدم باغ میں رہتے تھے تو پھولوں کی کیا کمی ہوگی۔ فلہٰذا نوشہ کے سر پر سہرا ضرور لٹکتا ہوگا مگر ہم کہتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ باغ میں پھولوں کی کمی نہ تھی مگر کون ہے جو اس حقیقت نفس الامری سے انکار کرنے کی جرأت کرے کہ سہرا بغیر دھاگے کی مدد کے بن نہیں سکتا اور ہم ثابت کرتے ہیں کہ شادی کے وقت دھاگے کا وجود نہ تھا کیونکہ دھاگا تو اس وقت پیدا ہوا ہے جب بی بی حوّا نے چرخہ کاتنا شروع کیا اور یہ واقعہ شادی سے بہت بعد کا ہے۔ شادی سے قبل کا نہیں ہوسکتا اور اس کی

Marfat.com

عقلی دلیل یہ ہے کہ چرخہ بوڑھی عورتیں کاتا کرتی ہیں کنواری لڑکیاں نہیں کاتتیں اور اگر کوئی شخص پنجاب کا دستور پیش کرے اور حضرت بلھے شاہ کی کافی کو ثبوت میں پیش کرے کہ :

کر کتن ول دھیان کڑے

تو ہم کہیں گے کہ ہم اس بات کو نہیں مانتے کہ اماں حوا پنجابی رسوم پر عامل تھیں۔ فلہذا ہم نے ثابت کر دیا کہ جس باغ میں باوا آدم کی شادی ہوئی اس میں شادی کے دن تک چرخہ نہیں کتا اور جب چرخہ نہیں کتا تو دھاگا کہاں سے آیا اور جب دھاگا نہ تھا تو سہرا کیسا۔ یہی حال مقنع اور گگنے اور لال لال کپڑوں کا ہے۔ اب رہا تاشہ، باجا، گاجا سو اس کی یہ کیفیت ہے کہ اوّل تو اس باغ میں مرے جانور کی کھال اور تانت کہاں ملی ہوگی۔ لوہے اور تانبے کے تار کب، کیسے اور کہاں بنے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ان مزامیر کا بجانے والا کون ہوگا کیونکہ وہاں سوائے باوا جی اور اماں جی کے اور آدمی ہی کون تھا اور یہ شرارت سوائے آدمی کے اور کسے آتی ہے۔ باوا آدم کے اولاد تو شادی کے بعد ہوئی ہے اس لیے یہ بھی نہیں مان سکتے کہ کسی بیٹے نے دہل نوازی کی ہو اور ہم اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ نوشاہی شرم گینی نے باوا صاحب کو اجازت دی ہو کہ اپنی ہی شادی ہو اور آپ ہی ڈھول تاشہ بجاتے جائیں یہی کیفیت برات کے کھانے کی ہے۔ فلہذا ہم نے ثابت کر دیا کہ اس عظیم الشان شادی میں جو سب سے پہلی تھی سہرے مقنعے اور ڈھول تاشے اور برات کے کھانے کی لغویات مطلق نہ تھیں۔

اور جب اس شادی میں کوئی خلافِ شرع بات نہیں ہوئی تو ان شادیوں میں جو اس بڑی شادی کی یادگاریں کی جائیں کوئی لغویت کبھی اور کسی طرح نہ ہونی چاہیے۔

ہمیں امید ہے کہ جس طرح باوا صاحب نے اماں جی کے ساتھ اچھی طرح صلح و سازگاری سے بسر کی اور اپنی پیاری اور چہیتی اور اکلوتی بیوی کا کہنا مانا اگرچہ اس کہنا ماننے میں انھیں پریشانی و پشیمانی اٹھانی پڑی جو خدا نے اپنے فضل و کرم سے ان سے دور کر دی۔ اسی طرح موجودہ شادی کے نوشہ بھی اپنی دلھن کے ساتھ صلح و سازگاری سے بسر کریں گے اور اس کا کہنا مانتے رہیں گے۔

اب ہم اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں اور منشی محمد علی کو نصیحتیں کرتے ہیں جس پر عمل کرنے سے ان کے اخبار میں ترقی ہو سکتی ہے۔

Marfat.com

اول: منشی محمد علی کو چاہیے کہ اخبار کو کیا نام "پالیسی" کے اصول پر چلائیں۔ اس سے ان کی ہر جگہ آؤ بھگت ہوگی اور اخبار بھی دھڑلے سے بکے گا۔ لیکن ابھی تک انھیں پالیسی کے اصول اور اس لفظ کے صحیح معنی ہی معلوم نہیں ہیں۔ ایک دفعہ ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ میاں تم ولایت میں مڈل پاس تک کا امتحان دے آئے ہو اور کیا نام منشی میاں کالے (میکالے) کی سی انگریزی لکھتے ہو بھلا ہمیں "پالیسی" کے معنی تو بتاؤ اور یہ کہ کس زبان کا لفظ ہے اور کن لفظوں سے مرکب ہے۔ اس پر انھوں نے ایک شاعر کے دیوان سے جس کا نام "ڈکشنری" ہے بڑے لمبے چوڑے معنی بتائے۔ جس سے ہم تاڑ گئے کہ جو معنی ہمیں اور نیز دو ایک اڈیٹروں اور چار پانچ لیڈروں کو جو سب کے سب حاجی یا نیم حاجی یا ربع حاجی ہیں اور نیز جملہ خطاب والوں کو معلوم ہیں ان کی انھیں ہوا بھی نہیں لگی۔ بنا برآں ہم پر لازم ہوا کہ اس لفظ کا ماخذ اور معنی اور تاریخ بتائیں۔ فلہذا سنو اور یاد رکھو اور عمل کرو کہ "پالیسی" اصل میں اس زبان کا لفظ ہے جس میں منشی فردوسی طوسی نے کریما لکھا ہے اور منشی حاجی نے بوستان کو مرتب کیا ہے جس طرح ہماری عربی فارسی کے بہت سے عمامہ پوش الفاظ صاحب لوگوں کی ولایت میں جا کر پتلون پوش ہو گئے اسی طرح یہ لفظ بھی ولایتی الفاظ کی برادری میں مل گیا ہے۔

سکندر بادشاہ جب ایران کے رستم کو شکست دے کر اپنی ولایت کو واپس گیا ہے تو اسے بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ یہ لفظ دو ٹکڑوں سے مرکب ہے۔ یعنی "پا" جس کے معنی ہیں 'پاؤں' یا قدم اور 'لیسی' جو عربی کے مصدر لیسیدن سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں چاٹنا جو غایت درجے کا تعظیمیہ عجز ہے۔ یہ لفظ اسی طرح کا ہے جیسے کاسہ لیسی اور اسی قسم کا جیسے پابوسی مگر یاد رکھنا چاہیے کہ کاسہ لیسی اور پابوسی اور پالیسی میں باعتبار صلہ یابی درجہ بدرجہ فرق ہے یعنی اگر کاسہ لیسی پر کوئی شخص خان صاحب کا خطاب پاتا ہے تو پابوسی پر نواب صاحب اور پالیسی پر لبیار نواب بہادر بنا دیا جاتا ہے۔ اب معنی اور مفہوم کو سمجھتے بوجھتے اور قدر و قیمت کو جانتے پہچانتے اگر مسٹر محمد علی پالیسی کے اصول کو اختیار کریں تو ان کے اخبار کے لیے بھی سود مند ہو اور ان کے لیے بھی عند الحاجت کام آئے۔

دوم: بہت سے باخبر عامل ہم سے یہ بات بہ صیغۂ راز کہہ چکے ہیں کہ اس اخبار میں ایسی

Marfat.com

زبردست تاثیر ہے اور اس پر ایسے زوردار موکل تعینات ہیں کہ جو شخص معنی مطلب کو سمجھ کر اس تاثیر کو سلب کرلے اس پر حضور رسی اور خطاب یابی کی آنچ حرام ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ تاثیر اچھی ہے یا بری مگر چونکہ ہماری نظر میں ناظرین اخبار کے آفتاب دولت و اقبال کے لیے حکم کسوف رکھتی ہے فلہذا منشی مشارٌالیہ کو چاہیے کہ آیندہ اپنے اخبار میں سے اس تاثیر کو نکال ڈالیں اور اگر خود انھیں ایسی طاقت نہ ہو تو کسی زبردست عامل کو جو حاجی یا خان بہادر یا نواب ہو اور جو تسخیر کواکب کی زکوٰۃ بھی دے چکا ہو بطور مدیر مقرر کردیں تاکہ ناظرین اخبار امیدوار توجہات سرکار گرامی اقتدار ہیں۔

سوم: منشی محمد علی کو چاہیے کہ لیڈروں [illegible] بار یابوں، خطاب داروں نیز آنریبلوں اور ڈیمی آفیشلوں کو اپنے اخبار میں کبھی برا نہ کہیں اور نہ ان سے اختلاف کریں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بدی کے فرشتے معمولی آدمیوں کو برا کہنے یا اُن سے اختلاف کرنے کا تو صرف رجسٹر میں نوٹ ہی کرلیتے ہیں لیکن لیڈروں، باریابوں اور خطاب داروں، آفیشلوں اور ڈیمی آفیشلوں کو برا کہنے یا ان سے اختلاف کرنے پر بڑی سخت رپورٹ کردیتے ہیں جس کی بنا پر عاقبت میں زبردست بازپرس ہوتی ہے۔

چہارم: نظم کے متعلق منشی موصوف کو چاہیے کہ نقد سخن کے بجائے چاہے ادھار سخن ہی چھاپیں مگر جو کچھ وہ چھاپیں وہ کیا نام "ہیچ عیب" شعری سے پاک ہو اور ایسا ہو کہ ہم حاجی لوگوں کی سمجھ میں آجائے کیونکہ جب ہماری سمجھ میں نہ آیا تو ہم داد نہ دیں گے اور جب ہم داد نہ دیں گے تو قبر کے اس پار کون ہے جس سے داد کی توقع ہو۔ اگلے زمانے میں جو باتیں ناممکن تھیں وہ اب ماہرین فن کیمیا نے سہل کردی ہیں۔ پہلے لفظ اور معنی ایسے لازم و ملزوم تھے جیسے لہسن اور اس کی بو۔ مگر اب کیا نام کہ بڑے بڑے مدبرین سیاست نے لفظوں میں سے معنی کو ایسا نکال لیا ہے جیسا بلوے ہوئے دودھ میں سے مکھن [illegible] مصنوعی دانت والے آدمی کو آسانی ہے کہ جب چاہے دانتوں کی کمانی چڑھائے اور جب چاہے اتار لے چنانچہ بارہا ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ بعض شاعر نظم کو تو چھپنے کو بھیج دیتے ہیں مگر معنی کی کمانی بھیجنی بھول جاتے ہیں اس لیے آیندہ سے منشی متذکرہ بالا کو چاہیے کہ نظم کا پارسل وصول ہوتے ہی

اچھی طرح سے دیکھ لیں کہ معنی کی کمانی بھی ساتھ آئی ہے یا اسے شاعر صاحب قلم دان ہی میں رکھ کر بھول گئے۔

پنجم:- منشی محمد علی نے عورت اور اقتصادیات کے مضامین اس کثرت سے چھاپے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے مردوں کا دونوں چیزوں سے دل بھر گیا۔ اب طبقۂ مذکور نے طے کر لیا ہے کہ اگر آئندہ اخبار میں "عورت اور اقتصادیات" کے ساتھ ساتھ اتنے ہی کالموں میں "مرد اور افلاسیات" کا مضمون نہ چھپتا رہا تو مرد ایک دم ہڑتال کر دیں گے اور نہ اخبار لکھیں گے نہ چھاپیں گے اور نہ تقسیم کریں گے نہ پڑھیں گے نہ چندہ ادا کریں گے۔ فلہذا منشی موٰی الیہ کو ہار کر ان سب کاموں کے لیے ولایت سے ہر جہاز میں "اقتراعیات" کی کیپ منگوانی پڑے گی

ہماری رائے میں بالفعل اسی قدر نصیحتیں کافی ہیں۔ اگر ہم نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھ لیا کہ منشی محمد علی نے ہماری نصیحتوں کو شکر گزاری سے قبول کر کے ان پر عمل کیا تو ہم آئندہ وقتاً فوقتاً اور بھی نصیحتیں کرتے رہیں گے۔ والسلام

ہمدرد، دہلی ــــــــــــ ملا علی کاتب بودھا موی

۲۰ جولائی ۱۹۱۴ء

--- --- ---

حدیث دیگراں

(۱۱)

محفوظ علی نے "ہمدرد" میں حاجی صاحب، حاجی بلیغ العلیٰ اور ملّا بودھاموی کئی ناموں سے لکھا ہے۔ بعض دفعہ تو حاجی لغلول کے نام سے ملّا علی بودھاموی کو مخاطب کیا ہے۔ اس کی وجہ وہ خود جانتے ہوں گے ہماری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ بلکہ اکثر لوگوں نے حاجی لغلول کو الگ اور ملّا علی کو جدا سمجھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں محفوظ علی ہی کے دو روپ تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے حاجی لغلول اور ملّا علی دونوں ناموں سے محفوظ علی ہی لکھا کرتے تھے۔

تمکین کاظمی ________

نقوش۔ لاہور

اگست ۱۹۶۱ء

تمکین صاحب کو مغالطہ ہوا جس کی وجہ سے انھوں نے کئی ایسی تحریریں بھی سید محفوظ علی سے منسوب کر دیں جو حقیقت میں ان کی نہیں ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقوش بابت اگست ۱۹۶۱ء) دراصل "ہمدرد" کے کالم "تجاہل عامیانہ" کے لکھنے والے سید صاحب کے علاوہ محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری بھی رہے۔ فاروق صاحب علی گڑھ کے ریاضی کے ایم۔ اے تھے۔ بعد میں مسلم لیگی ایم۔ ایل۔ اے بھی رہے۔ "بزم تجاہل" میں "حاجی بلیغ العلیٰ" کا نام فاروق صاحب ہی پر چسپاں کیا گیا تھا جو بطور تخلص میں "حاجی لغلول" بن جاتا تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے فرمایا سہ

بلیغ العلےٰ تھا نام مرا اس کو دیکھیے

اتنا مروڑا یاروں نے لغلول کر دیا

فاروق صاحب کے بیٹے احمد صدیق مجنوں گورکھپوری ہیں۔ ان ہی کی رعایت سے بعد میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مضامین میں فاروق صاحب کا تذکرہ

Marfat.com

جا بجا کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون (رہبر کا گیت) میں رشید صاحب فرماتے ہیں "حاجی صاحب کا عربی نام 'بلغ العلیٰ' اور فارسی 'جیب زیتونی' ہے۔ کچھ لوگ و سابق دیوانہ ہمدرد' اور حال 'ابوالمجنون' کہتے ہیں"۔ اب یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ حاجی صاحب ملا علی کو جہاں خطاب کرتے ہیں وہاں دراصل فاروق صاحب کا روئے سخن سید محفوظ علی صاحب کی طرف ہے۔ دونوں کے موضوعات و اسالیب جدا ہیں۔

——— مؤلف

ہمدرد" کے دورِ ثانی میں (چیف سب اڈیٹر فاروق صاحب قرار پائے۔ فاروق صاحب ابھی تک "علی گڑھیت" اور "نیچریت" کے اثر سے بالکل آزاد نہیں ہوئے تھے۔ انھیں مولانا (محمد علی) کی ہم اشناسیوں میں ملکہ تھا۔

محمد علی۔ ذاتی ڈائری ——— عبدالماجد دریا بادی

فاروق دیوانہ مرحوم کے انتقال کو ابھی دو ہی چار سال ہوئے ہیں۔ بڑے ہی ذہین تھے اور ایک معنی میں ہمہ داں۔ ریاضی تو ان کا فن ہی تھا اور فلسفہ، تاریخ، بلکہ قانون تک میں عالی دماغ، نکتہ رس۔ مزاج کے لاابالی شدت سے۔ کتاب شاید بجز "قیل وقال" کے اور کوئی نہیں چھوڑی۔

مکتوب دریا باد۔ بارہ بنکی بنام مؤلف ——— عبدالماجد دریا بادی

۱۴ اگست ۱۹۶۹ء

حاجی صاحب کی تقریر جنگ پر

کیا نام کہ ایک صبح کو جب ہم سو کر اُٹھے تو معلوم ہوا کہ یورپ میں جسے انگریزی میں ولایت اور اردو میں لندن کہتے ہیں لڑائی ہو گئی ہم نے یقین نہیں کیا اس لیے کہ اوّل تو یورپ میں ٹرکی کے پاس ایسا کوئی بڑا علاقہ باقی نہیں رہ گیا ہے جس کی وجہ سے جنگ کا اندیشہ ہو۔ دوسرے یہ خبر اخبار "ہمدرد" میں چھپی تھی اور ہر گاہ کہ ہم کو یہ گمان ہے اور صاحب لوگوں کو یقین ہے کہ اخبار "ہمدرد" کبھی کبھی ایسی خبریں چھاپ کر جسے پنجابی میں "سنسنی خیز" کہتے ہیں ملک میں شورش پھیلاتا ہے فلہذا ہم نے اس خبر کو غلط سمجھا۔ لیکن جب دوسرے دن بھی یہی خبر" پانیر" اور" انگلش مین" میں خاص رپورٹر صاحب بہادر دام اقبالہ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی نظر آئی تو ہم کو یقین ہو گیا کہ خبر صحیح ہے اور ہم کو افسوس ہوا کہ اگر آج ہمارا اپنا اخبار البعیر جاری ہوتا تو ہم بھی اس خبر کو چھاپتے اور لوگوں کو بتلاتے کہ جنگ کیسے کی جاتی ہے اور بادشاہ لوگ کیوں لڑتے ہیں اور ان کے وزیر لوگ کس طرح تقریر کرتے ہیں اور اعلان جنگ کیوں کر کیا جاتا ہے اور الٹی میٹم بھیجنے کا کیا قاعدہ ہے۔ کیا نام کہ اگلے زمانے میں جب سکندر بادشاہ اور دارا میں لڑائی ہوئی تو دارا نے سکندر کو سوا سیر سرشف جس میں سے روغن زرد یا سیاہ یا سفید یا خدا جانے کون سا رنگ نکالا جاتا ہے بھیجا تھا۔ جس کو سکندر نے اپنے کبوتروں کو کھلا دیا۔ اس کو الٹی میٹم کہتے ہیں اور یہ تمام باتیں سکندر نامہ و بہار دانش و یوسف زلیخا و مینا بازار و پنج رقعہ وغیرہ میں لکھی ہیں جو ہم کسی فرصت کے وقت میں پڑھ کر سنائیں گے۔

کیا نام کہ ہماری انجمن کا فرض ہے کہ تمام معاملات ملکی و مالی و سیاست داخلی و خارجی و رموز مملکت و نقشہ جات جنگ مثل نقشہ شطرنج و نقشہ بھیم و نقشہ کشتوار یورپ وغیرہ کے متعلق اپنی رائے محفوظ رکھے اور جب مناسب سمجھے لوگوں کو اس سے آگاہ کر دے فلہذا آج ہم لڑائی پر لیکچر دیں گے۔ وھو ھذا

کیا نام کہ لڑائی بہت ہی بری چیز ہے اس لیے کہ شرعاً ممنوع ہے اور حاجی لوگ جب حج کو جاتے ہیں تو کبھی نہیں لڑتے بلکہ آپس میں دوستی کر لیتے ہیں اور ایک ہی شغدف میں بیٹھتے ہیں یہ اور

بات ہے۔ اس زمانے میں وہ ہر بات پر آپس میں تو تو میں میں کہتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جنگ کے زمانے میں بنیے غلّہ مہنگا کر دیتے ہیں اور روپیہ بہت صرف ہوتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو چندہ دینا ہوتا ہے چنانچہ پچھلے سال روم اور روس کی لڑائی پر کئی سو روپے گولی بارود اور توپوں وغیرہ کی خریداری میں خرچ ہو گیا اور سپاہیوں کی تنخواہ بڑھائی گئی سو علیحدہ۔ کیا نام کہ ایک سپاہی کی تنخواہ میں بیس آنے سے کیا کم اضافہ ہوتا ہوگا اور بادشاہ لوگوں کے کچھ دس بیس سپاہی تو ہوتے نہیں بلکہ ایک ایک قلعے میں سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو آدمی نوکر ہوتے ہیں پھر تم سمجھ لو کتنا خرچ کرنا پڑتا ہوگا۔ فلہٰذا ہم لوگوں کو چاہیئے کہ اپنی گورنمنٹ یعنی سرکار کو منع کر دیں کہ وہ جنگ میں نہ شریک ہو اور اگر وہ نہ مانے تو لڑنے دیں بلکہ ممکن ہو تو مدد کریں۔ یعنی قطرب سچ کہنا۔ حاجیوں کا ایک رسالہ الگ تیار ہو تو کیسا (حاجی صاحب تقریر کے درمیان میں ہمیشہ بے تکلفی شروع کر دیتے ہیں لیکن اتنی زیادہ گھریلو زبان میں انھوں نے کبھی تقریر نہیں کی تھی۔ پروفیسر قطرب نے حاجی صاحب کے چہرے کو استعجاب سے دیکھا اور گردن ہلا کر خاموش ہو رہے) کیا نام کہ حاجیوں کے رسالے کے بھیجنے سے بہت فائدے ہیں۔ اوّل تو کیا عجب ہے کہ جاتے یا آتے راستے میں حج بھی مل جائے اور اگر حج نہ بھی ملا تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے جو حاجیوں کے بہت بڑے خیر خواہ ہیں ضرور ملاقات ہو گی بلکہ ممکن ہوا تو ہم ان کو اپنے رسالے کا کمانڈر ان چیف یا نائب امیر البحر یا لفٹینٹ یا کرنل یا لفٹینٹ گورنر یا جمعدار بہرحال جو کچھ عہدہ فوج میں حاکم لوگوں کا ہوتا ہے بنائیں۔ اس لیے کہ وہ واقف ہیں تمام امراض حاجیانہ سے۔ مثلاً طاعون و چیچک و ہیضہ و نہر زبیدہ کی خشکی و تری و سیلاب و طغیانی جو عرب کے ریگستان میں بہ کثرت آتی رہتی ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ حاجی لوگ مکّہ اور مدینہ کے راستے میں ہوتے ہیں اور حاجیوں کی واری ونا واری و افلاس و تونگری و گداگری وغیرہ جو جدّہ میں بہ کثرت پائی جاتی ہے بقول شاعر۔ الشّاذ کالمعدوم اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن خان بہادر بھی ہیں۔ کیا نام کہ لڑائی میں بہادری کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ نہیں کہتے ہیں کہ "اے مرداں بکوشید تا جامۂ زناں مپوشید"؟

پس ثابت ہو گیا کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کا جانا بہت ضروری ہے اور لڑائی بالکل بے کار شئے ہے اور حاجیوں کا افلاس برحق ہے جس کا علاج کرنا بالکل مارلین صاحب بہادر کا فرض ہے

جنھوں نے ہندوستان کے افلاس پر ایک کتاب لکھی ہے۔

کیا نام کہ ہم ایک بہت ضروری بات بھول گئے یعنی ہم نے جنگ کی وجہ نہیں بیان کی اور ہر گاہ کہ بنائے مخاصمت نہ معلوم ہو تو لڑائی پر جانا بے سود ہے۔ فلہذا ہم سب سے پہلے اسباب جنگ بیان کریں گے۔ کیا نام کہ لڑائی کا سبب ابھی اخبار والوں نے صاف صاف بیان نہیں کیا ہے بلکہ ان کو ہی نہیں معلوم ہے کہ یہ لڑائی روم و روس کی ہے یا کسی اور کی۔ چنانچہ بعض اخبار جرمنی اور فرانس کی لڑائی کا حال لکھتے ہیں اور بعض آسٹریا سرویا کی جنگ کی کیفیت درج کرتے ہیں اور کسی اخبار میں بلجیم و جرمنی کا تنازعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب جھوٹے ہیں بلکہ واقعہ کچھ اور ہی ہے جس کی کسی کو مطلق خبر نہیں و ہو ہذا۔ یعنی یہ کہ ایک دن آسٹریا کا بڑا بیٹا شکار کھیلنے گیا تھا اور سرویا کا لڑکا مکتب سے پڑھ کر آ رہا تھا۔ ایک صاحب نے چونکنے ہو کر کہا کہ اجی حضرت آسٹریا اور سرویا آدمی تھوڑے ہیں جن کے بیٹا اور بیٹی ہو بلکہ آسٹریا بحراوقیانوس میں ایک جزیرہ ہے اور سرویا اندلس میں ایک پہاڑ ہے۔ حاجی صاحب اس اعتراض پر بہت جھنجھلائے اور یوں گویا ہوئے) کیا نام کہ ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان میں سے کون دریا ہے اور کون پہاڑ ہے مگر واقعہ یوں ہی ہے کہ دونوں اپنے اپنے گھر سے گاڑیوں پر ہوا کھانے نکلتے تھے۔ سڑک پر آمنے سامنے مڈبھیڑ ہوئی ایک کے سائیس نے دوسرے سے کہا کہ اپنا گھوڑا بغل کر دو۔ (دوسری آواز۔ جناب حاجی صاحب آپ نے تو پہلے شکار گاہ کا قصہ شروع کیا تھا اب تُندی سڑک کا واقعہ شروع کر دیا۔) اجی تم لوگوں سے کون اپنا مغز خالی کرے۔ بادشاہوں اور وزیروں میں کچھ ایک ہی بات پر جنگ تھوڑی ہوتی ہے جس بات پر یا لڑ پڑے۔ ابھی تم سے کوئی پوچھے کہ برطانیہ کا کیا بگڑتا تھا جو جرمنی سے لڑ پڑا تو بتاؤ کیا جواب دو گے۔ ان باتوں کو ہم ہی خوب سمجھتے ہیں مگر آج مفت کی زق زق بق بق میں ہمارا سر دُکھنے لگا۔ اب کوئی اور صاحب تقریر کریں۔

ملا علی کاتب بودھا موی ———— ہمدرد دہلی

حدیث دیگراں

(۱۲)

اردو میں کئی صدیوں تک تمثیل نگاری ہوتی رہی لیکن انیسویں صدی کے آخر میں محمد حسین آزاد نے اردو والوں کو اس کا درک دیا۔ اس کی تکنیک بتائی اس کا نام سمجھایا۔ انگریزی ALLEGORY کا ترجمہ انھوں نے تمثیل کیا جو زبانوں پر چڑھ جانے کی وجہ سے ایک ادبی اصطلاح بن گیا۔ ALLEGORY دو یونانی لفظوں سے مرکب ہے۔ ALLOS بمعنی دوسرا اور AGORIA بمعنی بولتے ہوئے، یعنی جس میں ایک بات کہہ کر دوسری بات مراد لی جائے۔ تمثیل کے کردار دراصل کسی دوسرے کردار کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان سے وہ مراد نہیں جو ظاہراً نظر آتا ہے بلکہ ان کے نیچے موجِ تہ نشیں کی طرح کچھ اور معنی چھپے رہتے ہیں۔ اس طرح تمثیل استعاروں کی ایک زنجیر یا لڑی ہوتی ہے۔

نگار۔ کراچی ——— گیان چند

سالنامہ ۱۹۶۶ء

سید محفوظ علی صاحب تمثیلیہ کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں۔ تمثیلیہ ایک مشکل فن ہے اور اس میں کامیابی بہت دشوار ہے۔ اس میں کامیابی کے لیے طاقت ور تخیل، زبردست شخصیت اور حساس دل اور زندہ یقین کی ضرورت ہے سید محفوظ علی میں یہ اوصاف موجود نہیں۔ "شیخ سمارالله کی صاحبزادیاں" تمثیلیہ کی صنف میں کوئی بلند پایہ جگہ پانے کے لائق نہیں۔ یہ ایک حد تک دلچسپ ضرور ہے لیکن اس کا حسن سطحی ہے، خیالات معمولی ہیں۔ اس میں نہ خطیبانہ ہیجان ہے اور نہ کوئی زندہ شعلہ زن حقیقت کا انکشاف۔

سخنہائے گفتنی ——— کلیم الدین احمد

Marfat.com

میر محفوظ علی کا طنز مولویانہ ہے اور مقصد بھی وہی ہے۔ ان کے یہاں زاویۂ نظر محدود، واقفیت سطحی اور جذبات کا تنوع مفقود ہے۔" شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" کامیاب نہیں ہے، پھر بھی کہیں کہیں اس ویرانے میں جو ثقیل الفاظ اور غیر ضروری اظہارِ علمیت کے بگولوں کی زمین ہے شگفتہ طنز آ جاتا ہے۔

خورشید الاسلام ــــــــــــ تنقیدیں

"تمثیلیہ یہاں ALLEGORY کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

ALLEGORY ادبی تحریر و انشا کی ایسی ذو معنی تخلیق ہوتی ہے جس میں کسی حقیقت کو ایک دوسری متوازی اور متشابہ افسانوی داستان یا واردات کے پردے میں استعارۂ مسلسل (SUSTAINED METAPHOR) کا سہارا لے کر بیان کیا جاتا ہے۔ تمثیلیہ میں اس کا مصنف ایسے اشارے اور کنائے فن کارانہ ہابکدستی کے ساتھ شامل کر دیتا ہے جو کردار و واقعات مقصود کی طرف قاری کا ذہن منتقل کرنے کی وافر صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ تمثیلیہ کے لیے نپا تُلا پلاٹ اور خیال کی غیر معمولی گہرائی ضروری ہوتی ہیں۔ سیاسی اور سماجی طنز کا یہ بہترین ذریعہ ہے کیونکہ بات استعاروں میں کہی جاتی ہے اس لیے افراد کی گرفت یا قانون کی دار و گیر کا امکان کم و بیش مفقود ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ تمثیلیہ نگار دل کا مطلب استعاروں میں چھپا کر افسانہ کا روپ دھارتا ہے۔

اب اصل مضمون "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" کی طرف آئیے۔ اس تمثیلیہ کا حل اسی کے اندر مضمر ہے لیکن اسے اور آسان بنانے کے لیے اس کی مزید فرہنگ پیش کر دوں۔ آئیے مضمون کے آخر سے شروع کریں۔

مضمون کے خاتمے پر راقم کے بعد مرزا غالب کے ایک مشہور مقطع پر تضمین اس طرح کی گئی ہے ؎

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف بر طرف ‎ ‎ ‎ ‎ ایں قدر دانم کہ تمغہ نام یارے داشتم

یہاں "سمعب" کا تجزیہ حرفی کیجیے تو س = سید، م = محفوظ، ع = علی اور ب = بدایونی ہے۔ اس طرح صاحبِ مضمون کا پتہ چل گیا۔

اس مکالمے میں جو کردار ہیں ان کی شرح یہ ہے۔ سماء = آسمان، فلک، غبرا = زمین، تلمیذ الرحمٰن = شاعر (الشعراء تلمیذ الرحمٰن)، آسیہ = ایشیا، روپا = یورپ، امری = امریکہ، افری = افریقہ، حسینہ = آسٹریلیا، دریائی = OCEANIA، برطو = برطانیہ، گنو = JOHN BULL، فرسو = فرانس، سلفو = روس، المو = جرمنی، حصنو = ہندو، سمنو = مسلمان اور جپو = جاپان۔

مضمون کے شروع میں "۱۱ رمضان ۱۳۳۲ھ" درج ہے۔ اس پر مصنف کا پائیں حاشیہ ہے کہ سنہ عیسوی کے لیے ملاحظہ ہو "تقویم رعد"۔ رحمت اللہ رعد کی تقویم یا کسی اور جنتری سے رجوع کیجیے تو تاریخ عیسوی مطابق تاریخ ہجری مذکور ۴ اگست ۱۹۱۴ء نکلتی ہے۔ یہ وہ تاریخ ہے جس دن یورپ کی پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تھی۔

اس مضمون میں جو مکالمات ہیں وہ اسی جنگِ عظیم میں شامل ہونے والی اقوام کا حال و کردار اور ان کی آپس کی رقابتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اختتام پر یہ فقرہ ہے "جوان مرا المو بھائیوں سے لڑ مرا" یعنی جرمنی نے حملہ کر دیا۔ غور فرمائیے اس سے زیادہ "شعلہ زن حقیقت کا انکشاف" اور کیا ہوگا جو کلیم الدین احمد کو نہیں ملا۔ رہی بات "خطیبانہ ہیجان" اور "ثقیل الفاظ" کی، تو اس بارے میں قابلِ غور یہ امر ہے کہ مضمون پانچ بہنوں کی آپس کی گفتگو کو ضبطِ تحریر میں لاتا ہے۔ اس لیے اس میں عورتوں کی بولی اور انھیں کے محاورہ و روزمرہ کا حربہ استعمال کیا گیا ہے۔ باقی مندرجہ ذیل "حدیثِ دیگراں" میں ملاحظہ فرمائیے۔

مؤلف

سید محفوظ علی کے لب و لہجہ کو تمسخر اور فقرہ بازیوں سے پیدا ہونے والی ظرافت سے دور کا لگاؤ نہیں ہے اور نہ ان کی تحریر پڑھ کر ناظر قہقہے لگانے لگتا ہے، بلکہ ان کی سنجیدگی میں شوخی اور طنز کی ایک ایسی مٹھاس ہوتی ہے کہ اس سے دماغ ایک خاص کیف و سرور محسوس کرتا ہے۔ تمثیلیہ ایک بہت مشکل فن ہے۔ اس کوچے میں قدم رکھنا ہر فن کار کے بس کی بات نہیں، مگر سید صاحب نے اس کوچے میں بھی نہایت فن کارانہ انداز میں اپنے قلم اور طبیعت کی جودت دکھائی ہے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح ——— غلام احمد فرقت کاکوروی

"شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سید کے ذہن کی رسائی اور قلم کی شگرف کاری کس کس طرح سے اور کن کن نازک اور دقیق لمحوں میں بروئے کار آئی ہے۔

گنجہائے گرانمایہ ——— رشید احمد صدیقی

ان کی تحریروں میں بول چال کی صفائی، محاورہ بندی اور ماحول کے مختلف افراد کے دلچسپ مرقعے ملتے ہیں اور ناظر کو محظوظ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" ظرافت کے اس رنگ کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔ محفوظ علی بدایونی کی اس تحریر میں جزئیات نگاری، ماحول کی عکاسی اور کرداروں کی پیش کش سب کچھ موجود ہے، لیکن دراصل اس کی سب سے بڑی خوبی وہ شگفتہ انداز نگارش ہے جو مصنف کے لبوں پر تبسم بن کر جگمگاتا ہے اور ناظرین کے دل میں گدگدی پیدا کرنے لگتا ہے، یوں کہ ماحول سے یگانگت کچھ اور بڑھ جاتی ہے اور زندگی، جس رنگ روپ میں بھی ہے، انتہائی دلکش، معزز اور خوشگوار نظر آنے لگتی ہے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح ——— وزیر آغا

Marfat.com

سید صاحب کی انشا پردازی کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان کو عورتوں کی صحیح و شستہ زبان لکھنے کا بڑا ملکہ تھا اور وہ اسی زبان میں بڑے پتے کی باتیں بڑے لطف سے بیان کر جاتے تھے۔ عورتوں کی زبان لکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا اس زبان میں اہم اور مشکل باتوں کو خوبی اور خوبصورتی سے سمونا مشکل ہے۔ "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" ان کے گہرے مطالعے اور صناعانہ چابک دستی کی بڑی اچھی مثال ہے۔ سارے مضمون میں ایک طرح کی ڈرامائیت جاری و ساری ملتی ہے۔ اس طرح کے مواد کو اس انداز سے ڈھالنا اور یہ آب و رنگ پیدا کرنا ہمارے ادب میں مدتوں یادگار رہے گا

گنجہائے گرانمایہ ——— رشید احمد صدیقی

سید صاحب کی ظرافت میں ایک طرح کی BUOYANCY ملتی ہے۔ بعضوں کی ظرافت ٹھوس اور کثیف، جیسے پانی میں سیسے کا ٹکڑا گر کر تہ نشین ہو جائے، بعضوں کی سیّال ہوتی ہے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر پھیل کر فضا میں غائب ہو گئی۔ سید کی ظرافت کی مثال "کنول کے پھول" سے دے سکتے ہیں۔ پانی کا اتار چڑھاؤ کیسا ہی ہو پھول برابر شگفتہ، جھومتا، اور تیرتا رہے گا۔

گنجہائے گرانمایہ ——— رشید احمد صدیقی

اس بحث کو یہیں چھوڑیئے: "ان کے یہاں واقفیت سطحی ہے" اس الزام کا جواب سید محفوظ علی صاحب کے تحقیقی اور تاریخی مضامین میں ڈھونڈیئے جو مشتے نمونہ از خروارے کے بطور اس مجموعے میں شامل ہیں۔

جن لوگوں نے انھیں دیکھا، سنا اور برتا ہے وہ انھیں بلا تامل علم و دانش کا ایک بحر ذخار مانتے ہیں۔ وہ ایک چلتی پھرتی قاموس العلوم تھے جس میں ادراک و آگہی، شعر و ادب، لسانیات و لغات، فلسفہ و تاریخ، مذہب و سیاسیات

کے خزینے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے تھے۔ علوم ظاہر و باطن کا وہ کون سا نغمہ ہے جو اس ساز میں نہ تھا۔ جو احباب چند لمحوں کے لیے بھی ان سے ملنے جاتے تھے، وہ کوئی نہ کوئی نئی بات اُن سے سیکھ کر اُٹھتے تھے۔

یہ بات خالی از دلچسپی نہیں کہ اُن سے علمی استفسارات کرنے والوں میں اس زمانے کے چوٹی کے لوگ تھے۔ مثلاً مولانا محمد علی، مولانا ابو الکلام آزاد، علامہ اقبال، وغیرہم۔ جس زمانے میں حضرت اقبال مسئلۂ زمان و مکان پر توجہ فرما رہے تھے، اس وقت انھوں نے سیّد محفوظ علی صاحب سے بھی ان الفاظ میں رجوع کیا تھا۔ "مخدومی جناب سیّد صاحب۔ السلام علیکم۔ کیا مسلمان ریاضی دانوں میں کوئی اس بات کا بھی قائل ہوا ہے کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں؟ یا نہیں۔ شاید نصیر الدین طوسی نے ایسے امکان کا کہیں ذکر کیا ہے۔ مگر حوالہ یاد نہیں"۔ [ا] اسی سلسلے میں سیّد صاحب نے مولانا یعقوب بخش راغبؔ قادری بدایونی مرحوم (سابق استاد دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا رسالہ "الانجم الطوالع" بھی بھجوایا۔

اس مجموعۂ مضامین کا غائر مطالعہ کر کے قارئین کرام خود اپنی رائے قائم کریں۔ میں بیدل کا ایک شعر پڑھ کر سیّد صاحب کی شخصیت سے متعلق کچھ مزید شہادتیں پیش کرتا ہوں ؎

بکلامِ بیدلؔ اگر رسی، مگذر ز جادّۂ منصفی
کہ کسے نمی طلبد ز تو صلۂ دگر مگر آفریں

مؤلف

ہر بڑی شخصیت اور ہر بڑے کارنامے کے پیچھے عام نظروں سے اوجھل بظاہر ایک نہایت معمولی اور ناقابلِ التفات لیکن دراصل پختہ کار ہستی ہوتی ہے

[ا] ملاحظہ ہو علامہ اقبال کے خطوط کا مجموعہ "اقبال نامہ"۔ مولف

اور اس کو تقویت بھی پہنچاتی رہتی ہے۔ یہ ہستی جدال و قتال کے میدان اور عیش و طرب کی محفل دونوں سے علیحدہ رہتی ہے۔ لیکن میدان و محفل دونوں میں اس کا عمل و دخل پوشیدہ رہتا ہے۔ ایک مدت تک مولانا محمد علی پر سید محفوظ علی کا اسی قسم کا اثر و تسلط رہا۔ سید صاحب کے درجے کو متعین کرنے کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ مولانا محمد علی، سید محفوظ علی سے بے جھجک ہونے کی ہمت نہ کر سکے۔ جو لوگ مولانا محمد علی کی بت شکنی اور خود شکنی سے واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سید کا وہ کون سا سکوت ساحل تھا جو سمندر کی سطوت سے باخبر تھا اور بے پروا بھی۔

گنجہائے گرانمایہ ـــــــــ رشید احمد صدیقی

ایک دفعہ ان (مولانا محمد علی) کے ایک مضمون کا ایک پروف میں نے دیکھا تھا اس میں کوئی غلطی رہ گئی۔ مزاج برہم ہوگیا۔ دفتر میں آکر مجھ پر برس پڑے میں بھی کچھ برسا اور اس وقت اپنا استعفیٰ دے کر گھر چلا آیا۔ دوسرے دن شوکت بھائی زبردستی پکڑ کر لے گئے اور میں گیا بھی۔

علی برادران ـــــــــ قاضی عبدالغفار

کچھ عرصے بعد محمد علی نے اردو میں "ہمدرد" نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے اسٹاف کی جستجو ہوئی۔ کسی صاحب نے میرا نام بھی تجویز کر دیا۔ میر محفوظ علی کے ذریعے محمد علی نے مجھے بلوایا۔ طے یہ ہوا کہ ہمدرد کی ادارت کے لیے مولوی عبدالحق کو بلایا جائے۔ مجھے یہ کام سونپا گیا کہ حیدر آباد جاؤں اور مولوی صاحب کو لے آؤں۔

میں نے "ہمدرد" کی طرف سے پیش کش کی تو مولوی صاحب خفیف سے تامل کے بعد راضی ہو گئے اور یہ تامل اس لیے تھا کہ مولوی صاحب مولانا محمد علی کے مزاج سے ذرا خائف تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نباہ نہ ہو سکے۔

Marfat.com

(بالآخر مولوی صاحب نے ہتھیار ڈال دیے (یعنی وہ حیدرآباد نہ چھوڑ سکے)۔

علی برادران ——— سید ہاشمی فرید آبادی

۱۹۲۴ء میں جب مولانا محمد علی دوبارہ "ہمدرد" جاری کرنے کے انتظامات کر رہے تھے، بھائی ابو محمد صاحب مرحوم نے مجھے رائے دی کہ میں اس ادارے سے وابستہ ہو جاؤں۔ میں نے بھی اس کو غنیمت سمجھا کہ مجھے مولانا محمد علی جیسے شخص کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے۔ چنانچہ بھائی صاحب کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

ابھی ہمدرد کے اجرا کے انتظامات ہی ہو رہے تھے کہ میں نے اس سے وابستہ ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دراصل چند ہی روز بعد میں نے محسوس کر لیا کہ میرا اور ان کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ ان کی 'ہر پدر' میں 'جورپدر' بھی شامل تھا، اور وہ بھی پوری شدت اور انتہا پسندی کے ساتھ۔

علی برادران ——— ابوالاعلیٰ مودودی

علی گڑھ پر سے ترک موالات کا سیلاب گزر چکا تھا۔ موجودہ مسلم یونیورسٹی سے قریب ہی ایک وسیع بنگلے میں مولانا محمد علی نے جامعہ اسلامیہ قائم کر دیا تھا ایک بڑے ادارے کو وجود میں لانے کے لیے، وہ بھی ایک بڑے ادارے کے مقابلے میں، مولانا محمد علی ایسی بے پناہ ہستی کم سے کم مدت میں جو کچھ کر سکتی تھی اور جو کچھ نہ کر سکتی تھی وہ سب موجود تھا۔ ہر طرف ہر قسم کے آدمی اور ہر طرح کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔

میر صاحب کی خلق شگفتگی و ملاطفت سارے ہنگامے پر غالب تھی۔ پریس کا کام جاری تھا۔ کاپی اور پروف چلے آ رہے تھے۔ کچھ لوگ ترجمے کا کام کر رہے تھے

Marfat.com

وہ بار بار میر صاحب سے رجوع کرتے تھے۔ بعض قلمی نسخوں کی تصحیح و تحشیہ میں مصروف تھے، وہ میر صاحب کے پاس آتے جاتے تھے۔ میر صاحب ہر ایک کو برجستہ اور برٹرے لطف سے مطمئن کر دیتے تھے۔ اس درمیان میں کبھی کبھی مولانا محمد علی بھی گرجتے برستے ادھر نکل آتے تھے۔ میر صاحب کے پاس پہنچتے ہی یہ "شمشیر و سناں اول" "طاؤس و رباب آخر" میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے شعلہ و شبنم کا قران بھی دیدنی تھا!

گنجہائے گرانمایہ ــــــــــ رشید احمد صدیقی

کلیم الدین احمد دعویٰ کرتے ہیں کہ سیّد محفوظ علی "زبردست شخصیت" کے مالک نہیں تھے۔ رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں۔ "جو لوگ مرحوم سے واقف نہیں، وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ پروانے کی خاک کس رونقِ محفل کی یادگار تھی۔" "زاہد تنگ نظر" اور "کافر" کی اس جنگ کا فیصلہ قارئین کرام خود ہی فرمائیں۔ میں نے شہادتیں فراہم کر دیں۔

یہ عرض کرتا چلوں کہ میں نے اس ضمن میں جہاں جہاں دیگر اکابر سے بین السطور موازنے کا پہلو اختیار کیا ہے، اس سے ایک کی برتری یا دوسرے کی کمتری ہرگز مقصود نہیں، بلکہ چند در چند پارینہ داستانوں کے آئینے میں نئے دور کے کچھ شکوک کا ازالہ منظور ہے۔ وہ سب کے سب جس جگہ بھی تھے آفتاب تھے۔

ــــــــــ مؤلف

Marfat.com

شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں

۱۱ رمضان ۱۳۳۲ھ ہجری[۱]

اظہارِ تقدس مقصود ہو تو گناہگار اور اعلانِ تورّع منظور ہو تو مکّار۔ یہ واقعہ ہے کہ مجھے مدت العمر میں شاید ہی کبھی چھپ چھپ کر اور کنسوئیاں لے کر غیر عورتوں کی گفتگو سننے کا اتفاق ہوا ہو۔ اور اگر شاذ و نادر کبھی ہوا بھی ہو تو یقیناً یہ پہلا موقع ہے کہ دد چھوڑ کر اکٹھی پانچ عورتوں اور وہ بھی اونچے درجے کی خاتونوں کو باتیں اور وہ بھی ذاتی اور خاندانی گلے شکوے کرتے سنا۔ اور سننے کے بعد ہی نہیں کہ اِس کان سنا اُس کان اڑا دیا بلکہ قلمبند بھی کر لیا اور قلمبند بھی کر لیا تو قلمدان میں بند نہ کیا بلکہ اب ڈھنڈورا پیٹنے بیٹھا ہوں۔

تمھاری اس بھری بستی میں مشکل سے کوئی سمجھدار متنفس ایسا نکلے گا جو شیخ سماء اللہ صاحب کو جانتا بلکہ اچھی طرح پہچانتا نہ ہو۔ اور ایسا شخص تو اس سے بھی زیادہ مشکل سے ملے گا جسے شیخ صاحب سے دوستی یا دشمنی۔ محبت یا عداوت کا اچھا یا برا تعلق نہ ہو۔ مگر آفریں ہے شیخ صاحب کو کہ انھیں نہ دوستوں کی دوستی کی پرواہ نہ دشمنوں کی دشمنی کا کھٹکا۔ وہ اپنے حال میں مست اور اپنے خیال میں محو ہیں اور اپنی شانِ رفعت نشان کے اعتبار سے اعلیٰ ادنیٰ دوست دشمن سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ وضعدار تو سینکڑوں ہزاروں دیکھے سُنے مگر وضعداری کی مد میں اس شخص نے مد کر دی کہ جو بات جس وقت پہلے دن کی تھی بھلا اس کا وقت ٹل تو جائے اور جس ترتیب اور جس سلسلے سے شروع کی تھی بھلا اس میں فرق پڑ تو جائے۔ سیر کا جو وقت پہلے دن مقرر ہو چکا ہے آندھی آئے مینہ آئے' اولے پڑیں' لو چلے' اس میں تبدیلی قیامت ہی آ جائے تو آئے ورنہ کیا امکان۔ بڑھاپا آ گیا مگر وہی خم دہم' وہی آن و شان قائم ہے۔ وہی البیلی چال ہے کہ جب چلتے

۱۔ سن عیسوی کے لیے دیکھیے تقویم رمضان۔ مصنف

ہیں دوستوں کے سر پر اور دشمنوں کے جگر پر پاؤں دھرتے جھومتے جھامتے ہی چلتے ہیں۔ دور کیوں جاؤ اپنے محلے کے منشی تلمذالرحمٰن ہی سے پوچھ لو کہ دنیا میں یہ کج رفتار کون مشہور ہے۔

غبرا خاتون کے ساتھ ان کی شادی کا واقعہ میری بلکہ مجھ سے زیادہ عمر والوں کی یاد سے بہت پہلے کا ہے۔ جس طرح یہ سچی بات ہے کہ شیخ صاحب ذات کے اونچے اور بہت اونچوں سے اونچے ہیں اسی طرح یہ بھی سچی بات ہے کہ بیوی ذات میں اُن سے نیچی اور بہت نیچی گری ہوئی اور حد درجہ گری ہوئی ملی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کچھ کم سچی بات نہیں ہے کہ اس سے زیادہ اونچی ذات والی بیوی خدائی بھر میں ملنی ممکن نہ تھی۔ بیوی کی ذات اگر گری ہے تو میاں ہی کی ذات سے گری ہوئی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، بیگموں اور خاتونوں کی ذات کو غبرا خاتون کی ذات سے وہی نسبت ہے جو چھاج کو دودھ سے اور بھوسی کو گیہوں سے ہے۔

جن پانچ عورتوں کی گفتگو سے باہمی کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ انھیں شیخ سماء اللہ صاحب کی صاحبزادیاں ہیں جو انھیں غبرا خاتون کے بطن سے ہیں۔ پانچوں باپ کے سایۂ عاطفت اور ماں کے آغوشِ محبت میں پل بڑھ کر ماشاء اللہ مرتب ہو چکی ہیں اور اب اپنے اپنے گھروں کی مالک ہیں۔

مجھے تو خود اعتراف ہے کہ اشخاص کی عمر اشیا کی مقدار اور اجسام کے فاصلے کا اندازہ کرنے میں مجھ سے ہمیشہ غلطی ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ مقدار اور فاصلے اور عمر میں مردوں کی عمر کا اندازہ ہمیشہ ٹھیک ٹھیک کر لیتے ہیں۔ عورت کی عمر کے اندازے میں وہ تک اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں اس لیے میں ان خاتونوں کی عمریں بقید سال و ماہ و روز نہیں لکھ سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ قیاس و تخمین سے کچھ نہ کچھ کم زیادہ لکھ دیتا لیکن کمی میں تو مضائقہ نہیں (اور مضائقہ کیسا ان خاتونوں کی شکر گزاری کا باعث ہوتا) اگر خدانخواستہ بندہ بشر ہے کہیں زیادتی ہو جاتی تو قیامت ہی آ جاتی۔ یعنی انھیں مجھ سے مفت کی شکایت بلکہ عداوت پیدا ہو جاتی۔ سب مرد جانتے ہیں کہ جو باتیں عورتوں کو ایسی ناگوار ہوتی ہیں کہ نہ برداشت ہو سکیں نہ معاف ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی عمر کا تخمینہ بڑھا کر کیا جائے۔ اس لیے زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ امر قطعی خلافِ مصلحت

Marfat.com

ہے کہ جس صنف میں آج اقتراعیات (سفریجٹ) جیسی بہادرانِ دریچہ شکن پیدا ہونے لگی ہیں اس کے پانچ افراد کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنالوں۔ آخر میرے مکان میں بھی تو دریچے، روشن دان، چوکھٹ، کواڑ، چھپّر، کھپریل خدا کے فضل سے سبھی کچھ ہیں بیٹھے بٹھائے ہلکی پھلکی جان کو فکر مول لے میری بلا۔

یہ جو پان کھائے، آنکھوں میں سرمہ، دانتوں میں مسّی اور ہاتھوں میں مہندی لگائے ڈھیلا ڈھالا کرتہ پاجامہ پہنے۔ ہلکا دھانی دوپٹہ اوڑھے، قطب کو پیٹھ کیے تکیہ لگائے بیٹھی ہیں آسیہ بیگم ہیں۔ جو عمر اور تجربے کے اعتبار سے چال ڈھال کے اعتبار سے، شکل وصورت کے اعتبار سے۔ قدو قامت کے اعتبار سے سب میں بڑی ہیں اور اس لیے سب بہنیں انھیں بڑی آپا کہتی ہیں۔ قیافہ بتا رہا ہے کہ بچپن اور جوانی کے دو دن عیش وآرام ومسرت واطمینان سے گزرے ہیں۔ تیسرا دن یعنی بڑھاپا آیا تو آلام وافکار کو ساتھ لایا جنھوں نے کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ مگر ضبط کہتا ہے "خبردار جو ایک حرف بھی زبان سے نکالا" چنانچہ آفریں ہے اس کوہِ وقار کو کہ چھاتی کے کواڑ بند کیے۔ دل میں حسرتیں اور منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی ہے۔ مجال کیا جو دل کا ترجمان زبان کو بنائے۔

آسیہ بیگم کے داہنے ہاتھ پر جو سیاہ فام خاتون آدھی ساڑھی باندھے اور آدھی اوڑھے سر کے جھلے اور اینٹھے ہوئے بالوں میں کوڑیوں اور جھوٹے موتیوں کی لڑیاں لٹکائے گلے میں کہربا کے دانوں کی مالائیں۔ ہاتھوں میں عاج کی چوڑیاں اور پاؤں میں چپلیں پہنے بیٹھی ہیں اور جو سب میں زیادہ مفلوک الحال اور شکستہ بال معلوم ہوتی ہیں افری خانم ہیں جنھیں آسیہ بیگم تو افری افری کہتی ہیں مگر باقی اور بہنیں سانولی آپا کہہ کر پکارتی ہیں۔ افری خانم کے داہنے ہاتھ کو جو دھاری دار سایہ پہنے۔ ٹوپ اوڑھے۔ عینک لگائے۔ ناک بھوں چڑھائے۔ سب سے زیادہ متین یا مغرور مگر یقیناً سب سے زیادہ متمول الگ تھلگ بیٹھی بکڑ لیتی ہیں یہ امری خانم ہیں جنھیں آسیہ بیگم تو امری اور باقی بہنیں "نئی باجی" کہہ کر پکارتی ہیں۔ آسیہ بیگم اور افری خانم کے سامنے اور امری خانم کی طرف منہ کیے جو نیم مشرقی نیم مغربی وضع بنائے، ننگے پاؤں، ساڑھی باندھے، پیوٹا کوٹ پہنے، کالر لگائے۔ ٹوپ اوڑھے بیٹھی ہیں یہ برعکس نہند نام زنگی کافور "حسینہ بیگم ہیں جنھیں آسیہ بیگم اور امری خانم تو "حسینہ" کہتی ہیں باقی سب بہنیں "دریائی بہن۔ دریائی بہن کہہ کر پکارتی ہیں۔ یہ چاروں بہنیں تو بیٹھی

Marfat.com

ہوئی ہیں لیکن پانچویں جو غالباً کیا یقیناً سب سے چھوٹی ہیں آبد بیگم کے دلہنے ہاتھ سے کچھ فاصلے پر مغرب کی جانب افری خانم کی پیٹھ پیچھے کھڑی ہوئی ہیں جو کبھی ٹہل لیتی ہیں۔ کبھی ٹھہر جاتی ہیں۔ ان کا قد چھوٹا ہے مگر جسم گداز اور گٹھا ہوا۔ منہ میں سگریٹ، آنکھوں میں گلابی ڈورے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے جو اکثر قہقہے تک ترقی کر جاتی ہے۔ ان کی وضع قطع تو امری خانم سے بالکل ملتی جلتی ہے مگر مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے " امری خانم" تو متین و خاموش، با مغرور و مدمغ شکن در ابرو اور سرکہ بر جبین با ہمہ دبے ہمہ الگ تھلگ سی بیٹھی یا لیٹی ہیں۔ برخلاف اس کے یہ تیز و طرار اور شوخ و چالاک ہے جھجکیں ایک پہلو پر قرار نہیں۔ سب سے ملتی جلتی بولتی چالتی ہے اگرچہ یہ ضرور ہے کہ اس میل جول بول چال شوخی طراری میں تعلّی تفوق اور نخوت و انانیت کا رنگ اچھا خاصا چمکتا اور چھلکتا نظر آتا ہے۔ ان کا نام شاید اس وجہ سے کہ ان کے پاس روپیہ بہت ہے یا شاید اس وجہ سے کہ ان کا رنگ نہایت سپید ہے " روپا بیگم" ہے اور سب بہنیں انھیں " روپا روپا" کہتی ہیں۔ حسینہ البتہ کبھی کبھی " چھوٹی بہنو" کہتی ہے۔

اتنا لکھنے پایا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ خاکسار ہوا تو ان سے باتوں میں مشغول برخوردار .... طولمرہ جو ماشاءاللہ اسکول کی ایک ابتدائی جماعت میں پڑھتا ہے اپنی اردو کی کتاب لے کر آ بیٹھا۔ آپ جانیے چھ سات برس کی عقل کی بساط ہی کیا۔ اب جو پایا اچھا کاغذ اور اچھا قلم تو شرارت کہو یا ناسمجھی صفحے کے بیچوں بیچ میں سطور ذیل لکھ ڈالیں۔

ایشیا سب سے بڑا براعظم ہے۔ افریقہ ایشیا سے مغرب کی طرف ہے اسے تاریک براعظم کہتے ہیں۔ امریکہ ۱۴۹۲ء میں دریافت ہوا اس لیے نئی دنیا کہلاتا ہے۔ اوشینیا، ایشیا سے جنوب و مشرق میں واقع ہے یورپ سب سے چھوٹا براعظم ہے۔

آیندہ کے لیے تو تنبیہ کر دی گئی مگر خیال ہوا کہ پٹھان کے بچے کی طرح مضمون نگاری کے میدان میں اس کا وار خالی نہ جانا چاہیے۔ لہذا بچے کی تحریر بجنسہٖ شاملِ مضمون رہنے دی جس کے لیے ناظرین سے معافی طلبی کے بعد پھر سلسلہ سخن شروع کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

روپا: بڑی آپا سلام

آسیہ: جیتی رہو۔ ٹھنڈی سہاگن، دعا دینے کو تھی کہ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو مگر درخواست سے پہلے ہی منظوری کا اثر دیکھ رہی ہوں۔ خود نہانا تو کوئی بات نہیں تم تو دودھ سے دوسروں تک کو نہلوا رہی ہو[1]۔ ماشاءاللہ وہ کثرت ہے کہ ٹین کے ڈبوں میں بند ہو ہو کر ایرا غیرا کے گھر پہنچ رہا ہے۔ پوتوں کی یہ کیفیت کہ ربھینی برامت مانیو میں ہونسی نہیں اور تمھاری سگی بہن ہو کر بھانجوں کو ہونسوں تو مجھ خالہ پر تف ہے! اپنے گھر کا تو ذکر کیا دوسروں کے گھروں میں ایسے پھل رہے ہیں جیسے کڑ دی تومڑی۔

روپا: یہ سب آپ بزرگوں کی دعا کا اثر ہے۔

آسیہ: کہو بہن، برطو، فرسو، سلفو، الموکہاں تک نام لوں سب بچی بچے اچھے ہیں؟

روپا: جی ہاں سب اچھے ہیں۔

آسیہ: برطو تو بے چارہ بڑا گنو ہے۔ فرسو بانکا چھیلا ہے۔ شام ہوئی نہیں کہ وہ خط بنوا مونچھیں چڑھا، تیڑھی ٹوپی رکھ بازار کی سیر کو نکلا۔ سلفو مٹا فیل ہے: لمبا، چوڑا، بھاری بھرکم، الفربہ، خواہ مخواہ مرد آدمی، مگر سنتی ہوں گھنا ہے۔ الموکو میں نے عرصے سے دیکھا نہیں پچھلی دفعہ جب تم لے کر آئی تھیں تب تو بڑا شریر اور چلبلا بچہ تھا۔ مگر اٹھان ماشاءاللہ اچھی تھی۔ ہونہار اور چونچال ایسا تھا کہ دونے کو پچھاڑے۔

روپا: جی ہاں۔ اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ جھگڑالو بہت ہے۔ بھائیوں کو چین نہیں لینے دیتا۔ آپ نے برطو، فرسو، سلفو کو ایسا ہلا لیا ہے کہ ہر وقت آپ ہی کے پاس بنے رہتے ہیں۔ میں بہترا بلواتی پکڑواتی ہوں مگر آپ کا گھر انھیں ایسا بھایا ہے کہ ٹلنے اور ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

آسیہ: اے ہے ملنا کیسا۔ آنکھوں سکھ، کلیجہ ٹھنڈک، ماں اور خالہ میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ سنا نہیں کہ ماں مرے ماسی جیے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ تمھارے یہاں کا سا عیش آرام مجھ غریب کے گھر کہاں۔

---

[1] ملاحظہ ہو ملک سوپ یعنی دودھ کا صابن۔ مصنف

Marfat.com

روپا :۔ آپا برا نہ مانو تو کہوں۔

آسیہ :۔ شوق سے کہو۔ بڈھوں کے اچھا برا ماننے کی پروا جوان نہیں کیا کرتے۔

روپا :۔ آپ کے گھر میں اس قدر غربت نہیں جس قدر بدتمیزی، پھوہڑپن اور گھنونا پن ہے۔ کسی کو کھانے کا سلیقہ نہیں، پہننے کی تمیز نہیں، انتظام کی عقل نہیں۔

آسیہ :۔ (آہِ سرد بھر کر) ہاں بہن سچ کہا۔ خدا کی شان، کبھی ہم ہی آس پڑوس میں تیوناے اور تمیز والے سمجھے جاتے تھے۔ سینا پرونا ہم جانتے تھے۔ کھانا پکانا ہم جانتے تھے۔ لکھنا پڑھنا ہم جانتے تھے۔ آج پھوہڑ ہم، بدتمیز ہم، گندے ہم، گھنونے ہم، مگر اس کی وجہ جانتی ہو؟ آیا پیسہ آئی مت، گیا پیسہ گئی مت۔ گانٹھ میں دام تو سب کریں سلام۔

روپا :۔ تو اب آپ کے دام کہاں گئے؟

آمری :۔ (آنکھوں چڑھا کر) کس نے کھا لیے؟

حسینہ :۔ (منہ بنا کے) کس نے چرا لیے؟

آسیہ :۔ (آہِ سرد بھر کر) کہاں گئے؟ کس نے کھا لیے؟ کس نے چرا لیے؟ کیا جواب دوں۔ بیٹیو! دکھے جی کو اور دکھانے سے کیا فایدہ۔

آمری :۔ اپنی تو ہم کہتے ہیں۔ پاک رہ بے باک رہ۔ ہمیں بڑی کے دھن سے غرض نہ چھوٹی کی دولت سے مطلب۔ نہ اودھو کا لینا، نہ مادھو کا دینا۔ اگر کبھی کبھار کچھ لیتے ہیں تو کچھ دے کر ہی لیتے ہیں۔ ویسے لینے کا ہمیں حق کیا ہے۔

آسیہ :۔ اے آمری! میں کچھ کہتی ہوں۔ میں نے لینے کا ہمیشہ گن مانا، دینے کا کبھو احسان نہیں جتایا مگر منہ پر آئی بات اب جو کہلواتی ہو تو کہتی ہوں۔ دیئے کھلونے اور لیں اشرفیاں، دیا لوہا اور لیا سونا۔ میرے گھر سے آگ لائیں نام دھرا بیسندر۔

حسینہ :۔ بیوی! اپنی تو ہم کہتے ہیں۔ ہم ناشکرے نہیں۔ کھا کے مکرے تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے۔ ہم تو نئی باجی اور چھوٹی بھنّو کو جانتے ہیں۔ انھی کا جھوٹن کھاتے اور انھی کا اترن پہنتے ہیں اب سے پہلے ہمارے گھر میں تو بھونی بھانگ بھی نہ تھی۔ جب سے انھوں نے خبر لی ہے چولھے پر توا اور گھڑے پر کٹورا ہوا ہے۔ ان کے بچے آتے تو گھر گلزار ہو گیا۔

Marfat.com

آسیہ :- بیوی بو! مجھے بحث کرنا منظور نہیں۔ اَڑی اَڑی بات طاق بیٹھے۔ میل کا بیل، سوئی کا بھالا، بات کا بتنگڑ بن جائے۔ اچھے جی برے ہو جائیں۔ اس لیے جو تم کہتی ہو سچ ہے۔

روپا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پیچھے سے دنادن دنادن توپوں کی گھن گرج آواز سنائی دی۔ سب نے پیٹھ پھیر کر دیکھا تو آگ کے شعلے بلند ہیں۔ روپا یہ دیکھ کر یہ کہتی ہوئی گھر کو بھاگی ––

"ہے ہے جوان مرا الموبھائیوں سے لڑ پڑا!"

آسیہ، بہن گھبرانا نہیں۔ اللہ تیرے گھر میں ٹھنڈک سہاگ رکھے۔ خصنو ستو کو ابھی بھیجتی ہوں اور یہاں چنتو سے بھی کہتی ہوں کہ وہ بھی اپنے نوکر چاکر لے کر جلد پہنچے۔

راقم

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف برطرف
این قدر دانم کہ ہمچو نام یارے داشتم

نقیب - بدایوں
مارچ ۱۹۱۹ء

حدیث دیگراں

(۱۳)

سید محفوظ علی صاحب کی وہ تحریریں میں نے دیکھی ہیں جو "مضامین محفوظ علی" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئیں۔ ان تحریروں میں سید صاحب کی ذہانت پوری طرح اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور زندگی کی عام اور معمولی باتوں سے بھی ایک باشعور انسان کی طرح دلچسپی لے سکتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں جگہ جگہ ذہانت کی بجلیاں سی کوندتی ہیں اور ایک تہذیب کا عکس پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے۔ میر محفوظ علی صاحب اُردو کے صاحب طرز انشاپرداز ہیں اور ان کے اسلوب میں ایک جاذبیت ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ سید محفوظ علی صاحب کی شخصیت میں ان کے وطن بدایوں کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ بدایوں کا چھوٹا سا شہر اپنی ثقافتی، علمی اور دینی روایت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس نے بعض ایسی عظیم شخصیتوں کو پیدا کیا ہے جن کو ہماری تہذیب اور ثقافتی روایت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ سید محفوظ علی صاحب بھی ان میں سے ایک ہیں۔

مکتوب لاہور بنام مؤلف ——— عبادت بریلوی

۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

بدایوں۔ میونسپل شہر اور ضلع روہیلکھنڈ کمشنری۔ اتر پردیش، ہندوستان شہر سوت ندی کے مشرقی کنارے پر بریلی سے ۲۷ میل جنوب و مغرب میں واقع ہے۔ آبادی (۱۹۶۱ء) ۵۹٫۵۸۷۔ روایات کے مطابق بدایوں ۹۰۵ء

Marfat.com

کے لگ بھگ بدھ نام کے ایک ہندو راجہ نے بسایا تھا۔ ۱۱۹۶ء میں اسے قطب الدین ایبک نے فتح کیا اور وہ دلّی کی اسلامی سلطنت کی شمالی سرحد کی اہم فوجی چوکی قرار پایا۔ وہ قطب الدین ایبک اور اس کے بعد آنے والے ہندوستان کے مسلمان سلاطین کے تحت ایک ممتاز گورنرنشین مقام رہا۔ تاآنکہ شاہجہاں نے مقامی انتظامیہ کو ۱۶۵۷ء میں بریلی منتقل کر دیا۔ ۱۸۳۸ء میں بدایوں ضلع کا صدر مقام قرار دیا گیا۔

شہر میں ایک پُرانے قلعے کے کھنڈر موجود ہیں اور ایک عالی شان جامع مسجد ہے جس کے سامنے کا حصہ ۲۸۸ فٹ اونچا ہے۔ دہلی کے سلطان شمس الدین التمش کی سرپرستی میں جو بدایوں کا گورنر رہ چکا تھا یہ مسجد ۱۲۲۳ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کی مرمت اور جلد اعلیٰ پیمانے پر چودھویں صدی، بدایوں کی شدید آتش زدگی کے بعد ۱۵۷۱-۷۲ء اور ۱۸۷۸-۷۹ء کے دوران ہوئی۔

بدایوں سڑکوں کے ذریعے گردونواح سے منسلک ہے۔ وہ شمالی مشرقی ریلوے کی مین لائن (چھوٹی لائن) پر متھرا اور بریلی کے درمیان واقع ہے۔ وہاں چند چھوٹی صنعتیں قائم ہیں۔

ضلع بدایوں (۱,۹۹۸ مربع میل، آبادی ۱۹۶۱ء ۱۴,۱۰,۲۲۹) دریائے گنگا کے وسیع میدان میں واقع ہے۔ یہ دریا اس کی جنوبی مغربی حد پر بہتا ہے۔ گنگا کی معاون ندیاں سوت، مہیوا اور رام گنگا اسے سیراب کرتی ہیں۔ ضلع میں بہت سی جھیلیں اور تالاب ہیں۔ ۸۵ فی صد آبادی کا ذریعۂ معاش زراعت ہے۔ خاص فصلیں باجرہ، دھان، گندم، چنا اور جو ہیں۔

——— انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

بدایوں کے ساتھ شریف کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس کا مستحق ہے کہ وہ ایک زمانے تک علم و فضل اور عرفان و معرفت کا مرکز رہا ہے۔ بدایوں کا

نام لیتے ہی سب سے اوّل دو بڑی باکمال اور عجیب و غریب ہستیاں سامنے آجاتی ہیں، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور عہدِ اکبر کے مشہور مورخ عبدالقادرؒ بدایونی جن کے نام کا جز ہوگیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں ہماری زبان میں "بدایوں کے للّا" ضرب المثل کے طور پر مشہور رہیں، حالانکہ وہ بستی اہلِ کمال کی بستی تھی۔

مضامین محفوظ علی ——— عبدالحق

انگریز قوم کے بارے میں واشنگٹن ارونگ نے کہا ہے کہ خاکہ اُڑانے اور مضحک نام تراشنے کے سوا مزاج کی کوئی اور صنف ایسی نہیں جس میں یہ قوم خود سے بازی لے گئی ہو۔ اس ترنگ میں انھوں نے افراد ہی کو نشانۂ ہدف نہیں بنایا بلکہ قوموں کو بھی طرح طرح کے طنز آمیز لقب بخشے، حتیٰ کہ اس دل لگی میں انھوں نے خود اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑا۔ پھر یہ کہ انھوں نے خود کو عظمت، مردانگی، اور شان و شوکت کا پتلا بنا کر پیش نہیں کیا، بلکہ اپنی ٹھیٹ، مضحکہ خیز اور جانی پہچانی قومی کمزوریوں کے نقوش کو "جان بل" کی فرضی شخصیت کے کردار کے پردے میں اجاگر کیا۔

کچھ یہی حال بدایوں والوں کا ہے۔ انھوں نے اپنی زندہ دلی سے متاثر ہو کر اپنی کمزوریوں کو "للّا" (بروزن ب ل ا) کی لغت میں سمو کر ابھارا۔ بدایوں میں "للّا" معصوم بچے کو بھی کہتے تھے اور ابلہ صفت بڑوں کو بھی۔ "انا ٹوی ٹاڈے" (انا تو ہی تا دے، کا توتلا تلفظ) وہاں زبان زد عام تھا اور اس سے طرح طرح کے لطیفے گڑھ کر منسوب تھے۔ مثلاً ایک برخوردار کو ان کی کھلائی گود میں لیے سیر کرا رہی تھی۔ اُدھر سے ایک بزرگ گزرے۔ بچے کی معصوم دلکشی سے متاثر ہوتے۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ "ارماں صاحبزادے! کیا نام ہے تمھارا؟" یہ بے چارے شرما ہی تو گئے۔ نظر نیچی کرلی۔ انا کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ بولے۔ "انا ٹوئی ٹاڈے!" ایک دوسرے سعادت آثار قرآن پاک

Marfat.com

کا درس لے رہے ہیں۔ بچپن کے توتلے پن نے ابھی ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ سبق ہے "ذٰلِکَ بِکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ۔" لیکن۔ "ذٰلِکَ بِکُلِّ" پر گاڑی اٹک گئی۔ کوشش کرتے رہے لیکن یاد نہیں آیا۔ بالآخر دوڑے دوڑے ماں کے پاس گئے اور کہنے لگے (نعوذ باللہ) "دَے لِلّے مُلّے، اماں ٹوئی بتا دے!"

اسی طرح کے مقامی لطیفے بہت سے ہیں۔ ذرا کسی سے لغزش ہوئی یا جھجک اور جھپک کا مظاہرہ ہوا کہ گرفت ہوئی۔ "بداؤں کے للّا ہوئے نا۔" اور یہ "نا" بھی خاص بدایوں کا روزمرہ ہے۔ "للّا" ہجویات میں بھی نظم ہوا ہے۔ مثالیں حاضر ہیں۔ پہلی ضیاؔ صاحب کی شان میں ہے ؎

اندھیر ہوا نام اندھیری کا ضیاؔ ہے
نادان ہے، کمسن ہے، بداؤں کا للّا ہے

یا

اوڑھنی اوڑھو للّا چپکے سے گھر میں بیٹھو
تن مُنّی سی کوئی بازار سے ڈھولک لے لو

بدایوں کی بولی تو ادبیات عالیہ تک کی توجہ کا باعث بنی۔ ایک بار ایک ناول "جمیل الشان" لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ناول نگار غالباً "حق" کے مدیر عبدالرؤف عباسی تھے۔ انھوں نے اس ناول میں خان بہادر میراں بخش بدایونی کا ایک اہم کردار پیش کیا تھا جو بے حد بالا رس، بااثر اور خوش تدبیر تھے اور جن کی بدولت لکھنؤ کی زبان کے شانہ بہ شانہ بدایوں کی بولی کھڑی تھی۔

آیئے اب میر محفوظ علی صاحب کی طرف واپس چلیں۔ مولوی عبدالحق [۱] نے بدایوں کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاؒ اور ملّا عبدالقادر بدایونیؒ کے نام لیے

---

[۱] ملاحظہ ہو "مقالات ماجد" یعنی مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین کا مجموعہ
مؤلف

ہیں۔ بدایوں میں ایک جگہ "پتنگی ٹیلہ" کے نام سے مشہور ہے یہیں حضرت نظام الدینؒ کی ولادت ہوئی تھی۔ اس جگہ سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر بیدوں ٹولہ ہے۔ یہاں ملّا عبدالقادر بدایونی کا مسکن تھا۔ ان ہر دو جگہوں سے دو۔ دو سو گز کے فاصلوں پر سید باڑہ میں میر محفوظ علی صاحب کا مولد و مسکن تھا حضرت نظام الدینؒ سے تین صدی بعد ملّا عبدالقادرؒ کا ظہور ہوا اور ملّا سے تین صدی بعد میر محفوظ علی کا۔ مسئلہ تناسخ کو اٹھانا منظور نہیں، لیکن یہ تینوں ہستیاں بدایوں کی سرزمین پر زماں و مکاں کا ایک مساوی الاضلاع مثلث بناتی ہیں، وہ مثلث جس کے ہر زاویے پر عرفان و معرفت، علم و فضل اور زہد و اتقا کے تین عالیشان ستون استادہ ہیں۔ سید محفوظ علی بلاشبہ اسی زنجیر کا ایک حلقہ اور اسی تسبیح کا ایک دانہ تھے جن سے بدایوں کی تاریخ مزیّن ہے۔

دراصل بدایوں ہر دور میں علما شعرا، مورخین، معلمین اور محققین کا گہوارا رہا۔ سارا شہر ایک بڑے یونیورسٹی کیمپس کی مانند تھا جہاں دانشور اپنے اپنے ذاتی کتب خانوں میں نادر کتابوں کے ذخیروں کے درمیان محو اور مگن رہتے تھے۔ کوئی تاریخ لکھ رہا ہے۔ کوئی ترجمہ کر رہا ہے۔ کوئی تحقیق میں مشغول ہے کوئی شعر و شاعری میں محو ہے۔ یہیں میر محفوظ علی صاحب مطالعہ، تحقیق اور نوشت میں مشغول رہتے تھے۔ کتابوں کی الماریوں کی چابیوں کا گچھا ہمیشہ کمر بند میں بندھا رہتا تھا۔

———— مؤلف

بدایوں جس کی قدامت کے متعلق مورخین کی رائے ہے کہ پانچ ہزار برس ہوئے آباد ہوا تھا۔ اس کے موسس نے اس کی اساس علم و فضل پر رکھی تھی اور علم و فضل کے دریا بہائے اگرچہ اس دور کے علما و فضلا کی بابت اس وقت کچھ نہیں معلوم ہے۔ دورِ قطبی اور شمسی میں اس شہر کو "قبۃ الاسلام" ہونے کا فخر

رہا۔ دورِ شمسی میں سینکڑوں علماء اور صاحب کمال عرب و عجم سے آکر اقامت گزیں ہوئے اور پھر اس کی خاک سے سینکڑوں صوفی، عالم و فاضل، حکیم و شاعر پیدا ہوئے۔ "طبقات ناصری" "فیروز شاہی" "منتخب التواریخ" "فرشتہ" وغیرہ وغیرہ میں بدایوں کے جستہ جستہ حالات ملتے ہیں۔

ذوالقرنین۔ بدایوں نمبر ــــــــ محمد سلیمان بدایونی

خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت بڑھتا جاتا تھا علم کی روشنی بھی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی۔ اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل بدایوں معلوم ہوتی ہے۔ حضرت سلطان الاولیا نظام الدینؒ بدایونی دہلوی وہ سیاح معرفت ہیں جنھوں نے بدایوں اور دہلی کی منزلوں کو ملا دیا۔ اس زمانے میں اس سرزمین کے دوسرے نامور مولانا علاؤالدین اصولی بدایونی (استاذ نظام الدین اولیاؒ) حاجی جمالؒ بدایونی ملتانی، رکن الدین بدایونی، خواجہ بخشی بدایونی، وغیرہ ہیں۔

حیات شبلی ــــــــ سید سلیمان ندوی

میر محفوظ علی، علی گڑھ کے نامور فرزندوں میں مولوی عبدالحق اور مولانا ظفر علی خاں کے ساتھیوں میں تھے۔ میر صاحب علم و آگہی میں اپنی ذات سے ایک دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ مذہب، تاریخ، ادب، شاعری، لغت، فلسفہ، کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر ان کی پوری نظر نہ ہو اور کوئی موضوع نہ تھا جس پر وہ اعتماد کے ساتھ گفتگو نہ کر سکتے ہوں وہ خود اپنی وضع قطع سے مشرقی روایات کا زندہ نمونہ تھے اور اپنی تحریروں میں ان اقدار کے فروغ پر زور دیتے تھے جو ان کے خیال میں ان روایات کی اساس ہیں۔ میر محفوظ علی کی ظرافت اردو میں ایک بلند سطح کے مزاح کی نادر مثال ہے۔ یہ مذاق عام پسند نہیں خاص پسند ہے۔

آج کا اردو ادب ــــــــ ابواللیث صدیقی

بدایوں کی نمائش

تاریخ کچھ ہی کہے کہ سرکار بدایوں سلطنتِ مغلیہ کا بہترین صوبہ اور بلدۂ بدایوں حاکم نشین شہر تھا ہم نے تو یہی دیکھا کہ یہاں کے لوگوں کو کھتے کی خریداری کے لیے پیلی بھیت شکر کے لیے ہاتھرس اور برتنوں کے لیے فرخ آباد جانا پڑتا تھا۔ کھتے، شکر اور برتنوں کی خریداری کے لیے باہر جانا تو پرانی بات ہوگئی علم خریدنے کے لیے بریلی ہائی اسکول اور انصاف خریدنے کے لیے ججی شاہجہاں پور جانا تو ابھی کل کی بات ہے۔

ہمیں تو یہ بھی یاد ہے کہ بدایوں سے بارہ بارہ چوبیس میل تک ریل کی سیٹی کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور یہ "خشکی سے محدود جزیرہ" بیرونی دنیا سے محض اونٹ گاڑی اور یکے کے سلسلے ہی سے مربوط و منسلک تھا۔

بزرگوں کا قول تھا کہ جس وقت بدایوں کو تین چیزیں مل جائیں گی تو اس کا شمار بھی دنیا کے بڑے شہروں میں ہونے لگے گا۔ یعنی ہائی اسکول، ریل، ججی۔ اب شکر ہے کہ یہ "معالیدِ ثلاثہ" ہمارے شہر کی دسترس میں ہیں۔ جن میں سے آخرالذکر کے لیے ہم سب کو لارڈ لا منٹر بعدہٗ سرو حال لارڈ و آئندہ خدا معلوم) مسٹن صاحب بہادر کا رہینِ منت ہونا چاہیے۔

ہائی اسکول اور ججی تو اس قسم کے "کارخانے" ہیں جیسے دوسرے بڑے شہروں میں ہوا کرتے ہیں لیکن ہماری ریلوے لائین کا سلسلۂ نسب اس خاندان سے ملتا ہے جو اپنی ٹلکے گز کی مہذب چال کے لیے مشہور ہے اور جسے ہر قدم پر اس کا خیال رہتا ہے کہ پہیے کے نیچے ہزاروں لاکھوں چونٹیوں کی جانیں ہیں۔ سنا ہے کہ ریلوے انھیں انجنوں کو استعمال کرتی ہے جو واٹ اور اسٹیون نے بطور مشق اوّل بنائے تھے۔

ہائی اسکول، ریل اور ججی پانے کے بعد بزرگوں کے قول کے مطابق بدایوں اب واقعی بڑا ہوگیا اور خدا کے فضل سے حدِ بلوغ کو پہنچ گیا جس کا ثبوت رات کے دس بجے کے بعد

Marfat.com

اچھے اچھے خاندانوں کے نوابوں کی مستانہ خرامی سے ملتا ہے۔ منجملہ بہت سے شواہد بلوغ کے ایک نمائش بھی ہے جس کا آغاز نومبر کی سترہ تاریخ سے ہوا ہے اور جس کے حسنِ انتظام کے لیے ہم کارکنانِ نمائش کو مبارک باد دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نمائش جس دماغ سے پیدا ہوئی تھی اب اس کے ہاتھوں میں نہیں ہے بلکہ اپنے پدران اصطباغی کے ہاتھوں میں ہے۔ سابق وحال کا موازنہ ومقابلہ نہ ہمارا کام ہے نہ اس کے مواقع ہمیں حاصل ہیں لیکن بہ تحقیق معلوم ہوا ہے کہ پہلے کی بہ نسبت نمائش کا طول و عرض اب بہت زیادہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بچے نے عمر کے ساتھ ساتھ جسم میں بھی ترقی کی ہے۔ یا شاید یہ ہو کہ پدراؤں کے جسم پر مختصر سی نمائش ہی زیب دیتی تھی لیکن اب جب کہ پدرانِ اصطباغی خدا کے فضل سے سب کے سب "ریگولیشن ہائٹ" (REGULATION HEIGHT) والے جسموں کے مالک ہیں تو چھوٹی سی نمائش ان کے قدوں پر کیا زیب دیتی ہے۔

جامہ ہر کس بہ قد خود دوزد

نمائش کے پروگرام میں شاعری بھی رکھی گئی تھی۔ شعر کا اشیائے نمائش کی فہرست میں شامل کیا جانا شاید اس لیے جائز سمجھا گیا ہو کہ "بافتن" کا مصدر پارچہ پوشیدنی، بوریا اور شعر اور اس قسم کی چیزوں کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ مگر سنا ہے کہ عین وقت پر ایک بحث پیدا ہو جانے سے نمائش جس طرح اور اہل حرفہ کی دستکاری سے معمور تھی۔ شعرا کی دماغ کاری سے خالی رہی۔ بحث یہ آپڑی تھی کہ اہالیانِ ڈسٹرکٹ بورڈ یہ کہتے تھے کہ "شعر کا وزن عام اجناس بازاری کی طرح سیر رائج الوقت سے ہوگا" مگر شعرا یہ احتجاج کرتے تھے کہ "جب سیر رائج الوقت کے ہوتے ہوئے افیون کے لیے وزن خاص مستعمل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ شعر کے لیے جو بہ اعتبار کیف وسرور افیون سے کسی طرح کم پایہ نہیں ہے۔ خاص وزن نہ ہو اور اس لیے وہ بجائے معمولی اور مستعمل وزن یعنی چھیانوے روپے والے سیر کے فعولن فعولن سے کیوں نہ وزن کیا جائے"۔ ڈسٹرکٹ بورڈ والوں کا یہ عذر تھا کہ "اگر آج ہم شعر کے لیے کوئی بھی

Marfat.com

دوسرا وزن چاہے وہ فعولن فعولن ہی ہو مقرر کر دیں تو کل کو مثلاً گھی والے اس تبدیلی کو سند میں پیش کر کے کہیں گے کہ جب ایک مرتبہ وزن رائج بازار بدل گیا تو ہمارے یے چالیس روپے والا سیر جو بمبئی میں چلتا ہے کیوں نہ رائج کیا جائے"۔ غرض کہ ڈسٹرکٹ بورڈ والے اپنی ضد پر اور شعرا اپنی ہٹ پر اڑے رہے اور اس نوک ومگر میں" شاعری ازمیاں گم شد"۔ منسوجاتِ قطنی وپشمی کی موجودگی میں منسوجاتِ شعری کا عدم وجود اس امر کا نہایت افسوس ناک ثبوت ہے کہ نئی روشنی میں شعر کو پارچہ پوشیدنی سے زیادہ ناقابل اعتنا سمجھا جاتا ہے۔

نمائش میں گھوڑوں کا تو پتہ نہیں مگر گھوڑوں کے علاج کا شفاخانہ مع اپنے پورے ضمیمہ جات و متعلقات کے نمائش میں موجود ہے۔ موٹر اور ہوائی جہاز کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نسل انسانی کا یہ پرانا اور تاریخی رفیق ہمیں داغِ مفارقت دے گیا۔ اس مرحوم ہستی کے رخصتی ایڈریس یا نوحۂ مفارقت کے طور پر مرزا منش خان بہادر شیخ سید محمد صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ نے نمائش میں ایک" فرسی" لیکچر دیا۔ سنا ہے کہ مخاطبت زیادہ تر خالی کرسیوں سے تھی اس لیے کہ ذی روح سامعین کی تعداد لیکچرار سے وہی نسبت رکھتی تھی جو اعشاد کو احاد سے ہے۔ ہمارے خیال میں اگر صاحب موصوف" موٹر اور طیاروں کا خیر مقدم" اپنی تقریر کا عنوان قرار دیتے تو سامعین کثرت سے تشریف لاتے۔ اس لیے کہ ہندوستانیوں کا نقش نگیں عام طور پر" اتراشحنہ مردک نام" ہے۔

نمائش میں مختلف اقسام کے گنّے اور غلّے اور پھل رکھے ہوئے ہیں۔ غلّے کو دیکھ کر ہم نے دریافت کیا کہ" پوسہ" اور" سوسہ" اور" کوسہ" اور اسی قسم کے گراں قیمت گیہوں کی پیداوار تو بہت زیادہ ہے لیکن" پرانی چال" کے گیہوں جو کسی زمانے میں روپے کے بیس پچیس سیر تک بکتے تھے کیا اُن کی کاشت ہندوستان میں بند ہو گئی ہے"۔ ایک ماہر علم زراعت نے جو وہاں موجود تھے ہمیں سمجھایا کہ جب سے" نئی چال" کے گیہوں اور دوسری قسم کے غیر ملکی بیج ہندوستان میں آنا شروع ہوئے" پرانی چال" کے غلّے کا تخم سوخت ہو گیا۔ ان صاحب سے گرانی اجناس کے

Marfat.com

متعلق دیر تک گفتگو رہی۔ اُن کا خیال ہے کہ ہندوستانی ناقدرے ہیں جو غلّہ موجود اور غلّہ معدوم میں مطلق امتیاز نہیں کرتے۔ لوگ جب تک نئی چال کے غلّے کے اجزائے ماہیتی کی خصوصیات مختصہ سے واقفیت تامہ نہ پیدا کریں گے غلط فہمی سے ہمیشہ یہی شکایت کریں گے کہ اناج پہلے سے بہت مہنگا ہوگیا ہے۔ آج کل جو غلّہ جدید آلات کشاورزی اور جدید ذرائع آب پاشی اور جدید ترین اقسام خورش زمین کی مدد سے پیدا کیا جاتا ہے۔ پہلے ضرور ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی کا تناسب "پرانی چال" کے غلّے کے اجزائے ترکیبی سے معلوم کیا جائے تب اس کا اطمینان ہوگا کہ نئی چال کا پانچ سیر غلّہ اپنے فعل کے اعتبار سے "پرانی چال" کے پچیس سیر کے برابر ہے یہ تناسب جو تازہ ترین طریقۂ تحلیل کیمیاوی سے دریافت ہوا ہے حسب ذیل ہے۔ مثال کے لیے ہم ہر قسم کا پانچ سیر غلّہ لے کر یوں تناسب ظاہر کرتے ہیں۔

پرانی چال کا غلّہ وزن پانچ سیر		نئی چال کا غلّہ وزن پانچ سیر	
۱۔ اجزائے تولید امراض	۳٫۷۴	۱۔ اجزائے تولید امراض	۴٫۷۴
۲۔ اجزائے تغذیہ اجسام	۱٫۲۵	۲۔ اجزائے تغذیہ اجسام	۱٫۲۵
۳۔ اجزائے برکت	۰٫۰۱	۳۔ اجزائے برکت	۱۹٫۰۱
میزان	۵٫۰۰ سیر	میزان	۲۵٫۰۰ سیر

تناسب مندرجہ بالا کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ جب کہ تغذیہ کُن اجزا وہی رہے اور تولید امراض کے اجزا میں کسی قدر اضافہ ہوگیا اور برکت کے اجزا تقریباً چگنے ہوگئے جس کی وجہ سے پانچ سیر غلّہ باوجود پانچ سیر ہونے کے پچیس سیر ہو جاتا ہے۔ اگر برکت کے اجزائے ترکیبی کی بیشی کا اس پر بھی یقین نہ ہو تو اس مثال سے سمجھیے۔

ایک چپراسی ہے جو پچھلے بیس پچیس سال سے چھ سات روپے ماہوار تنخواہ پا رہا ہے۔ اب سے بیس سال پہلے اس کے گھر میں کھانے والوں کی تعداد نصف درجن تھی جن کی خوراک کے لیے تین سیر روزانہ کے حساب سے مہینے میں دو من دس سیر غلّہ آتا تھا اور اس کی قیمت اوسطاً ساڑھے چار روپے ہوتی تھی اب اسی چپراسی کے یہاں بجائے نصف درجن کے ۳/۴ درجن کھانے والے ہوگئے۔ لہذا اب اس کے گھر میں ساڑھے چار سیر روزانہ کے حساب سے مہینے

Marfat.com

میں تین من پندرہ سیر غلہ خرچ ہوتا ہے جس کی قیمت کم و بیش ساڑھے بائیس روپے ہوئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کی تنخواہ میں تو بیشی نہیں ہوئی ہے اور ایک غریب چپراسی کے "دستِ غیب" میں بھی بقدر اٹھارہ روپے ماہوار کے بیشی ہونا ناممکن ہے چاہے وہ کسی آنریری حاکم ہی کا چپراسی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا بجز اس کے کہ غلہ رائج الوقت میں برکت کے اجزا کی حیرت انگیز بیشی ہو گئی اور کسی نتیجے پر پہنچ ہی نہیں سکتے۔ وہی ماہر علم زراعت فرماتے تھے کہ اگر نئی چال کے تخم کے تجربے میں خاطر خواہ کامیابی ہو گئی اور اہلِ ہند روپیہ سیر غلہ کھانے کے عادی ہو گئے تو ایسے گیہوں کا تخم منگایا جائے گا جس کا ایک دانہ ایک آدمی کے پیٹ بھرنے کو کافی ہوگا اور اس وقت ثابت ہو جائے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام گیہوں کا صرف ایک ہی دانہ کھا کر کیسے ہزاروں بچے پیدا کر سکے۔

اسی سلسلے میں انھوں نے یہ سائنسی اکتشاف بھی بیان کیا کہ "گھی کے بھاؤ کے متعلق بھی آج کل لوگ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ گھی کے مہنگا ہونے کی شکایت تو کرتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ پہلے اگر روپیہ کا سیر بھر گھی آتا تھا تو وہ محض سادہ اور غیر آمیزش گھی یعنی "روغن زرد مفرد" ہوتا تھا۔ اب جب کہ اس میں آرد آلو، روغن مہوائے مقطر، روغن کنجد مقشر اور شحم مجہول جیسی اشیا ملائی جاتی ہیں اور وہ بجائے سادہ گھی ہونے کے "روغن زرد مرکب" ہو جاتا ہے تو تجارتی اصول کے مطابق وہ کس طرح اتنی ہی مقدار میں اتنے ہی داموں میں آ سکتا ہے۔

نمائش کے میدان میں ہر روز ایک "ایٹ ہوم" ہونا بھی لازمی ہے۔ ہندوستان کے اکثر مقامات میں "ایٹ ہوم" دیکھا تو ہم نے ایک آدھ دفعہ پہلے بھی ہے مگر اپنے لفظی معنوں میں اس کا صحیح استعمال نہیں دیکھا۔ یعنی ایک ڈیرے یا قنات دار شامیانے کے زیر سایہ وسط میں ایک میز رکھ کر اس کے چاروں طرف ملا ملا کر کرسیاں رکھ دیں جن میں لوگ اس طرح سما جائیں جیسے چھوٹے گھر میں بڑا کنبہ۔ میز جو وسط میں بچھی ہے اس پر سامان تحریر نہیں بلکہ سامان تفکہ ونقل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ سامان ان لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتا ہے جو مثلاً دوسری یا تیسری

یا چوتھی قطار میں بیٹھے ہیں لہٰذا متعدد عہدیدار اسے میز سے تھالیوں میں منتقل کر کے تھوڑا تھوڑا پرشاد بانٹتے پھرتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہاں "القاسم محروم" کا فرسودہ اصول کام میں نہیں لایا جاتا۔

نمائش کی سرزمین پر شہر کی مال اور فوجداری کی بڑی، مجھولی، چھوٹی سب قسم کی کچہریاں بھی اپنے اپنے مقامات سے منتقل ہو کر آگئی ہیں جو "دل بہ یار دست بہ کار" کے مطابق نمائش میں بھی شریک ہیں اور اپنا فرض منصبی بھی ادا کرتی ہیں۔ نمائشوں میں کچہریوں کی موجودگی کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ کچہریاں فی الحقیقت عدالتی دوکانیں ہیں جن میں فیس دے کر انصاف خریدا جاتا ہے یا یہ کہ کچہریوں کی مسلوں میں " اگزبٹ" ہوتے ہیں اور " اگزبٹ" نمائشوں کے لیے ایسے لازمی ہیں جیسے پلاؤ کے لیے چاول۔

نمائش کے تفریحی پروگرام میں ایک مد لوٹا ریس (LOTA RACE) بھی تھی ایک مقام پر الٹے لوٹے رکھے ہوئے تھے۔ شہسوار ہاتھ میں ایک کاغذ پوش چوب دستی لیے ہوئے سرپٹ گھوڑا لا کر پہلے تو لوٹے کو بہ یک ضرب چوبدستی سیدھا کرتے تھے۔ پھر لاٹھی ڈال کر اٹھا لیتے تھے۔ لاٹھی پر اس طرح لوٹا لے جانا پرانے زمانے کی لڑائیوں کی یاد تازہ کرتا تھا۔ جب حریفِ فاتح حریفِ مفتوح کا سر نیزے میں چھید کر لے جاتا تھا۔ لوٹے کو انسانی سر سے وہی نسبت ہے جو نرگس کو انسانی آنکھ سے ہے۔ شہسواروں کو اس طرح لوٹا لاٹھی پر لے جاتے ہوئے دیکھ کر عجب نہیں جو بہت سے ہندوستانیوں کو غش آنے کے قریب ہو گیا ہو۔ ہم منتظمین نمائش سے التجا کرتے ہیں کہ آئندہ سال ایسی خوفناک تفریح نمائش کے پروگرام میں نہ رکھیں۔ اگر کسی خطابی " خان بہادر" یا " رائے بہادر" کو غش آگیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

پروگرام کے مطابق نمائش میں شطرنج ٹورنامنٹ بھی ہوا۔ کھلاڑیوں کے جوڑ مقرر

Marfat.com

کرنے میں شاعرانہ نکتہ آفرینی سے کام لیا گیا تھا۔ مثلاً ایک طبیب صاحب کے فریق بازی ایک مختار صاحب قرار پائے تھے۔ غالباً یہ انتخاب اس وجہ سے ہوا ہوگا کہ خاصیت جلابی کی دونوں میں قدر مشترک تھی یا یہ وجہ ہو کہ ایک کی نظر جان پر رہتی ہے تو دوسرے کی مال پر، اور ظاہر ہے کہ جان و مال جوڑ کے الفاظ ہیں۔ سنا ہے کہ "بنفشہ گاؤ زبان" "قانونِ قبضہ آراضی" سے بازی لے گیا۔ وکالت کے مقابلے میں طبابت اس سے پہلے بھی ایک دفعہ اپنے اپنے پیشے کی فضیلت کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ فریقین دیر تک دلائل و براہین کے اسلحہ سے مصروف جنگ رہے آخر میں حکیم صاحب نے یہ کہہ کر اپنے فریق کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا کہ "اگر آپ اپنے پیشے میں کوئی غلطی کریں تو وہ غلطی عدالت مقامی سے لے کر عدالت العالیہ ہائی کورٹ تک برابر طشت از بام ہوتی رہے گی لیکن اگر ہم غلطی کریں تو وہ فوراً ایسی زمین دوز ہو جاتی ہے کہ قیامت ہی میں اکھڑے گی۔"

اس ٹورنامنٹ میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایسے امیدوار بھی لیے گئے جن کی عمر سولہ سال سے کم تھی اور نابالغ کامیاب کھلاڑی کو چاندی کا ایک خاصدان انعام میں دیا جانا تجویز ہوا۔ سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کو نقرئی انعام کی چاٹ دے کر ایسے پُرمنفعت شغل میں لگانا تو حقیقت میں نئی نسل کے ساتھ خیر خواہی کا بہترین ثبوت ہے مگر شطرنج باز کو خاصدان انعام میں دینا اس وقت تک ہمیں باور نہیں آسکتا جب تک ہمیں یہ یقین نہ دلایا جائے کہ آج کل "بلیرڈ" کے کامیاب کھلاڑی کو کلہاڑی انعام میں ملنے لگے۔ اگر انعام کے لیے خاصدان مل ہی گیا تھا تو بہتر ہوتا کہ "پان خوری" کا بھی ایک ٹورنامنٹ قائم کیا جاتا۔

آخر میں ہم بہ کمال ادب اہالیانِ نمائش کو ایک فروگزاشت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں لیعنی یہ کہ جہاں اور سامان تفریح مثل گھوڑ دوڑ، شطرنج، ٹینس وغیرہ رکھے تھے وہاں ایک "بھوکا ٹورنامنٹ" بھی رکھتے۔ جو کھلاڑی اس مقابلے میں شریک ہوتے (اور آج کل بلاشبہ ان کی تعداد صدہا سے متجاوز ہوتی) انھیں جوار، باجرے یا بجھرے یا مٹرے یا منڈوے کی دو دو روٹیاں یا پاؤ پاؤ بھر بھونے چنے دیے جاتے اور جس وقت اسٹارٹر صاحب ایک دو تین کہتے کھلاڑی روٹی کے نوالے کھانے یا چنے کے پھنکے مارنے شروع کر دیتے۔ جو کھلاڑی سب سے

Marfat.com

کم وقت میں اور سب سے پہلے اپنا حصّہ تناول کرلیتا اسے سب سے پہلا اور دوسرے نمبر والے کو دوسرا انعام دیا جاتا۔ اس ٹورنامنٹ سے ایسی گرانی کے زمانے میں بہت سے سفید پوشوں کا ایک وقت تیر ہوجاتا اور لوگوں کو جلد سے جلد کھانا کھانے کی مشق بھی ہوجاتی۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ اس ٹورنامنٹ کا منتظم کسی عہدیدار سرکاری کو نہ بنایا جاتا کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ سرکاری رعب سے غریب رعایا کے دانت کھٹے ہوجاتے ہیں۔ ان ارضی بہشت کے وہ ساکنین جن کے کام و دہان مادّی رحیق مختوم اور عنب و رمان سے لذت یاب ہیں وہ تو ان روٹیوں کو طعاماً ذا غصّۃ اور "لا یسمن ولا یغنی من جوع" سمجھتے ہوں گے لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہزارہا بلکہ لکھوکھا وہ ہستیاں جن کی تخلیق "فی احسن تقویم" ہوئی ہے انفس من والسلوی مائدۃ من السماء خیال کرتیں اور اس "اطعمہ فی یوم ذی مسغبتہ" پر منعم حقیقی کی تحمید اور مطعمین مجازی کی تحسین کرتیں۔

ملّا علی آق سقال ——————
نقیب، بدایوں

حدیث دیگراں

(۱۴)

محفوظ علی صاحب کا لب ولہجہ" اودھ پنچ" کے مقابلے میں زیادہ متین و سنجیدہ ہے وہ تمسخر سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے پھبتیاں نہیں نکلتیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے قہقہے نہیں لگاتے اور نہ دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے سنجیدہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ان کے خیالات میں گہرائی نہیں اور ان کی تنقیدی قیمت نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی سنجیدگی، سبکی، لطافت، باریکی کی منافی ہے اور اکثر تو یہ ناقابل برداشت بے رنگی کا سبب ہوجاتی ہے۔

سخنہائے گفتنی

——— کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد صاحب ایک ہی سانس میں گرم و سرد دونوں سموگئے۔ وہ گومگو کی ایک غیر شعوری کشمکش سے دوچار نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تحسین کے ساتھ ساتھ تنقیص کو اس لیے روا رکھا ہے کہ وہ منصف مزاج ناقد سمجھے جائیں اور ان پر جانبداری کا الزام نہ آسکے۔ یہ رائے انھوں نے "صاحب دین" کے ایک ٹکڑے کو سامنے رکھ کر تحریر فرمائی ہے۔ دوسری طرف اس مضمون کی توصیف میں ناقدین کی آرا کا ایک انبار لگایا جا سکتا ہے۔ میں صرف دو اصحاب کی آرا کو پیش کرکے فیصلہ قارئین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں۔ ان میں سے طنز و مزاح کے دریا کے شناور غلام احمد فرقت ہیں۔ سید صاحب کا یہ مضمون نصاب کی کتابوں تک میں جگہ پا چکا ہے۔

——— مولف

Marfat.com

"شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" "یا" "صاحب دین" ظرافت کے بلند ترین معیار پر پورے اترتے ہیں۔ سید صاحب کے یہ مضامین نہ تو قہقہہ آور ہیں اور نہ ان سے لبوں پر ہنسی بیدار ہوتی ہے، بلکہ ان کی تازگی اور نفاست سے دل میں ایک روح پرور گدگدی پیدا ہوتی ہے۔

اردو ادب میں ——— غلام احمد فرقت کاکوروی

طنز و مزاح

سید محفوظ علی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں اور سلطان حیدر جوش تینوں کا نقطۂ نظر ایک ہے۔ تینوں علی گڑھ کے پرانے "گناہگار"، قدامت کے پرستار، جدیدیت کے دشمن۔ مگر تینوں کا مشاہدہ چونکہ تیز ہے اس لیے جہاں کہیں افراط و تفریط یا نشیب و فراز ملتے ہیں ان کے مضحکہ خیز پہلو دکھانے سے نہیں چوکتے۔ "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" "یا" "صاحب دین" ظرافت کے بلند ترین نصب العین پر پورے اترتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر کوئی قہقہہ نہیں لگاتا، بلکہ ہنستا بھی نہیں۔ مگر ان میں وہ تازگی، شگفتگی اور نفاست ہے کہ روح میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ظفر علی خاں اور سید محفوظ علی ایک ہی زمانے کے ہیں۔ دونوں نے ساتھ پڑھا ہے اور برسوں ساتھ رہے ہیں۔ مگر دونوں میں نقطۂ نظر ایک ہونے کے باوجود بڑا فرق ہے۔ محفوظ علی مزاح نگار ہیں اور ظفر علی خاں طنز نگار۔ آپ جانتے ہیں کہ طنز و ظرافت ایک دوسرے سے کتنے قریب ہونے پر بھی کتنے دور ہیں۔

انتخاب آل احمد سرور ——— آل احمد سرور

سید کا دور "اودھ پنچ" اور رعایات و مناسبات لفظی کے فوراً بعد کا دور ہے، اس لیے سید اور ان کے پیش روؤں کی صناعی و صنعت گری

Marfat.com

میں ربط ملتا ہے۔ البتہ یہ سید کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے پیش روؤں کے ادبی اور زوال پذیر تکنک کو ترقی دے کر اس طور سے ختم کردیا کہ اس میں مزید ترقی کی گنجائش باقی نہ چھوڑی۔ لیکن سید کو جو چیز ایک طور پر ترکے میں ملی تھی اس کو انھوں نے ادبی اور فنی نقطۂ عروج تک پہنچا کر بس نہیں کیا بلکہ "رعایات ومناسبات" سے مبصرانہ ظرافت کی تخلیق کی اور ظرافت کے تانے بانے میں طنز کی ایسی بوقلموں دھوپ چھاؤں پیدا کردی کہ فن کی ترقی کے امکانات بہت زیادہ وسیع ہوگئے۔ "صاحب دین" میں اس مبصرانہ ظرافت کے بڑے اچھے نمونے ملیں گے

گنجہائے گرانمایہ ——— رشید احمد صدیقی

مضمون "مسٹر صاحب دین" کا ایک اور پہلو توجہ طلب ہے۔ اس میں سید صاحب نے ایک واحد کردار کو اجاگر کیا ہے۔ قوت مشاہدہ کی شدت اور ہمہ گیری، خیالات کی ترتیب، اسلوب اظہار و بیان کی خوبی۔ ان سب چیزوں نے اسے خاکہ نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اردو ادب میں سیرت نگاری اور افسانہ نویسی تو موجود تھی لیکن خاکہ نگاری کی تکنیک نسبتاً نئی تھی۔

——— مؤلف

Marfat.com

مسٹر صاحب دین

گزشتہ جنگ کے نتائج بو قلموں میں سے جہاں اہلِ دنیا کو یہ احسانِ عظیم کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ فاتحین نے ضعیف قوموں کی ہمدردی و تحفّظ کے خیال سے اضعف الاقوام کے سر سے حکم رانی و جہاں بانی کے نتیجے کا بوجھ ہلکا کر دیا وہاں یہ نقصان عظیم بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ حالاتِ مابعد الحرب نے نسل انسانی کے ایک انگشت نما اور قابلِ اعتنا طبقے کو بہ حیثیت طبقے کے چراغ سحری اور آفتابِ لب بام بنا دیا۔ اس طبقے سے میری مراد یونیورسٹی زاد گروہ سے ہے جو طریقِ تعلیم اور افتادِ خیال اور وضع و قطع اور طرزِ ماند و بود کے اعتبار سے اپنی ایک جداگانہ ہستی قائم کر چکا تھا۔ کیا یہ جذبات پر خاص اثر ڈالنے والی حقیقت نہیں ہے کہ اس عجیب الخلقت گروہ کے افراد جو اب تک اپنے نام کے داہنے یا بائیں مسٹر یا اسکوائر کا عدم انضمام اپنی سب سے بڑی اور ناقابل معافی توہین سمجھتے تھے اب مولانا، مہاتما، بطل حریت اور دیش بندھو کے ناقابل التفات گروہوں میں ضم ہو ہو کر اپنی ہستی فنا کیے دیتے ہیں۔ وہ جنٹلمین جو جسم تو بجائے خود اپنے جذبات و خیالات اور الفاظ و عبارات تک کو بغیر کوٹ پتلون پہنائے کسی کے سامنے آنے نہیں دیتے تھے اب کھدر کے کرتے اور گاڑھے کی دھوتی یا پاجامے میں بلا کسی جھجک اور جھجک کے ہر جگہ آتے جاتے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ گاڑھے کی روئی دار فرغلوں نے کشمیر کے اوور کوٹوں کو معزول کر دیا۔ کھلے گریبان کے کرتوں نے پس دریدہ کو شکستِ فاش دے دی لیونڈر کی جگہ پسینہ نے لے لی۔ سگریٹ معدوم اور بیڑی ہر جگہ موجود۔ استرے رخساروں کے صحن میں مشق کرنے کی جگہ سروں کی چھتوں پر دوڑنے لگے۔ اگر یہی لیل و نہار ہے تو مجھے اپنے جذبات کو (عام اس سے کہ وہ انبساطی ہوں یا انقباضی) نہایت کوشش سے روک کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس جدید طبقے کو چند زمانہ شناس بزرگوں نے برا بھلا سن کر اور دکھ درد سہہ کر پنجاہ سالہ کوشش و کاوش کے بعد پیدا کر پایا تھا اور جسے ہر شہر ہر قصبے بلکہ ہر بڑے گاؤں کی گلی

Marfat.com

کوچوں میں دیکھنے کی پچاس چالیس برس سے آنکھیں عادی ہوگئی تھیں وہ اب سے دو چار برس کے اندر اندر ایسا معدوم و مفقود ہو جائے گا کہ اس کا ایک فرد نمونے کے طور پر عجائب خانے میں رکھنے کو بھی تو نہ ملے گا اور مولوی صاحبان خوش ہو ہو کر کہیں گے ۔

فسابلت علیہم السماء و الارض

کہتے ہیں کہ طوفانِ نوح سے پہلے سطحِ ارض کے کسی حصے پر ڈوڈو (DO-DO) اور میمتھ (MAMMOTH) نامی جانوروں کی نسل تھی ۔ خدا جانے آب و ہوا کے راس نہ آنے (یا آج کل کی اصطلاح میں) ترکِ موالات پر عامل یا غیر عامل ہونے کی وجہ سے ان دونوں کی نسل متاصل ہوگئی ۔ حیوانات کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ علمائے فن کو کئی معلومات کی وجہ سے ان دونوں کی شکل و صورت کی تشخیص و تعین میں کیسی کیسی الجھنیں اور دقتیں پیش آتی ہیں ۔ کوئی کہتا ہے کہ کارنوال میں ٹین کی کان کھودتے میمتھ کے ڈھانچ کا ایک حصہ ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھی کے سے لمبے اور سپید سے دانت ہوتے تھے ۔ دوسرا لکھتا ہے کہ ملبوان میں کوئلے کا غار تلاش کرتے میمتھ کے ڈھانچ کا ایک حصہ ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دانت بارہ سنگھے کے سینگ کی طرح شاخدار ہوتے تھے ۔

ان مثالوں کے بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے بھی بہت سے ایسے حیوان تھے جو ہمارے اس سیّارے پر بستے تھے اور جو بعد میں معدوم النسل ہو گئے ۔ چونکہ اُس زمانے کے علماء و مورخین نے سُستی و بے توجہی سے کام لیا اور ان کے متعلق صحیح معلومات قلمبند نہ کیے لہٰذا حیوانوں کے تفصیلی حالات آج تاریکی میں ہیں ۔

اسی طرح جب خدانخواستہ ۔۔۔۔۔ (اس فرقے کے دشمن میرا قلم پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لکھو انشاء اللہ) یہ جدید تعلیم یافتہ اور متفرنج طبقہ ڈوڈو اور میمتھ کی طرح معدوم ہو گیا اور اپنی صحیح تصویر نہ چھوڑ گیا تو آئندہ نسلیں اس کے متعلق بھی تاریکی میں رہیں گی اور اس تاریکی کا ذمہ دار اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں اور کتابوں کے مصنفوں کو قرار دیں گی ۔ یقین فرمائیے کہ مجھے تو اس وقت کے تصوّر سے آج شرم آتی ہے جب کہ آنے والے مؤرخین اور ماہرین حیوانات آج کل کے اہلیانِ قلم دوات کو جن میں خصوصیت کے ساتھ جناب

خواجہ[۱] ، مصوّرِ فطرت اور اسسٹنٹ کلکٹر جوش[۲] کے نام لیے جا سکتے ہیں، کوتاہ قلمی بلکہ اخفائے واقعات ، کے جرم کی پاداش میں ازالہ حیثیت عرفی تک پہنچنے والے الفاظ سے یاد کریں گے۔

خاکسار ذرّۂ بے مقدار نہ اہلِ قلم ہے۔ نہ مصوّر، نہ ماہر حیوانیات ہے نہ عالمِ نفسیات، سطور ذیل کی غایت جز این نیست کہ اربابِ فن کو اس ضروری اور اہم کام کی طرف دلالت علی الخیر ہو۔

یہ ایک نہایت کاواک خاکہ ہے۔ امید کہ کوئی صاحب اس سے زیادہ صحیح اور واضح خال و خط کی تصویر کھینچیں گے تاکہ مستقبل کے مورّخ اور ماہر حیوانیات کے لیے ایک کارآمد تاریخی، علمی اور نفسیاتی مواد محفوظ رہے۔

کیا حقیقت میں آپ مسٹر صاحب دین سے واقف نہیں۔ تعجب ہے میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ طول و عرض ہند کی دوسری آبادی میں کوئی لکھا پڑھا آدمی نہیں جو اسے نہ جانتا ہو۔ چاہے اب وہ اس تصویر کے پردے میں اسے پہچان نہ سکے۔ مسٹر موصوف کا سوقیانہ اور عجیب نام اس کی مشہور و زبردست شخصیت کے چہرے پر لاعلمی اور بے التفاتی کا نقاب نہیں ڈال سکتا بلکہ میں تو نام میں بھی سوقیت و عجابت کے تسلیم کرنے کو کسی طرح تیار نہیں ہوں! آخر مسلمانوں میں چراغ دین[۳]، میراں دین، شاہ دین اور ہندوؤں میں رام دین، گنگا دین، ماتا دین عام طور پر شرفا و معززین کے نام ہوتے ہی ہیں۔ بہرکیف آپ اگر مسٹر موصوف سے واقف نہیں تو معاف کیجیے یہ آپ کے عدم وقوف کا ثبوت ہے نہ اس کے عدم شہرت کا۔ اور آپ ہی جیسے حضرات کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے میں اس سبق آموز اور نتیجہ نما شخصیت کے خال و خط کا محض خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱؎ خواجہ حسن نظامی۔ مؤلف

۲؎ سلطان حیدر جوش۔ مؤلف

۳؎ ملاحظہ ہو حاجی یلملم ابن حاجی قشتمشم کی کتاب "اسماء سمیتموہا انتم و اباؤکم" جو اس

(باقی اگلے صفحے پر)

Marfat.com

علمائے یورپ کی تاریخی انکشافات میں اس مسئلے کو براہین و دلائل سے قطعی مستغنی کر دیا ہے کہ " دورِ ابوت" سے پہلے جس عصر حاضر کے شواہد توحش میں شمار کرنا چاہیے عہدِ ماضی کی سب سے بڑی تمدنی نشانی " دورِ امومت" تھا یعنی قدر شناس اور منزلت مفہم زمانے نے آج جو تفوق جنس ذکور کو بخشا ہے کہ علاوہ اناث البیت کی وہ اولاد و انساب تک پر اپنی ملکیت کا سکہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

مجت پر اس صدی کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ پہلے باب مفرد ناموں کی تقسیم مشتق، جامد، مہمل کے تفصیلی تذکرے کے بعد دوسرے باب میں مرکب ناموں کی تفریق و تفصیل ہے جن میں ایک قسم " معجونِ مرکب" بھی ہے۔ اسی سلسلے میں حاجی صاحب فرماتے ہیں" شہرت، علمیت و شرافت کے ثبوت کے لیے فی زمانہ ناموں میں جو عمل ارتقائی جاری ہے اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ کل تک جس شخص کا نام چراغ دین تھا آج وہ جزو ثانی پر الف لام بڑھا کر اپنے آپ کو چراغ الدین کہتا ہے۔ اس میں مغالطہ یہ ہے کہ وہ دین کو بجائے دین ہندی کے دین عربی یقین کرتا اور باور کراتا ہے۔ خاکسار کے نزدیک قرینِ قیاس یہ ہے کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے آستانۂ عالیہ پر دعا کرنے یا حضرت میراں سالار مسعود غازی کی منت ماننے یا کسی فقیر یا سید سے رجوع کرنے کے بعد جو لڑکے پیدا ہوں ان کے نام چراغ دین، میراں دین اور شاہ دین رکھے جائیں۔ یعنی دادۂ چراغ (دہلی) دادۂ میراں (سالار مسعود غازی) دادۂ شاہ (بوعلی قلندر بادشاہ برکت علی) اور یہ نام بالکل ایسے ہی ہیں جیسے کریم داد، رحیم داد، مولا داد، خدا داد، نبی داد، علی داد، ولی داد، میر داد، شاہ داد۔ اگر یہ قیاس صحیح نہیں ہے تو خدارا مجھے سمجھا دو کہ جن باپوں نے اپنے لڑکوں کے نام چراغ دین، میراں دین اور شاہ دین رکھے ہوں انھیں علم و مذہب کی میزان میں تول کر میں کیا سمجھوں۔ حاجی علیم صاحب کی اس کتاب کے اقتباسات ہم کبھی کبھی پیش کرتے رہیں گے۔

_____ مصنف

Marfat.com

بٹھاتا ہے وہی تفوق کم از کم جہاں تک اولاد و انساب کا تعلق تھا پہلے عنـ...ت کو حاصل تھا۔ حقیقت میں تشخیص و تعین نسب کے لیے یہ زمانہ "دورِ عین الیقین" ہے۔
صاحب دین اسی عہد امومت کی یادگار ہے یعنـ... اپنی اضافت اپنی اس گود سے قائم کرتا ہے جس میں اس نے عہد طفلی میں ہا... ...ں چلاتے ہیں۔
مسٹر موصوف کو عالم وجود میں لانے کا ...یاز جس خاتون کو حاصل ہوا ان کا میکے کا نام تو "ہن برستی"[1] مگر سسرال میں آکر اس نام کے علاوہ "کلیہ کماری"[2] خاتون بھی کہتے ہیں۔
مسٹر صاحب دین کے وا... ...مانی یعنی اس ملک کے جوزا صفت رئیس نواب "مسہن رائے" سے ان خاتون کی شادی کا ...ہ تاریخ کی کتابوں میں نہایت تفصیل و تشریح سے مرقوم ہے جس کا لب لباب یہ ہے
یہ شادی "نڈھ کپتان"[3] والے لارڈ میکالے کی مسلسل و متواتر سعی و کوشش کا بے نتیجہ نتیجہ تھی۔ ...ونِ موصوف نہایت طرار و چالاک تھیں۔ خوش نصیبی سے میاں ملے نرے گاودی اوند... سسرال میں جو آئیں تو میکے کے خیالات، میکے کی وضع قطع اور میکے کی زبان کو اپنے ساتھ لائیں۔ اب گھر کے کام کاج پر سب نوکر چاکر میکے ہی والے بھر دیے۔ بڑے سے بڑا احسان جو سسرال کے تمدن پر کیا وہ یہ تھا کہ سر سے الزام اتارنے کو اس بستی کی ایک سڑی بھی

---

[1] غیر زبان کا لفظ ہے اس واسطے تلفظ کی غلطی قابلِ معافی ہے۔ بعض ثقہ حضرات سے اس نام کا تلفظ یونیورسٹی سنا ہے۔ مصنف

[2] ڈاکٹر اقبال جو علاوہ کشف و کرامات کے علم تواریخ میں بھی بہت کچھ دخل رکھتے ہیں سنا ہے کہ انھوں نے کسی جگہ فرمایا تھا کہ "کشور ہند میں کلیہ نا...م کا بت" یعنی مجسمہ بھی تیار کر لیا گیا تھا لیکن یہ پتہ لگ نہ سکا کہ کشور ہند کس خاص شہر کا نام ہے اور اب وہ بت وہاں موجود بھی ہے یا نہیں۔ مصنف

[3] علی گڑھ کے اولڈ بوائے جن کا تعلق کالج سے بیسویں صدی کے عشرہ اوّل میں قائم ہوا

(باقی اگلے صفحے پر)

Marfat.com

بڑھیا خادمہ[1] رکھ لی۔ صاحب دین کی ولادت کا زمانہ دور قومیانہ کا آخری عہد ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب حکومت مآبِ ہاتھ کلکتہ مدراس کی کوٹھیوں میں چونا، شورہ، سیاہ مرچیں تولتے اور لٹھا ململ لنکلاٹ ناپتے تھے۔

محققین عالم (چاہے وہ قدیم نظامات ارسطوطالیسیہ وفیثاغورثیہ سے تعلق رکھتے ہوں یا جدید اسکولات ہکسلیہ وڈاروینیہ سے) اس امر پہ متفق اللسان ہیں کہ صاحب دین نوعی اعتبار سے حیوانِ ناطق کی ایک مضمحل سی شاخ ہے۔ ساتھ ہی اس کے اہلِ نظر اس کی ایک خصوصیت بدیہی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حیوانِ ناطق کے عام مولود کے خلاف صاحبِ دین ماں کے پیٹ سے مونڈھی ڈاڑھی والا چہرہ لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس سے ایک حکیم اور ماہر حیوانیات تو بجائے خود رہا ایک عامی بھی سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نکال ہی نہیں سکتا کہ وہ بحالت جنین ہی میں ڈاڑھی مونڈھنی شروع کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی سفسطی یہ موشگافی کرے کہ ماں کے پیٹ میں

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

شاید کالج کے میر عمارت گرڑھ کپتان مرحوم سے واقف نہ ہوں لیکن انیسویں صدی کے عشرۂ آخر تک کے اولڈ بوائز کے دلوں میں اس زبردست شخصیت کی یاد اب تک لطف و مسرت کی وہی کیفیت پیدا کرتی ہوگی جو آڑھے ترچھے ناہموار پینچوں والی پگڑی اور انگرکھے پر کوٹ اور کوٹ پر صدری میں ملبوس پونے سات فیٹ بلند جسم انسانی کو زمانۂ طالب علمی میں دیکھ کر پیدا ہوتی تھی۔ سپید ڈاڑھی والے پوپلے منہ سے کالج کی عمارت کے مزدوروں اور خصوصاً مزدورنیوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور دشنام بازی کے ساتھ دشنام دہی سے انکار۔ کالج کی پارٹیوں میں شرکت اور طلبا کو نصیحت سر سید مرحوم کے ساتھ بے تکلفانہ ظرافت ہر طالب علم کو اب تک یاد آکر لطف دی جاتی ہوگی۔ میکالے، مصطفٰی خاں اور سر آکلینڈ کالون والا لطیفہ اگرچہ ہر پرانے طالب علم کو یاد ہے مگر اس کے اعادہ کا یہ موقع نہیں۔

—— مصنّف

[1] سیکنڈ لینگویج ۔ مصنّف

اسے استرا کہاں ملتا ہوگا تو اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ مرغابی اور بطخ کے بچوں کو تیرنا سیکھنے کے لیے انڈوں کے اندر دریا اور سوئمنگ باتھ (SWIMMING BATH) کہاں ملتے ہوں گے۔

مثل مشہور ہے "ماں پر پوت پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا" صاحب دین نے ماں کی گود میں آنکھ کھولی تو ماں ہی کی وضع قطع اختیار کی اور ماں ہی کی زبان بولنی شروع کی وہی حرکات و سکنات اور وہی خیالات اختیار کیے۔

اب ہم عام سوانح نگاروں کی طرح صاحب دین کے ابتدائی زمانے کے حالات کی تفصیل لکھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ لہذا ان کی جوانی کے حالات و خیالات جستہ جستہ بلا ترتیب و تنویب پیش کرتے ہیں۔

صاحب دین نے ہوش سنبھالتے ہی ایک نظر میں تاڑ لیا کہ قدیم تہذیب و تمدن کا بوسیدہ ڈھانچ کلیتہً پھونک دینے کے قابل ہے۔ چنانچہ وہ اس کا قائل نہیں ہے کہ اولاد پر والدین کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اس کی نظر میں یہ محض اتفاق ہے کہ باپ باپ واقع ہوا ہے ورنہ ہوسکتا تھا کہ وہ بیٹا ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ "پیارے باپ" کا مستحق ہے اور اگر زیادہ ترقی کی گنجائش ہو تو "وہ بڈھا بے وقوف" کافی ہے۔ بھائی ایک رقیب ہے جس کے مقابلے میں اپنے حقوق کا تحفظ لازمی ولابدی ہے۔ اصلی عظمت و عزت کی مستحق زوجہ ہے نہ کہ ماں۔

اب تک عام خیال یہ تھا کہ صاحب دین سب کچھ ہوسکتا ہے مگر طبیب۔ شاعر اور مرتشی نہیں ہوسکتا۔ لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ صاحب دین کے جسم میں طبابت شاعری اور رشوت خواری کے جراثیم موجود ہیں۔ چنانچہ بعض قابل قدر ہستیاں ایسی ہیں جن میں یہ سب یا بعض خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

جس طرح ہمارے یونانی اطبا نے آلو، انڈے، دہی اور دنیا بھر کے کھانے پینے کی چیزوں کا مزاج نکال لیا ہے اور درجہ قائم کرکے یہ قرار دے دیا ہے کہ کون سی چیز کس درجے میں گرم ہے، کس درجے میں سرد، کس درجے میں تر ہے اور کس درجے میں خشک۔

Marfat.com

معلوم نہیں کہ اس طرح صاحب دین کو بھی اشیائے ماکولہ میں سمجھ کر کسی طبیب نے اس کا بھی مزاج نکالا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس فروگزاشت پر افسوس کرتے ہوئے فقیر اپنا اجتہاد پیش کرتا ہے کہ میرے تجربے میں صاحب دین ایک مختلف المزاج والکیفیت چیز ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب دین کا مزاج کسی دوسرے صاحب دین کے ساتھ تو ہمیشہ گرم و تر رہتا ہے مگر غیر صاحب دین کے ساتھ عموماً سرد و خشک اور غصہ یا ریل کے سفر کی حالت میں گرم خشک ہو جاتا ہے اسی طرح کسی دوسرے صاحب دین کے لیے چاہے وہ فہرست چندہ لے کر آئے یا دعوت۔ چاہے ایک صاحب دین ہمیشہ سریع الفہم ہے مگر غیر صاحب دین کے لیے چاہے وہ خفیف سے خفیف درخواست ہی لے کر آئے وہ نہایت بطی الفہم ہے

انگلستان[1] پلٹ صاحب دین کو لندن سے ناگفتہ بہ محبت ہے۔ اپنے قیام لندن کے واقعات کو بیان کرتے وقت اس کی زبان سے غیر معمولی طاقت۔ اس کی آنکھوں سے غیر معمولی چمک اور اس کے چہرے سے غیر معمولی مسرت آمیز حسرت یا حسرت آمیز مسرت برسنے لگتی ہے اور آخر کار وہ بیتاب ہو کر کہہ اٹھتا ہے "پیارے پیارے بڈھے لنڈن، کس قدر میں چاہتا ہوں کہ تیرے آغوش میں جان دے دوں۔" عشاق کا اپنے محبوب کے قدموں یا ذرا گستاخی سے کام لے کر اس کے آغوش میں جان دینا تو دیوانوں کا پامال مضمون ہے مگر صاحب دین کی اس تمنا میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ معاد کا قائل نہیں ہے اور اسے یقین

---

[1] انگلینڈ ریٹرنڈ کے لیے انگلستان پلٹ سے بہتر لفظ مجھے نہیں مل سکا۔ اس لیے میں انجمن ترقی اردو سے عموماً اور مولانا وحید الدین صاحب سلیم سے خصوصاً درخواست کروں گا کہ اس لفظ کو وہ اپنے آغوشِ استعمال میں لے لیں۔ اس لفظ میں حالتِ مفعولی کے سوا حالت فاعلی کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ سال پلٹ کے ساتھ ہی کایا پلٹ بھی ملحوظ رہے۔ آخری پہلو کا اظہار آج کل کانگریسی صاحب دین جس طرح کر رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔
—— مصنف

Marfat.com

ہے کہ ثواب و عذاب حشر و نشر۔ اور حیات بعد الموت مذہب کی سخن سرائی ہے لیکن آخر وہ مشرقی ہے۔ بچپن کی باتیں کان میں پڑی دل سے مشکل سے نکلتی ہیں۔ اس لیے ڈرتا ہے کہ مبادا مشرق میں یہ باتیں صحیح ہوں اور یہاں سے جانے والوں کے لیے وہاں روک ٹوک اور قرنطینہ ہوتا ہو مگر لندن والوں نے راہ و مقام کے موانعات صاف کر لیے ہوں گے۔ وہاں کی معرفت جانے والوں سے فرشتے تعرض نہ کریں۔

صاحب دین خدا کا قایل ہو یا نہ ہو مگر خدا سے اسے بہت سی شکائتیں ضرور ہیں۔ اکثر شکائتیں تو ایسی ہیں جن کا وہ کچھ نہ کچھ انتظام کر لیتا ہے۔ مثلاً وہ ناقابلِ اعتنا ہستی جسے دنیا اس کا اتفاقی باپ جانتی ہے اور جس کے وجود سے تو اسے بہت کم سابقہ پڑتا ہے مگر اس کے نام سے کام لینے کی اسے اس وقت ضرورت پڑتی ہے جب کسی دفتر میں اس کی ولدیت لکھی جائے۔ اگر وہ ہستی جنٹلمین نہیں ہے تو صاحب دین اسے اپنے ڈرائنگ روم میں کبھی گھسنے ہی نہیں دیتا یا مثلاً اس کا موروثی گھر کسی جنٹلمین کے آنے کے قابل نہیں ہے تو وہ وطن میں آمد و رفت ہی کم رکھتا ہے۔ اور اگر آتا ہے تو ہوٹل یا ڈیٹنگ روم ہی میں وقت گزار لیتا ہے لیکن دو شکائتیں ایسی ہیں جنھیں وہ نہ کبھی نظر انداز کر سکتا ہے نہ معاف۔ یعنی اس کی کالی رنگت اور جاہل بیوی۔ یہ دونوں کی دونوں چیزیں ایسی ہیں جنھیں نہ وہ شرم سے چھپا ہی سکتا ہے اور نہ فخر سے دکھا ہی سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح اس کا زیادہ وقت صابن اور ادویہ مصبغ اللون کے استعمال میں گزرتا ہے اسی طرح اس کی عمر کا معتد بہ حصہ ہستی انسانی کے نصف کرۂ شمالی (کیونکہ اماں حوا بابا آدم کی الٹی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں) کی ترفہ حالت اور رفع جہالت کی تدابیر سوچنے میں گزرتا ہے۔

وہ انگریزی اچھی بولتا ہے یا بری۔ مجھے اس کی نسبت کچھ کہنا نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ بولتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے نوکر، اپنے گھوڑے، اپنے کتے حتیٰ کہ اپنے مچھر اور اپنے کھٹمل اور اپنے جوتے تک سے انگریزی بولتا ہے اور جب کبھی اسے مجبوراً اپنی دیسی زبان

بولنی پڑتی ہے تو وہ ایک ایسی کھچڑی ہوتی ہے جس میں بلا مبالغہ ۱۴ چھٹانک سپید چاول (انگریزی الفاظ) اور صرف ۲ چھٹانک کالی دال (دیسی الفاظ) ہوتے ہیں۔

گنگا کو اگرچہ وہ ماں کا محبت آمیز خطاب دیتا ہے مگر کہتا "گینجز" ہی ہے۔ مکہ کو اگرچہ وہ ہمارا مقدس مقام کہتا ہے مگر بولتا "میکا" ہی ہے۔

وہ سلطان کو "سلٹن" اور خلیفہ کو "کیلیف" ہی کہے گا۔ خاکسار نے تو بمبئی میں ایک صاحب دین کا لفظ مسلمان کو "مزلما" کہتے سنا ہے۔ جب میں نے ان کی زبان سے یہ جدید ترین لفظ سنا تو ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر فوراً "قطع من الیل مظلما" پڑھ دیا جسے وہ کچھ نہ سمجھے۔ سب سے زیادہ مہربانی وہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اور اس کے حکمران پر کرتا ہے وہ حیدرآباد کو "ہائی ڈرا باڈ" اور حضور نظام کو "نائی زم" ہی کہتا ہے۔

چند الفاظ اس کی زبان پر بار بار ایسے آتے ہیں جن کے معنی نہ وہ سمجھتا ہے نہ سمجھنا چاہتا ہے نہ ان سے کام لیتے ہوئے وہی مافی الضمیر ادا کرتا ہے جو ان الفاظ کا اصلی مفہوم ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

مجھے بہت افسوس ہے۔	I am very sorry.
آپ کا شکریہ	Thank you.
آپ کا بہت ممنون ہوں۔	Much Obliged to you.

حالات وخیالات کا تنوع و تناقض صاحب دین کو جذبات وحرکات متضادہ کے ناگفتہ بہ کشاکش میں گرفتار کر دیتا ہے۔ جس گروہ میں ظاہری اور اتفاقی اعتبار سے اس کا شمار ناگزیر ہے اس کی کونسلی اور میونسپلی اغراض کے تحفظ کو دیکھتے ہوئے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ قدرت کا غیر متبدل اصول ہی توڑے مگر اس گروہ کے جنس اناث کی گود بلا لحاظ عمر و قامت روزانہ نہیں تو ہر مہینے ایک نئے اور نوزائیدہ بچے سے بھری جائے مگر جب وہ اپنی آمدنی یا تنخواہ پر نظر ڈالتا ہے تو "خشیہ املاق" اسے فریخ لیدر اور راد. ویہ مانع و دافع

کے استعمال اور اس اعتبار سے "قتل نفس" تک پر مجبور کرتی ہے۔

سب سے زیادہ کشمکش جو صاحب دین کو پیش آتی ہے اور جو حقیقت میں نہایت ہمدردی کے قابل ہے وہ مذہب کے متعلق ہے۔ ذاتی اعتبار سے اس کے خانۂ دماغ کے نئے کرایہ دار "فلسفہ اور خیالاتِ مغربیہ" تو مطلقاً روادار نہیں کہ گھر کا پرانا مگر تاریک سکونت مالک "مذہب" ایک منٹ کے لیے بھی گھر میں گھسنے پائے مگر سوشل اغراض کے لحاظ سے ناممکن ہے کہ صاحب دین پرانے مالک کے قبضے سے ایک سیکنڈ کے لیے کبھی انکار کرے۔ اس لیے صاحب دین کے متعلق بھی کہنا پڑتا ہے کہ وہ نہ مذہب میں داخل ہے نہ اس سے خارج نہ وہ اسے حقیقت میں چھوڑ سکتا ہے نہ سچ مچ پکڑ سکتا ہے۔ مگر صاحب دین پر بے دینی کا الزام صحیح نہیں۔ میں آستینیں چڑھائے تیار بیٹھا ہوں کہ پوری لسانی اور زور بیان سے اس کی وکالت بلکہ بیرسٹری کر کے اسے اس الزام سے بچا لوں۔ کیونکہ تم نے اسے پتلون اور کوٹ اور ٹوپ ہی میں ڈھکا چھپا دیکھا ہے مگر میں نے کوٹ اور قمیص بلکہ بنیان کے نیچے اسے بازو پر تعویز باندھے یا گلے میں جنیو پہنے دیکھا ہے اب یہ اس کی مصلحت ہے کہ ان چیزوں کو وہ اتنے پردوں میں کیوں چھپائے رہتا ہے۔ تم نے اس کے ڈرائنگ روم کے کارنس پر وہسکی کی بوتل بھی دیکھی ہوگی مگر میری دوربین آنکھ نے اسی کارنس پر اور اسی بوتل کے پاس گلدستے سے چھپی ہوئی زمزم یا گنگا جل کی شیشی بھی دیکھی ہے۔ تم نے تو اس کی لائبریری کی الماری میں ہکسلے اور سوین برن اور انگرسال کی تصانیف ہی دیکھی ہیں مگر میں نے اسی لائبریری کی اسی الماری میں قرآن کریم یا گیتا کا انگریزی ترجمہ بھی دیکھا ہے بلکہ یہ بھی دیکھا ہے کہ جب زولا اور ڈیوماس پڑھتے پڑھتے وہ تھک جاتا ہے تو محض کلاسیکل لٹریچر کے طور پر اس ترجمے کے بھی دو ایک صفحے سگار کے کشوں یا وہسکی کے پیگوں کے درمیان پڑھ لیتا ہے۔

وہ مذہب کا پابند ہو یا نہ ہو لیکن اگر وہ خوش قسمتی سے کونسل میں پہنچ جاتا ہے تو اس کی مذہبیت پر مسجدوں کے لوٹے اور مندروں کی گھنٹیاں قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خاکی شاہ کے میلے یا دھولیا ماوس کے دن کو عام تعطیل قرار دیے جانے کے لیے وہ جیسی

سر توڑ کوشش کرتا ہے اس کا حال کونسل روم کی میزوں کرسیوں سے پوچھو۔ وہ وقت دیکھنے اور اسے اور اس کے علمی ماں اور اخلاقی باپ کو اس کی مذہبی خدمت پر مبارک باد دینے کے قابل ہوتا ہے۔ جب وہ پیگ لے کر اور اپنے لیونڈر آگیں رومال سے ہونٹوں یا مونچھوں کا نم پونچھ کر اجمیر کے عرس یا ہردوار کی جاترا میں جانے والے مسافروں کی آسانی کی غرض سے تیسرے درجے کی گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا رزولیوشن پیش کرنے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی تقریر کا یہ جملہ "مائی لارڈ۔ اجمیر شریف کا عرس (وہ انگریزی تک میں شریف کا لفظ استعمال کرتا ہے) ہمارے مذہب کا مقدس ترین اور اہم ترین فریضہ ہے" میرے اس استفہامی دعوے کا ثبوت ہے کہ کیا اس سے بڑھ کر مذہب کا خادم تصور میں آسکتا ہے۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ عرس مقدس ترین اور اہم ترین فریضہ کہنا کم سے کم جہالت اور زیادہ سے زیادہ بہت کچھ ہے۔ مگر فرض، واجب، سنت اور نفل کی تفریق و تمیز تو علما کا کام ہے۔ اس سے اس کی امید ہی کیوں رکھو۔ نماز اس نے خود چاہے سفید جمعرات ہی کو پڑھی ہو مگر جمعہ کی نماز کے لیے مدارس اور دفاتر میں چھٹی دلانا بجا طور پر اس کا سب سے بڑا مذہبی کارنامہ ہے۔ مذہب اور مذہبیت کی ضرورت اسے کونسل یا چنگی کی ممبری کے انتخاب کے وقت پڑتی ہے اس زمانے میں امیدوار صاحب دین کو صبح کے وقت بے وضو بے طہارت غسل سے شام کی نماز میں شامل ہوتے اور اپنے حلقے کے غریب سے غریب مردے کے جنازے میں شرکت کرتے دیکھا گیا ہوگا۔ ایک امیدوار کونسل صاحب دین کے حلقہ رائے دہندگان میں اتفاق سے دیوبند کا مدرسہ بھی شامل تھا لہٰذا جماعت علما سے رائے مانگنے جانے سے قبل صاحب دین کو ڈاڑھی کا کھیت رکھنا پڑا تھا۔

یوں تو ہر صاحب دین کا ایک ہی مذہب ہے یعنی یہ کہ مذہب قابلِ اعتنا نہیں لیکن عموماً دو گروہ ہیں ایک وہ جنھوں نے بچپن میں پاجامہ پہنا ہے اور ایک وہ جنھوں نے دھوتی باندھی ہے اب دونوں گروہوں میں سے جو صاحب دین کونسل یا میونسپلٹی کا ممبر ہو جاتے تو پاجامہ اور دھوتی میں آویزش رکھنا وہ سب سے بڑی "مذہبی خدمت" سمجھتا ہے۔ چنانچہ کونسل یا میونسپلٹی میں اس قسم کے سوالات صرف اسی کی ذات سے مذہب کی اعانت کا باعث ہوتے ہیں۔

۱۔ کیا گورنمنٹ مہربانی کرکے بتائے گی کہ فلاں محکمے کے چپراسیوں میں اس کے ہم

مذہب چپراسیوں کی تعداد اس کے ہم مذہب افراد کی مردم شماری کے تناسب سے کم کیوں ہے ؟

۲۔ میونسپل بورڈ نے امسال جو نالیاں بنوائی ہیں ان میں سے اس کے ہم مذہب افراد کے ایک محلے کی ایک نالی میں چند نیم پختہ اینٹیں لگانے سے اس کے ہم مذہب سکنائے محلہ کی بڑی حق تلفی ہوئی ہے۔ بورڈ کو چاہیئے کہ وہ اینٹیں نکلوا کر سرخ پختہ اینٹیں لگوا دے۔

صاحب دین کے یوں تو بہت سے دشمن ہیں مگر دو ایسے ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس کی رائے میں مسلمان کبھی پنپ ہی نہیں سکتے۔ یعنی پردۂ نسواں اور رمضان کے روزے۔ مولوی اس کے سامنے ہتیار ڈال چکے۔ سود کو وہ دار الحرب کہہ کر جائز کر چکا۔ انگریزی وضع کو وہ ترکوں کی تقلید میں حق بجانب ثابت کر چکا ہے مگر یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کے لیے مخلص تلاش کر رہا ہے، مگر ابھی قطعی طور پر کامیاب نہیں ہوا ہے۔ صاحب دین کو اس حقیقت کا علم ہے کہ قانون ملکی شیشے کا بنا ہوا اور قانونِ مذہبی ربڑ کا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تعزیراتِ ہند کی خفیف سے خفیف دفعہ کی خلاف ورزی سے قانونِ ملکی ٹوٹ جاتا ہے مگر شرع شریف کے بڑے سے بڑے حکم کی خلاف ورزی سے بھی قانونِ مذہبی ٹس سے مس نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسی دنیا کے دیکھنے کا متمنی ہے جو مذہب کی گرفت سے قطعی آزاد اور قانون کی پابندیوں میں بالکل جکڑی ہوئی ہو۔

صاحب دین جلد باز اور بے صبر ہے۔ وہ عیش نقد کو ہاتھ سے چھوڑ کر عیش نسیہ کا انتظار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "کواعب اترابا" اور "کاساً دھاقا" میں اپنا حصہ فی الفور یہیں وصول کرتا ہے اور "اپیکیورس" اور خیام کی آواز میں آواز ملا کر کہتا ہے ؎

یک جام شراب زلف یارے لب کشت
ایں جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت

صاحب دین میں بے قناعتی اور بے اطمینانی کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی

Marfat.com

حالت موجودہ کا شاکی ہی رہتا ہے۔ اگر باکار رہے تو شاکی۔ اور بے کار رہے تو شاکی۔ اگر اس کی آمدنی کم ہو تو شاکی اور زیادہ ہے تو شاکی۔

ان تحمل علیہ یلہث او تترکہ یلہث

اس کی رائے میں جس طرح رخسار صرف استرے ہی کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح استرا بھی محض رخساروں ہی کے لیے وضع کیا گیا ہے اور بس اس میں کمال یہ ہے کہ ناخن گیر اور مقراض کا کام دانتوں سے اور موچنے کا کام چٹکی سے لے سکتا ہے۔ وہ دانت کریدنے کے لیے نیم کی سینک پر کونسل ٹوتھ پک کو اور دانت مانجھنے کے لیے پیلو ن کی مسواک پر برسلس ٹوتھ برش کو ترجیح دیتا ہے اگر اس کی طہارت پسندی اور پاکیزہ مزاجی کا حال دیکھنا ہو تو اسے واش بیسن میں منہ دھوتے دیکھو۔ تمھیں کوئی حق نہیں کہ ٹائے مغسول سے کلّی کرتے دیکھ کر اس پر اعتراض کرو۔

عیب وے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ صاحب دین کو قومیت اور مذہبیت کے ابھارنے اور سدھارنے کا خیال ہے اور بہت ہے اور یہی خیال ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے قوم و مذہب کی ترقی کا سبب ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ

نقیب، بدایوں ——— ملّا علی آقِ سقال

جون ۱۹۲۲ء

حدیثِ دیگراں

(۱۵)

منظر نگاری میں سید صاحب کو اس درجہ کمال حاصل تھا کہ جس جگہ کا ذکر کرتے اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ہوبہو کھنچ جاتا۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون "اتحاد بین المسلمین والہنود" میں خود فقیرانہ بھیس میں ایک افغانی ایرانی اور عرب سے مخاطب ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اردو ادب میں ——— غلام احمد فرقت کاکوروی

طنز و مزاح

سید محفوظ علی صاحب کی مکالمہ نگاری کے دلچسپ نمونے " بلبلان اسیر کی رہائی" اور "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" میں سامنے آچکے ہیں۔ ہر جگہ انھوں نے موقع اور کردار کی مناسبت سے بات چیت میں مخصوص روزمرہ اور محاورہ کا رنگ بھرا ہے۔ آنے والے مضمون میں افغانی، ایرانی اور عرب کی گفتگو کا اسلوب اور لہجہ جو سید صاحب نے بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے فطری بھی ہے اور تبسم خیز بھی۔

——— مؤلف

Marfat.com

اتحاد بین المسلمین والہنود
(تشخیص مرض وتدبیر علاج)

بحمداللہ کہ فقیر نے اس وقت تک سیاسیات حاضرہ میں حصّہ لینے یا رائے دینے کی کبھی جسارت نہیں کی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس نہ وقت ہے نہ دماغ اور نہ علم۔ بنا براں فقیر نے اپنے لیے کنجِ خمول ہی بہتر سمجھا۔ مگر مسئلہ اتحاد بین المسلمین والہنود کو فقیر سیاسی نہیں بلکہ ایک خالص تمدّنی وعمرانی مسئلہ سمجھتا ہے۔ اسی اعتبار سے فقیر کو ہمت ہوئی کہ اپنے افکار ومساعی کو ارباب بصیرت کی خدمت میں پیش کرے۔

چونکہ رسالہ "الناظر" بھی سیاسیات سے اجتناب کرتا ہے اور اس مسئلے کے اذعانِ صحیح میں فقیر کا ہم نوا وہم خیال ہے لہذا یہ توقع بے جا نہیں کہ اس کے متعلق فقیر کے خیال وعمل کی اشاعت واعلان میں اعانت سے دریغ نہ فرمایا جائے گا۔

فقیر نے غایت فکر ونظر اور کمال حدت بصر سے کام لے کر مسئلے کے مالہ وما علیہ پر غور کیا ہے۔ فریقین کے صاحبان رائے اور واقفانِ حال سے بحث وتمحیص کی ہے اور الحمداللہ کہ فقیر اس خاص سبب کے دریافت کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوگیا ہے جو صدیوں کی یک جائی اوطان اور یکسانی اغراض کے باوجود اس توحش وتجنب کا داعی حقیقی ہے اور فقیر نے اپنے ظرف دماغ کے بقدر اس کا چارۂ کار بھی سوچا ہے۔

تصنع موقوف وتکلف برطرف۔ امر واقعی یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند نے باوجود اپنی قلّت تعداد واستعداد کے ہندو بھائیوں کو اپنی طرف سے یکسر خائف وغیر مطمئن کر رکھا ہے

Marfat.com

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ خوف و عدم اطمینان عموماً اوّل الذکر کے کسی فعل یا ترک فعل کا نتیجہ ثابت نہیں ہوتا مگر اس کو کیا کیجیے کہ ان کی ہیئت کذائی۔ ان کی افتاد خیال اور صورت حال ہی ایسی ہے جو ہر بے گانے جار الجنب اور صاحب بالجنب کے لیے موجب اجتناب ہو سکتی ہے۔

باوجودیکہ اکثر ہندو ارباب علم و اثر اور خود فقیر نے بہت کچھ افہام و تفہیم کی اور اطمینان و تسلی دی کہ "بھائی صاحبو۔ خوف و اضطراب کی کیا بات ہے۔ انتم رجال وہم رجال باوجود مال ممدود اور بنین شہود۔ باوجود تفاخر اولاد اور تکاثر اموال کے تم مٹھی بھر ننگے بھوکے۔ جاہل کاہل مسلمانوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہو وہ تمھارے اپنے ہیں۔ ضرورت کے وقت کام دیں گے۔ دکھ درد میں شریک ہوں گے۔ بہت سے ایسے ہیں جن کا تمھارا خون ایک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ باقی جو ایسے ہیں جن کا تمھارا خون ملا ہوا نہیں ہے وہ بھی اسی ملک کے باشندے ہیں۔ تم سے تعلقات رکھتے ہیں۔ تم سے توقعات رکھتے ہیں۔ ان کا مرنا جینا بھی اسی ملک میں ہے۔ تم ان کے پڑوسی ہو۔ دوست ہو۔ رنج و راحت کے شریک ہو۔ بہتر ہے کہ آپس میں بیگانے بن کر نہ رہو بلکہ یگانے بن کر رہو۔

مگر قَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ۔ صاف صاف عرض کرنا پڑتا ہے اور تشخیص مرض کے لیے اسباب و علامات کو صاف صاف بیان کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ انھیں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہم مذہبوں کے ممالک ماورائے سرحد ہند سے لے کر برابر ایک دوسرے سے ملصق و متصل دور تک چلے گئے ہیں۔ جس وقت خفیف سی تو تو میں میں بھی ہو گئی تو یہ اپنے ہم مذہبوں کو ادھر بلالیں گے اور اس وقت جو گزرے گی سو گزرے گی۔

فقیر نے بھی غور کیا تو پایا کہ خطرہ بے اصل و بے بنیاد نہیں۔ پنجاب کی شمالی و مغربی حد سے لے کر جو مسلمانوں کے ممالک کثیر السواد ہم شروع ہوتے ہیں تو دنیا کے اور چھور تک جا پہنچتے ہیں۔ سرحد سے بالکل ہی ملا ہوا افغانستان ہے۔ اس کے بعد مشرق کی طرف تو

Marfat.com

ترکستان ہے اور مغرب کی جانب ایران ۔ ایران سے ملے ہوئے ایک سمت کو شام و فلسطین و عراق و جمہوریہ ترکیہ اور دوسرے رخ کو عرب ۔ عرب سے ملی ہوئی مصر کی سرحد ہے اور مصر سے قریب طرابلس الغرب، طونس، الجزائر اور اس کے بعد ہی ہسپانیہ والوں کا وہ سر منڈا حریف[1] ہے جس کی شہامت و بسالت نے دنیا کے بہت سے ایوان ہائے سیاست میں تہلکہ ڈال رکھا ہے۔ اس کے ادھر اُدھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسلامی آبادیاں کہاں کہاں تک متحد و منتشر چلی گئی ہیں۔ اب تک تو مست الست مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کی ہمہ گیر کثرت کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن اگر کسی وقت انھوں نے اپنی ہمہ جا قلت کو محسوس کر کے حقیقت میں اپنے ہم مذہبوں کے اس گروہ کثیر الانفار اللہم زد فزد کو "الارازی[2] الارازی"۔ "بیا[3]، بیا"۔ "تعال[4]، تعال"۔ گلے، گلے[5]"۔ "ودیا کالے، ودیا کالے[6]" کہہ کہہ کر پکار لیا تو واقعہ یہ ہے کہ وہ ساعت[7] اُدھئی[8] وَّ اَمَرُّ ہوگی جس کے تصور سے ہر مسلمان تک کانپ اٹھتا ہے۔

فقیر اس کے سد و علاج کے سوچنے پر اپنا بہترین وقت صرف کر چکا ہے سا ابتدا یہ رائے ہوئی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں سے چندے لے کر اپنے اہتمام سے درۂ خیبر اور درۂ بولان کو تیغہ کرا دے اور ہمالیہ کی دیوار پر سرتاسر بوتلوں کے ٹکڑے سیمنٹ سے نصب کرا دے تاکہ ادھر سے ایاب و ذہاب کا راستہ ہی مسدود ہو جائے۔ مگر اس میں یہ قباحت نظر آئی کہ ادھر تو میوہ جات و مغزیات کی درآمد منقطع ہو جانے سے مسلم امراء کو ضعف دماغ اور ادھر ابا زیرہ[8] و ہلیت[9] کی درآمد مسدود ہو جانے سے ہندو ساہوکاروں کو سوء ہضم کی

---

[1] حریف کے سر کو مونڈ دو تو ریف رہ جائے گا۔ مصنف [2] پشتو
[3] فارسی [4] عربی [5] ترکی
[6] سومالی [7] سورہ القمر رکوع ۳ [8] زیرہ
[9] ہینگ۔ مؤلف

کی شکایت ہو جاتے گی۔ معہذا ممکن ہے کہ اغیار تبت دکراچی کی راہ سے آجائیں۔ لہذا کامل غور و خوض کے بعد یہ طے کیا کہ اس امر کی کوشش کی جائے کہ یہ اسلامی آبادیاں سب اپنی اپنی جگہ سے بہت دور ہٹوا دی جائیں اور ہمارے ہندوستان کی سرحد کے کنارے کنارے صدہا میل تک ایک طویل و عریض غیر مملوکہ، غیر مقبوضہ، غیر معمورہ اور غیر مزروعہ قاع[1] صفصف پڑا رہے جس میں بشرط گنجائش رقم طویل و عمیق خندقیں کھدوادی اور پختہ چونے سے پختہ کرادی جائیں اس سے ہمیں آرام و اطمینان کی نیند تو آئے گی اور بھائی بھائی میں روز روز کی بدمزگی و بےاعتباری تو جاتے گی۔

اس کے متعلق فقیر نے بطور خود اور بصرف کثیر آغاز سعی کیا۔ فقیر کے کرم گستر واقفان حالات جانتے ہیں اور شہادت دے سکتے ہیں کہ فقیر نے محض اللہ تعالے کے توکل اور اپنی طاقت کے بھروسے پر ہندوستان سے باہر کا دور و دراز سفر اختیار کیا تھا اور یہ امر از راہ تفاخر نہیں بلکہ بطور تحدی عرض کیا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان بھر کے کسی بڑے یا چھوٹے رئیس یا امیر یا تاجر یا زمیندار یا راجے یا مہاراجے یا سیٹھ یا ساہوکار یا کسی کانگریس یا خلافت یا مسلم لیگ یا سنگھٹن یا تنظیم یا کسی چھوٹانی یا بڑنی یا گپتا یا سیتا نے کسی وقت یا کسی موقع پر ایک حبہ سیاہ یا ایک پشیز شکستہ (پھوٹی کوڑی) سے اس فقیر حقیر کی امداد و اعانت کی ہو تو آج وقت ہے کہ علی رؤس الاشہاد شہادت پیش کر کے فقیر کی تکذیب و تبکیت کر دے۔ ہاتوا برہانکم۔

المختصر فقیر شد رحال کر کے مع جریب زیتونی و تسبیح یشبی و گلیم پشمی و عبائے قطنی و عمامہ کھدری بہ قصد سفر نکلا۔ تذکرہ مصائب طریق و مہالک سبیل بے مزہ باعث اطناب و تطویل ہوگا اور چونکہ سطور ہذا کے ذریعہ روداد سفر کی تدوین و ترتیب پیش نظر نہیں لہذا تبدیل

۱؎ چٹیل میدان۔ مؤلف

لاحاصل ہے۔

اس ہفتمواں کی اوّلین منزل مقصود چونکہ سرزمین انگونزہ دانگورتھی لہذا سب سے زیادہ صعوبت حصولِ پروانہ راہداری میں پیش آئی۔ ادھر اپنے بے اطمینان۔ ادھر پرائے بدگمان۔ حالانکہ اس مہم میں اگر فقیر کو کامیابی ہو جاتی تو اخراجات تحفظ ہند کے موازنے میں موجودہ رقم خطیر نہ رہنے پاتی۔

بارے سب مزاحمتوں کا مقابلہ کر کے فقیر افغانستان پہنچ گیا اور وہاں کے خانوں اور سرداروں ملکوں اور اربابوں، سرخیلوں اور ملا ؤں سے ملا۔ اگرچہ انھوں نے ضیافت اسلامی کے آداب مرعی رکھے۔ نان سنگک (موٹی روٹی) و نان تنک (پتلی روٹی) تکہ وکباب قورت غوڑی (دہی وخشک گوشت) وقرت بانجن ربورانی اپلاد وچلاو۔ شیر وپنیر۔ مسکہ و جغرات کھلائے۔ قریات وقنات اور کارز وفالیز (آبِ جاری) کی سیر کرائی، کشمش وشمش شفتالو و زرد آلو، بہی و بادام، انگور وانجیر، سیب وانار پیش کیے، مگر باتیں بہت اکھڑی اکھڑی کیں۔ انھوں نے فقیر کی درخواست کو سن کر چھوٹتے ہی کہا۔

" ملا۔ تمھارا ہندوستان بڑا ملک اور تم ہندی بڑا آدمی۔ ہم تمھارا ملک سے ناواقف نہیں۔ ہم جانتا ہے تم لوگ کام کا آدمی نہیں کلام کا آدمی ہے۔ تم لوگ دال روٹی، پوری کچوری کھا کر پان چبا کر خالی خولی چاؤ چاؤ کاؤ کاؤ کرنا جانتا ہے۔ تمھارے ملک کے اندر پول کی فراوانی۔ جنس کی ارزانی اور حمل ونقل کی آسانی ہے۔ تم لوگ تجارت کرتا ہے۔ زراعت کرتا ہے۔ چاکری کرتا ہے۔ پیشہ وری کرتا ہے۔ اس طور سے تم دولت جمع کرتا ہے بعدہ باخود لڑائی کرتا ہے۔ اور لڑائی عورت کا مانند۔ ہم لوگ تمھارا طرح نہیں۔ واللہ ہم مرد ہے۔ اگر لڑتا ہے مرد ہو کر۔ وگر ملتا ہے مرد ہو کر۔ لاکن اس سے ہم کو مطلب نہیں۔ لڑو یا ملو وہ تمھارا خوشی۔ رہا ہمارا اس ملک سے جانا سو ملّا سنو کہ افغان گل محمد خان ہیں اور گل محمد کے واسطے شاعر پہلے ہی کہ گیا ہے" زمین جنبد نہ جنبد گل محمد"۔ لہذا بابا تمھارا خوشی آتے سو کرو خان کا گتنا تو یہاں سے ہٹنے والا نہیں۔"

Marfat.com

یہ ٹکا سا جواب سُن کر فقیر اپنا سا منہ لے کر واپس ہوا اور سیدھا ایران پہنچا۔ یہ لوگ کمال تہذیب وتپاک سے پیش آئے۔ کوفتہ پلاؤ و خرمہ پلاؤ، تنتجن و فسنجن، قلیا و قورما، بغرا و بورانی، بیضہ و بریانی، شیر برنج و شیر بادام، صابونی و مکارونی، لولہ کباب و سیخ کباب، بادام کاغذی و انار رطلی، سرداو گرمک، انگور شقالی و ریش بابا۔ ..... غلامان سب کھلاتے۔ قہوہ و شیر چاؤ قلیان و (افیون) تریاک کی تواضع کی مگر اصل مطلب قبلہ و قبلی و آرے بلے، ایں و آں و چنیں و چناں ہی میں ٹال دیا۔ لیکن جب فقیر نے اصرار کے ساتھ مطالبۂ جواب کیا تو آخر کار اپنی مشہور لسانی و چرب زبانی سے کام لے کر فرمایا:

"قربانت شما، ہم اپنے گرمگاب و جوشاب، اپنے بے ستون و راوکان، اپنے تنگہ اللہ اکبر و وادی گلپوشان اپنے حافظیہ و سعدیہ، اپنے سلطانیہ و ناصریہ، اپنی اس خوش آب و خوش گل زمین سے کس دل و جگر سے مفارقت گوارا کریں جو ہماری مقدس قومیت کا مسکن قدیم و موطن قویم ہے۔ جہاں سب سے پہلے تہذیب انسانی نے ظہور کیا۔ جس کے بہادروں نے تمدنِ یونانی و رومانی کے پرخچے اڑا دیے۔ اور جب یہاں کی خاک نیرِ اسلام کے نور سے مستنیر ہوئی تو تاریخ شاہد ہے کہ اس خاک کے ذرّوں نے دنیائے معلوم و مسکون کے گوشے گوشے اور چپے چپے کو معمور نور کر دیا۔ بابائے ما عشق وطن نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا ہم حوادثِ روزگار کی لطمہ خوری اور مصائب اغیار کی لکد کوبی کے لیے وقف رہے لاکن با ایں ہمہ ہم خاک پاکِ ایران سے مفارقت پر راضی نہ ہوئے ہماری مائیں ہمیں لوریاں دیتی ہیں:

' تو کودک ایرانی و ایران وطن تست۔ تو جانی و ایران چو تن تست جان رانتن بے عیب بکار ست بلم لاے۔ لم لاے، بلم لاے، بلم لاے!

"جناب آغا۔ ہم تو دربارِ رستم و اسفندیار کو چھوڑ کر بہشتِ بریں بھی نہ جائیں گے کیونکہ غیبی زبان پہلے ہی ہم سے کہہ چکی ہے۔

کہ در جنّت نخواہی یافت | کنارِ آب رکناباد و گلگشت مصلّی را

"آغا معاف دارید۔ معلوم ہوتا ہے اہل ہند اپنے ملک سے عشق و شگفتگی نہیں رکھتے بلکہ اپنی خودی سے محبت رکھتے ہیں۔ ورنہ روز روز کی اس باہمی ہنگامہ آرائی و آویزش کے کیا معنی جن سے مفادِ ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اگر اختلاف عقاید و معاشرت کا عذر کیا جاتے تو یہ بے کار عذر ہے۔ ہمہ در زیر کاسہ نیم کاسہ دارند۔ کیا ہمارے ملک میں پیروان زرتشت نہیں۔ مگر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ یہاں قدیم وجدید باشندوں اور گبر و مسلمان میں نہ فرق و امتیاز ہے نہ جنگ و جدال۔ ہم ان کی ملت کا احترام کرتے ہیں اور وہ ہماری کثرت کا اعتبار۔ تعجب ہے کہ جب براہمہ ہند اتنی تعداد کثیر میں ہیں تو وہ کس واسطے ڈرتے اور تنگدلی سے پیش آتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ خوف یا بخل سے کام لینے کے بجائے محبت و سیر چشمی سے کام لیں۔ ہم نہایت متاسف و متالم ہیں کہ آپ کی خواہش پر عمل نہیں کرسکتے۔"

فقیر یہاں سے بھی بے نیل مرام واپس آیا اور عرب شریف حاضر ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی سیادت و شیخوخت کا احترام کیا اور اپنی ضرب المثل مہمانداری و مسافر نوازی سے کام لیا۔ ترویقہ (ناشتہ) میں لبن وعسل (دودھ و شہد) رطب وعنب (چھوارا و انگور) حب حب سوسیی و بطیخ فرنساوی (سوز کا تربوز فرانسیسی خربوزہ) بر وقان و تفاح (نارنگی سیب) جبنہ و زبدہ (پنیر و مکھن) قہوہ و شائے (چائے) غدا و عشاء (دوپہر کا کھانا و شام کا کھانا) میں خبز خمیر خبز بطیر (خمیری روٹی و تپلی روٹی) قدید ثرید بہ مرقہ و شوربہ (خشک گوشت، مصالحہ دار شوربہ یخنی) کباب کتلاتہ (کٹلٹ) لحم مقلی (بھنا ہوا گوشت) لحم مسلوق (ابلا گوشت) لحم طیر و لحم صید (طیور کا گوشت شکار کا گوشت) دھن و زر (گھی چاول) اور سجارہ و کبریت (سگریٹ و دیا سلائی) سے تکریم و تواضع کی مگر حرف مطلب کو لیت و لعل اور تمنی و ترجی ہی میں رکھا۔ آخرکار جب فقیر نے ادائے جواب کے لیے پیہم تقاضے کیے تو صاف صاف کہا۔

" صلے علی النبی یا شیخ۔ تم نے کہا کہ اپنا ملک چھوڑ دو۔ ہم اس کا جواب دیتے ہیں

Marfat.com

کیا یہ ہمارا ملک نہیں۔ کیا ہم بنو اسمٰعیل نہیں۔ پھر کیا ہم بنو قیدار، پھر بنو عدنان، پھر بنو سعد، پھر بنو مضر، پھر بنو کنانہ، پھر بنو فہر، پھر بنو غالب، پھر بنو لوے، پھر بنو مرہ۔ پھر بنو کلاب، پھر بنو عبد مناف اور پھر بنو ہاشم نہیں۔ اگر ہیں اور تم کو ماننا پڑے گا کہ دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ عرب اپنے انساب سے واقف ہیں اور تم کو ماننا پڑے گا کہ دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ عرب اپنے انساب سے واقف ہیں تو کیا ہم ابراہیم علیہ السلام کی ذریّت میں داخل نہیں۔ پھر کیا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریّت کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بیت الحرم کے پاس خاص اللہ تبارک و تعالیٰ کی منظوری سے سکونت نہیں دی تھی۔ کیا ہمارا ملک ناف زمین اور دنیا کا وہ مشہور ترین ملک نہیں جس کا تذکرہ کتب عتیق میں ہے۔ کیا اس ملک میں ہماری قومیت متحدہ میں آزادی کی چالیس صدیاں نہیں گزاریں۔ پھر کیا ہمارے ملک اور ہماری قوم اور ہمارے قبیلے میں فخر کائنات خلاصۂ موجودات خاتم النبیین رحمۃ للعالمین نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم پیدا نہیں ہوئے۔ کیا ہماری زبان ام الالسنہ نہیں۔ کیا خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہماری زبان میں اپنا کلام پاک نازل فرما کر اسے دنیا کی کل زبانوں کا سرتاج نہیں بنا دیا۔ پھر کیا ہمارا شہر مکہ مبارک دنیا کے پردے پر سب سے پرانا شہر، ام القریٰ، بلداً امنا، بلد امین، مولد النبی اور مہبط وحی نہیں۔ کیا بیت اللہ شریف بیت وضع للناس نہیں، کیا مل و حرم دنیا تے اسلام کے لیے باعث تعظیم و تکریم نہیں۔ ... کی خدمت و دربانی کا فخر ہمیں حاصل نہیں جس دربانی کو حضرت داؤد علیہ السلام اپنی زبور میں عیش و آرام کے خیموں سے بہتر بتاتے اور بیت العتیق کے آستانے پر رہنے کی تمنا کرتے ہیں۔ اگر یہ سب صحیح ہے تو ہمارے کان آج یہ کیوں سن رہے ہیں کہ ہم اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ تم نے قرآن کریم پڑھا ہے۔ اگر پڑھا ہے تو کیا اس میں نہیں پڑھا" اِخراجُ اَھلِہٖ منہ اکبر عند اللہ"۔

پہلے ستاروں سے کہو کہ جو السماء چھوڑ دیں۔ طیور سے کہو کہ کرۂ ہوا چھوڑ دیں وحوش سے کہو کہ جنگلوں کو چھوڑ دیں۔ مچھلیوں سے کہو کہ سمندر کو چھوڑ دیں اور پھر اور یورپ اور امریکا کے باشندوں سے کہو کہ اپنے اپنے ممالک چھوڑ دیں۔ جب یہ سب تمہارے

کہنے پر عمل کرلیں تو ہمارے پاس آؤ۔ اور اگر یہ نہیں تو قسم ہے فالق الحب والنواے اور اور خالق الارض والسما کی کوئی شخص ہمیں ہمارے ملک سے نکال نہیں سکتا۔ یہ ہمارا جواب ہے۔ اعملوا ما شئتم۔

" یا سیدی۔ ہم بدنصیب تھے کہ ہم نے اپنے رسول روحنا فداہ کی وصیت آخری کی تعمیل میں تقصیر و تقاعد کیا۔ اب تو ہم نہ یہاں کا قبضہ چھوڑدیں گے نہ غیر کو یہاں قبضہ کرنے دیں گے۔ الملک ملکی والزمان زمانی۔ والسلام۔"

فقیر سفر افغانستان و ایران و عرب سے بہت خستہ و ماندہ ہوگیا تھا اور اب ہر ایک باقی ماندہ ملک میں فرداً فرداً جانا نہایت مشکل تھا لہذا مصر میں ایک مجمع اسلامی کا اہتمام کیا گیا جس میں باقی ماندہ ممالک اسلامی کے وکلاء و نواب جمع ہوئے۔ حضرت شیخ جمال الدین افغانی کے شاگرد خاص حضرت شیخ کمال الدین صنعانی کے بہ حیثیت صدر جملہ اکابر ملت کی جانب سے جو کچھ فرمایا اس کا ملخص یہ ہے۔

" بحمد اللہ کہ اغیار کے جگانے سے اب ہم بیدار ہوگئے ہیں اور ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم نے اپنے ممالک کی سرزمین کو اپنے خون کے آخری قطرے اور اپنی حیات کے آخری لمحے کے بدلے خریدا ہے۔ یا شیخ۔ تم تو تم اب تو چچا اروپا بھی ہم سے یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ جیتے جی ہم یہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی ہٹنے اور ایک شبر زمین چھوڑنے کا نام لیں۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھو۔ چاہے تم لوگوں کو بخار چڑھے یا اختلاج قلب ہوجائے ہم اپنے ملکوں سے ٹلنے اور نکلنے والے نہیں۔ اگر تمھیں ہماری طرف سے بدگمانی ہے تو ہم اطمینان دلاتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہی معاملات سے اتنی فرصت نہیں کہ تمھارا خیال کریں۔ لیکن اگر ہمیں کبھی تمھارا خیال آتا ہے تو ہم اسلامی سچائی سے یقین دلاتے ہیں کہ وہ خیال محبت ہمدردی اور شکر گزاری کا خیال ہوتا ہے۔ ہم سے اگر ہو سکے گا تو ہم تمھارے افکار کو رفع کرنے میں مدد دیں گے نہ یہ کہ خدا نخواستہ تمھاری پریشانیوں میں اضافہ کریں گے جس طرح ہم خود اپنے ملک میں آرام و اطمینان سے رہنے کے خواہش مند ہیں، اس طرح چاہتے ہیں کہ تم بھی اپنے ملک میں اطمینان امن اور آزادی سے رہو۔

Marfat.com

• اگر تمھیں ناگوار نہ ہو تو ہم چند باتیں صاف صاف کہیں۔ ہمیں افریقہ، اروپا اور امریکہ ہر ملک کے آدمیوں سے ہر وقت واسطہ رہتا ہے۔ ہم سب کے مزاج و طبیعت سے واقف ہیں۔ لیکن اگر ہم نہیں سمجھ سکے ہیں تو اہلِ ہند کو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تم ہندوستانی لوگ کس طبیعت کے آدمی اور کس مٹی کے بنے ہو۔ تمھارے ملک کا باوا آدم ہی نرالا ہے تم مسلم بھی ہو اور مسلم کش بھی۔ تم محتاج بھی ہو اور مسرف بھی۔ تم مظلوم بھی ہو اور ظالم بھی تم مصیبتوں میں گھرے بھی ہو اور آپس میں لڑتے بھی ہو۔ میرے بھائی میری بات کا بُرا نہ مانو۔ قاعدہ ہے کہ اگر کسی گھر میں آگ لگے تو گھر والے سب یک دل ہو کر بجھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ میں نے نہیں سنا کہ وہ اس وقت کو باہمی تکرار و فساد و سب و شتم یا باہمی ہمت شکنی میں صرف کرتے ہوں اور آگ بجھانے سے بے پروا ہو جاتے ہوں۔ اگر وہ ایسا کریں تو پھر سمجھا جائے گا کہ یا تو گھر میں آگ ہی نہیں یا آگ لگی ہے تو گھر ان لوگوں کا نہیں یا کسی وجہ سے انھیں سامان بچانے سے دلچسپی نہیں۔ مثلاً بیمہ کمپنی سے روپیہ وصول کرنا ہے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ نہیں اور آگ لگی ہے تو پھر سمجھنا چاہیئے کہ گھر والوں کے حواس اس قدر مختل اور دماغ اس درجہ بے کار ہو گئے ہیں کہ نقصان کا احساس ہی نہیں۔

• ہم نہیں جانتے کہ اہلِ ہند میں اس قدر باہمی نا چاقی کیوں ہے۔ اگر اس کا باعث اختلاف مذہب ہے تو "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"۔ مذہب تو بنی نوعِ انسان سے محبت سکھاتا ہے۔ اس کے علاوہ مظلومیت و مملوکیت ایسی مشترکہ مصیبت اور محبت وطن اور حفاظت ملک ایسی مشترکہ خدمت ہے جس سے کسی باشندے کو انکار و اختلاف ہو ہی نہیں سکتا اور یہ اشتراک مصیبت و خدمت بجائے خود اتحاد کا قوی محرک ہونا چاہیئے۔ اگر مختلف باشندوں کی قلت و کثرت بے اعتباری کا باعث ہو تو ہماری رائے میں جس قوم کی تعداد سب سے زیادہ ہو اس کا اور صرف اسی کا اخلاقی اور سیاسی اور وطنی فرض ہے کہ وہ اپنے عمل سے اپنے قلیل التعداد بھائیوں کی استمالت و دلجوئی کرے۔ ان کی نظر میں اپنا وقار و اعتبار بڑھائے اور انھیں یقین دلائے کہ کثرت کسی وقت قلت کو نقصان نہ پہنچائے گی اور اس کے حقوق نہ تلف کرے گی۔ کیا تمھارے برادران ہنود اس معمولی بات کو نہیں سمجھتے کہ

Marfat.com

جب تک قلیل التعداد اقوام والے "مزدوران خوش دل" نہ ہوں انھیں کیا پڑی ہے کہ "کار بیش" کریں۔ جب تک انھیں یہ خطرہ رہے گا کہ جس چھپر کے اٹھانے میں ان سے مدد لی جاتی ہے اس کے سایے میں آرام دوسرے پائیں گے تو وہ اس چھپر کو اٹھانے ہی کیوں لگے۔

"کیا ہم لوگوں کے ہاں قلّت وکثرت کا سوال نہیں ہے۔ ضرور ہم میں عقل ہے۔ ہم میں انصاف ہے۔ ہمارا دماغ اس مسئلے کو صحیح پہلو سے سوچتا اور ہماری آنکھ صحیح زاویے سے دیکھتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب گاڑی میں کئی پہیے ہوں تو ایک پہیہ بھی گاڑی کو نہیں چلا سکتا۔ اس لیے ہم سب پہیوں کو یکساں مضبوط حالت میں رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی عیسائی، یہودی، قبطی، نبطی سبھی ہیں۔ دیکھو ترکی ممالک میں، دیکھو شام وعراق وفلسطین میں، دیکھو مصر میں اور سب مل کر کام کرتے ہیں۔ ہم ان کی حد سے زیادہ دلجوئی کرتے ہیں اور اگر بلقان اور آرمینیا کے فسادوں کا طعنہ دو تو اب یہ راز طشت از بام ہو چکا ہے کہ یہ ساری ریشہ دوانی وموشگافی پرانی سرزمین آسیہ (ایشیا) بلکہ کل سرزمین مشرق کے اللہ الحسام مغرب کی تھی اور اگر خدانخواستہ اب بھی کبھی اور کہیں یہ آگ لگے تو سمجھ لو کہ اس کی چنگاری بھی مغربی آتش دان ہی سے آئی ہے۔ خدا نہ کرے کہ تمھارے ہاں بھی وہی ہوا کام نہ کر رہی ہو جو ہر جگہ آگ سلگاتی پھرتی ہے۔

"مجھے مسلمانان ہند سے خصوصیت کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہے۔ ہنود کی تنہا خوری تو مسلّم ہے مگر بذل وایثار، برادر نوازی وسیر چشمی، حریت پسندی وامن دوستی کا جو جوہر تمھاری گھٹی میں پڑا تھا اسے آج کیا ہو گیا۔ کیا تم اپنے وطن سے دور ہو کر اپنا آموختہ سبق بھی بھول گئے۔ تم نے ہندوستان میں صدیوں اصلاح کا کام کیا ہے۔ لہٰذا تم خصوصیت کے ساتھ اس "امر" کے مامور ومخاطب ہو کہ "ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحہا"۔ اگر تمھارے ہندو بھائی تمھارے ساتھ تنگ نظری اور تنگ حوصلگی کا برتاؤ کرتے ہیں تو مضائقہ نہیں تم اپنی بلند نظری اور عالی حوصلگی کو ہاتھ سے کیوں دو۔ وہ تم سے ڈرتے ہیں اور بھاگتے ہیں تم ان سے ملو اور کلیجے سے لگاؤ، وہ تم سے نفرت کرتے ہیں تو تم ان سے محبت کرو اور ثابت کر دو کہ تم ان کے اچھے بھائی اور اپنی مادر وطن کے اچھے بیٹے ہو۔ امید کہ ہمارا یہ

Marfat.com

پیام تم اپنے ہر بھائی تک پہنچا دو گے۔ والسّلام"۔

ان سب ممالک میں سعی لاحاصل کرنے کے بعد فقیر وطن واپس آیا اور پھر سوچنا شروع کیا کہ کیا تدبیر کی جائے جس سے ہندو بھائیوں کا انتشار و اضطرار رفع ہو۔ چنانچہ آخری اور قطعی تدبیر یہ سوچی اور اس کے سوا کوئی اور تدبیر سمجھ میں نہیں آئی کہ مقدس سرزمین ہند ہی کو اس کے مقر اصلی سے ہٹا کر کہیں اور لے جایا جائے تاکہ ماورائے سرحد کے وحشی اور اُجڈ پڑوسیوں سے پیچھا تو پاک ہو۔

وہ جو کہتے ہیں "جوئندہ یابندہ" سو فقیر نے جگہ بھی ایسی ڈھونڈ نکالی ہے کہ باید و شاید۔ آرام بھی بہت اور پڑوسی بھی مہذب و معتبر، متموّل و مستقیظ، آب و ہوا نہایت معتدل، بارش بکثرت، کائنات الجو میں نباتات و حیوانات کی پرورش کی بدرجۂ اتم طاقت، مگر جگہ کسی قدر تنگ ہے اور پورے ہندوستان کی سمائی مشکل۔

ہندوستان کو مع ہمالیہ اور دامن کوہ کی سطوح مرتفع کے لے چلنا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ قطع نظر گرانی کوہ بھوٹان و نیپال و سکم و کشمیر و نادھن کلیہ، اپنی ریاستی حیثیت کھو کر اپنے مقامات سے ہٹنا کیوں گوارا کریں گی۔ اس کے علاوہ سندھ و پنجاب و مشرقی بنگال و ریاست ہائے راجپوتانہ بھی تبدیل مقام کے خواہش مند نہیں اور ولسن صاحب کے اصول خود انتظامی کی رُو سے کسی کو حق نہیں کہ انھیں خلاف مرضی مجبور کرے خصوصاً جب اہل برار کی مرضی کے بغیر واپسی امانت ناممکن ہے تو بلا حصول رضامندی تبدیلِ مقام کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا فقیر نے حساب کیا تو ۲۵ درجے عرض البلد کے جنوب کا کل حصّہ قابل حمل و نقل رہا۔ مگر اس پر بھی عمل درآمد ذرا طاقت طلب اور ہمت آزما ہے۔

مسلمان اول تو ہیں ہی کتنے اور جو ہیں ان میں سے مرزا پھویا نوابوں اور رئیسوں اور کام چور لیڈروں اور مولویوں کو نکال کر باقی سب کے سب فاقہ مست بے فکرے یا پست ہمت ہیچکارے رہ جاتے ہیں لہٰذا ان سے تو کسی طاقت طلب اور ہمت آزما کام کی امید

Marfat.com

فضول ہے۔ یہ وقت ہے ہندو بہادروں کی ہمت دکھانے کا، کہ ہندوستان کو اس کی جگہ سے اٹھا کر ہاتھوں ہاتھ لے چلیں اور مشرق کی طرف رخ کر کے آبنائے ملاکا سے گزر کر بندرگاہ سنگاپور سے گزر کر، فرانسیسی کوچین چاینا سے گزر کر، ہانگ کانگ سے گزر کر، خلیج فارموسا سے گزر کر ٹھیک خط سرطان پر مابین درجہ ہائے ۱۲۰، ۱۴۰ طول البلد اور ۱۱۰ اور ۳۰ عرض البلد یعنی جزیرہ فارموسا و جزیرہ کیوسو کے درمیان خالی قطعہ میں لنگر انداز کر دیں۔ یہ مقام ایک طرف ساحل چین سے متصل اور دوسری جانب جزیرہ جاپان سے ملحق ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں قلیل التعداد آفاقیوں اور اقامت گزمینوں کو مستثنیٰ کر کے تمام و کمال بدھ مذہب کے پیروؤں کی آبادی ہے جو ہندو سبھا منعقدہ بنارس کی قرارداد کے مطابق سب کی سب ہندو جاتی میں شامل و داخل ہے۔

اس نقل مکان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اب تک ہندو بھائی بجا طور پر مسلمانوں کے سفر حج و زیارات کو مشتبہ نظر سے دیکھتے تھے اور نیز انھیں طعنہ دیتے تھے کہ جب تک ان کی محبت و ہمدردی ممالک غیر اور اقوام غیر کے ساتھ ہے وہ سچے محب وطن اور اچھے خادم ہند نہیں ہو سکتے۔ اس نقل مکان کے بعد چونکہ ہندوؤں کے مقدس مقامات مثلاً گوری شنکر، کیدار ناتھ، ہردوار، متھرا، اجودھیا اور بنارس اور مقدس دریائے گنگ و جمن ہمالیہ کے ساتھ یہیں رہ جائیں گے لہذا ہندوؤں کو بھی تیرتھ جاترا کے لیے وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر یہاں آنا پڑے گا اور اس کے بعد مسلمانوں پر تعرض کا موقع نہ رہے گا بلکہ فقیر کی رائے پر عمل ہو تو ہندو پنڈت اور مسلمان مولوی ایک ہی جہاز میں بیٹھ کر گھر سے نکلیں گے۔ ایک ساحل کراچی پر اتر کر تیرتھ جائے گا دوسرا ساحل جدہ پر اتر کر حج کر آئے گا اور پھر جاتری اور حاجی دونوں اپنی اپنی گنگا جل اور زمزم شریف کی شیشیاں لے کر ایک ہی جہاز سے گھر لوٹیں گے۔ مسلمان اپنے ہم مذہب عربوں، ترکوں، مصریوں، شامیوں اور افغانوں سے محبت کرنے اور تعلقات بڑھانے میں آزاد ہوں گے اور ہندو اپنے پس ماندہ بھوٹانیوں، نیپالیوں اور کشمیریوں، سندھیوں، پنجابیوں، بنگالیوں اور راجپوتوں سے پریم بڑھانے کے مختار ہوں گے۔ اب تک ہندوؤں کی محبت اور ہمدردی

محض ہندوستان قدیم کی چار دیواری میں محدود و مرکوز تھی اب، ہندوستان قدیم و جدید میں برادر نوازی کی داد دے سکیں گے اور مسلمانوں پر بدگمانی کا موقع خود بخود رفع ہو جائے گا۔ جدید ہندوستان میں ہندو اور مسلمان نہایت پریم اور محبت سے بسر اور پوجیہ مہاراج لاجپت رائے کے احکام ثلاثہ عشر پر عمل کریں گے۔

فقیر نے اپنے پندار میں تدبیر تو کمال غور و فکر کے بعد سوچی ہے مگر اس میں صرف ایک امر محل نظر ہے اور وہ یہ کہ نیا پڑوسی جاپان ابھی حال ہی میں جوان ہوا ہے لہذا جدید ہندوستان کو اپنے مال سے چوکس اور کیل کانٹے سے درست رہنا پڑے گا۔ ایسا نہ ہو کہ ذرا آنکھ چوکی اور چراغ گل پگڑی غایب، ہندوستان کو مغلوب ہو جانے کی پرانی عادت ہے۔

ان فی ذلک لذکرے لاولی الالباب

الناظر، لکھنؤ ——— ملا مضمون العلی

از بودھا منو

حصّۂ سویم

(افسانے)

Marfat.com

Marfat.com

حدیث دیگراں

(۱۶)

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں "یو۔پی والا" پر آپ سے کچھ گفتگو کروں۔ عرصہ ہوا ایک صاحب نے خطابات کی ایک فہرست شائع کی تھی۔ قافیہ یہی "والا" تھا۔ خطاب یا القاب کا یہ طرز اتنا مقبول ہوا کہ اب لوگ اسے بے تکلف استعمال کرنے لگے ہیں۔ اس وقت سارے خطابات تو یاد نہیں، صرف چند ایک ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ عام لوگوں کے فائدے کو مدِ نظر رکھ کر ان کا حقِ تصنیف یا حقِ ملکیت محفوظ نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کے ترک و اختیار کا حق ہر عاقل، بالغ اور بے روزگار کو حاصل ہے۔ سنیئے ـــــــــ

آر۔ ایچ ـــــــ شیشے والا　　پی۔ کے ـــــــ بھٹی والا

جے۔ بی ـــــــ گھڑی والا　　سی۔ پی ـــــــ موتی والا

او۔ یو ـــــــ مرغی والا

بہرحال اب یہ لفظ چل نکلا ہے، جسے بے تکلف صاحب اور یکّہ بان دونوں استعمال کرتے ہیں۔

(آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر) ـــــــ رشید احمد صدیقی

خنداں

رشید احمد صاحب نے جن صاحب کا تذکرہ نام لیے بغیر کیا وہ تحقیق کرنے پر سید محفوظ علی ہی نکلے۔ مضمون متعلقہ جو ۱۹۰۴ء میں مولانا

Marfat.com

ظفر علی خاں کے "دکن ریویو" میں شائع ہوا تھا، آگے ملاحظہ ہو۔

محفوظ علی صاحب کی ایسی ہلکی پھلکی رعایت لفظی کو مولانا محمد علی بہت پسند فرماتے تھے چنانچہ اپنے ایک مکتوب[۱] مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۰۸ء میں وہ سید صاحب کو "ترکی بہ ترکی" لکھتے ہیں۔ "بیوی گھڑی کا تقاضا کرتی ہیں، گھڑیالی بجز چین نہیں، گھڑی بغیر چین نہیں، CHAIN کا لحاظ رہے۔"

ایک اور مثال ذہن میں آتی ہے۔ عبدالسمیع خاں (متوفی کراچی ۱۹۶۷ء) جو "سمیع آرٹسٹ" کے نام سے مشہور ہوئے، ہوشنگ آباد، صوبہ سی۔پی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے کارٹونسٹ بھی رہے ایک مرتبہ سمیع صاحب کا تعارف پنڈت مدن موہن مالوی سے کراتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا۔ "یہ سی۔پی کا موتی ہے"۔ یہ جملہ سید محفوظ علی ہی کی اختراع کی آواز بازگشت تھی۔

سید صاحب کی رعایات لفظی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ غلام احمد فرقت کاکوروی فرماتے ہیں ــــ "سید صاحب کو نہ صرف الفاظ کے انتخاب کا ملکہ تھا بلکہ ان کے ہر ہر لفظ میں گہرائی اور معنویت کا سمندر موجیں مارتا ملتا ہے۔ رعایت لفظی سے انھوں نے بھی اپنے بعض مضامین میں فائدہ اٹھایا ہے، مگر اس میں بھی ان کے یہاں ایک فن کار کا سا انداز ملتا ہے[۲]" رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں ــ" وہ الفاظ سے بھی کھیلنے کے شائق تھے۔ ان کے ظریفانہ مضامین میں "رعایات و مناسبات" کا اچھا خاصہ عنصر ملتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جو اب قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی، لیکن وہ ان رعایات کو رعایت کی خاطر بہت کم استعمال کرتے تھے۔ وہ ان میں "موقع"

۱ؔ خطوط محمد علی

۲ؔ اردو ادب میں طنز و مزاح ۔ مؤلف

Marfat.com

ماحول' کا ایسا رنگ بھر دیتے تھے کہ ان میں واقعیت جھلکنے لگتی تھی۔ ایسی واقعیت جو آرٹ میں جان پیدا کر دیتی ہے۔"

اظہار فوقیت مقصود نہیں، ایک مثال لفظ "پالیسی" سے متعلق عرض کرتا ہوں۔ نواب سید محمد آزاد جو "اودھ پنچ" کے بڑے ممتاز لکھنے والوں میں تھے۔ "پالیسی" کی تعریف کرتے ہیں۔ "گیدڑ بھبکی، ہوائی بندوق کی آواز، کمزور کو دبانا، زبردست سے ڈرنا۔" حکیم ممتاز حسین عثمانی "اودھ پنچ کی نوٹ بک" میں رقم طراز ہیں۔ "پالیسی 'پالیسیدن' کا حاصل مصدر اور پالیسیدن خود بہ ترکیب مقلوب اضافی 'لیسیدنِ پا' ہے جس کے معنی ہیں 'پاؤں چاٹنا'۔ ہم انگریزی نہیں جانتے اسی وجہ سے جب کوئی نیا بگڑا مختس ہندوستانی پالیسی پالیسی رٹتا ہے تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ 'پالیسی' کی خواہش رکھتا ہے"۔ اب یہی لفظ جب سید محفوظ علی کے نشتر کے نیچے آتا ہے تو بات بلندی کے آخری درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "یہ لفظ دو ٹکڑوں سے مرکب ہے، یعنی 'پا' جس کے معنی ہیں پاؤں یا قدم اور 'لیسی' جو فارسی کے مصدر لیسیدن سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں چاٹنا جو غایت درجے کا تعظیمیہ عجز ہے۔ یہ لفظ اسی طرح کا ہے جیسے 'کاسہ لیسی' اور اسی قسم کا جیسے 'پابوسی'۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ کاسہ لیسی اور پابوسی اور پالیسی میں باعتبار صلہ یابی درجہ بدرجہ فرق ہے۔ یعنی اگر کاسہ لیسی پر کوئی شخص خان صاحب کا خطاب پاتا ہے تو پابوسی پر نواب صاحب اور پالیسی پر بسا اوقات نواب بہادر بنا دیا جاتا ہے'۔

صحیح فرمایا ہے رشید احمد صدیقی نے کہ ۔"بعض دیگر انشا پردازوں کے مضامین کے خلاف سید محفوظ علی صاحب کا ہر لفظ کانٹے کا تلا معلوم ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جتنی جزئیات پر بھی ان کو عبور ہے۔"

ناموں کی گردان جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا میرا خیال ایک ادبیتے جاگتے

نام کی طرف لے جاتی ہے۔ اس نام کے مالک ازراہ محبت "ہم، تم، خان" کہلاتے ہیں جو اردو ترجمہ ہے آئی، یو، خان کا جن کا پورا نام عنایت اللہ خان ہے۔ یہ بدایوں کے سپوت ہیں اور وہاں کے پہلے مسلمان آئی، سی، ایس انھوں نے محض اپنی لیاقت سے اس مقابلے میں امتیازی کامیابی حاصل کی تھی وہ پنجاب کے سویلین رہے اور صوبائی اور مرکزی حکومتوں میں ہمیشہ عہدہ ہائے جلیلہ پہ فائز رہے۔ بدایوں کے ایک اور آئی، سی، ایس مرحوم واحد بخش قادری (ڈبلیو، بی، قادری) تھے جو حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کے سیکرٹری رہے تھے۔

آنے والے مضمون میں ایک دلچسپ بات قابل غور یہ ہے کہ اس میں سید صاحب نے اپنی پیدائش سے پوری ایک صدی بعد یعنی ۱۹۷۰ء کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس مضمون کو لکھے ہوئے بھی ساٹھ سال سے زیادہ مدت گزر چکی۔ اب جب کہ ۱۹۷۰ء آئی اور گزر بھی گئی موجودہ معاشرے کی روشنی (یا تاریکی) میں سید صاحب کے افسانوی تخیل کو حقیقت کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ ان کی نگاہ کس قدر دُور رس تھی۔

ہیں تری چشم جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش

مؤلف ———

شوہر کا شکار

سطورِ ذیل کی اشاعت کا محرک اوّل تو اخبار" زمیندار" کا لیڈر "مسلمانان در شراب و مسلمانی در کتاب" ہے اور محرک ثانی ایک نہایت خوشنما زنانہ خط ہے جس کی زیارت مجھے حال میں نصیب ہوئی۔ خط کی راقمہ ایک شریف خاندان کی تعلیم یافتہ دوشیزہ ہیں اور مرقوم الیہ ان دوشیزہ کے والد کے ایک دوست کے صاحبزادے جو ماشا اللہ شکیل۔ شوخ طبع، رنگین مزاج، ناکتخدا نوجوان اور ایک معزز عہدے پر ممتاز ہیں. راقمہ نے اس خط کے ذریعے سے ایک دوسرے نوجوان کے متعلق (جس کے ساتھ ان کے عقد کی تجویز ہے) کچھ حالات بطور خود دریافت فرمائے ہیں۔ خط کی عبارت اس درجے شوخ بلکہ عریاں ہے اور امور مستفسرہ ایسی صفائی و بے باکی سے لکھے گئے ہیں کہ اگر نام کی جگہ انگلی رکھ دی جائے تو بہ آسانی یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ مراسلت ایسے دو سخت بے تکلف اور آزاد نوجوانوں کے درمیان ہے جن کے بہت سے رازہائے زندگی مشترک ہیں اور جن کے خیالات اظہار کے وقت معمولی آداب تہذیب کے پابند نہیں۔

ابھی اس قسم کی مثالوں کی ابتدا ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہا تو میرے منہ میں خاک! جو کچھ آگے چل کر پیش آنے والا ہے اس کا پیشگی فوٹو سطور ذیل میں نظر آسکتا ہے۔

بیسویں صدی کی عمر کا آفتاب مدت ہوئی کہ خط نصف النہار کو طے کر چکا ہے اور تیس سال کی قلیل الشمار مدت میں غروب ہوا چاہتا ہے۔ یوریشین اینگلو

Marfat.com

ریلوے[1] اور بلو اسکائی نیویگیشن کمپنی[2] نے یورپ کو ایشیا کا تفرج گاہ بنا دیا ہے اور ایشیا کو یورپ کی شاہراہ ہمارے ہندوستان جنت نشان کو اگرچہ امن برطانیہ کی بدولت سکون و اطمینان اور امن و امان نصیب ہے اور اس میں حکومت ارضی کے اعتبار سے کوئی انقلاب واقع نہیں ہوا ہے لیکن "ملکِ خیال" اور "سرزمینِ عمل" میں ایسے ایسے عظیم الشان انقلابات ہو چکے ہیں کہ موجودہ ۱۹۷۰ء کے خیال و عمل کا مقابلہ گزشتہ ۱۹۱۰ء کے خیال و عمل سے کیا جاتے تو ان میں وہی نسبت ہو گی جو ظلمات کو نور سے اور ظل کو حرور سے ہے

---

[1] EURASIAN ELECTRIC RAILWAY یعنی وہ ریلوے جو ایشیا اور یورپ کو باہم ملاتی ہے۔ اس ریلوے کی تعمیر کی تجویز تو نومبر ۱۹۱۰ء میں پیش ہوئی تھی مگر جس زمانے کے حالات ہم قلمبند کر رہے ہیں اس وقت یہ ریلوے نئی پرانی ہو چکی ہے اور ہندوستان کے گزشتہ بادشاہوں کے تخت گاہ (دہلی) اور موجودہ شہنشاہ کے تخت گاہ (لندن) کی درمیانی حد فاصل صرف ۱۸ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ سنیچر کی سہ پہر کو صاحب بہادر کچہری بند کر کے ہندوستان سے روانہ ہوتے ہیں اور اتوار کی صبح کو سینٹ پال کے گرجے میں لیڈیوں کے دیدار سے لذت یاب ہوتے ہیں۔ پیر کی صبح کو ہنوز خانساماں بریک فاسٹ ٹیبل کی جھاڑ پونچھ میں مشغول ہوتا ہے کہ صاحب بہادر سیٹی بجاتے واپس آ جاتے ہیں۔ مصنف

[2] BLUE SKY NAVIGATION COMPANY یعنی وہ کمپنی جس کے ہوائی جہازات مشرقی آسمان پر آمد و رفت کرتے ہیں۔ جس طرح ریلوے لائین کسی خاص سرزمین میں جاری ہو کر اسی کے نام سے موسوم ہو جاتی ہے۔ جیسے روہیل کھنڈ کمایوں ریلوے۔ راجپوتانہ مالوہ ریلوے۔ اسی طرح یہ جہازات چونکہ ارض مشرق کے آسمان پر چلتے ہیں جن کا رنگ نیلگوں ہے لہذا اسی نام سے موسوم ہوتے۔ مصنف

Marfat.com

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ پرانے خیالات کے دقیانوسی سلیپٹ سکّے نئی ٹکسال کی گھریا میں ڈال کر پگھلا دیے گئے۔ اب نئے خیالات کے جگمگاتے کلداروں کا چلن ہے تہذیبِ قدیم کی بخیہ دری ہو چکی۔ اب تہذیب جدید کی جلوہ گری ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ (اور قوموں کی ہم کیوں کہیں) مسلمان اپنا مذہب اپنی روایات، اپنا تشخص، اپنا تمدن، اپنی زبان، غرض کہ اپنا چودہ سو برس کا خزانہ ملیامیٹ اور مغربی تمدن کی نقالی کر کے "از ایں سو راندہ و از آں سو درماندہ" ہو چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ کشش کا مقناطیسی اثر مسجد اور خانقاہ سے منتقل ہو کر کونسل ہال اور تھیٹر میں چلا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ داڑھی اگر خال خال کبھی اور کہیں کسی چہرے کی خس پوشی کر رہی ہے تو محض اس وجہ سے کہ شہنشاہ اڈورڈ سابع اور شہنشاہ جارج خامس کے منہ لگ کر امپیریل فیشن میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ محقق ایشیا سے قدیم کو عمامے کا مسمّیٰ دیکھنے کے لیے لاہور کا ٹکٹ لینا پڑتا ہے تاکہ وہاں کے عجائب خانے میں جا کر مختلف وضعوں کی دستاروں اور پگڑیوں کے نمونے دیکھ آئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی سوسائٹی میں پان کی جگہ پیگ نے اور رشک کی سگار نے لے لی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ تعلیم کی فراوانی پردۂ نسواں کی دھجّیاں پھاڑ پھاڑ کر ان سے جہالت کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ صنف نازک کا ان اعضائے بدن کو چھپانا مخالف تہذیب اور منافی تمدن سمجھا جاتا ہے جن کو کھولنا کبھی خلاف مذہب اور باعث ننگ و شرم تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ جنس لطیف کی افراد اپنے رفیق زندگی کی تلاش و انتخاب کا حق صرف اپنے ہی بھولے بھالے اور اثر پذیر دل تک محدود رکھنا چاہتی ہیں اور اپنے کسی بزرگ کی تجربہ کار اور عاقبت بیں عقل کی دست اندازی بلکہ محض صلاح اپنے اس حق میں کسی طرح اور کسی حالت میں گوارا کر ہی نہیں سکتیں چاہے وہ بزرگ ان کی آئندہ خوشحالی پر مطمئن اور تکلیف پر فکر مند رہنے کا کتنا ہی حق کیوں نہ رکھتا ہو۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ سوسائٹی نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہر عورت چاہے وہ کسی عمر اور درجے کی ہو اور چاہے شوہر دار ہو یا مجرّد، ہر غیر رشتہ دار اور اجنبی مرد تک سے چاہے وہ کسی

Marfat.com

عمر اور درجے کا ہو اور چاہے زوجہ دار ہو یا مجرد جلسے یا تنہائی میں۔ جس جگہ اور جس وقت اس کا جی چاہے۔ ملنے جلنے اور اس کے پاس رہنے سہنے میں اسی طرح اور اسی قدر آزاد و مختار ہے جس طرح اور جس قدر ہر مرد ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ وہ کنواری لڑکیاں جو صنفی امور میں بہ اعتبار عمر و جاہت معمولاً ہیچمداں سمجھی جانی چاہئیں مگر جو بوجہ تجربہ و مہارت عملاً ہمہ داں ہوتی ہیں اپنی دستی حسن دان میں علاوہ آئینہ کنگھے، ہیر آئل، لیونڈر، صابون اور بال صفا کے لازماً اور ضرورتاً بہت سی چھوٹی چھوٹی شیشیاں لیے پھرتی ہیں جن میں کسی پر "لطفہ" کسی پر "لذتی" کسی پر "دیر پا" کسی پر "۴۰+۴۰ علیل" کسی پر "بیمار" کسی پر "دافع" اور کسی پر "مانع" لکھا ہوتا ہے۔

اس زمانے کے ایک سہائی دوپہر کو ایک چھوٹا ہوائی جہاز بریلی کے آسمان پر شہاب ثاقب کی طرح گزرا اور سیول لائن میں بی۔ ٹی۔ کلبلی[۵۱] بیرسٹر ایٹ لا کی عالی شان کوٹھی کے احاطے میں اترا۔ ایک جینٹل مین اس میں سے کود کر برآمدے میں داخل ہوا اور دربان سے پوچھتا ہوا "صاحب ہیں" بلا انتظار جواب ہال میں سے پھلانگ کر اور زینے پر کھٹ پٹ چڑھ کر ایک پر تکلف سجے ہوئے کمرے میں پہنچ گیا۔

"یار کلبلی۔ اچھا ہوا گھر ہی پر مل گئے میں تو سمجھا تھا جانے کہاں کہاں پھرائے گے تب جا کر کہیں مل پاؤ گے۔"[۵۲]

کلبلی۔ "ہلو اسکر[۵۳] آجاؤ۔ اچھے آئے۔ کہو خیر ہے کوئی ضروری بات ہے؟"

اسکر۔ "ہاں خیر ہے۔ کچھ نہیں ایک بہت ضروری بات ہے۔"

کلبلی۔ "اچھا بیٹھو تو جاؤ۔" (برقی بٹن پر ہاتھ رکھتے ہی خدمت گار آیا)۔

---

۵۱ مصنف کا درج کردہ حاشیہ اس مضمون کے ضمیمے کے پہلے پیراگراف میں ملاحظہ ہو۔ مؤلف

۵۲ ایضاً۔ ضمیمہ کا دوسرا پیراگراف۔ مؤلف

۵۳ ایضاً۔ ضمیمہ کا تیسرا پیراگراف۔ مؤلف

Marfat.com

"بکش[1] صاحب کو وہسکی سوڈا لاؤ"۔ (دوست سے) میز پر سے سگار لو اور آرام کرسی پر دراز ہو کر سناؤ کہ کیا بات ہے۔"

اسکر۔ "کچھ نہیں۔ میں ابھی کیپٹن حاجی کے ہاں تھا۔"

کلبلی۔ "یہ بات کیا ہوئی۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار آتے ہو۔ کہتے ہو خیر ہے پھر کہتے ہو کچھ نہیں۔ پھر کہتے ہو ایک بہت ضروری بات ہے۔ بات پوچھتا ہوں تو کہتے ہو کچھ نہیں آخر میں فرماتے ہو تو یہ فرماتے ہو کہ کیپٹن حاجی کے ہاں تھا۔ کیا کیپٹن حاجی بہت زیادہ تیز پیتے ہیں۔"

اسکر۔ "میرے پیارے دوست کیا بتاؤں۔ اس وقت میرا دماغ چکر میں ہے"۔

کلبلی۔ "سگار لو سگار۔ دو ایک کش کے بعد دماغ کھل جائے تو بات کہہ کر جی ہلکا کرو"۔

اسکر۔ "تمھیں معلوم ہے کہ میں آج صبح تک ڈلہی (دہلی) تھا"۔

کلبلی۔ (جرأت دلانے والے لہجے میں) "ہاں۔ ہاں۔ بھائی جان۔ بات تو کہو"۔

اسکر۔ "بات کیا کہوں۔ ڈلہی میں میرا نصیب کھل گیا اور میری مقسومہ[2] مجھے مل گئی"۔

کلبلی۔ "(خوشی سے اچھل کر) حقیقت میں۔ اچھا تو تم نے اپنی رفیق زندگی ڈھونڈھ ہی نکالی او تم خوش نصیب[3] کتے۔ مگر بتاؤ تو کیسے"۔

اسکر۔ "میں ڈلہی میں لارڈ جیکسن[4] رائے کے ہاں گنیش ہال میں مقیم تھا کیونکہ تمھیں یاد ہوگا

---

[1] خدمتگار کے نام "بخش" کا بگڑا ہوا انگریزی نما تلفظ۔ مؤلف

[2] یعنی وہ خاتون جو کسی جنٹل مین کی قسمت میں لکھ گئی ہو۔ اکثر ولایتی لیڈیوں کا نام روزی (ROSIE) ہوتا ہے اس کی صحیح ترین وجہ یہی ہے کہ وہ مقدرات میں سے ہوتی ہیں اور کوئی شخص اپنے لیے ان کی مقدار بڑھا نہیں سکتا چاہے گھٹا دے۔ مصنف

[3] O, YOU LUCKY DOG! ۔ مصنف

[4] "جے کشن رائے" کا ترقی یافتہ روپ۔ مؤلف

Marfat.com

کہ پچھلی گرمیوں میں جب ہم تم سملے میں تھے تو انھوں نے ہولی پر مجھے ڈلہی آنے کی دعوت دی تھی۔ میرے پہنچنے کے تیسرے چوتھے دن اور کئی مہمان پہنچے۔ ان ہی میں ایک خاتون بھی تھی جسے 'بھابی جان' کہہ کر خطاب کرنے کا فخر تمھیں عنقریب حاصل ہونے والا ہے۔"

کلبلی۔ "شاباش تم خوش نصیب پرانے بدمعاش[۵۱]۔ میں تمھیں مبارک باد دیتا ہوں۔"

اسکر۔ "مہربانی بہت بہت کلبلی، تم خوب جانتے ہو کہ جب لوگ ہماری تمھاری، میرا مطلب ہے کہ میری عمر۔۔۔۔۔۔

کلبلی۔ (بات کاٹ کر) "نہیں نہیں، ہماری تمھاری' ہی کہو۔ تم تو میرے غسل خانے میں ہیر ڈائی (خضاب) کی بوتلیں دیکھ ہی چکے ہو"۔

اسکر۔ "خیر یوں ہی سہی۔ جب لوگ ہماری تمھاری عمر کو پہنچ جائیں تو کسی خاتون کا بغیر اس بات کو جانے ہوئے کہ ہم مالدار ہیں ہم سے محبت کرنا بڑی ہی خوش نصیبی ہے۔ پس اگر کسی کو ایسی عمر میں کوئی محبت کرنے والی، شیریں ادا، کوتہ قبا، نغمہ سرا، ارگن نوا۔"

کلبلی۔" اے واہ بے شاعرو!"

اسکر۔ (کلبلی کی بات سنی اَن سنی ایک کر کے)" مل جائے تو مسلمانوں کی جنت کو مع اس کی گاو دیدہ حوروں کے سات سلام، تعجب ہے کہ کنیش ہال میں کسی کو اس کی نسبت کچھ بہت زیادہ حالات معلوم نہ تھے۔ مگر اس سے کیا ہوا۔ دو ایک دن ہی میں میں نے اس کے متعلق وہ سب باتیں معلوم کر لیں جن کی ضرورت تھی۔ یعنی ایسی حسینہ و جمیلہ اور اس پر ایسی خوش خصال، اور پھر محبت کی محض محبت کے باعث قدر کرنے والی۔ کلبلی یار، پچھلے دس سال مجھے یہی ڈر لگا تھا کہ اگر کوئی خاتون مجھ سے شادی کرے گی تو محض میری دولت کی وجہ سے مگر اس حسن کی دیوی اور محبت کے اوتار

---

۵۱ ـ BRAVO YOU LUCKY OLD ROGUE! مصنف

نے تو مجھے محض ایک معمولی حیثیت کا آدمی سمجھ کر تبادلۂ عشق کیا ہے۔ کلبلی میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صوفیا رسل[1] . . . . .

کلبلی۔ (ہکا بکا ہو کر) "سوفیا رسل"۔

اسکر۔ "ہاں یہ اس خاتون کا نام ہے۔ مسٹر رسل اصل میں ان ایرانی تاجروں کی اولاد میں سے تھے جو بمبئی . . . . ."

کلبلی۔ (کانپتے ہوئے ہاتھ سے سگار منہ سے ہٹا کر بھرائی ہوئی آواز میں) "اسکر اتنی جلدی جبڑے مت چلاؤ"۔

اسکر۔ "کیوں کیا ہوا"

کلبلی۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) "سوفیا رسل بمبئی کے ایرانی تاجروں کے خاندان کی لڑکی یقیناً تمہیں غلطی ہوئی ہے۔"

اسکر۔ (جوش میں آکر) "میں سمجھ نہیں سکتا کہ تمہارا مطلب کیا ہے۔ مجھے یقیناً اپنے جذبات کے متعلق کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں اور اسی قدر یقین سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے سوفیا رسل کے جذبات کے متعلق بھی کوئی غلطی نہیں ہوئی میری عمر اور تجربے کا آدمی اس بارے میں غلطی نہیں کر سکتا"۔

کلبلی۔ (اسی قدر جوش میں آکر) "میں تمہاری عمر اور تجربے کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ مجھے بھی سوفیا کے ساتھ اپنی قلبی کیفیت اور نیز اپنے ساتھ سوفیا کی قلبی کیفیت کے متعلق ہرگز ہرگز کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔"

اب اسکر ہکا بکا ہو کر کلبلی کا منہ تکنے لگا اور آخر کار بہ مشکل تمام یہ الفاظ ادا کر سکا "تب تم اسے جانتے ہو؟"

کلبلی۔ "جانتے ہو! ہاں یقیناً بہت زیادہ یقیناً جانتا ہوں۔ میں نے ایک ہفتے اس کی

---

[1] مصنف کا درج کردہ حاشیہ اس مضمون کے ضمیمہ کے چوتھے پیراگراف میں ملاحظہ ہو۔ مؤلف

Marfat.com

معیت میں اپالو ہوٹل میں گزارا اور قبل اس کے کہ وہاں سے روانہ ہو اس نے میری بی بی بننے کا قریب قریب وعدہ کر لیا تھا۔"

اسکر۔ "تب اس نے یقیناً بعد میں اپنا خیال بدل ڈالا۔"

کلبلی۔ "مجھے اس کا یقین نہیں۔ وہ نہایت شریف اور وضع دار خاتون ہے۔ اس قسم کی لغویت کی میں تو اس سے امید رکھتا نہیں اور اگر تم رکھو تو تم نے اسے دیکھا ہی نہیں"۔

اسکر۔ "دیکھا ہی نہیں۔ اچھا دیکھا جائے گا۔ مگر اس عرصے میں تمھارے پاس اس کا کوئی خط آیا؟

کلبلی۔ "نہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے مجھ سے طے کر لیا ہے کہ اگلے مہینے وہ مجھے نینی تال میں ملے گی اور وہاں نسبت کا اعلان کیا جائے گا۔"

اسکر۔ "اچھا میں دیکھتا ہوں، تمھاری اس کے ساتھ ابھی نسبت ہی نہیں ہوئی ہے۔"

کلبلی۔ "نہ تمھاری ہوئی ہے۔ تمھاری باتوں ہی سے معلوم ہو گیا۔"

اسکر۔ ادھر دیکھو کلبلی، ایک بات ہے جس پر ہم دونوں کو اتفاق ہو گا اور وہ یہ کہ سوفیا رسل جیسی شریف لڑکی سے لغویت یا چھچھورپن کے کسی فعل کا صدور امکان عقلی سے خارج ہے۔"

کلبلی۔ (جلدی سے) "بے شک، بے شک۔"

اسکر۔ "ناممکن ہے کہ اس نے ہم میں سے کسی کو دھوکا دیا ہو۔ لہٰذا ہم دونوں میں سے کوئی ایک ضرور اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ کیوں ہے نہ؟"

کلبلی۔ "بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔"

اسکر۔ "اور چونکہ تم اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہو کہ اس نے تمھیں لب دہی کی ہے لہٰذا بہتر ہے کہ خود سوفیا رسل ہی پنچایت کرے"۔

کلبلی۔ (خوش ہو کر) "میں اس پر راضی ہوں"۔

اسکر۔ (اسی قدر خوش ہو کر) "اور یہ احقر بھی"۔

کلبلی: "کیا سوفیا رسل ابھی تک لارڈ جبکیسن رائے ہی کے ہاں مقیم ہے؟"

اسکر۔ "پرسوں تک وہیں رہے گی۔"

کلبلی: "اچھا تو کل ہم دونوں وہیں چلیں اور اس کے سامنے معاملہ پیش کر کے خود اس کی زبان سے فیصلہ سنیں۔"

اسکر۔ "قبول۔ منظور۔ کل صبح نو بجکر پچاس منٹ پر کتب خانے کی چھت پر سے ہوائی جہاز میں سوار ہوں گے۔"

کلبلی۔ "بہت بہتر۔"

اسکر۔ "تو میں اب جاتا ہوں۔ کل صبح کتب خانہ پلیٹ فارم پر ملاقات ہوگی۔"

کلبلی۔ "نہیں میں راستے میں سے تمھیں اپنی برقی موٹر میں لیتا ہوا پلیٹ فارم پر جاؤں گا۔"

اسکر۔ "مہربانی۔ گڈ بائی۔"

کلبلی۔ "گڈ بائی"

مسٹر کلبلی بیرسٹر دوسرے دن صبح کو کسی قدر سر گرانی اٹھے اور خاموشی کے ساتھ دیر تک اپنے جذبات کا جائزہ لیتے رہے۔ انھیں دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ انھیں سوفیا رسل سے شکایت ہے کہ کیوں اس کے کسی نادانستہ یا دانستہ ابہام کی وجہ سے اسکر کے دل میں غلط امید پیدا ہو سکی۔ انھیں خود اپنے آپ سے شکایت ہوئی کہ کیوں انھوں نے اس امر پر اصرار نہ کیا کہ سوفیا رسل ان کی منسوبہ ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دے۔ مگر سب سے زیادہ شکایت انھیں اسکر سے تھی جو اپنے حمق کی وجہ سے یہ سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ جب سوفیا رسل ایک جنٹلمین سے معناً وعدہ کر چکی ہے تو سوسائٹی کے قانون کے مطابق کسی دوسرے جنٹلمین کو بیچ میں کودنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ اسکر کی نسبت پہلے انھوں نے رائے قائم کی کہ وہ سخت احمق ہے مگر اس رائے کو فوراً ہی بدل کر یہ فیصلہ کیا کہ وہ سخت کمینہ ہے۔ اس کے بعد انھیں خیال آیا کہ یہ بڈھا بدمعاش جو دانتوں کا پرانا سیٹ نئے سیٹ سے بدل کر اور نیرڈائی کا دوھرا رنگ بالوں پر چڑھا کر دن پر دن نکھرتا اور چھتا بنتا جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ سوفیا رسل جیسی کم عمر نازنین، خاتون کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوگئی ہے جا ہے وہ محبت کتنی ہی جھوٹی

Marfat.com

کیوں نہ ہو۔

انھیں خیالات کی جگالی کرتے ہوئے بی، ٹی، کلبلی بیرسٹر صاحب ناشتہ کی میز پر پہنچے جہاں صبح کی ڈاک ان کی منتظر تھی۔ انھوں نے ایک ایک لفافہ سرسری نظر سے دیکھا یہاں تک کہ ان کی نگاہ ایک خوشنما اور طرحدار لفافہ پر جم کر رہ گئی اور ان کا دل دفعتاً "کود کر منہ میں آ گیا"[1] اگرچہ انھیں سوفیا رسل کی تحریر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر دیکھتے ہی یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو اسی نازنین کا خط ہے۔ جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اسی کا خط تھا جس کے الفاظ یہ تھے۔

مائی ڈیر مسٹر کلبلی۔

جن محبت آمیز توجہات سے آپ نے پچھلے موقع پر میری قدر افزائی فرمائی ان کی بناء پر مجھے جرأت ہوتی ہے کہ میں ایک راز میں آپ سے خواستگار امداد ہوں۔ ایک صاحب مسٹر ڈیوڈ اسکر اپنی نظر محبت میری ایک خاتون دوست کی جانب مبذول فرماتے ہیں اور چونکہ میں اپنی دوست کا نام ظاہر نہیں کرتی لہذا یہ کہنا خلاف رازداری نہ ہوگا کہ مسٹر ڈیوڈ کی نظر بے اثر اور بلامعاوضہ نہیں رہی۔ چونکہ میں اپنی دوست کے آیندہ سود و بہبود کے متعلق پورا اطمینان کرنا چاہتی ہوں لہذا کیا آپ میری خاطر مسٹر ڈیوڈ اسکر کے متعلق اس امر کی تفتیش کی زحمت گوارا کریں گے کہ آیا وہ بہ اعتبار مزاج اور محبت کے اس قابل ہیں کہ کسی معزز خاتون کی آیندہ خوشی ان کی امانت میں دی جا سکے۔ ممکن ہے کہ آپ کا حلقہ سوسائٹی وہ نہ ہو جس میں مسٹر ڈیوڈ گھومتے ہیں[2] مگر بلاشبہ آپ کے ان کے بہت سے مشترک دوست ہوں گے جن سے اس قسم کی اطلاع آپ حسن سلیقہ سے حاصل کر سکیں گے۔

منتظر توجہاتِ دلی

سوفیا رسل

---

[1] HIS HEART LEAPT INTO HIS MOUTH. مصنف

[2] CIRCLE OF SOCIETY IN WHICH HE MOVES. مصنف

Marfat.com

مکرّر

ایک نہایت ہی خفیف سی بات اور ہے وہ یہ کہ میری دوست چونکہ ماشا اللہ وفور دولت میں پلی ہیں لہذا آپ بہ صحت ممکنہ پتہ لگائیں کہ مسٹر ڈیوڈ کی رقم آمدنی سالانہ کس قدر ہے۔

سوفیا رسل

کلبلی بیرسٹر صاحب نے اس نمیقہ اینقہ کو دو تین دفعہ پڑھا اور آخر کار ایک اطمینانی سانس لے کر کرسی کے تکیے کو ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور یوں سوچنے لگے۔

" اخاہ - یہ عقدہ اب جا کر کہیں حل ہوا - یہ گدھا اسکر تو بزعم خود سوفیا رسل سے معاشقہ کرتا ہے مگر وہ حسن، محبت وصداقت کی دیوی اس خیال میں ہے کہ وہ اس کی رفیق کا خواستگار ہے۔ ایسی حالت میں سوفیا رسل کا اسکر کی جانب غیر معمولی التفات کرتے رہنا مطلق بے جا نہیں ہے۔ اسکر اگرچہ بے وقوف ہے پھر بھی میرا دوست ہے اس لیے میرا فرض ہے کہ اس کی آنکھیں کھول دوں کہ مس سوفیا رسل نہایت سچائی اور ایمانداری سے اس خیال میں ہیں کہ اسکر کا قدم عشق ان کی ایک خاتون دوست کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن سوفیا رسل نے تو اسے بطور راز لکھا ہے۔ عفیس میں ان سے اپنے دوست اسکر کی خاطر معافی مانگ لوں گا۔

دس منٹ کے بعد کلبلی بیرسٹر صاحب کی ایرُوکار[ف] اسکر ہال کے برآمدے کے سامنے ٹھہری اور وہ اتر کر کمرے میں داخل ہوئے۔ مسٹر ڈیوڈ اسکر لمبا منہ بنائے ہوئے شکن درابرد ناشتے کی میز پر تھے۔ کلبلی نے از راہ عنایت بے تکلفی ان کے گال پر ایک چپت رسید کر کے فرمایا۔ " چہرے کی لمبائی اگر یونہی بڑھتی گئی تو ڈر ہے کہ کہیں کھوپڑی شریفہ اسکر ہال کی چھت

ف یعنی وہ گاڑی جو کرۂ ہوا پر چلتی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک موٹر کار زمین پر چلتی تھی۔ لیکن اب وہ چھکڑے، رہلو، بہلی، رتھ، چرٹ، تسکرم، ٹمٹم، پالکی اور ہوادار کے ساتھ اصطبل فنا میں پہنچ چکی اور اس کی جگہ ہوائی جہاز اور ایروکار نے لے لی جو فضائے اثیر کی ہوائی سڑک پر اڑتی پھرتی ہے۔ مصنف۔

سے نہ جا ملے"۔

اسکر۔ (نہایت زہریری لہجے میں) "جناب معاف فرمائیے"۔

کلبلی۔ (تھوڑا تھوڑا ہو کر) "بھئی میرا قصد توہین کا نہ تھا"۔

اسکر۔ "خیر"۔

کلبلی۔ "مگر یہ تو بتاؤ کہ مس سوفیا رسل کی یہ کون سی خاتون دوست ہیں جن کی طرف وہ لکھتی ہیں تمھارا گوشۂ چشم ہے"۔

اسکر۔ "غالباً وہی جن کی طرف تمھارا گوشۂ چشم ہے"۔

کلبلی۔ (تعجب سے) "یہ کیا بات ؟"

اسکر۔ "میں کیا جانوں۔ ان کے نوازش نامے سے جو ابھی وصول ہوا مجھے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"

کلبلی۔ "کیا انھوں نے تمھیں بھی کوئی خط لکھا ہے ؟"

اسکر۔ "جی ہاں جس میں تمھارے متعلق استفسارات کیے ہیں"۔

یہ کہہ کر اسکر نے میز پر سے خط اٹھا کر کلبلی کو دیا جسے پڑھتے ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ صرف ناموں کا فرق تھا ورنہ نقل مطابق اصل۔

مسٹر کلبلی بیرسٹر صاحب کا دماغ جس میں انھوں نے (بقول ایک حیدرآبادی بیرسٹر کے) پچیس ہزار روپے کا قانون بند کیا تھا اب کہیں جا کر کھلا۔ چنانچہ خط میز پر رکھ کر انہوں نے فرمایا۔

"او لومڑی۔ تو ہم دونوں کو اُلّو بنا رہی ہے"۔

اسکر۔ "جیسے ہی مجھے یہ خط ملا فوراً ہی یقین ہو گیا کہ اس مضمون کا خط تمھارے پاس بھی آیا ہو گا"

کلبلی: "تم خط پڑھتے ہی سمجھ گئے کہ کیا بات ہے"۔

اسکر۔ "تم جیسے گدھے نہ سمجھیں تو نہ سمجھیں میں تو اسی وقت سمجھ گیا کہ اس چال سے وہ جاننا چاہتی ہے کہ ہم میں موٹا شکار کون سا ہے"۔

لارڈ جیکسن راتے کے گنیتش ہال میں مس سوفیا رسل کھانا کھانے کے لیے تبدیل لباس فرما رہی ہیں۔ ان کے پیارے پیارے چہرے پر فکر کے علامات اور بھولے بھالے دل میں یہ خیالات ہیں۔

Marfat.com

" ان احمقوں ۔ اسکر اور کلبلی کے پاس سے کب تک جواب آتے گا ۔ اس سے بہتر کوئی طریقہ اس بات کے جانچنے کا نہ تھا کہ ان میں سب سے زیادہ دولت مند اور شوہری کے لیے سب سے زیادہ مناسب کونسا ہے ۔ مگر جواب جلد آنا چاہیئے ۔ میں نے اس تیسرے احمق کرنل تلاّ[1] کو ادھر لٹکا رکھا ہے اور اس سے وعدہ کیا ہے کہ ایک ہفتے میں فیصلہ کر کے اطلاع کر دوں گی کہ آیا میری شوہری کی اسے تمنا کرنا چاہیئے یا نہیں اور ہاں بھول ہی گئی ان پاگلوں بنگال ٹائی گمر[2] اور بامبے ڈک[2] کو بھی تو بہت نیت کا جواب دینا ہے جو برسوں سے سائے سے ٹکے لگے میرے پیچھے ایسے پھرتے ہیں جیسے جنوری کے پیچھے نومبر ۔ دسمبر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مس صاحبہ کے خیالات کی رَو یہاں تک دوڑنے پائی تھی کہ خادم نے کمرے میں آ کر ایک لفافہ پیش کیا جو ابھی برقی ڈاک[3] سے وصول ہوا تھا ۔ لفافہ ذرا وزنی تھا ۔ اس لیے مس صاحبہ کو تعجب ہوا کہ کسی مشتاقِ توجہ نے کاغذ کے اتنے تختے اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کیے ہوں گے ۔

لفافہ چاک کر کے جلدی سے خط نکالتے وقت یہ خیال آیا کہ ہوں نہ ہوں ان احمقوں اسکر اور کلبلی میں سے کسی کا خط ہوگا ۔ اس خیال کے آتے ہی باچھیں کھل گئیں ۔ دیکھا تو تین خط تھے ۔ پہلے کے الفاظ یہ تھے ۔

" خاتون عصمت مآب ۔ بہ جواب والا نامہ گزارش ہے کہ جہاں تک مجھے علم ہے مسٹر بی ۔ ڈی کلبلی بہ اعتبارِ مزاج و محبت اس قابل ہیں کہ ہر خاتون کی آیندہ خوشی ان کی امانت میں دی جائے ۔ خاکسار ۔ ڈیوڈ اسکر ۔"

کمترین ۔ مسٹر بی ۔ ڈی کلبلی کی سال گزشتہ کی آمدنی بیرسٹری سے تین گنی یعنی مبلغ پنتالیس روپے

---

[1] مصنف کے حاشیے کے لیے ملاحظہ ہو اس مضمون کے ضمیمہ کا پانچواں پیراگراف ۔ مولف

[2] ایضاً چھٹا پیراگراف ۔ مولف

[3] جس زمانے کے حالات قلمبند کیے جا رہے ہیں اس زمانے میں ڈاک رسانی اس طرح ہوتی تھی کہ ڈاکخانہ سے بجلی کے تار پر برقی تھیلے ہر شخص کے نام کے خطوط کے رکھ دیتے ۔ بٹن دبایا اور تھیلا اس کے مکان پر پہنچ گیا ۔ مصنف ۔

Marfat.com

اور ان کی خاندانی جائیداد سے جس کے وہ تنہا مالک مطلق ہیں ایک لاکھ ننانوے ہزار نوسوچھپن روپے ہے۔ یہ اطلاع میں نے سب سے زیادہ واقف کار یعنی خود ان سے حاصل کی ہے۔ ڈ۔ ا"

دوسرے خط کے الفاظ یہ تھے۔

خاتون عصمت مآب۔ بہ جواب والا نامہ گزارش ہے کہ جہاں تک مجھے علم ہے سرڈیوڈ اسکر باعتبار مزاج و محبت اس قابل ہیں کہ ہر خاتون کی آیندہ خوشی ان کی امانت میں دی جا سکے

خاکسار بی۔ ٹی کلبلی۔

مکرّر۔ سرڈیوڈ اسکر کی سال گزشتہ کی رقم منافع اسکر میلم کمپنی سے جس کے وہ شریک غالب ہیں خالص ان کے حصے کے دو لاکھ باون ہزار تین سو بیالیس روپے گیارہ آنے چھ پائی تھی۔ یہ اطلاع میں نے سب سے زیادہ واقف کار یعنی خود ان سے حاصل کی ہے۔ ب ٹ ک

تیسرے خط کے الفاظ یہ تھے۔

"خاتون عصمت وصداقت مآب۔ چونکہ اطلاعات مندرجہ ہر دو خطوط جناب ہی کے خطوط کے جواب میں ہیں لہٰذا ہم دونوں انھیں ایک ہی لفافے میں ایک ساتھ پیش کرتے ہیں

خاکساران۔ ڈیوڈ اسکر و بی۔ ٹی کلبلی"

ان خطوط کے پڑھتے وقت مس صاحبہ کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا جب پڑھ چکیں تو انھوں نے اپنے منہ سے ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا اور خطوط کو چاک کر کے بدیں الفاظ حوالۂ آتشدان کیا۔

"چولہے میں جائیں۔ چلو دو تو کم ہوئے۔"

اسی شام کو سرڈیوڈ اسکر اور مسٹر بی۔ ٹی کلبلی دونوں اپی کیورس کلب میں ایک چھوٹی سی میز کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے سامنے ایک گلاس ہے اور بیچ میں ایک کنٹر۔

سرڈیوڈ اسکر۔ "یار کلبلی۔ اس تلخ تجربے نے سکھا دیا کہ ہماری اور تمھاری بھابی جانیں قضائے اثیری میں معلق رہیں تو اچھا ہے۔ رہی صحت کی درستی اس کے لیے ملک فلاتخگ نیت یورپ کا جدید ترین اصول نہایت قابلِ قدر اور واجب العمل ہے کہ جو شخص بازار سے ایک آنے کا دودھ بآسانی خرید سکتا ہے اسے گائے رکھنا حماقت ہے۔"

مسٹر کلبلی" بالکل سچ کہتے ہو" (کنسٹر کی طرف ہاتھ بڑھا کر) "قدحے پُر کن۔ کوری عشاق سرِ دنیا رسل"۔

دونوں نے گلاس بھر لیے اور ہونٹوں سے لگا کر ان کے پیندوں کو آسمان دکھا دیا۔

در دہاں خاکم ہمیں باشد چو وضع روزگار
کیش آئیں جملہ وقف سوختن خواہد شدن

(دکن ریویو)

ضمیمہ ۔ شوہر کا شکار

۱ - مغربی صوبے کے مسلمانوں میں تو انیسویں صدی سے بھی پہلے سے سرنام (SURNAME) کا رواج عام تھا۔ مثلاً طیب جی (جسٹس بدرالدین طیب جی) کاجی جی (جسٹس عبد علی کاجی جی)، چندا بھائی، تھادر بھائی، چھوٹانی سیانی جینیا (مسٹر محمد علی جینیا) پارپیا (عبدالحسن پارپیا) دس رام (سراللہ دینا دس رام)، دریام (حاجی علی دریام)، دھرم سی (مہر علی دھرم سی)، لالا جی (سرحسین بھائی لالا جی) جیتے کر، تنگے کر، لونڈے، مرگے، یہاں تک کہ اس زمانے میں بعض لوگوں نے سرنام کے شوق میں خدا اور رسول (معاذ اللہ) بننا شروع کر دیا تھا۔ مثلاً ایک صاحب تھے کریم اللہ جو اپنے آپ کو کے۔ اللہ لکھتے تھے۔ دوسرے صاحب امداد نبی سے آئی۔ نبی بن گئے تھے۔ مگر اس وقت صوبہ جات متحدہ میں سرنام عام نہ تھا لیکن جس زمانے کے یہ حالات لکھے جا رہے ہیں اس صوبے میں بھی یہ دبا عام ہے۔ بعض جنٹل مین تو اپنے یا اپنے باپ داداؤں کے پیشوں کو سرنام بنا لیتے ہیں جیسے سی، پی، موتی والا۔ پی، سی چکی والا ۔ جے، بی گھڑی والا۔ آر، سی شیشے والا ۔ اور سی، جے کپڑے والا ۔ او، یو مرغی والا ۔ چنانچہ ہمارے صوبے کے نہایت ممتاز مسلمان سرکاری عہدے دار مسٹر پی ۔ کے بھٹی والا، سی آئی ای انسپکٹر جنرل محکمہ آبکاری موجود ہیں۔ بعض مسلمان اپنے کسی مشہور بزرگ کے نام ہی کو

Marfat.com

سرنام بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں مولوی کلب علی صاحب ایک بڑے عابد و زاہد رئیس تھے۔ ان کے صاحبزادے عزنان علی ہوئے جنھوں نے اپنے دستخط آئی اے کلب علی یعنی عزنان علی کلب علی کرنے شروع کیے۔ پھر تو ان کی اولاد میں ہر شخص کا سرنام کلب علی ہوگیا جو آج کل پھل پھلا کر اچھا خاصا ولایتی نام کلبلی بن گیا ہے۔ اس خاندان سے ہمارے دوست مسٹر بی۔ ٹی کلبلی ہیں۔

۲۔ برادران وطن نے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں جو کوششیں انیسویں صدی کے آغاز ہی میں شروع کردی تھیں اس کا نتیجہ آخرکار یہ ہوا کہ "دونوں دین سے گئے" "پانڈے نہ کھیر ہوئے نہ مانڈے"۔ اردو تو گئی مگر ہندی نہ آئی بلکہ اس کی جگہ گورا شاہی آگئی۔ اب ہر جگہ گٹ پٹ ہی ہے۔ بنیا انگریزی میں جنس بیچتا ہے اور چمار انگریزی میں جوتا گانٹھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس امر کے عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ جو گفتگو مسٹر کلبلی اور ان کے دوست کے درمیان ہوئی وہ خالص یا نخالص انگریزی میں ہوئی اور اس لیے اردو کی "صحت" کا ملزم ہمیں سمجھنا چاہیئے نہ کہ مسٹر کلبلی یا ان کے دوست کو۔

۳۔ مسٹر کلبلی بیرسٹر کے نام کی طرح یہ سرنام بھی بزرگ خاندان کے نام سے بنایا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے شروع تک اس کا تلفظ و املا "اصغر" تھا۔ مگر اب اسکر (اسکر OSCAR) بولا اور لکھا جاتا ہے۔

۴۔ بیسویں صدی کے آغاز تک اس نام کا تلفظ و املا "صفیا" تھا۔ مگر جس زمانے کے حالات لکھے جارہے ہیں اس وقت "سوفیا" بولا اور لکھا جاتا ہے جو انگریزی خواتین کے ناموں کے ساتھ نسبت اشتراک رکھتا ہے۔ مس سوفیا کے والد کا اسم گرامی ایف۔ رسل تھا۔ جسے بیسویں صدی کے آغاز میں فضلِ رسول کہتے ہیں۔ چونکہ ناکتخدا لڑکیاں اپنے نام کے ساتھ خاندانی سرنام شامل کرتی ہیں لہذا سوفیا رسل ہوا جسے بیسویں صدی کے آغاز میں صفیہ بنت فضل رسول کہتے ہیں۔

۵۔ شروع بیسویں صدی میں ایک شخص خیبت اللہ نے ٹھیکے داری سے رقم کثیر پیدا

کی اور وہ اچھا خاصہ رئیس ہوگیا۔ اس کی اولاد میں اسی وزن پر نام رکھے گئے مثلاً فرحت اللہ، قدرت اللہ وغیرہ۔ جس زمانے کے حالات ہم لکھ رہے ہیں اس وقت نام کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ جن میں سے اخیر ٹکڑا یعنی "ت اللہ" تلا ہوکر سرنام بن گیا تھا۔ کرنل تلا جن کا پورا نام رئیم تلا ہے اسی خاندان سے ہیں۔ کیا یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں اس نام کا املا رحمت اللہ تھا۔

۶۔ مس سوفیا رسل کے ازدواجی امیدواروں کے گروہ کثیر النعار میں دو شبیلہ مین خاص امتیاز کے مستحق تھے۔ ایک تو کلکتہ کے سولین مسٹر ٹی ٹاگرا اور دوسرے مبئی کے سوداگر ایم۔ ڈی ڈاکٹر تھے۔ مسٹر ٹاگر کی مونچھیں نہایت گھنی اور بڑی تھیں۔ اور خدا جانے کیا بات تھی کہ جس جلسے میں وہ موجود ہوتے اس میں اکثر خاتونوں کے رخساروں پر ایسے نشان بن جاتے جیسے کسی دندانہ دار چیز کے چھونے یا کھری چارپائی پر گال رکھنے سے بن جاتے ہیں۔ دوسرے صاحب یعنی مسٹر ڈاکٹر باعتبار قد و قامت نہایت مختصر اور باعتبار رنگ و روغن نہایت سرخ سپید تھے اور اپنی سیماب وشی کے باعث مشہور تھے۔ مس صاحبہ کی بلاغت آفریں شوخی نے یا تو نام کی رعایت یا ان کی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر یا دونوں کی خوشگوار آمیزش سے کلکتہ کے مسٹر ٹاگر کو بنگالی ٹائیگر یعنی شیر نیستان بنگالہ اور مبئی کے مسٹر ڈاکٹر کو بامبے ڈک یعنی ماہی شور ابمبی کا خطاب دیا تھا۔

——— مصنف

Marfat.com

تلوّن

رات کے بارہ بجے خالی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ اپنی عسرت پر غور کرتا ہوا طیب "گرینس ریسٹران" کی طرف سے اپالو بندر کی طرف جا رہا تھا۔

عموماً اس کی بے پروائی اور بے فکری آتے دن کے مصائب و نوائب کو کوئی دیرپا اثر اس طبیعت پر نہیں رہنے دیتی تھی اور اس لڑائی میں جو روزانہ اسے قسمت کے ساتھ لڑنی پڑتی تھی۔ اگر وہ غالب نہیں ہوتا تھا تو کم از کم غیر مغلوب ضرور رہتا تھا۔ مگر آج کی سردی اور گرسنگی کی شدت۔ اس کی بے پروائی اور خوش مزاجی پر فی الجملہ فتح یاب ہوگئی اور بمبئی کے متموّل ابنائے جنس کے ساتھ ایک فوری جذبہ مبغضنف نے اس کے چشم و ابرو کو ڈراؤنا بنا دیا۔

آخر "چوّنی" جو گزشتہ شام اس کے پاس موجود تھی کچھ دیر بعد ہی جیب سے مفارقت کر کے ایرانی چائے فروش کے صندوقچے میں پہنچ چکی تھی جس کی وجہ سے آج معدے کو صبح کی چائے اور چاشت کے ناشتے اور شام کے کھانے سے قطعاً محروم ہونا پڑا۔ شام کو غم بالائے الم یہ ہوا کہ پچھلے مہینے کا کرایہ نہ ملنے سے مکاندار نے اسے مکان سے بھی نکال باہر کیا۔ ایسی حالت میں زمانے کی سفلہ نوازی اور سوسائٹی کی اس خارج از اعتدال روش پر اسے جس قدر غصّہ نہ آئے تھوڑا ہے کہ جس وقت بمبئی کے دولت مند سیٹھ ساہوکار جو الف کے نام لٹھ بھی نہیں جانتے تاج محل میں ڈنر اڑا کر موٹروں میں جا رہے ہوں تاکہ اپنے پرتکلف منازل عیش میں مخملی گدوں والی مسہریوں پر محو استراحت ہوں۔ بمبئی یونیورسٹی کا ایک گریجویٹ اور فلسفہ و اقتصادیات کا ماہر گلیوں میں بے آب و نان اور بے خانماں پھر رہا ہو جسے حضرت عیسٰی کی طرح پڑ رہنے کو جگہ بھی نہیں۔

انھیں تاریک خیالات کے پیچ و تاب میں اس کے قدم آہستہ آہستہ اسے منزل غیر مقصود کی طرف لیے جا رہے تھے کہ "اپالو بندر" کا "پویلین" آگیا۔ خدا جانے وہ یہاں کھڑا ہوا اپنی حالت پر کب تک غور کرتا رہتا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی اور وہ ذرا تاریکی

Marfat.com

میں ہٹ گیا۔ ایک شخص نہایت آہستہ آہستہ آیا اور اس سے کوئی دو گز کے فاصلے پر منڈیر کے قریب کھڑا ہوگیا۔ طیب کو اس نے بالکل نہیں دیکھا۔ یہ شخص اپنے خیالات میں اس درجہ مستغرق تھا اور سمندر کی طرف اس طرح ٹکٹکی لگائے دیکھتا تھا کہ طیب اپنی گرسنگی اور بے خانگی سب بھول گیا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔ طیب کی نگاہ تیز تھی اس لیے اس نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ وہ ایک خوش پوش متوسط القامت اور خوب صورت نوجوان ہے۔ طیب تعجب اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ منڈیر پر رکھ دیے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سمندر میں کودنے کے لیے تیار ہے مگر ایک منٹ ایسی حالت میں رہنے کے بعد وہ منڈیر پر چڑھ گیا اور اس طرح بیٹھ گیا کہ ایک پاؤں سمندر کی طرف لٹکا ہوا اور ایک پاؤں اپالو بندر کے چبوترے کی طرف۔

طیب نے اس سے زیادہ تاریکی میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور قریب آکر اجنبی کی خشکی کی طرف والی ٹانگ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"معاف کیجیے اجازت ہو تو میں دریافت۔۔۔۔۔۔

اجنبی۔" ابے تو کون ہے اور میری ٹانگ کیوں کھینچتا ہے؟"

طیب۔" جناب عالی اس وقت جس شخص کو جناب کی پابوسی کا فخر حاصل ہوا ہے وہ طیب ایم۔اے ہے۔ ممکن ہے کہ جناب نے خاکسار کا نام نہ سنا ہو۔ یقین فرمایئے کہ میں جناب کی ٹانگ کھینچنے کی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے صرف ایک سوال پوچھنے کے لیے جناب کو متوجہ کرنے کی جسارت کی ہے۔"

اجنبی۔" سوال۔ مجھ سے۔ اچھا کیا سوال ہے؟"

طیب۔" محض اتنا۔ کیا آپ خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟

اجنبی۔" اور اگر میں کرنا چاہتا ہوں تو کیا تم مجھے روکو گے؟"

طیب۔" خدا نہ کرے کہ میں روکوں۔ میرا آپ نے کیا بگاڑا ہے۔ میں آپ کے خانگی معاملات میں دخل دینے والا کون۔ مگر بات یہ ہے کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔"

اجنبی۔" غریب۔ تمھاری غریبی کو میری خودکشی سے کیا تعلق؟"

Marfat.com

طیب: "کچھ نہیں مگر ایک اعتبار سے بہت کچھ ہے۔"

اجنبی ۔ "بہت کچھ کس اعتبار سے؟"

طیب " اس اعتبار سے کہ جناب سمندر میں رونق افروز ہوں گے تو میری رائے ناقص میں جناب کی جیب کا زر نقد، جناب کی عینک، جناب کی گھڑی، جناب کی انگوٹھی یہ سب چیزیں جناب کے ساتھ سمندر میں جائیں گی۔ جو وہاں غیر مطلوب اور بے مصرف ہوں گی۔ یہ اسراف کی ایک ایسی شکل ہوگی جسے میں بہ حیثیت ماہر اقتصادیات کے کسی طرح جائز نہیں سمجھتا۔ جناب خیال فرمائیں کہ سمندر کے اندر جناب کو نہ کسی چیز کے خریدنے کے لیے روپے پیسے کی ضرورت ہے نہ وقت دیکھنے کے لیے گھڑی کی۔ نہ دور کی چیز دیکھنے کے لیے عینک کی اور نہ نمائش کے لیے انگوٹھی کی۔ آپ تو ایسے عالم میں پہنچ جائیں گے جہاں بغیر صرف کیے ہر چیز ملے گی لیکن یہ خاکسار ابھی تک عالم مادی اور دنیائے اسباب میں گھرا ہوا ہے۔ فلاکت نصیبی سے آج کل نانِ شبینہ کو محتاج ہے۔ ایسی حالت میں ان اشیا کا بمقابلہ بحرِ عرب کے میں زیادہ حقدار ہوں۔"

اجنبی کا طیب کی باتوں میں ایسا جی لگا کہ اس سے رو در رو ہونے کے لیے اس نے وہ پاؤں بھی جو سمندر کی طرف لٹکا ہوا تھا چبوترے کی طرف کر لیا اور طیب سے کہنے لگا۔

"تو تم غریب ہو"

طیب۔ "غریب اور بہت غریب۔ میں بھوکوں مر رہا ہوں اور آج شام سے رہنے کو مکان بھی نہیں"

اجنبی ۔ "تب تم ایک کام کیوں نہیں کرتے"۔

طیب ۔ "جناب وہ کیا۔"

اجنبی ۔ "چلو ہم تم ساتھ ڈوب کر خودکشی کر لیں"۔

طیب ۔ "جناب معاف فرمائیے۔ ڈوب کر خودکشی کرنا آپ کو پسند ہو۔ مگر میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ ہر چیز نے میرا ساتھ چھوڑ دیا مگر امید کی ایک ہلکی سی شعاع نے ابھی تک میرا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔"

اجنبی ۔ "میری رائے میں تو تمھاری مشکلات کا خاتمہ اس سے بہت جلد ہو جاتا مگر چونکہ تم اس کو

پسند ہی نہیں کرتے لہذا مجبوری اور اگر سچ پوچھو پسند تو میں بھی نہیں کرتا۔"

طیب۔ "مگر آپ کے لیے تو شاید خودکشی ناموزوں نہ ہوگی۔ کیونکہ آپ کے پاس خودکشی کرنے کے قوی وجوہ ہوں گے۔"

اجنبی: "مگر اب تو تم نے میرے خیالات کی رَو کو ایسا روک دیا کہ اب میں اس کے لیے تیار نہیں اگر تم اس وقت میرا پاؤں پکڑ کے باتوں میں مشغول نہ کر لیتے تو اب تک تو۔۔۔۔۔

طیب۔ جناب تو ابھی وقت ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے جسم پر سے غیر ضروری اشیا میری جیب میں منتقل فرمادیں اور اس کے بعد یہاں سے وہاں تک کا راستہ۔۔۔۔۔"۔

اجنبی۔ (طیب کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) "بھئی خدا کے لیے رہنے دو"۔

یہ کہہ کر اور طیب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اجنبی دھم سے چبوترے کی طرف کود پڑا اور قریب کی ایک بنیچ پر جا بیٹھا۔ طیب بھی پاس آ گیا۔

اجنبی: "بھئی بات یہ ہے کہ میں ایک متلون مزاج آدمی ہوں اور اپنے جذبات سے جلد مغلوب ہو جاتا ہوں۔ مگر اب وہ جذبہ اور غلبہ فرو ہو گیا۔ (کچھ سوچ کر) میں بڑا احمق تھا جو اپنی جان عزیز ایک عورت کی بے اعتنائی۔۔۔۔۔"

طیب۔ "عورت۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں سمجھتا تھا کوئی نہایت اہم معاملہ ہوگا جس کی وجہ سے آپ دنیا کو خیرباد کہنا چاہتے تھے۔"

اجنبی: "مجھے نہایت خجالت کے ساتھ اعتراف ہے کہ خودکشی کی وجہ تو ایک عورت کی بے اعتنائی ہی تھی۔ بھائی صاحب کبھی آپ سے بھی کسی عورت نے بے اعتنائی کی ہے۔"

طیب۔ "جی ہاں۔ مگر صرف ایک ہی عورت ہے جو اکثر بے اعتنائی کرتی ہے اور جس سے آپ کی بھی شناسائی ہے۔"

اجنبی: "میری شناسائی ہے اور آپ سے بے وفائی کرتی ہے۔ وہ کون عورت ہے؟"

طیب "خاتونِ دولت۔ اگر آج آپ اپنی جیب کے غیر ضروری بوجھ کو میری جیبوں میں منتقل فرما کر خلوت گاہ قبر میں آرام فرماتے تو یقیناً آج مجھ سے خاتون صاحبہ ہمکنار ہوتیں۔ مگر اب تو۔۔۔۔۔"

اجنبی۔ "ارے بھئی میں بھول گیا۔ چلو "گرینیس ریسٹوران" میں پہلے تمھارے معدے کی مرمت کرائیں پھر دیکھا جائے گا۔"

طیب۔ "اس میں شک نہیں کہ آج میں دن بھر کا بھوکا ہوں مگر ابھی ایسی حالت نہیں ہے کہ میں بھیک مانگنے کے لیے مجبور ہو جاؤں۔ اب حالت بدل گئی ہے، جب تک یہ سوال در پیش تھا کہ آیندہ عینک، گھڑی، انگوٹھی اور پاکٹ بک کا مالک سمندر ہو یا میں تو میں اپنے دعاوی کو ترجیح دیتا رہا۔ لیکن اب جناب میں گرسنہ ہوں گداگر نہیں ہوں۔"

اجنبی۔ "ارے بھئی، تمھاری وجہ مایوسی ہی میرے لیے وجہ ممنونی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہو۔ اگر تمھارے آج کے کھانے کی قیمت میری زندگی کی قیمت تھی تو کم از کم اس شے کی قیمت کے بقدر تمھارا مقروض ہوں۔ جسے آج تم نے بچایا ہے۔ اسے بھی جانے دیجیے میں آپ کی اس وقت دعوت کرتا ہوں اور بہ حیثیت ایک جنٹل مین کے آپ کو اسے قبول فرمانا چاہیئے۔" طیب خاموش ہو گیا۔

سامنے سے ایک وکٹوریہ نکلی جسے اجنبی نے روک لیا اور دونوں سوار ہو کر مالابار ہل کی طرف چلے۔ راستے میں اجنبی نے بتایا کہ اس کا نام سہراب جی فریدون جی پالکی والا ہے۔ مکان پر پہنچ کر سہراب جی نے طیب کو پہلے تو خوب کھانا کھلایا اور اس کے بعد دونوں باتوں میں مشغول ہوئے۔ سہراب جی نے اپنی ناکامیٔ محبت کا قصہ چھیڑ کر "مینٹل پیس" پر سے ایک فوٹو اٹھا کر طیب کو دکھایا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی بے اعتنائی نے آج مجھے آبی قبر میں سونے کے لیے مجبور کیا۔

طیب۔ "بھائی سہراب جی جب آپ نے مہربانی کر کے مجھے اپنے ذاتی حالات سے مطلع کیا ہے تو مجھے یہ سوال کرنے کی اجازت دیجیے کہ آپ کی محبوبہ نے کن الفاظ میں انقطاع محبت کیا۔"

سہراب جی۔ "اس نے آج کے خط میں جو کچھ لکھا اس کا ملخص یہ تھا کہ وہ ایک شخص مہربان جی کی محبت کے علاوہ اپنے باقی عشاق کی محبت پر میری محبت کو ترجیح دیتی ہے اور چونکہ مہربان جی کے حقوق محبت کے تقدیم و ترجیح کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی لہٰذا افسوس کہ وہ میرے ساتھ شادی نہ کرنے پر مجبور ہے۔"

طیب۔ "اب دو تین باتیں اور بتا دیجیے۔ لڑکی کا نام اور مہربان جی کے تفصیلی حالات آپ کو

جہاں تک معلوم ہوں۔"

سہراب جی۔" لڑکی کا نام تہمینہ ہے۔ یہ کسی دولت مند خاندان کی لڑکی نہیں ہے۔ گرانٹ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے اور اس سال امتحان میں شریک ہونے والی ہے۔ مہربان جی کے متعلق میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ اس کا نام مہربان جی ہنجی موڑ والا ہے۔ کہیں کمسریٹ میں نوکر ہے۔"

طیب۔" اب جب کہ آپ اس خاتون سے مایوس ہو چکے ہیں کیا آپ مجھ پر اتنا اعتبار کریں گے کہ اس کا آخری خط کسی دن تھوڑی دیر کو مجھے دے دیں"۔

سہراب جی۔" جب چاہو لے لینا مگر شرط یہ ہے کہ واپس دے دینا۔"

طیب کو چونکہ علم تھا کہ آج بمبئی جیسے غدار شہر میں کوئی چھت نہیں ہے جس کے نیچے وہ رات بسر کر سکے لہٰذا سہراب جی کی اس دعوت کو کہ آج کی رات وہ اس کے پرتکلف مکان میں بسر کرے اس نے بڑی خوشی سے قبول کیا اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں اپنی اپنی چارپائیوں پر سو رہے۔

صاحب۔" مہربان جی بصرے سے کلرکوں اور اسسٹنٹوں کی جو مانگ آئی ہے اس سے متعلق ماتحت دفتروں کے کلرکوں سے دریافت کرو کہ وہاں جانے کے لیے کون کون شخص رضامند ہے ہماری رائے میں تنخواہ اس قدر زیادہ ہے کہ بہت سے آدمیوں کو وہاں جانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اگر تم خود جانا چاہو تو ہم بڑی خوشی سے تمھاری سفارش کر سکتے ہیں تنخواہ بہت معقول ہے اور آیندہ ترقی کے لیے تمھارا استحقاق بہت زیادہ ہو جائے گا۔ تمھاری غیر حاضری میں یہاں کا انتظام اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمھارے اسسٹنٹ کو تمھاری جگہ پر متقرر کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ اس سے نیچے درجے والے کو دی جائے گی جب تم واپس آؤ گے تو تمھاری مستقل جگہ تمھارے لیے خالی کر دی جائے گی۔ جنرل صاحب نے بھی چٹھی میں لکھا ہے کہ اگر تم وہاں آ گئے تو بہت اچھا ہوگا۔ اگر تمھاری مرضی ہو تو ہم تمھاری سفارش کریں۔ مگر یہ سب تمھاری مرضی پر ہے۔"

مہربان جی۔ حضور کی پرورش ہے۔ مگر میں اپنی خوشی سے تو بالفعل ہندوستان سے باہر جانا چاہتا نہیں ہوں"

Marfat.com

صاحب۔ "کیوں؟"

مہربان جی۔ "حضور، میری شادی ہونے والی ہے۔ میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ بہت جلد وہ مجھ سے عقد کرے گی۔ ایسی حالت میں میں اپنی مرضی سے تو ابھی باہر جانا نہیں چاہتا۔ اگر حضور مجبور کریں گے تو میں نہیں جانتا کہ میں کیا کروں گا"

صاحب۔ "نہیں ہم تمھیں مجبور نہیں کرتے۔"

مہربان جی۔ "تو حضور میں بالفعل ہندوستان سے باہر جانا نہیں چاہتا۔"

مہربان جی یہ کہہ کر اپنی میز پر آ بیٹھے اور دفتر کے کام میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چٹھی رساں نے ان کی ذاتی ڈاک دفتر ہی میں جا کر دی۔ مہربان جی سرکاری کام کو اپنے ذاتی کام پر ترجیح دینے کی وجہ سے اپنے خانگی خطوط ہمیشہ سرکاری کام سے فارغ ہونے کے بعد فرصت کے وقت میں یا مکان جا کر پڑھا کرتے تھے۔ مگر آج کی ڈاک میں ایک خط تھا جس کی شان تحریر پر نظر پڑتے ہی انھیں محسوس ہوا کہ جب تک وہ اس خط کو نہ پڑھ لیں دفتر کا کام کرنا محال ہے لہذا کچھ دیر سوچنے کے بعد انھیں اپنا اصول توڑنا ہی پڑا اور خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ چونکہ دفتر کے صیغہ مراسلت کا کام مہربان جی کے سپرد تھا لہذا کثرت مزاولت کی وجہ سے وہ ہمیشہ طویل سے طویل مراسلہ کو صرف ایک ہی مرتبہ پڑھ کر اس کا مسودہ جواب تیار کرتے تھے۔ مگر اس مختصر سے خط کو انھوں نے کوئی تین چار مرتبہ پڑھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھر بھی مفہوم ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔

ناظرین سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ خط مس تہمینہ کا تھا جس کا ملخص یہ تھا کہ وہ ایک شخص سہراب جی کی محبت کے علاوہ اپنے باقی عشاق کی محبت پر مسٹر مہربان جی کی محبت کو ترجیح دیتی ہیں اور چونکہ سہراب جی کے حقوق محبت کے تقدم و ترجیح کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی لہذا افسوس کہ وہ مہربان جی کے ساتھ شادی نہ کرنے پر مجبور ہے۔

کئی مرتبہ اس خط کے پڑھنے کے بعد مہربان جی سر پکڑ کر اپنی کرسی کو تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ آخر کار وہ اپنی کرسی پر سے اٹھے اور سیدھے صاحب کے کمرے میں گئے۔

صاحب۔ "ویل۔ مہربان جی"۔

مہربان جی۔ "حضور میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں خود ہی بصرہ چلا جاؤں۔ لہذا دفتر کا انتظام فرما کر

Marfat.com

مجھے وہاں جانے کے لیے سبکدوش فرما دیجیے۔"

صاحب۔" مگر ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمھاری شادی ہونے والی ہے اور بالفعل تم ہندوستان سے باہر جانے کے لیے تیار نہیں۔"

مہربان جی۔" مگر اب میں نے اپنی رائے تبدیل کر دی ہے۔"

صاحب۔" اس کے اسباب ہوں گے۔"

مہربان جی۔" جی ہاں حضور اس کے اسباب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں چلا جاؤں۔"

صاحب یہ سمجھے کہ غالباً شادی میں ابھی عرصہ ہے اور مہربان جی چاہتا ہے کہ بصرہ کی ملازمت میں سے کافی رقم پس انداز کرے تب شادی کرے۔

صاحب۔" جنرل صاحب نے لکھا ہے کہ جو کلرک شرائط مندرجہ پر آنے کو تیار ہو وہ بلا مراسلت مزید فوراً ہندوستان سے روانہ ہو جائیں۔ لہٰذا اگر تم چاہو تو جہاز" ٹونڈلا" میں جو آج سے چوتھے روز جانے والا ہے سوار ہو جاؤ۔"

مہربان جی۔" چار روز کیسے میں تیار ہوں کہ آج ہی چلا جاؤں۔"

اپالو بندر پر مجمع ہے۔ لیڈیاں اور جنٹل مین دریا کنارے کھڑے اور بنچوں پر بیٹھے سیر کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ گزرگاہ عام سے علیحدہ طیب اور سہراب جی ایک بنچ پر بیٹھے سرگرم گفتگو تھے کہ سہراب جی کی نظر دفعتاً اٹھ گئی۔ اس نے طیب کو اشارہ کیا کہ" بائے کلب" کی طرف سے جو گاڑی آ رہی ہے اس میں تہمینہ ہے۔

طیب نے سہراب جی سے کہا" آپ میری فہم و فراست کے بڑے مداح ہیں اگر واقعی آپ کو میری عقل پر بھروسہ ہے تو جو میں عرض کروں اس پر عمل کیجیے۔"

سہراب جی۔" کیسے؟

طیب۔" آپ فوراً یہاں سے تشریف لے جایئے اور ممکن ہو تو سیدھے اپنے مکان کو جایئے مہربانی کر کے اس کی وجہ مجھ سے نہ پوچھیے۔"

Marfat.com

سہراب جی بچارا "بہت اچھا کہہ کر چلا گیا۔

تہمینہ آکر ایک بینچ پر بیٹھی ہی تھی کہ طیب اپنے ایک دوست کو لے کر اس کی قریب والی بینچ پر جا بیٹھا اور ایسی آواز میں اس سے باتیں کرنے لگا کہ تہمینہ بخوبی سُن سکے۔

طیب۔" ارے یار پیسی۔ تم نے مہر جی کا واقعہ سنا؟"

پیسی۔" کون مہر جی؟"

طیب۔" وہی مہربان جی جو ہمارے تمھارے ساتھ "سینٹ زیویئر" میں تھا۔"

پیسی۔" وہ تو کمسریٹ میں ہے"۔

طیب۔" ہاں وہی بے چارے کو ایک دم پلٹن کے ساتھ جانے کا حکم ملا تھا۔ اب اس کی موت کی اطلاع ملی ہے۔"

پیسی۔" کیسے مر گیا؟"

طیب۔" لڑائی میں جانا موت کے منہ میں تو جانا ہے ہی۔ یہ کیا پوچھنا کیسے مر گیا۔"

پیسی۔" بہت افسوس ہوا۔"

پیسی طیب کے اشارے سے یا خود بخود وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور طیب نے بظاہر اپنی نظر اور توجہ ایک کشتی کی طرف پھیر لی جو بحری قلعہ کی طرف سے گزر رہی تھی۔

تہمینہ نے طیب اور پیسی کی گفتگو کا حرف حرف سنا تھا۔ لاکھ ضبط کرنا چاہا مگر نہ ہوسکا۔ مجبور ہو کر اس نے طیب سے بلا معارفت سابقہ گفتگو شروع کی۔

تہمینہ۔" کیا یہ میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کس مہربان جی کا ابھی ذکر کر رہے تھے؟"

طیب۔" مہربان جی بہمن جی موٹروالے کا۔"

تہمینہ۔" آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ......"

طیب" میرے ایک دوست نے جو اس کے ساتھ کمسریٹ میں نوکر ہے لکھا ہے کہ بے چارہ مارا گیا۔"

تہمینہ۔" ممکن ہے کہ آپ کے دوست نے کچھ غلطی کی ہو۔"

طیب۔" بھلا ایسا ہوسکتا ہے۔ ہر وقت کا ایک جگہ رہنا سہنا۔ اس میں غلطی کا احتمال کیا۔

معاف کیجیے آپ کو مہربان جی سے کیا واسطہ ؟

تہمینہ ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) "میں بھی اسے جانتی ہوں"۔

طیب "۔ مجھے معلوم ہے کہ بے چارے کی شادی ہونے والی تھی۔ اگر دفعتاً نہ چلا جاتا تو شاید ہو بھی چکی ہوتی"۔

تہمینہ "۔ نہایت افسوس ہوا"۔

طیب "۔ میں نے سنا ہے کہ وہ لڑکی گرانٹ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے اور امسال امتحان میں شریک ہونے والی ہے اور اگر میرا حافظ غلطی نہیں کرتا تو ایک مرتبہ مہربان جی نے اسے دور سے مجھے دکھایا بھی تھا۔ لانبا قد ہے بڑی سیاہ آنکھیں ہیں۔ پتلے ہونٹ ہیں میدے اور شہاب کی سی رنگت ہے"۔

تہمینہ اپنا حلیہ سن کر شرمندہ ہوگئی اور شرم سے آنکھیں نیچی کرلیں۔

طیب "۔ مجھے اس بے چاری لڑکی سے دلی ہمدردی ہے"۔

تہمینہ جس کے دل و دماغ کا اندازہ ناظرین خود فرما سکتے ہیں اس کا کچھ جواب نہ دے سکی۔

طیب "۔ معاف کیجیے میں ایک سوال کردوں ؟"

تہمینہ ۔ "فرمایئے"۔

طیب ۔ "آپ کی رائے میں اس لڑکی کو کیا کرنا چاہیے"۔

تہمینہ ۔ "میں کیا بتا سکتی ہوں"۔

طیب ۔ "آپ قیاساً بتایئے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

تہمینہ ۔ "میں کچھ نہیں کہہ سکتی آپ ہی بتایئے کہ اسے کیا کرنا چاہیے" ؟

طیب ۔ (جو اس موقع کا منتظر تھا) "میری رائے میں تو اسے اپنی زندگی تباہ نہ کرنی چاہیے اور کسی ایسے شخص سے جس سے اسے مہربان جی کے بعد سب سے زیادہ محبت ہو شادی کر لینا چاہیے"۔

تہمینہ نے یہ سن کر ایک آہ سرد بھری اور گردن جھکالی۔

طیب "۔ مجھے اگر وہ لڑکی ملے تو میں یقیناً اسے بھی یہی صلاح دوں کہ فہرست عشاق میں جس کا

Marfat.com

نمبر دو میرا ہو اور جس سے اسے دوسرے درجے پر محبت بھی ہو شادی کر لینی چاہیئے۔
اگر آپ اس قابل ہمدردی لڑکی سے ملیں تو مجھے امید ہے کہ آپ اسے یہی صلاح دیں گی
بلکہ آپ اس سے یہ کہہ سکتی ہیں کہ یہ ایک بڑے تجربہ کار شخص کی رائے ہے۔"
دوسری صبح کو ڈاک سے سہراب جی کے پاس تہمینہ کا خط پہنچا۔ جس میں لکھا تھا کہ آج
شام مجھے "بینڈ اسٹینڈ" پر ملو۔
سہراب جی۔" یار طیب جانتے ہو میں اس وقت کہاں سے آ رہا ہوں۔"
طیب۔ (زمین پر لکیریں کھینچ کر) "میرا نجوم یہ کہتا ہے کہ تم بینڈ اسٹینڈ" سے آ رہے ہو۔"
سہراب جی۔" ارے اچھا بتاؤ کس سے مل کر آ رہا ہوں۔"
طیب۔ (زمین پر اور زیادہ لکیریں کھینچ کر اور انگلیوں پر کچھ گن کر) "مس تہمنہ سے مل کر۔"
سہراب جی۔" ارے یار تو تو بڑا جادوگر ہے۔ یقیناً تو نے "بینڈ اسٹینڈ" پر مجھے تہمینہ سے باتیں کرتے
ہوئے دیکھا ہوگا۔"
طیب۔" قسم لے لو میں تو "جیکبس سرکل" سے ابھی سیدھا آ رہا ہوں۔"
سہراب جی۔" اچھا بتاؤ وہاں کیوں گیا تھا۔"
طیب۔ (پھر لکیریں کھینچ کر اور کچھ حساب کر کے) "نجوم تو کہتا ہے کہ تہمینہ نے خط بھیج کر تمھیں
"بینڈ اسٹینڈ" پر بلایا تھا۔"
سہراب جی۔" ارے یار تو تو سچ مچ نجومی ہے۔"
طیب۔" اور میرا نجوم اس سے بھی زیادہ بتاتا ہے۔"
سہراب جی۔" وہ کیا؟"
طیب۔" وہ یہ کہ اگر تم۔ آج کیا تاریخ ہے۔"
سہراب جی۔" پچیس۔ ہاں تم کیا کہہ رہے تھے کہ اگر تم۔"
طیب" اگر تم اصرار کرو تو اگلے مہینے کی دس تاریخ کو مس تہمینہ ہماری بھابی جان ہو جائیں۔"
سہراب جی۔" مگر یار یہ راضی کیسے ہو گئیں؟"
طیب۔" آپ بڑے گدھے ہیں۔"

Marfat.com

سہراب جی ۔" کیوں ؟"
طیب ۔" یوں کہ آپ کی عقل سمجھنے سے قاصر ہے کہ تہمینہ کیسے راضی ہوگئی۔ کچھ تم نے اس سے
پوچھا بھی ۔"
سہراب جی ۔" مجھ سے اس نے جس وقت یہ کہا کہ اس نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ہے اور اب وہ
خیال کرتی ہے کہ میرے ساتھ شادی کرکے وہ زیادہ خوش رہے گی تو مجھ پر ایک ایسی مسرت
طاری ہوئی کہ میری زبان بند ہوگئی۔ اس کے علاوہ اس بات کے پوچھنے کا کیا موقع تھا
کہ اس نے اپنی رائے کیوں بدلی ۔"
طیب ۔" اب تو یار لوگوں کو مٹھائی کھلاؤ ۔"
سہراب جی ۔" اس میں آپ نے کیا کیا ہے جو مٹھائی کھلاؤں ؟"
طیب ۔" ہم نے یہ کیا کہ تہمینہ کو تمھارے ساتھ شادی کرنے پر راضی کرلیا ۔"
سہراب جی ۔" سچ بتاؤ تم نے راضی کرلیا۔ کیسے راضی کرلیا ؟"
طیب :" تمھیں یاد ہے کہ تم نے اپنی ناکامی کا حال بیان کرتے ہوئے اپنے رقیب کا نام مہربان جی
بتایا تھا ؟"
سہراب جی ۔" جی ہاں بتایا تو تھا ۔"
طیب ۔" بس اسی وقت میں نے سمجھ لیا کہ اب طیب کا دماغ سہراب جی کی شادی تہمینہ
سے کرادے گا ۔"
سہراب جی ۔" وہی تو بتاؤ کیسے ؟
طیب :" یہ معلوم ہونے کے بعد کہ آپ کا رقیب ایک شخص مہربان جی بھنجی موٹر والا ہے جو
کمسریٹ میں نوکر ہے اس کا صحیح پتہ لگانا کیا مشکل تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ سے
مس تہمینہ کا آخری خط مانگ لیا تھا ۔"
سہراب جی ۔" ہاں یاد ہے "۔
طیب ۔" آپ کو یہ سُن کر پُرلطف حیرت ہوگی کہ جس روز مجھے آپ نے وہ خط دیا اس کے چوتھے
پانچویں روز اسی مضمون کا ایک خط مہربان جی کے نام پہنچا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تہمینہ

کو اطلاع کیے بغیر فوراً بصرے کو روانہ ہو گیا۔ پھر یاروں کے دماغ نے وہ کام کیا جس کا نتیجہ آج کی ڈاک نے آپ کے سامنے پیش کیا۔"

اس کے بعد طیب نے سہراب جی سے وہ واقعات بیان کیے جو اپالو بندر پر پیش آئے تھے

اگلے مہینے کی نو تاریخ کے بمبئی سماچار کے لوکل کالمز میں یہ خبر درج تھی کہ آج شام کو بمبئی کے پارسی لکھ پتی مسٹر سہراب جی فردوں جی پالکی والے کی شادی مس تہمینہ فرامجی کے ساتھ "آل بلس" باغ میں ہوگی۔

(نقیب، بدایوں)

Marfat.com

انجمن نافرین زواج

"بھئی۔ میں تم سے اس روز بھی کہہ چکا ہوں اور آج بھی کہتا ہوں کہ میری رائے میں چوتھی شرط نہایت ہی لغو ہے۔"

"کوئی معمولی عقل اور سطحی دماغ والا غیر تعلیم یافتہ شخص اس شرط کو لغو کہتا تو مجھے پروانہ ہوتی مگر آکسفورڈ کے ایک گریجویٹ اور مڈل ٹیمپل کے بیرسٹر سے ایسی رائے کا اظہار تعجب خیز ہی نہیں۔ افسوسناک ہے۔ رشید تم بارہ برس تک انگلستان فرانس اور جرمنی میں رہ کر بھی ایسے ہی احمق اور تاریک خیال واپس آئے جیسے تمھارے بڈھے ——————"

رشید۔ (بات کاٹ کر) "کیا بے ہودہ بکتے ہو۔ تم بات کو مذاق میں ٹال رہے ہو۔ حقیقت میں مجھے اس چوتھی شرط کی وجہ سے تمھاری اس انجمن پر سخت اعتراض ہے۔ اسلم اگر تم اپنے لیے یہ طے کرو کہ تم شادی نہیں کرنا چاہتے تو مجھے اعتراض نہیں لیکن اگر تم شادی کو ایک ایسا جرم قرار دو جس کا مرتکب جلسوں اور انجمنوں میں شریک نہ ہو سکے ایک ایسا عیب قرار دو جس کی بنا پر بعض حقوق و امتیازات کے حصول کے ناقابل ہو تو مجھے سخت اعتراض ہے کیونکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم دنیا سے شادی کی رسم کو اٹھانا چاہتے ہو۔ چاہے تمھاری یہ کوشش صدیوں ہی میں جا کر کامیاب ہو۔ تم سوسائٹی میں ایک انقلاب ایک تلاطم ایک طوفان پیدا کرنا چاہتے ہو جس کے عواقب و نتائج پر تم نے غور نہیں کیا ہے۔

اسلم۔ جناب عالی! میں نے تو اس کے متعلق بیس برس تک غور کیا ہے مگر آپ کو زندگی کے بارہویں سال ایک چھوٹی سی بہو سے شادی کر لینے کے باعث غور کرنے کا موقع یقیناً نہیں ملا ہوگا۔ انجمن کی رکنیت کا معیار اہلیت ہی یہ ہے کہ اس کا ممبر صرف وہی شخص ہو سکے گا جو نہایت سچائی کے ساتھ یہ عہد کرے کہ وہ عمر بھر کبھی شادی نہیں کرے گا۔

Marfat.com

آپ اس شرط پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ انجمن کی جان یہی شرط ہے۔ یوں تو ملک میں سینکڑوں ہزاروں کلبیں اور انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم ہیں مگر اس انجمن کے انعقاد و قیام کی غرض و غایت یہی ہے کہ دنیا سے شادی کی رسم قبیح معدوم کردی جائے اس لیے کہ میری اور میرے ہم خیال احباب کی جو اس انجمن کے ممبر ہیں یہ قطعی رائے ہے کہ شادی کی رسم انسانی سوسائٹی کو تباہ کن اور انسانی تہذیب کی بنیاد کن ہے۔ آپ اس رسم شادی کے مفید تمدن ہونے کا ثبوت دیجیے اور میرے اصول پر اعتراض کیجیے۔ میں آپ کے جواب دینے کو موجود و مستعد ہوں"۔

رشید۔ "میں رسم شادی کا موئید ہوں جو ہزارہا سال سے مسلّم، مستحکم اور متفق علیہ اور معمول بہ ہے۔ قدامت اور مذہب نے اس میں شان تعظیم و تقدیس پیدا کردی ہے۔ اس لیے مجھے اس کے حق بجانب ثابت کرنے اور اس کے مخالف اصول پر اعتراض کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ سب سے بڑا اعتراض جو میں آپ کے اصول پر کرسکتا ہوں یہی ہے کہ وہ شادی جیسی قدیم، مسلّم اور متفق علیہ اور معمول بہ قانون کے مخالف ہے۔ ایسی حالت میں آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے ایجاد کردہ اصول کے حق بجانب ہونے کے دلائل پیش کریں"۔

اسلم۔ "میں اس وقت کوئی لمبی چوڑی نفسیاتی یا فلسفی تقریر نہیں کرنا چاہتا ہوں اس لیے کہ وقت بہت کم ہے اور مجھے اور آپ کو ٹھیک سات بجے طیب کے یہاں کھانے پر پہنچ جانا چاہیے اس لیے میری گزارش ایجاز و اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہوگی۔ قدرت نے انسان کو طبعاً آزاد و مختار بنایا ہے۔ جن قیدوں اور پابندیوں میں ہم اسے جکڑا ہوا دیکھتے ہیں یہ اس کے خود ساختہ ہیں۔ ایسی حالت میں یہ خود ساختہ قیدیں اور پابندیاں جس قدر کم ہوتی جائیں اسی قدر اس کی فطری آزادی اسے واپس ملتی جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ شادی کی رسم کو امتداد زمانہ نے مقدس و محترم بنادیا ہے۔ لیکن محض قدامت ہی کسی چیز یا کسی رسم کی صحیح یا کارآمد ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ آپ اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ اس رسم سے انسان کی آزادی محدود و مقید ہو جاتی ہے۔ نیچر صرف مرد اور عورت کا اجتماع وقتی چاہتی ہے۔ جس کے لیے ضرور نہیں کہ کسی خاص مرد کو کسی خاص عورت

کے آنچل سے ہمیشہ کے لیے باندھ دیا جائے۔ نیچر کا فعل بلا اس دوامی بندش کے بھی پورا ہو سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔

رشید۔ (بات کاٹ کر) "حضور جو کچھ فرما رہے ہیں اگر یہ مسلمہ یا بدیہات ہیں اور کسی دلیل کی محتاج نہیں تب تو مجبوری ہے ورنہ میں عرض کروں گا کہ میں ان میں سے کسی ایک امر میں بھی آپ سے بلا دلیل متفق الرائے نہیں ہو سکتا۔"

اسلم۔ "میرے جیسے تجربہ والے شخص کی ہر بات مسلمہ ہے اور دلیل سے مستغنی۔ آپ چپکے سنے جائیے۔ ان باتوں سے آپ کے علم میں اضافہ ہوگا۔"

رشید۔ "جب یہ کیفیت ہے تو بہت اچھا۔ میں آپ کی بکواس کو نہایت صبر سے سنوں گا۔

اسلم۔ "جس طرح ہر شخص باعتبار اپنی شکل وصورت کے دوسرے شخص سے مختلف ہے اسی طرح ہر شخص باعتبار اپنے خیالات و رجحانات۔ اپنی پسند و ناپسند۔ اپنے مذاق و عادت کے دوسرے شخص سے مختلف ہے دنیا میں مشکل سے دو آدمی ایسے ملیں گے جن کا مزاج ہر اعتبار سے اور بڑی باتوں سے لے کر چھوٹی باتوں تک یکساں ہو۔ ایسی حالت میں دو مختلف الطبائع، مختلف المزاج، مختلف الخیالات اور مختلف المذاق اشخاص کو تمام عمر تک ایک دوسرے سے ایسا باندھ دینا کہ وہ یک جان دو قالب ہو جائیں سراسر لغو اور صریح ظلم ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ہمیشہ سے شادیاں ہوتی آئی ہیں اور اگر ہم لوگوں کے مساعی خدانخواستہ بارآور نہ ہوتے تو آئندہ بھی ہوتی رہیں گی لیکن واقعہ ہے کہ دنیا کو شادی میں ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔

ہم تین قوموں کی شادیوں کو لیتے ہیں جو یکے بعد دیگرے منصۂ شہود پر آتی ہیں یعنی ہندو عیسائی اور مسلمان۔ ان تینوں قوموں نے اپنی سمجھ کے مطابق شادی کے بہتر سے بہتر قانون قاعدے بنائے۔ مگر تجربہ شاہد ہے کہ ہر قوم کو ہر زمانے میں ناکامیابی ہوئی۔ ہندو شادی کو محبت کے اعلیٰ ترین معیار پر پہنچاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت خاوند کی چتا پر "ستی" ہو جاتی ہے۔ محبت کے اس درجے کو حاصل کرنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی جاتی ہے کہ دو ایسی ہستیوں کی جن کے ذہن و دماغ

کم عمری کی وجہ سے کاغذ کے سادہ ورقوں کے مثل ہوتے ہیں ایک جگہ پرورش کی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی بچپن میں شادی کی جاتی ہے تاکہ ساتھ رہنے سہنے سے ان میں توافق خیالات اور تطابق رجحانات ہوجائے اور اس طرح شادی کی زنجیر اس قدر مضبوط کی جاتی ہے کہ مرد کے مرجانے پر بھی نہیں ٹوٹتی۔ عیسائی، ہندوؤں کی طرح بچپن میں شادی کرکے توافق خیالات اور تطابق رجحانات پیدا تو نہیں کرتا لیکن یہی چیزیں تیار شدہ تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ کورٹ شپ کا زمانہ برسوں تک رہتا ہے اور جب مرد ایسی عورت کو حاصل کرلیتا ہے جس کے خیالات و رجحانات اس کے رجحانات وخیالات کے مطابق وموافق ہیں تو اس سے شادی کرتا ہے۔ یہ زنجیر اتنی زبردست تو نہیں ہوتی کہ عورت کو خاوند کی چتا پر کھینچ لائے اور اسے مرد کی لاش کے ساتھ جلائے۔ لیکن پھر بھی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ مذہب و قانون کی متفقہ طاقت اسے بہ مشکل توڑ سکتی ہے۔ جس کوشش سے ہندو مرد وعورت میں تطابق خیالات و رجحانات پیدا کرکے اور عیسائی مرد وعورت میں تطابق خیالات و رجحانات تلاش کرکے محبت کی بنیاد مستحکم کی جاتی ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں گروہوں میں زن وشو کی ناخوشگواری کے واقعات معدوم ومفقود ہوں گے۔ لیکن مشاہدہ بتارہا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ سب سے آخر صورت شادی کی وہ ہے جو اسلام نے قائم کی ہے۔ اس میں نہ ہندوؤں کی طرح رجحانات وخیالات میں توافق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نہ عیسائیوں کی ہم مزاج وہم خیال عورت کی تلاش کرنے میں عمر نوح صرف کی جاتی ہے بلکہ ہر مرد ہر عورت کو تھوڑے سوچ بچار کے ساتھ یا بلغیر کسی سوچ بچار کے اپنی زوجیت میں قبول کرسکتا ہے۔ یہ زنجیر جیسی بنانے میں آسان ہے ویسی ہی توڑنے میں بھی سہل ہے۔ اس بیان سے تمھیں معلوم ہوگا کہ رسم شادی بھی مسئلہ ارتقاء کے تحت عمل ہے اور وہ زمانہ دور نہیں ہے جب کہ تمدن کی تدریجی ترقی اس زنجیر گلوگیر کی کڑیاں بالکل توڑ ڈالے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے اس زنجیر کو بہت کچھ ہلکا اور بودا کردیا لیکن وہ بھی اس کے بالکل توڑنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

Marfat.com

رشید۔" میں نے آپ کے ارشادات کو مثل ایک شاگرد رشید کے نہایت توجہ سے سنا لیکن یہ ملحوظ رہے کہ آپ نے مجھے یہ اجازت نہیں دی تھی کہ کسی امر کے متعلق دلیل طلب کروں یا جس امر میں مجھے آپ سے اختلاف ہو اس کا اظہار کروں۔"

اسلم۔" یہ ایسے بدیہی امور اور محکم مسائل ہیں کہ نہ مجھے ان کے متعلق دلیل پیش کرنے کی ضرورت تھی نہ آپ کے اختلاف سے میرے یقین میں ذرہ بھر فرق آ سکتا ہے۔"

رشید۔" تو ایک بات کہنے کی مجھے اجازت دیجیے کہ جناب کی اس پندرہ منٹ کی درفشانی سے میرے یقین میں ذرہ بھر تنزلزل نہیں آیا۔ بہر حال آپ کی انجمن معہ اس کی شرط چہارم کے آپ کو مبارک رہے۔

---

(۲)

خیالات کے اعتبار سے مغربی ترقی کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ کر بھی اسلم میں اکثر خوبیاں تھیں۔ والدین کی محبت وعظمت اس کے دل میں اتنی ہی تھی جتنی کسی مقدس عالم یا باعمل بیٹے کے دل میں ہو سکتی ہے۔ ہنسنا اور بے تکلف ہونا تو بڑی بات ہے وہ باپ کے سامنے چار مسلسل جملے بھی نہیں بول سکتا تھا۔ اس کو دہلی میں پریکٹس کرتے ہوئے چار سال اور "انجمن نافرین زواج" کا ممبر ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ آدمی جہاں رہتا سہتا ہے وہاں کم وبیش متفق الخیال لوگ ڈھونڈھ ہی نکالتا ہے۔ اس نے انجمن کی ترقی اور ممبروں کی تعداد کی توسیع میں بہت کوشش کی۔ دہلی جیسے شہر میں دس بارہ ہم خیال جنٹل مینوں کا ڈھونڈھ نکالنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس کی رائے اور انجمن کے سیکرٹری مسٹر شنکر کی رائے میں اگر کوئی اختلاف تھا تو یہ تھا کہ اول الذکر کو تو محض رسم ازدواج سے نفرت تھی مگر ثانی الذکر کو پچاس برس کی عمر پر پہنچ کر کل جنس اناث ہی سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

اسلم اس امر کا تو اکثر اعلان کرتا رہتا تھا کہ وہ جنس اناث کے لیے ناقابل فتح قلعہ نہیں ہے۔ لیکن یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ ایک نامعلوم اور غیر متشخص حسن کی تصویر اس کے پردۂ خیال پر منقوش و مرتسم ہے۔ یہ نسوانی حسن کا ایک "آئیڈیل" تھا جو فرصت کے اوقات میں اکثر اس کے پیش نظر رہتا تھا۔ قوت متخیلہ اس آئیڈیل کو کبھی لمبے سیاہ بالوں، کبھی سیاہ آنکھوں،

کبھی پتلے متبسّم ہونٹوں کی انفرادی شکل میں اور کبھی اس سارے مرقع کو اجتماعی صورت میں پیش کرتی رہتی تھی۔ محض اس وجہ سے کہ وہ ایسا خوش نصیب نہیں ہو سکتا کہ اس خیالی تصویر کو کبھی عالم آب و گل میں دیکھ سکے انجمن کی چوتھی شرط کے باوجود اس کے دل کے مخفی گوشے میں یہ خیال مضمر تھا کہ جو شخص اس مرقع حسن کے ساتھ ازدواج کی آہنی زنجیر میں باندھ دیا جائے اسے سوائے خوش نصیب کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

---

(۳)

دیوانی عدالتوں کی تعطیل شروع ہونے کو تھی۔ اسلم کا خیال تھا کہ تعطیل کا زمانہ بمبئی میں گزارے لیکن اس کے والد کا تار آیا کہ فوراً مکان چلے آؤ۔ چنانچہ دوسرے ہی روز وہ پٹنہ کو روانہ ہوگیا۔ شام کو ماں باپ نے کھانا کھاتے وقت بیٹے کو نادر شاہی حکم سنایا" بیٹا۔ ہمارا بڑھاپا ہے اور ہماری آخری تمنا ہے کہ تمہارا سہرا دیکھیں۔ لہٰذا ہم نے تمہاری شادی مولوی الطاف الرحمٰن کے یہاں ٹھہرائی ہے۔ سامان سب تیار ہے۔ ہماری رائے ہے کہ اس ہفتے میں عقد ہو جائے"۔ اسلم جیسے سعادت مند بیٹے کے لیے یہ نہایت نازک موقع اور سخت امتحان کا وقت تھا۔ والدین کا ادب اور عمر بھر کی سعادت مندانہ خدمت گزاری ایک طرف اور مدتوں کا قائم کیا ہوا اصول اور انجمن کی چوتھی شرط دوسری طرف، خاموش ہو رہا۔ والدین نے پرانی مثل کے مطابق خاموشی کو نیم رضا بلکہ کامل رضا سمجھا۔ سوتے وقت اسلم کو اس مسئلے پر غور کرنے کا موقع ملا۔

"عمر بھر کی اطاعت شعاری کا مقتضا یہ نہیں ہے کہ والدین کے آخری وقت میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کی جائے اور ان کی اس دیرینہ تمنا کا خون کیا جائے۔ مگر اپنے اصول سے تجاوز اور چوتھی شرط کی خلاف ورزی بھی مشکل ہے ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ والدین سے تو اختلاف کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اگر اختلاف کروں بھی تو وہ کب مانیں گے۔ شدت سے اختلاف یعنی قطعی انکار ان کی ناراضی کا باعث ہوگا اور میرا جی نہیں چاہتا کہ بڑھاپے میں ان کو ناراض کروں۔ لیکن میں کسی طرح سے شادی پر رضامند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ شادی میں کب کرتا ہوں

اصل میں والدین کرتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ میری شادی کرتے ہیں یا اپنی۔۔۔۔
ان کے شادی کرنے کی حالت میں چاہے وہ میری ہی ہو میرا اصول کہاں ٹوٹا۔ یہ امر آخر ہے کہ اس خاتون کے ساتھ جو بیاہ کر لائی جائے میرے تعلقات زن وشوئی ہوں یا نہ ہوں۔ بہرحال ابا جان اور بی اماں کی مرضی یہی ہے تو خیر۔۔۔۔۔"

---

(۴)

عقد کے تیسری چوتھی رات کو اسلم کی آنکھ کھل گئی۔ اپنی چارپائی سے اٹھا۔ لیمپ جل رہا تھا۔ دفعتاً نظر جو اٹھ گئی تو برابر کی چارپائی پر نسوانی حسن کا وہی "آئیڈیل" جو فرصت کے اوقات میں اکثر اس کے پیش نظر رہتا تھا۔ وہی لمبے سیاہ بال، وہی بڑی سیاہ آنکھیں، وہی پتلے متبسم ہونٹ، اجتماعی صورت اور عالم آب وگل میں اس کے سامنے موجود ہیں۔

---

(۵)

رشید۔: "اسلم صاحب ہیں؟"

خانساماں۔" حضور نماز پڑھ رہے ہیں۔"

رشید۔" اسلم صاحب نماز پڑھ رہے ہیں۔"

خانساماں:" جی حضور جب سے پٹنہ سے واپس آئے ہیں برابر پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں اسلم صاحب تشریف لاتے۔

رشید۔" بھئی اسلم۔ تمھیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ میری بیوی کا انتقال ہوگیا اب میں چاہتا ہوں کہ تمھاری انجمن کا ممبر ہو جاؤں۔ اب میں نہایت خوشی سے انجمن کی چوتھی شرط کے مطابق عہد کر سکتا ہوں۔

اسلم۔" مگر تمھیں یہ نہیں معلوم کہ میں اب انجمن نافرین زواج کا ممبر نہیں ہوں۔ میں نے پٹنہ ہی سے بذریعہ تار ممبری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میرے وہ خیالات نہیں ہیں۔ تمھیں یہ سن کر شرم آئے گی کہ جب کہ آکسفورڈ کا گریجویٹ اور

Marfat.com

مڈل ٹمپل کا ایک بیرسٹر مجھے میرے اصول سے متزلزل نہ کر سکا۔ ایک عورت نے بلا کسی دلیل و برہان اور بلا کسی زبانی منطق کے اس اصول سے توبہ کرا دی اور ساتھ ہی یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ میں اب رسم شادی کا نہ صرف مؤید ہی ہوں بلکہ اسے تہذیب اخلاق اور ترقیِ تمدّن کے لیے ایک نمونۂ رحمت سمجھتا ہوں۔ میری رائے میں ہر جسمانی و روحانی مرض کا علاج شادی ہے اور شادی بھی صحیح اسلامی طریقے کے مطابق اور اسلامی قیود کی پابندی کے ساتھ۔

نقیب، بدایوں ——— ملا علی آق سقال

اپریل ۱۹۱۹ء

حصّہ چہارم

تنقید و تبصرہ

Marfat.com

Marfat.com

حدیثِ دیگراں

(۱۷)

مطالعے کے شغل کے علاوہ بریلی میں بھی ایک استاد کو فارسی پڑھانا پڑی۔ اس زمانے میں کبھی کبھی مولانا احمد علی شوخ بجنین کی خدمت میں بھی حاضری ہوتی رہی خود میر صاحب کے بقول "قلم میں خارش" اسی زمانے سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلا مضمون جو شائع ہوا مولانا احمد علی کی تصنیف "شاہد ظرافت" کا ریویو تھا

علی گڑھ میگزین ــــــــ سبطین احمد بدایونی

جنوری ۱۹۳۹ء

تبصرہ نگاری کے کچھ اخلاقی پہلو بھی ہیں۔ کسی ایک شخصیت یا گروہ کی زیادہ تعریف یا زیادہ مذمت نامناسب ہے۔ اگر نکتہ چینی ضروری ہے تو اس میں الفاظ ایسے استعمال کیے جائیں جو نرم ہوں اور انداز بیان ناخوشگوار نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سچی بات کہنے سے گریز کیا جائے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ہر بات رکھ رکھاؤ سے کہی جائے۔ مثلاً کسی فن کار کے بارے میں یہ نہ کہیے کہ وہ جاہل یا نالائق ہے۔ البتہ اس کی فنی تخلیق کی تمام کمزوریوں کو واشگاف کرنا چاہیئے اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیجیے۔

فن صحافت ــــــــ عبد السلام خورشید

مولانا احمد علی شوخ بجنین "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں میں سے تھے اور کبھی کبھی وہ ا۔ا۔ش۔ب کے پردے میں لکھتے تھے۔ آج نہ "شاہد ظرافت" دستیاب ہے اور نہ اس پر سید محفوظ علی صاحب کا تبصرہ۔ یہ انیسویں صدی کے نوادرات ہیں۔ البتہ سید محفوظ علی صاحب نے تبصرہ نگاری سے لکھنے کی ابتدا کی ان کے دو تبصرے

آئندہ درج کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کی تحریریں ہیں، لیکن جدید میزان پر جس کے اوزان ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اوپر گنائے ہیں، ان دو مضمونوں کو تولیے اور خود فیصلہ فرمائیے کہ وہ جدید معیار پر کیسے اترتے ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر نے مولف سے سیّد محفوظ علی کے ایک اور تنقیدی مضمون کا تذکرہ کیا اور فرمایا " اس طرح کا دوسرا مضمون آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ دیوانِ حافظ کی کسی شرح پر تبصرہ تھا۔ افسوس کہ اس مضمون تک رسائی نہ ہو سکی۔

——— مولف

Marfat.com

اردو رسائل پر ایک نظر

میں ایک رمتا جوگی بہتا دریا۔ مجھے تبصرہ نگاری سے کیا غرض۔ بمبئی آیا تھا تو یہ غرض تھی کہ اپنے دوست مولوی ظفر علی خاں صاحب بی اے سے نیاز حاصل کروں جن کی علمی شہرت کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ "ٹائمس بلڈنگ" ایک چنگی خانہ ہے جہاں آکر ہر شخص کو اپنے دماغ کے صندوق کا محصول چاہے وہ بالکل ہی خالی ہو کم از کم بقدر ایک مضمون کے تو ضروری ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بہتیرا انکار کیا لیکن وہ شانِ جبروتی جو ایڈیٹروں سے "ہم" کہلواتی ہے میری "نہیں" کو کب خاطر میں لاتی۔ گریز کے طور پر میں نے کہا کہ جس طرح "فصیح الملک" کے کسی پچھلے نمبر میں مولانا وجاہت صدیقی نے "زمانہ" کی ایک تنقید پر اعتراض کرتے ہوئے ریویو نگاری کی خدمت کو لازمۂ ایڈیٹری قرار دیا تھا اسی طرح کوئی مجھے بھی "ایرا غیرا نتھو خیرا" نہ سمجھے۔ لیکن مولوی صاحب نے یہ عذر بھی نہ چلنے دیا اور کہا کہ ولایت میں عام دستور ہے کہ اخباروں اور رسالوں میں جو ریویو لکھے جاتے ہیں وہ اکثر ملک کے اُن مشہور اہلِ قلم کے ہوتے ہیں جنھیں ایڈیٹوریل اسٹاف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جو اپنا اصلی نام ظاہر کرنے کے بجائے اپنا علمی نام ریویو کے آخر میں لکھتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے اینگلو انڈین پریس میں بھی یہی طریقہ مروج ہے۔

آخرکار مولوی صاحب کی طلاقتِ لسانی میری سیماب دشتی اور گریز پائی پر غالب آئی اور فقیر کو اپنا رختِ سفر کندھے سے اتار کر تعمیلِ فرمائش کرتے ہی بنی۔

رسالوں کے انبار میں فطری دلچسپی کے اعتبار سے سب سے پہلے جن رسالوں پر میری نظرِ انتخاب پڑی وہ دو ہیں جن کا موضوع مذہب یا مذہبی مناظرہ ہے۔

ضیاء الاسلام (ایڈیٹر محمد فضل حسین صاحب بسمل۔ مراد آباد۔ دو روپیہ آٹھ آنہ سالانہ) نام سے معلوم ہوتا ہے کہ محض مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا پرچہ ہے اور اس کی ایک ایک سطر

Marfat.com

سطر مذہب کے نکات و رموز کے انکشاف کے لیے وقف ہوگی۔ اور حقیقت میں اگر ایسا ہوتا تو بہت اچھا تھا لیکن ایڈیٹر صاحب نے جہاں اس پرچے کے مقاصد "اسلام کی برکات اور خوبیوں کا اظہار۔ دیگر مذاہب پر اس کی فضیلت ثابت کرنا۔ سائنس اور فلسفے کے حملوں سے اسلام کو بچانا اور الزامات کے گرد و غبار کو اسلام کے منوّر چہرے سے بر دلائل عقلی و نقلی نہایت متانت سے دور کرنا" گنائے ہیں وہاں "مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں۔ اور نتیجہ خیز قصص، علمی، اخلاقی، تاریخی، تعلیمی، تمدنی، معاشرتی اور صنعت و حرفت کے متعلق نتیجہ خیز مضامین، اسلامی معلومات و خبریں وغیرہ۔ ضروری نوٹس" کی غیر ضروری پخچریں بھی لگادی ہیں۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ فاضل ایڈیٹر ۵۶ صفحے کے پرچے میں یہ تمام اغراض پورے کرکے کہاں تک دریا کو کوزے میں بند کرتے اور چنے کی دال پر قل ہو اللہ لکھتے ہیں۔ جنوری سنہ رواں کے پرچے میں "کیمیائے اسلام" کے بعد جو رسالہ" البیان" سے لیا گیا ہے" اسلامی اور عیسائی مذہبی جنگ" والا مضمون قابلیت سے لکھا گیا ہے اور جتنا حصہ جنوری کے پرچے میں چھپا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون اُن مخالفین اسلام کا پورا پورا جواب ہوگا جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت بہ جبر ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت امیر کابل کے حالاتِ سیاحتِ ہند درج کیے گئے ہیں جس کی لطیف وجہ ایڈیٹر صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ "ضیاء الاسلام کے کالم ضیاء الملتہ والدین کے خلف الصدق . . . . کے تذکرہ سے خالی" نہ رہیں۔ حالاتِ سیاحت کی لبسم اللہ، اشعار صنعتی سے شروع ہوتی ہے۔ اگر مجھ کم سواد کو یارق، یوح، مقترح، یحش کے معنی بلامدد صراح و قاموس معلوم ہوتے تو میں مولانا جمیل احمد شوق مراد آبادی سے استدعا کرتا کہ اپنا وہ دیوان جو اسی رنگ میں ترتیب دیا گیا ہو بذریعہ وی۔ پی پارسل میرے نام بھیج دیں۔

ایڈیٹر صاحب ضیاء الاسلام اگر اپنے پرچے کے مضامین کے دائرۂ مقاصد کو ذرا تنگ کریں تو بہت ہی مناسب ہوگا۔ میری رائے میں یہ خصوصیت

انوار الاسلام۔ (شہر سیالکوٹ، مہینے میں دوبار۔ دو روپے سالانہ) میں زیادہ ممتاز ہے جس نے اپنا مقصد مخالفینِ اسلام کے اعتراض کا رد قرار دیا ہے۔ میں نے ممتاز کہا ہے جس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں

Marfat.com

اسے مستحسن سمجھتا ہوں کیونکہ بحث کا وہ طریقہ ہرگز موثر نہیں ہو سکتا جس سے فریقین کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو۔ جادلہم بالتی ھی احسن ۔ ایڈیٹر صاحب انوار الاسلام نے پہلے مضمون میں نیوگ کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے جی چاہتا تھا کہ میں قطعاً اس کی نسبت اظہارِ ناپسندیدگی کروں لیکن دوسرے مضامین کے فحوا سے معلوم ہوا کہ اغیار وا جانب نے فرط تعصب سے اسلام پر اس قدر ذلیل اور رکیک حملے کرنے شروع کیے ہیں کہ بیچارے مولوی تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق بن کر بہ درجۂ مجبوری سختی سے جواب دیتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ وہ خلافِ تہذیب برتاؤ جو انوار الاسلام جیسے پرچوں کو مجبور ہو کر مخالفین مذہب کے ساتھ کرنا پڑتا ہے اُس کی محرک آریوں اور عیسائیوں کی عامیانہ تحریروں ہی کی رکاکت اور بدتمیزی ہوتی ہوگی۔ لیکن ہماری حیرت و استعجاب کی یہ دیکھ کر کوئی حد نہ رہی کہ ۔

تجلّی ۔ (لاہور۔ ایک روپیہ آٹھ آنے سالانہ) بھی جو پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی کے رسالے "ترقی" کا مذہبی حصّہ ہے اور جس کے ایڈیٹر کی پالیسی صلح کل ہے اس سوقیانہ مذاق سے نہ بچ سکا۔ ہم نے نہایت افسوس سے جنوری کا نمبر پڑھا جس نے پہلے دوسرے ہی صفحہ سے چٹکیاں لینا شروع کی ہیں اور آخر میں جا کر برچھیاں چبھوئی ہیں ۔ ع

خدا غارت کرے اس اختلافِ دین و مذہب کو

اس پرچے میں صرف ایک مضمون ہے جسے دوسرے مذہب والے ٹھنڈے دل سے پڑھ سکتے ہیں یعنی "قدیم اور جدید ملحدانہ طریقے اور اُن پر سرسری نظر" کاش ایڈیٹر تجلّی اس راز کو سمجھیں کہ دوسرے مذاہب پر جگر خراش حملے کیے بغیر بھی وہ اپنے مذہب کی خوبیوں کا ثبوت دینے کی کوشش کر سکتے ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں ۔

مذہب کے بعد جو چیز انسان کے جذبات پر اثر ڈالتی ہے وہ پالیٹکس ہے ۔ خصوصاً آج کل جب کہ ملک میں چاروں طرف پولیٹیکل خیالات کا تلاطم بپا ہے ۔ اس موضوع پر ۔

بھارت ماتا ۔ (لاہور۔ ایک روپیہ آٹھ آنے سالانہ) کے نام سے ایک نیا پرچہ نکلنا شروع ہوا ہے جس کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے خیال میں جس طرح جسم کے لئے غذا ضروری ہے اسی طرح قوم کے لیے پالیٹکس کی ضرورت ہے ۔ اچھی غذا جزو بدن ہو کر جسم کو تقویت دیتی ہے ۔ خون صالح پیدا

کرتی اور عمر بڑھاتی ہے اور بری غذا جسم میں مواد فاسد پیدا کرتی۔ انواع واقسام کے امراض کی محرک ہوتی اور آخر میں انسان کو ہلاک کر ڈالتی ہے۔ اسی طرح اچھی پالیٹکس قوم کے صحیح نشوونما میں مدد دیتی اور بری پالیٹکس پولیٹیکل تخمہ اور طاعون کی محرک ہوتی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے کثیر التعداد ماہواری پرچوں میں کچھ پرچے ایسے بھی ہوں جو کلاً یا جزواً پولیٹکل امور کو اپنے حیطۂ اغراض میں لیے ہوئے ہوں اور اسی لیے ہم "بھارت ماتا" کا خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ایڈیٹر "بھارت ماتا" کو صلاح دیتے ہیں کہ اگر وہ اس پرچے کو صحیح اصول پر چلانا اور اپنے مشن میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو انھیں اِن چند باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

(۱) مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بلکہ تقریباً کل مسلمان ہندوؤں سے پولیٹکل امور میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اس اختلاف کو طعن و تعریض اور سخت کلامی کے ذریعہ سے مخالفت کی حد تک پہنچانے سے قطعاً احتراز کرنا چاہیئے۔

(۲) گورنمنٹ کے ساتھ رعایا کا طرز عمل مودبانہ ہونا لازمی ہے اور اخباروں و رسالوں کو جو رعایا کے وکیل ہیں، حقوق رعایا کے پیش کرتے وقت یا اُن کے تحفظ میں قلم اٹھاتے وقت جادۂ اعتدال سے متجاوز نہ ہونا چاہیئے۔

"بھارت ماتا" نے اپنے پہلے نمبر میں ان دونوں باتوں کا خیال نہیں رکھا۔ قصور کی میونسپلٹی میں مسلمان اراکین کی کثرتِ تعداد کو "لاغر خانہ" کے بیلوں اور گایوں کی لاغری کا باعث قرار دینا یا دادا بھائی نوروزجی کی اس (بزعم تلک) باغیانہ خواہش کو جو پچاس سال کی سرگرم مگر یاس انگیز کوششوں کا نتیجہ ہے واجب الاتباع خیال کرنا ہندوستان کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانا ہے۔

پالیٹیکس کے بعد جس چیز کی ملک کو سخت ضرورت ہے وہ سوشیل اصلاح ہے۔ ان پرچوں میں جنھوں نے اس اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اور تقسیم عمل کے اصول کو مدنظر رکھ کر سوسائٹی کی کسی خاص خرابی کے رفع کرنے کو اپنا مقصد قرار دیا ہے ہم۔

ٹیمپرنس گائیڈ۔ (امرتسر۔ ایک روپیہ چار آنے سالانہ) کی کوششوں کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ ہماری رائے میں ہر اس شخص کو جو شراب کو ام الخبائث اور انسان کے شیرازۂ اخلاق کا بکھیرنے

Marfat.com

والا سمجھتا ہو ٹیمپرنس گائیڈ جیسے پرچوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ پرچہ بحیثیت مجموعی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل و تائید نہایت خوش اسلوبی سے کر رہا ہے اور بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ بہت کم باتیں اس میں ایسی ہوتی ہیں جو اس کے موضوع سے کچھ نہ کچھ تعلق نہ رکھتی ہوں۔ جنوری کے پرچے کا تقریباً ایک ثلث آل انڈیا ٹمپرنس کانفرنس کی روئداد اور رائٹ آنریبل سیموئیل اسمتھ آنجہانی کے حالات کے لیے وقف کیا گیا ہے اور بجا وقف کیا گیا ہے۔ اگر ایڈیٹر صاحب اس پرچے کی چھپائی میں زیادہ اہتمام کریں تو بہت مناسب ہو۔

قومیت کے زینے کی پہلی سیڑھی عصبیت ہے۔ جب تک اُن جماعتوں کی خصوصیات میں جن کے ملنے سے قوم بنتی ہے عصبیت کی جھلک نہ پائی جائے قوم کی شیرازہ بندی مشکل سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کی ذات بندی و فرقہ بندی مشہور ہے۔ ہندوؤں میں تو ذات پات کا ابتدا ہی سے اہتمام تھا۔ لیکن ہندوستان میں آکر مسلمانوں نے بھی اپنی اس عالمگیر برادری کو جو اپنی اصلی حالت میں غیر ممکن الانقسام تھی مختلف فرقوں اور مختلف ذاتوں میں تقسیم کر دیا۔

ایسی حالت میں ہر جماعت کے لیے کسی نہ کسی ایسے ذریعہ یا واسطے کی ضرورت تھی جو اس جماعت کے دور افتادہ افراد میں رابطۂ اتحاد یا تبادلۂ خیالات کا سلسلہ قائم کرے۔ ہم خوش ہیں کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مختلف فرقوں اور مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے پرچے یا اخبار نکالے ہیں۔ ان میں سب سے اچھا پرچہ ـــ

قریشی میگزین۔ (امرتسر۔ ایک روپیہ آٹھ آنے سالانہ) ہے جو ظاہری اور باطنی محاسن کا جامع ہے۔ "انساب القریش" کے عنوان سے جس مضمون کا مفید و دلچسپ سلسلہ ایڈیٹر صاحب نے شروع کیا ہے اور جس کا چھٹا نمبر جنوری میں شائع ہوا ہے نہایت قابلیت و ہمہ دانی سے لکھا جا رہا ہے جس کے لحاظ سے ہم انھیں مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

قریشی میگزین کا موضوع اس قدر وسیع النکات اور کثیر المواد ہے کہ کسی اور مبحث پر خامہ فرسائی کرنے کی زحمت ایڈیٹر صاحب یا اُن کے مضمون نگاروں کو دوسرے اخباروں کے لیے چھوڑ دینی چاہیئے' اسی لحاظ سے جنوری کے نمبر میں "انسداد گداگری" "دلچسپ اعداد" "مولوی یعقوب خاں ہزاروی کی پردہ دری" والے مضامین یا "ردتی" والی نظم کو سرے سے قلم انداز کرنا

چاہیئے تھا۔ گداگری کے متعلق اگر کچھ لکھنا ضرور تھا تو بہتر تھا کہ قریش بلکہ ساری امت کے سرتاج حضرات سادات کے اس طرز عمل کے متعلق سختی یا نرمی سے کچھ لکھا جاتا جو گداگری کے لگ بھگ ہے۔ اسی طرح دلچسپ اعداد میں بھی قریش سے بحث کی جاتی۔ بہر حال قریشی میگزین ایک مفید اور قابلِ قدر کوشش ہے اور ہم قریشیوں کو زور سے توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اپنے فرقے کے اس لائق وکیل کی جہاں تک ممکن ہو مدد کریں۔ اسی طرح ہم کشمیری جماعت کے روشن خیال اور تعلیم یافتہ اصحاب سے ــــ

کشمیری میگزین ۔ (لاہور۔ ایک روپیہ سالانہ) کی سفارش کرتے ہیں جو ہمارے کرم فرما مولوی محمد الدین صاحب فوق ایڈیٹر "پنجۂ فولاد" کی اخباری مستعدی اور خدمت گزاری کا ایک قابلِ قدر نتیجہ ہے۔ پرچے کی لکھائی چھپائی اور اس کے مضامین کے متعلق ہم کو زیادہ موشگافی کی حاجت نہیں۔ کیونکہ مولوی محمد الدین جیسے تجربہ کار اخبار نویس کی دیدہ ریزی اس پر صرف ہو چکی ہے۔ ہم صرف اتنی صلاح دیں گے کہ اس قسم کے مضامین میں جیسا فروری نمبر میں "کشمیر کی تجارت" ہے بہتر ہو اگر بجائے خیال آرائی اور قیاسی دقیقہ سنجی کے شمار و اعداد سے بحث کی جائے اور زیادہ شرح و بسط سے کام لیا جائے۔ مسلمان کشمیریوں کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس موقع پر الہ آباد کے مشہور و معروف رسالے ــــ

۔ (ایڈیٹر پنڈت تیج بہادر سپرو ایم اے ال ال۔ ڈی۔ تین روپے سالانہ) کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جو ہمارے ہندو کشمیری بھائیوں کی قومی اغراض کے لیے وقف ہے اور بہ اعتبار نفاست مضامین ہندوستان کے اچھے علمی پرچے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ پنڈت تیج بہادر صاحب کے علمی ذوق سے خدا ہندوستان کے ہر سپوت کو حصہ دے جو باوجود قانونی مشاغل کے انہماک کے قومی اور علمی خدمت گزاری کے لیے کچھ نہ کچھ وقت نکال رہے ہیں۔

جنوری کے پرچے میں سب سے زیادہ معرکۃ الآرا مضمون دادابھائی نوروزجی کے عنوان سے ہمارے دیرینہ کرم فرما مسٹر چکبست لکھنوی کا ہے جن کے مضامین پرانے زخموں پر نمک چھڑکنے اور فریق مخالف کے پہلو میں چٹکیاں لینے کے اعتبار سے ایک خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں اور جن کے پولیٹیکل کارنامے اور علمی مشغلے ہمیشہ ایک شانِ نشتر زنی لیے ہوتے ہیں۔

Marfat.com

مسٹر چکبست اُن نوخیز ملکی "ریفارمروں" میں ہیں جو ہندوستان کی دو جلیل القدر قوموں میں اتفاق و اتحاد تو بجان و دل چاہتے ہیں مگر اس طرح کہ زبردست قوم زیر دست قوم کو طعن و تشنیع سے، طنز و تعریض سے گھڑک کر، جھڑک کر اس کی خوبیوں کو ایک ایک کرکے مٹی میں ملا کر اور اس کے عیوب کو چن چن کر اس کی ہتیلی پر رکھ کر اسے کردہ و ناکردہ لغزشوں، خطاؤں بلکہ گناہوں کا ملزم قرار دے کر اقرار عجز و فروتنی پر مجبور کرے اور زیردست قوم کو زبردست قوم کے سفید جھنڈے تلے آکر پناہ لینی پڑے۔ کاش ہمارے تفرقہ انداز مصلح کو کوئی سمجھاتا کہ اتفاق کا طریقہ دنیا میں ایک اور ہے جو اُن کے طریقے سے زیادہ مفید و کارآمد اور موزوں و مناسب ہے اور وہ یہ ہے کہ رفق و مروت اور محبت و آشتی سے کام لیا جائے۔

یہ ناممکن تھا کہ دادا بھائی نوروزجی کے پولیٹیکل کارنامے بیان کرتے وقت سر سیّد علیہ الرحمۃ کا ذکر نہ آئے، مگر یہ بالکل ممکن تھا کہ مسٹر چکبست سر سیّد کے پولیٹیکل مساعی کی تنقیص و توہین کیے بغیر بھی دادا بھائی نوروزجی کی تحمید و تحسین کرتے۔ لیکن سر سیّد کا ذکر کرنے سے پہلے ہم اُس ناپاک ہستی۔ اُس "خدا کی مخلوق" کا نام سننے کے مشتاق ہیں جو "انسان کی شکل میں "کرۂ ارض کے مقدس ترین حصّہ آریہ ورت کو ناپاک کر رہی ہے اور جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کا پولیٹیکل اتحاد ایک امرِ محال ہے اور جس کے مذہب میں منفعتی اور سب جمی کی چار دن کی چاندنی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا ثواب میں داخل ہے۔"

اشعث طماع ایک شخص کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا اور اس خیال سے کہ جس قدر کھانا ہے سب میرے ہی پیٹ میں پڑ جائے جلد جلد لقمے کھانے اور بغیر چبائے نگلنے شروع کیے اور دم کے دم میں قاب صاف کردی۔ اس کا ساتھی بیچارہ تہذیب آمیز تعجب یا تعجب آمیز تہذیب کی وجہ سے اس کا منہ ہی تکتا رہ گیا اور جب آخر میں کہنے لگا کہ حضت۔ آپ نے تو میرے لیے کچھ نہ چھوڑا تو اشعث نے نہایت دیدہ دلیری اور شوخ چشمی سے جواب دیا یعنی عجیب دانہ زدہ ہو کر کھانے کا ذکر کرتے ہو۔ میں نے کھایا تو کیا اور تم نے کھایا تو کیا۔ ایک ایسی چیز کے واسطے جو چار گھنٹے میں فضلہ بن جانے والی ہے تم پرانے مراسم کا پاس نہیں کرتے لاحول ولا قوۃ:

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ "خدا کی مخلوق" جس کی طرف مسٹر چکبست نے صرف اشارہ

کیا اور جس کے نام سننے کی ہم نے تمنا ظاہر کی اشعث کے ساتھی کی طرح مظلوم اور واجب الرحم ہے کہ بھوک کی بھوک کی رہی اور اپنے دوست کی صلواتیں بھی سنیں جو ساری رکابی چٹ کر گیا اور جسے ہیضہ کیا تخمہ تک بھی نہ ہوا۔

اگر منصفی اور سب ججی کی چار دن کی چاندنی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا کسی خاص مذہب کی رو سے ثواب میں داخل ہے تو کیا مسٹر چکبست کا یہ اخلاقی فرض نہیں ہے کہ کم سے کم اپنے ہم مشربوں کو تو ایسے قابلِ نفرت اور ناقابلِ متابعت مذہب کی پیروی سے روکیں اور ہم گورنمنٹ گزٹ میں دیکھیں کہ فلاں فلاں منصف اور سب جج اور ڈپٹی کلکٹر فلاں فلاں عہدوں سے مستعفی ہوئے، منصفی اور سب ججی تو درکنار اگر مسٹر چکبست اپنی کوشش سے پلوٹو کے اس تین سر والے دربان کو جو ہر کلکٹری کے پھاٹک پر ہیڈ کلرک کی صورت میں بیٹھا رہتا ہے وہاں سے اٹھوا دیں تو ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ انسان کی شکل والی خدا کی مخلوق کو گلا کاٹنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

اخبارات و رسائل میں عموماً ہندو مسلمانوں کے تعلقات اور نیشنل کانگریس کا ذکر کرتے ہوئے سرسید علیہ الرحمتہ کی پولیٹیکل خدمات کے متعلق ہمیشہ غلط بیانی یا غلط فہمی سے کام لیا جاتا ہے جسے ہم مضمون نگار صاحبان کی ناواقفیت پر محمول کرتے ہیں لیکن مسٹر چکبست جیسے وسیع النظر اور باخبر شخص سے تعجب ہے کہ انھوں نے بھی سرسید کی ان خدمات کا اندازہ کرنے میں ایسی لغزش سے کام لیا جو غلط بیانی کی حد سے بڑھ کر سوءِ ظن کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ ہم مسٹر چکبست کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ان بزرگوں کے مجمع میں جنھوں نے پولیٹیکل بیداری کا صور پھونکا اور اپنے مردہ دل ہم وطنوں کو پستی و گمنامی کے گورستان سے نجات دے کر قومی زندگی کی جنت کا راستہ دکھایا" آخری درجے کی کرسی تو دی۔ ہم تو بعض ایسے ہندو اصحاب کے نام گنا سکتے ہیں جو سرسید کو پالیٹکس کے ادبستان میں طفل ابجد خواں بھی نہیں سمجھتے۔

سرسید مرحوم کی پالیسی کے متعلق جو کچھ مسٹر چکبست نے لکھا ہے اسے پڑھتے ہوئے ایک طرف تو ہم شکر گزار ہیں کہ مسٹر موصوف نے فراخ حوصلگی سے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ "سرسید مرحوم میں بھی دادا بھائی کی طرح حبِّ قوم کا سودا سمایا ہوا تھا" اور "سرسید کی صدقِ نیت میں شک کرنا کفر ہے۔ جو کچھ اس حبیب قوم نے کیا اپنے ہم مذہبوں کی سچی بہبودی کے خیال سے" لیکن اس

Marfat.com

کے ساتھ ہی ہمیں چکبست صاحب سے شکایت ہے اور نہایت افسوس کے ساتھ شکایت ہے کہ انھوں نے اس تعریف کے بعد ہی اس تنگ حوصلگی اور قومی سوءظن سے کام لے کر جو سرسیّد کی پولیٹکل مساعی کی تنقید کے متعلق ان کے ہم مشربوں کا شعار عام ہے۔ سرسیّد پر وہ دلشکن اور آزار دہ الزام لگایا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاف کو کم کرنے کے بجائے اور الٹا بڑھانے والا ثابت ہوا۔ ہو رہا ہے اور ہوگا۔ مسٹر چکبست نے سرسیّد کا معمول سعدی کا یہ

شعر ؎

اگر شہ روز را گوید شب است این

بہ باید گفت اینک ماہ و پروین

بتایا ہے جو کہنے کو تو دو مصرعے ہیں لیکن طرز ادا کی تلخی کے اعتبار سے دو دیوان ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ اس الزام کی صفائی میں شرح و بسط سے کام لیں لیکن پھر خیال آیا کہ فرد قرار داد جرم کو مفصل و مشرح ہونا چاہیئے۔ یہ ضرور ہے کہ پہلے مسٹر چکبست ہمیں بتائیں کہ سرسیّد کے خوشامدی کہنے کے ان کے پاس کیا وجوہ ہیں۔ وہ ہمیں بتائیں کہ "شہ" نے "روز" کو کس دن "شب" کہا تھا جس کی تائید کے لیے سرسیّد مرحوم "اینک ماہ و پروین" کہنے کو علی گڑھ سے بھاگے ہوئے گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچے تھے۔

شاید مسٹر چکبست نے آل انڈیا مسلم پولیٹکل لیگ منعقدہ ڈھاکہ کی کارروائی پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی ورنہ وہ افسوس نہ کرتے کہ "نواب محسن الملک اور شرف الدین صاحب جیسے بزرگ نواب سلیم اللہ صاحب ایسے پولیٹکل پیشواؤں کے پیچھے قومی ترقی کی نماز پڑھنے میں تکلف نہیں کرتے۔" ہم انھیں یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ اس امام کے پیچھے جس کا مذہب یہ ہو کہ کانگریس کی ہر تجویز سے اختلاف اور حکام وقت کے ساتھ اتفاق کیا جائے ان بزرگوں نے نماز نہیں پڑھی بلکہ ایسے شخص کا اقتدا کیا ہے جس کا مذہب یہ ہے کہ ہر اس معاملے میں جو مسلمانوں کے مفید ہو کانگریس کے ساتھ آمین کہی جائے۔

قومی پرچوں کی برادری میں میرٹھ کے دو پرچے۔

۱۔ دیش ہتکاری۔

۲۔ ہمدرد قوم۔

(ایک روپیہ چار آنے سالانہ) ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ تو ویش برادری کا وکیل ہے لیکن دوسرا پرچہ ہمدرد قوم باوجودیکہ سیاق عبارت بتا رہا ہے کہ کسی خاص جماعت سے تعلق رکھنے والا ہے جس کے جلسوں کی کارروائی جنوری نمبر میں شائع ہوئی ہے تاہم پتہ نہ لگ سکا کہ کس خاص برادری یا جماعت سے اس کا تعلق ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں پرچے اپنی اپنی برادریوں اور اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اب بھی مفید و مقبول ہوں لیکن عام پبلک کو ان سے دلچسپی اس وقت ہی ہو سکتی ہے جبکہ ایڈیٹر صاحب ان پرچوں کی ترتیب و تدوین میں زیادہ وقت اور اہتمام صرف کر سکیں اور بجائے دوسرے اخبارات سے رطب و یابس نقل کرنے کے ایسے خاص مضامین جو ان کی برادری اور قوم کے لیے مفید و دلچسپ ہیں بہم پہنچائیں۔ خواہ ع

عصمت بی بی بود بے چادری

کی وجہ سے یا مرنجاں مرنج طبعیت کے سبب ان پرچوں نے اپنا مسلک صلح کل رکھا ہے اور بجائے اس کے کہ دوسری برادریوں سے دست و گریباں ہوں خاموشی سے اپنا کام جو کچھ بن پڑتا ہے کیئے جا رہے ہیں۔ کاش یہی اصول ہمارے دینی برادران۔

اصلاح (کھجوہ۔ ضلع سارن۔ دو روپیہ سالانہ) اور

شیعہ (بازار بنڈی ضلع سارن دو روپیہ سالانہ) بھی مدنظر رکھتے اور بجائے اس کے کہ اسلام کے دوسرے فرقوں کی دل شکنی اور دل آزاری کریں فرقۂ شیعہ کی (جس کے یہ دونوں وکیل ہیں) سیاسی تمدنی اور اخلاقی بہتری کے لیے کوشش کرتے۔ جو درحقیقت مسلمانوں کی بہتری تھی اور جو ہماری دلی مسرت کا باعث ہوتا۔ بجائے اس کے کہ ہم ایڈیٹران اصلاح و شیعہ کی خدمت میں اپنی طرف سے کچھ گزارش کریں ہم ان کی توجہ مولوی سید مصطفےٰ حسین صاحب اثناء عشری لکھنوی کی تحریر کی طرف جو شیعیان ۔ کی اصلاح میں شائع ہوئی ہے منعطف کرتے ہیں۔

" دیکھنا یہ ہے کہ وہ (اصلاح) جس بات کا مدعی ہے اور جو سرورق پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھتا ہے کہ عام مسلمانوں کی ہر قسم کی اصلاح اور فرقہ شیعہ کی حمایت و ترقی آیا۔ حقیقتاً وہ اتنا بھی کرتا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ جس طرح وہ بوجہ چند مجبوریوں کے اس اخلاقی اصلاح اور خدائی مذہب کی تعلیم سے جس کی دنیا کے تمام انسانوں کو خواہش اور ضرورت ہے زینہ بہ زینہ

تنزل کرکے عام انسان یا عام مسلمان انسانوں کے سامنے اپنے کو نہیں پیش کر سکا۔ اسی طرح نہیں بلکہ عمداً از راہِ نادانی وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی مفید نہیں ہے جس کا کہ وہ دعویدار ہے۔ افسوس اور ہزار افسوس ہے کہ جب اس کا طرزِ تحریر تلخ گوئی اور اس کے ناگوار الفاظ دوسرے مسلمان بھائیوں کو دشمنی کی تعلیم دیتے ہیں تو وہ اس کے خریدار کیا خاک بن سکتے ہیں اور وہ عام مسلمانوں کی کسی قسم کی اصلاح کیا خاک کر سکتا ہے جب اصلاح کا طرزِ بیان اور تحریر اس قدر پاک اور مہذب اور شیریں ہے کو اس کو دیکھتے ہی آنکھ بند کر لی جائے اور سنتے ہی کانوں میں انگلی دے لی جائے تو وہ آواز دل تک کیا خاک پہنچے گی۔

تیرہ سو برس سے شیعہ سنی کا جھگڑا یوں ہی چلا آتا ہے اور ہر فریق کو زبردست سے زبردست دلیلیں فریق مخالف کو مغلوب کرنے میں ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ ایسی حالت میں ایڈیٹران شیعہ، اصلاح، اور اسی طرح ایڈیٹران النجم و کرزن گزٹ کا اس غیر مفید و ناخوشگوار بحث میں حصہ لینا اپنے آپ کو انتہا درجہ کا مجنون و مخبوط الحواس ثابت کرنا ہے۔ خدا ان مذہبی دیوانوں کو عقل و توفیق دے کہ وہ خوش نصیب ہندوؤں اور عیسائیوں اور پارسیوں سے سبق حاصل کر کے باوجود اپنے اختلافوں کے اس قومی محل کے استحکام و آرائش میں حصہ لیں جس کا سنگ بنیاد خدا نے اپنے رسولؐ کے مقدس ہاتھوں سے رکھوایا تھا۔

علم و حکمت کسی خاص قوم کی میراث اور کسی خاص طبقے سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ایک مشترکہ ترکہ ہے جو بنی نوع انسان کو اپنے مورث اولین سے ملا ہے اس کی شعاعیں ہر ملک اور ہر قوم پر یکساں اپنا پرتو ڈالتی ہیں اور اس لحاظ سے وہ پرچے جو معلومات انسانی میں بلا تفریق مذہب و ملت اضافہ کرتے ہوں ہماری توجہ کے خاص محتاج ہیں۔ ایسے پرچوں کی صف اوّل میں ہم ـــ

الندوہ (لکھنؤ۔ دو روپیہ سالانہ) کو جگہ دیتے ہیں۔ جس کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اس کے ایڈیٹر استاذنا و ملاذنا افتخار ملک و قوم علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ ہندوستان میں اردو لکھنے اور پڑھنے والے اب کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں۔ علامہ ممدوح کی تاریخی و ادبی تصانیف نے اردو داں پبلک کا مذاق بہت کچھ نکھار دیا ہے۔ اس بنا پر ہمیں امید تھی کہ الندوہ جیسا پرچہ جو اپنے قسم کا ایک ہی پرچہ ہے نہایت ہی کثیر الاشاعت ہوگا لیکن

Marfat.com

مینجر صاحب رسالہ سے ہمیں یہ سُن کر نہایت ہی تعجب اور افسوس ہوا کہ اس کی تعداد خریداران جیسی چاہیئے ویسی نہیں۔ ہم اسے اردو داں طبقے کی نہایت درجے کی بدنصیبی سمجھتے ہیں کہ سال بھر میں دو روپیہ اس بہترین دماغی اور علمی نعمت کے لیے صرف نہیں کر سکتے۔

عالمگیر کے متعلق دسمبر نمبر میں علاّمہ شبلی کا مضمون اس قابل ہے کہ انگلستان کیا مغربی دنیا کے بہتر سے بہتر علمی رسالے میں جگہ پائے۔ ہماری رائے میں اورنگ زیب کا سب سے بڑا قصور اس کی بدقسمتی ہے جس کی تصویر علاّمہ شبلی نے یوں کھینچی ہے۔" عبدالقادر بدایونی نے نکتہ چینی کے ساتھ اکبر کے صحیح صحیح واقعات قلمبند کیے۔ جہانگیر نے اپنے زمانۂ حکومت میں حکم دے دیا کہ اس کی اشاعت قطعاً بند کر دی جائے۔ نعمت خاں عالی نے" وقائع نعمت خاں" میں سر تا پا عالمگیر کی ہجو لکھی لیکن عالمگیر کے جانشین بہادر شاہ نے شیعیت کی مناسبت سے نعمت خاں کو" دانشمند خاں کا خطاب" دیا اور" وقائع نعمت خاں" درس میں داخل ہوگئی۔ عالمگیر کو جب بہادر شاہ سا جانشین اور نعمت خاں عالی، خافی خان، شاہنواز خاں جیسے وقائع نگار ہاتھ آئیں تو بے چارے کو نیک نامی کی کیا توقع ہو سکتی ہے

اورنگ زیب کی بدنصیبی کا تعلق جس حد تک اس کے جانشین سے ہے اس کی تلافی تو زمانہ نہیں کر سکتا لیکن جس حد تک اس کے وقائع نگاروں سے ہے اس کی تلافی کا موقع ابھی ہاتھ سے نہیں گیا اور ہم اورنگ زیب کو باوجود اب تک ہدف مطاعن و ملاعن رہنے کے نہایت درجہ خوش قسمت سمجھیں گے اگر اسے شبلی جیسا مؤرخ ہاتھ آجائے۔ ہمیں یقین ہے کہ مولانا کے" رائل ہیروز آف اسلام" میں اس سب سے زیادہ مظلوم اور ہندوستان کے سب سے زیادہ جلیل القدر فرمانروا کا نام ضرور ہوگا۔ لیکن اگر نہ ہو تو ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ کتاب جو اس سلسلے میں نکلے وہ" اورنگ زیب" ہو۔ کیونکہ ضرورت ہے کہ اورنگ زیب کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور جو عوام سے گزر کر خواص تک پہنچ گئی ہیں اور جس کے پھیلانے والوں کی سب سے بڑی بیّن اور واضح مثال آنریبل مسٹر گوکھلے ہیں دور کی جائیں۔

قوم کو علاّمہ شبلی کا نہایت شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اپنی علمی و تاریخی گہر ریزی کو اپنے قلم ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ دارالعلوم ندوہ کے ذریعے سے ایسے طلباء پیدا کر رہے ہیں جو اس مذاق کے پھیلانے اور قائم رکھنے میں بہت عرصے تک حصّہ لیں گے۔ نمونے کے طور پر ہم مولوی

Marfat.com

محمد عبد السلام صاحب متعلم دار العلوم ندوہ کو پیش کرتے ہیں جن کا مضمون" امام مسلم" قدر سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔

علوم اسلامی کے سلسلے میں ہم لکھنؤ کے ایک دوسرے قابل قدر رسالے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس نے اردو کی خدمت گزاری کے ساتھ مروجہ عربی کا ذوق اپنے ناظرین میں پیدا کرنے سے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ شوال ۱۳۲۴ ہجری کے

البیان (لکھنؤ۔ چار روپے سالانہ) میں سب سے پہلے" انتفاع بالرھن" کے عنوان سے ایک مضمون درج ہے جس میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ آیا۔ شے مرہونہ سے حالت رہن میں مرتھن مالی و آسائشی فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں۔ چونکہ یہ صورت ہندوستان میں اکثر پیش آتی ہے اس لیے اس بحث کا فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ" رہن لینے والا راہن سے اجازت لے کر رہن سے فائدہ اٹھانے کا اس کو مجاز بنا دے اس صورت میں کسی شخص کو ہندوستان میں دشواری نہ پیش آئے گی چونکہ جب رہن دینے والے نے اجازت دے دی تو بغیر کسی اختلاف کے ہر مذہب میں فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں راہن کا دستاویز رہن کو بہ ثبات عقل و ہوش بلا اجبار و اکراہ لکھنا اور بہ موجودگی سب رجسٹرار اس کی تحریر و تکمیل کا اقبال کرنا کافی شہادت ہے اس امر کی کہ راہن نے بصورت رہن مکان جمیع حقوق و مرافق داخلی و خارجی و سکونتی و آسائشی او ربحالت رہن جائیداد منقولہ آبادی، راہ، چاہ، تالاب و بنجر و جلکہ و شور و کلہ و درختان، ثمر و غیر ثمر بر مرتھن کو نہ صرف قبضہ مرتھنی دیا ہے بلکہ اپنا حق انتظامی بھی تا انقضا میعاد رہن اس کے نام منتقل کر دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کی اجازت یا اس کا انتقال راہن کی حقیقی و اصلی رضامندی پر بھی مبنی ہے یا دبے برندش کا معاملہ ہے۔ اگر بے چارہ کسی شرط سے انکار کرتا ہے تو مرتھن صاحب کی تھیلی کے منہ پر ایک گرہ اور کس کر لگتی ہے۔

اس مضمون کے آخری دو کالم حلت بیع و حرمت سود کی بحث کے نذر کیے گئے ہیں جو بجائے خود ایک دوسرے مضمون کی محتاج ہے۔ عربی اخباروں کا اقتباس نہایت ہی مناسب ہے اور

ہم چاہتے ہیں کہ کچھ زائد صفحے اس کے لیے علیحدہ کیے جائیں۔ کیمبلک اسلام والا مضمون اردو لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ ہے جس کے لیے ہم فاضل ایڈیٹر کو مبارک باد دیتے ہیں۔ یہ مضمون اخباری دنیا میں نہایت قدر سے دیکھا گیا ہے۔ جن حضرات کو اس عربی میں معلومات بڑھانا ہو جو آج کل ممالک اسلامیہ میں رائج ہے انہیں ہم صلاح دیتے ہیں کہ البیان کو ضرور خریدیں جس میں ایک کالم میں عربی اور مقابل کے کالم میں اس کا اردو ترجمہ درج ہوتا ہے۔

ال۔ تعریفی والے رسالوں کی فہرست نامکمل ہوگی جب تک کہ رسالہ جات ذیل کا ذکر نہ کیا جائے۔

المشرق

(ڈھاکہ۔ دو روپے سالانہ) نواب بہادر ڈھاکہ کی سرپرستی میں جدید ترین صوبہ کے دارالحکومت ڈھاکہ سے نکلنا شروع ہوا ہے جس کے چار نمبر اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ مضامین زیادہ تر تاریخی ہوتے ہیں جو دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ نظم کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے۔ امید کہ کارپردازان رسالہ اس پرچے کی چھپائی اور دیکھ بھال میں زیادہ توجہ کریں گے۔ ہمارے فاضل کرم فرما اور انگریزی کے مسلم الثبوت انشا پرداز مولانا ابوالفیض عبدالعلی صاحب ایم۔ اے نے جو سرچشمہ تہذیب مغرب سے سرشار ہونے کے باوجود ایشیائی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جن کی تقلید اس اعتبار سے ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان پر واجب ہے دسمبر و جنوری نمبر میں پان پر ایک نفیس مضمون لکھ کر اپنی رنگینیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے اور پان کی تاریخ و طبعی سرگزشت لکھ کر آخر میں اسے خدا کی عجیب و غریب قدرت کی ایک سچی اور بیّن نشانی ظاہر کرتے ہوئے اس کے ہر پتے کو ع

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

کا مصداق بتایا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو چاہیئے کہ سرورق کے عنوان کے شعر کے دوسرے مصرع پر نظر ثانی کریں۔

الکمال

(رجے پور۔ دو روپے سالانہ) نے حرکت زمین پر ایک سلسلۂ مضمون لکھ کر اور زمین کو ساکن ثابت کرنے کی کوشش کرکے بیسویں صدی کی علمی و سائنٹفک گھڑی کی سوئی کو

Marfat.com

صدہا سال پیچھے ہٹا دیا ہے۔ کاش کہ ایڈیٹر صاحب الکمال زمین کی حرکت محوری کے ابطال کی بیسود کوشش کے بجائے اپنی قوم جیسی جامد اور غیر متحرک شئے میں حرکت پیدا کرنے کی قابل تحسین سعی عمل میں لاتے۔ ستمبر اور اکتوبر نمبر کے پرچے کا دوسرا مضمون "اصول التراکیب" ہے جو نسبتاً زیادہ مفید ہے لیکن زیادہ مناسب ہوتا اگر مروجہ علم کیمیا کی روشنی اس مضمون پر ڈال کر محاکمہ علوم وفنون قدیمہ وجدیدہ کے اس مقصد کو بوجہ احسن پورا کیا جاتا جو الکمال کے سرورق پر درج ہیں۔ ہم ایڈیٹر صاحب کو مشورہ دیں گے کہ اپنے مقاصد کو مدّ نظر رکھ کر وہ غزلیات طرحی کی اس مقدار میں جو پرچے کے پورے سولہ صفحے گھیرے ہوتے ہے اور جس سے کسی طرح "اصلاح 'تمدّن' تہذیب، اخلاق و ترقی طب" متصور نہیں کچھ کمی کر دیں۔

الرفیق (رنگون۔ دو روپے سالانہ) کے دسمبر نمبر میں "کامیابی کے اسباب" والا مضمون جو ہمارے کسی نوجوان ہندو بھائی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے مختصر لیکن پُر معنی اور رطب و حشو زوائد ہے۔ اس مضمون میں محنت، پابندیٔ وقت اور استقلال کے تین زرّیں اخلاقی اصولوں کی تصویر خوبی سے کھینچی گئی ہے۔ "ریڈیکل کا سچا خواب" ایک حیرت انگیز مضمون ہے جس کے لفظ لفظ سے قومی درد ٹپک رہا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ جو پیغام خواب والے پیر مرد نے ہمارے دوست "ریڈیکل" کو چلتے وقت دیا اسے وہ اپنی قوم کے ان دلوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوں جن میں غیرت کا کچھ اثر باقی ہے۔ نظم کا حصہ افسوس ہے کہ بہت ہی پھیکا ہے۔ ہمارے دوست مسٹر رفیقی جو خود شاعر واقع ہوتے ہیں اگر کوشش کریں تو اس حصے کو دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ آیندہ اس کا لحاظ رکھیں گے۔ اپنی جس غزل کا عنوان انھوں نے غزل فارسی قائم کیا ہے شاید اس کے آخری مصرعوں کا خیال نہیں کیا جو خالص ہندی عربی میں ہیں۔

الاخلاق (آگرہ۔ ایک روپیہ چار آنے سالانہ) ۲۴ صفحات کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس کا مقصد کچھ تو اس کے نام سے ظاہر ہے اور کچھ سرورق کے اس شعر سے جسے حافظ شیرازی سے غلط طور پر منسوب کرنے میں مولوی عبدالحلیم شرر تک نے دھوکہ کھایا ہے۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام　　با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

نومبر کا پرچہ ابتدا سے لے کر انتہا تک چھوٹے چھوٹے ایڈیٹوریل نوٹس سے بھرا ہوا ہے جس سے وہ دلچسپی بالکل باقی نہیں رہی جو تنوع کا حصہ ہے۔ اخبار روزانہ و مباحث جاریہ پر بحث کرنے کے لیے روزانہ و ہفتہ وار پرچے ہی کچھ زیادہ موزوں ہیں۔ جو پرچہ ماہوار ہو اس میں مستقل مضامین کا جز غالب ہونا چاہیئے۔

ملک کے دوسرے علمی پرچوں میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کیے جانے کے لائق

ترقی

(لاہور۔ دو روپے آٹھ آنے سالانہ) ہے جو پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کو جاری ہوئے پانچ سال کی مدت گزر چکی ہے اور اس عرصے میں اردو کی جو خدمت اس نے کی ہے اس کے لحاظ سے کارپردازان رسالہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ اپنی بساط کے موافق اس نے مختلف علوم و فنون کو اردو لباس پہنانے کی کوشش کی ہے۔ جس کی وجہ سے اردو کی علمی اصطلاحات کے ذخیرے میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔ جو کام انجمن ترقی اردو کو کرنا چاہیئے تھا وہ یہ رسالہ انجام دے رہا ہے اور گو زبان کے متعلق اس میں بہت کچھ خامیاں ہیں جن میں اصلاح کی گنجائش ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کا شمار علمی رسالوں کے طبقہ اوّل میں ہے۔ چونکہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اس رسالے کی سرپرستی کی ہے اور ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم نے مدارس کی ابتدائی جماعتوں کے لیے اس کی خریداری منظور کی ہے اس لیے ہم خاص طور سے کارپردازان رسالہ کو اس امر کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ صفائی اور صحت زبان کا لحاظ رکھنے میں زیادہ اہتمام سے کام لیں۔ مثلاً فروری کے نمبر میں پہلی ہی سطر میں لکھا ہے "جو لوگ زمانہ کے نشانوں کے پڑھنے کے عادی ہیں"۔ یہ ایک انگریزی محاورہ کا لفظی ترجمہ ہے۔ ہم انگریزی محاوروں کے اردو میں بذریعہ ترجمہ لائے جانے کے مخالف نہیں لیکن ترجمہ ایسا ہونا چاہیئے جو نامانوس نہ ہو فقرۂ بالا میں معترض کہہ سکتا ہے کہ نشان پڑھے نہیں جاتے ہیں۔ اسی طرح صفحہ ۶۸ پر "سلف ڈینائل" کا ترجمہ "خود انکاری" کیا ہے جو کسی طرح جائز نہیں رکھا جا سکتا۔ ہم ترجمہ کرتے تو "نفس کشی" کرتے یا مثلاً اسی نمبر کے صفحہ ۷۹ پر "سلف کنٹرول" کا ترجمہ "خود ضبطی" کیا گیا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود داری، خود مختاری

وغیرہ ترکیبیں اسی کی مشابہ و مماثل ہیں لیکن نئی ترکیبوں کے گھڑنے میں زبان قیاس کو پورے مجتہدانہ اختیارات کبھی نہیں دیتی۔ "خود ضبطی" کے مقابلے میں "ضبط نفس" زیادہ دل پسند اور گوش آشنا ترکیب تھی۔ بہرحال ہم ان باتوں کا تصفیہ ایڈیٹر صاحب ترقی کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہیں "ترقی" کی طرح۔

خاتون (علی گڑھ۔ تین روپے سالانہ) بھی اپنے مشن کو اچھی طرح پورا کر رہا ہے اور خواتین ہند میں علمی ذوق کی اشاعت کرنے میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ سال میں منجملہ ۹۴ مضامین کے ۴۰ مضامین مستورات کے لکھے ہوئے تھے اور یہ مضامین چڑیا چڑے کی کہانی اور میٹھی چٹنی کے نسخے نہ تھے بلکہ اخلاقی و تمدنی و علمی سبھی طرح کے تھے دسمبر نمبر میں بیگمات کے لکھے ہوئے تین مضامین ہیں جن میں سے ایک قصے کا ترجمہ ہے۔ تینوں بہت اچھے ہیں۔ مردوں کے مضامین میں "رابعہ بصریہ" والا مضمون خوب ہے اور امید ہے کہ طبقہ اناث میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ مولانا اسلم جیراجپوری کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ بجائے اس کے کہ نظم پر اپنا وقت ضائع کر کے خدا کی طرف سے "یقولون مالا یفعلون" کی تنا ڑسن کر اپنی ثقاہت کے دامن پر دھبہ لگائیں مشاہیر خواتین اسلام کے حالات کے موتی خاتون کے ہر نمبر میں بکھیرتے رہیں جو نہ صرف فرقۂ اناث کے گوش علم میں ٹلکنے کے قابل ہیں بلکہ طبقہ ذکور کے جیغہ و دستار خرد میں ٹکنے کے لایق ہیں اور اگر ان کا جذبۂ شاعری دبانے سے کسی طرح دب ہی نہیں سکتا تو ایسی حالت میں ہم مولانا سے عرض کریں گے کہ آپ اپنی نظمیں۔

آفتاب (جھالرا پاٹن۔ دو روپیہ سالانہ) میں چھپوایا کریں جس میں سال گزشتہ حکایات لقمان کا ترجمہ منظوم بہ صنعت بے نکی چھپ چکا ہے اور اب فروری کے نمبر میں ولیم ٹیل کی نظم چھپی ہے۔ ہم اپنے فاضل دوست مولانا سید محمد حسین رضوی سے جہاں یہ شکایت کرتے ہیں کہ جب نظم کے حصے میں وہ نشان دلفریبی پیدا کر سکے نہ شان دلگدازی تو کیوں اس حصے کو اپنے پروگرام ہی سے نہ نکال ڈالا وہاں اس بیش بہا اور جلیل القدر خدمت کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو وہ اردو لٹریچر کے متعلق انجام دے رہے ہیں۔ نثر میں اب تک جو مضامین آفتاب کے ذریعے سے شائع ہوئے ان میں سے اکثر خصوصاً ایڈیٹر کے لکھے ہوئے مضامین اس قابل ہیں کہ کئی کئی بار پڑھے جائیں۔ جس طرح سال گزشتہ کی جلد سید صاحب

Marfat.com

کے علمی ذوق پر شاہد ہے اسی طرح سال رواں کے سلسلۂ جدید کا پہلا نمبر ان کی نفاست طبع کا ثبوت دے رہا ہے جس کے مضامین نہایت اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ خصوصاً مرزا سلطان احمد خاں صاحب کا مضمون "انسان" کے عنوان سے روح کے لیے نہایت عمدہ غذا بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن جس طرح ہندوستان کی قریب قریب بلکہ کل لذیذ غذائیں ثقیل ہوتی ہیں اسی طرح یہ مضمون بلکہ اس سے اوپر کا مضمون بھی دیر ہضم ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ معاونین آفتاب میں سے پچاس آفتاب خوان ایوان نعمت کی فہرست تیار کرتے وقت فلسفے کے گھی میں تیرتے ہوئے پراٹھوں کو سلیس ادب کی پتلی چپاتیوں پر ترجیح دے چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب باوجودیکہ ان کے تین سو معاونین میں سے صرف پچاس نے ان کی متواتر درخواستوں پر استصوابی پوسٹ کارڈوں کے واپس کرنے کی زحمت گوارا کی ابھی تک اس امید میں ہیں کہ وہ اپنے ناظرین کے مذاق صحیح کا اندازہ لگا سکیں گے۔ ہم ان کو بہ ادب مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس سعی لاحاصل میں نہ پڑیں اور اپنے مذاقِ سلیم سے کام لے کر جس قسم کے مضامین مناسب سمجھیں چھاپیں۔ ناظرینِ آفتاب آخر پبلک کا جز ہیں اور پبلک کے تلوّنِ مزاج اور ریاکاری کی یہ کیفیت ہے کہ انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی پبلک کے ہاتھوں اہل الرائے روتے ہی رہے۔ پبلک کے مذاق کی تہہ کو پہنچنا بحیرۂ ہند کے عمق کی پیمائش کرنا ہے۔ جن ۳۴ حضرات نے فلسفے پر مضامین لکھے جانے کی خواہش ظاہر کی ہے وہ اگر ہم پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ نہ کریں تو ہم یہ کہنے کو تیار ہیں کہ انھوں نے محض دو دن کی لی ہے ورنہ اکثر ان میں سے ایسے ہوں گے جو "ہیولیٰ" کو "حیولہ" لکھتے ہوں گے۔

فلسفے کے ذکر میں ہمیں یاد آیا کہ ایسے بڑے اہم اور عظیم الشان مضمون کی ادق مباحث کا ایک سب سے زیادہ چھوٹا اور کم مایہ پرچہ ــــ

نشتر

(لاہور۔ دو روپے آٹھ آنے سالانہ) کے چار صفحوں میں فیصلہ کر دیا گیا ہے۔

ہم نے ایک دوست کو نشتر کا جنوری نمبر دکھایا۔ انھوں نے پڑھا اور چپکے سے رکھ دیا۔ ہم نے پوچھا کیا رائے ہے، کہنے لگے صاحب برہان کی شان میں استاد غالب فرما گئے ہیں۔

"چوں شناسائی حقیقت جوہر لفظ ندارد۔ کتاب چرا می نگارد۔ بوریا می بافت سن می تافت۔ ہیزم می فروخت۔ گلخن می افروخت"

Marfat.com

اس پرچے کے تقریباً سب مضامین اوّل سے آخر تک ناقابلِ التفات ہیں۔ اور تو اور املا اور انشا تک درست نہیں۔ خان بہادر مولوی سید اکبر حسین صاحب کا مشہور و معروف قطعہ جو متعدد مرتبہ اخباری دنیا میں چکر لگا چکا ہے جس شان سے اس پرچے میں چھپا ہے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے　　کہ بیٹا کرلے تو ام۔ اے اگر پاس
بیاہ دوں تجھ سے لیلیٰ کو میں بے شبہ　　بلا خدشہ میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے آمنا ولیکن　　بڑی بی کھائی ہے تم نے کہیں گھاس
کہاں یہ ولولے یہ جوش یہ شوق　　کہاں وہ روز کی کالج کی بکواس

خان بہادر محمد اکبر حسین

جو سلوک نشتر نے خان بہادر کی نظم سے کیا ہے ویسا ہی سلوک ہمارے کرم فرما حکیم خنجر نے اپنے رسالہ ۔

ید بیضا (سکندر آباد ضلع بلند شہر) میں آنریبل نواب عماد الملک بہادر بلگرامی اور شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ جیسے اکابر و مشاہیر قوم کے مضامین کے ساتھ غزلوں کے گلدستے اور میونسپل بورڈ سکندر آباد کی روئیداد کے دوہرے دوہرے دم چھلّے لگا کر کیا ہے اور گلدستے میں بھی مزا یہ ہے کہ جہاں الہ آباد یونیورسٹی کے ایک سر برآوردہ گریجویٹ مولوی محمد عبد الغفار خاں صاحب بی۔ اے الہ آبادی کا کلام ہے اس کے پہلو میں بی حیدری جان صاحبہ شوخ سکندر آبادی کی غزل بھی درج ہے۔ ید بیضا جیسے علمی پرچے کے ساتھ جس میں "ہندوستان کا افلاس" جیسا قابلِ قدر اور بے بہا مضمون اور "جولیس سیزر" جیسا بے ساختہ ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ایسی رپورٹ شائع کرنا جس میں اس انبار خانے کی تعمیر تجویز ہو جس میں چوپا داخل نہ ہو سکے۔ یا لعل جی چمار کے مرنے کی خبر درج ہو یا رکریشن گراؤنڈ والے پل کا سڑک پختہ سے ۴۰ فٹ کے فاصلے پر واقع ہونا بتا کر سکندر آباد کی جغرافی حالت کا انکشاف کیا گیا

Marfat.com

ہو اس سے زیادہ بدنما ہے کہ حریر میں بوریے کا پیوند لگایا جاتا ہے۔

ہندوستان کے افلاس کے اسباب اور اس کے رفع کرنے کی تدابیر کے متعلق مولوی عبدالستار خاں صاحب نے جس خوبی اور قابلیت سے بحث کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ اسی قسم کے مباحث پر اکثر طبع آزمائی فرما کر نہ صرف ید بیضا بلکہ ملک کے دوسرے پرچوں کے ذریعے سے اپنے ہم وطنوں کو اپنے بیش قیمت خیالات سے مستفیض کیا کریں۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ جس ملک میں تمام صنعت و حرفت کے کام بعض جاہل اور کندۂ ناتراش لوگوں کے ہاتھ میں ہوں وہ ملک ترقی اور دولت میں ان ممالک کا کیونکر مقابلہ کر سکتا ہے جن کی صنعت و حرفت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو کامل طور پر تعلیم یافتہ اور مکمل طور پر ماہر فن ہیں۔ ہم مولوی صاحب کے ہم آہنگ ہو کر پیشوایانِ قوم کو توجہ دلاتے ہیں کہ صنعتی کارخانوں کے افتتاح میں کوشش کی جائے۔ قومی صنعت ماہران فن کے ہاتھ میں دی جائے۔ قوم کے دولت مند افراد کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنی دولت فیکٹریوں کے کھولنے اور چلانے میں صرف کریں اور بالاشتراک کام کو چلائیں تاکہ عظیم الشان اسکیل پر کام ہو سکے۔

ید بیضا کے اس نمبر میں "علم" کے عنوان سے خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے جو کئی نمبروں میں ختم ہوگا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمس العلما ممدوح جس قدر پُر گو ہیں نغز گو نہیں۔ اور اس خیال کی تائید میں وہ "علم" والے مضمون کو پیش کریں گے۔ لیکن ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اردو کی جو خدمت کی ہے اور جسے باوجود پیرانہ سری کے وہ برابر انجام دیے چلے جا رہے ہیں وہ اس قابل ہے کہ انھیں اردو زبان کے محسنوں کی صفِ اوّل میں جگہ دی جائے۔ اردو پرچوں میں جس قدر مضامین مولوی ذکاء اللہ صاحب کے شائع ہوتے ہیں کسی اور بزرگ کے شائع نہیں ہوتے۔ ان کی لائف اور ان کے علمی کارناموں پر ایک مجمل ریویو۔

دبدبۂ آصفی (حیدرآباد دکن۔ چار روپیہ سالانہ) کے رمضان نمبر میں شائع کیا گیا ہے۔ حیدرآباد دکن کو دہلی اور لکھنؤ کی حکومتوں کے انتزاع کے بعد ہم ہندوستان میں اسلامی

Marfat.com

جاہ و جلال اور مشرقی علوم و فنون کا مرکز خیال کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس جانفرسا مسابقت اور مقابلے کے زمانے میں جب کہ مسلمان ترقی کی دوڑ میں ہر جگہ دوسری قوموں کے پیچھے رہ جاتے ہیں ہندوستان میں ان کا اگر کوئی آسرا ہے تو یہی ہے۔

لکھنؤ میں علم کی شمع روشن ہوئی اور اودھ کا پایۂ تخت ارباب کمال کو ہندوستان کے ہر گوشے سے اپنی طرف کھینچ لایا اسی طرح لکھنؤ کی شمع کے بجھنے پر حیدرآباد کی محفل آراستہ ہوئی اور دولت آصفیہ کا دارالحکومت ہندوستان کی قدیم اسلامی تمدن کے اجزائے پریشاں کا شیرازہ بند ہوا۔ اردو کی سرپرستی کے لحاظ سے نظام الملک آصف جاہ خلداللہ ملکہ وحشمتہ کی گورنمنٹ ہمارے خاص شکر و امتنان کی مستحق ہے۔ ایسی حالت میں چاہیئے تو یہ تھا اور ہماری دلی تمنا تھی کہ حیدرآباد سے ایک نہیں متعدد علمی اور ادبی رسالے اردو زبان میں شائع ہوتے جو ہندوستان کے دوسرے اردو پرچوں کو راستے بتلانے والے ہوتے لیکن افسوس ہے کہ جیسی توجہ اس طرف ہونی چاہیئے ویسی نہیں کی گئی۔ دبدبۂ آصفی کو جو حسب الحکم وزیر اعظم دکن شائع ہوتا ہے جنھیں اردو زبان سے خاص انس و محبت ہے اردو لٹریچر کے ایسے نمونے ملک کے سامنے پیش کرنے چاہیئے تھے جو عدیم المثال ہوتے۔ فروری کے نمبر میں جس قدر مضمون درج ہیں بلا استثناء پھیکے اور بے مزہ ہیں۔ ایک بھی مضمون ایسا نہیں جو پڑھنے والے کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس پر قیمت چار روپے سالانہ ہے۔ جو پرچے کے حجم اور خصوصاً اردوداں ناظرین کی ہمیشہ خالی رہنے والی جیبوں کے لحاظ سے بہت ہی زیادہ ہے۔ ہماری رائے میں مہتمم صاحب دبدبۂ آصفی کو یا تو پرچے کی قیمت کم کر دینی چاہیئے یا "مخزن" اور "دکن ریویو" کی طرح قسم سوم نکالنی چاہیئے تاکہ کم استطاعت لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن سب سے بڑی کوشش پرچے کی علمی حیثیت کے درست کرنے کی طرف مبذول کرنی چاہیئے۔

حیدرآباد ہی سے ایک اور رسالہ۔

صحیفہ دو روپے آٹھ آنے سالانہ نکلتا ہے جو بہ حیثیت مجموعی نہایت عمدہ ہے۔ اس کے پچھلے دو تین نمبروں میں تاریخی مضمون نہایت قابل قدر نکلے ہیں۔ فروری کے نمبر میں

مولوی احمد مکرم صاحب عباسی کی نادر تحقیق کا دوسرا نمبر شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی دنیا کا اکثر چھٹا بادشاہ یا تو مجبور ہو کر خود بادشاہت سے دست بردار ہوا، یا معزول و قتل کیا گیا اور یا خود سلطنت کا اس پر خاتمہ ہو گیا۔ قابل مضمون نگار نے اپنے دعوے کے کمزور پہلوؤں کو "اکثر" اور "البتہ" کی سپر میں چھپانا چاہا ہے لیکن بعض صورتوں میں تو ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی ہے اور بعض صورتوں میں انھوں نے ایسی تاویلات سے کام لیا ہے جو روایات و درایت کے دقیقہ سنجوں کو متبسم کیے بغیر نہیں رہ سکیں۔ مضمون نگار صاحب کی تحقیق کے متعلق ہمارے چند موٹے موٹے اعتراضات یہ ہیں۔ (۱) سلسلۂ خلافت کے اعتبار سے جناب رسالت مآب پہلے خلیفہ نہیں ہیں جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرات امامیہ کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ہیں۔ اس لیے اہل سنت کے حساب سے حضرت امام حسن علیہ السلام پانچویں اور حضرات امامیہ کے حساب سے دوسرے خلیفہ ہوئے۔ اس حالت میں اُن کا خلافت سے دست بردار ہونا مضمون نگار کے کلیے کی تائید نہیں کرتا بلکہ بسم اللہ غلط کرتا ہے۔ (۲) اموِیہ سلسلے میں عبد الملک بن مروان کو پانچواں اور حضرت عبد اللہ ابن زبیر کو چھٹا مان کر اُن کی شہادت سے اپنے کلیے کی تائید کرنا مضمون نگار صاحب خود لکھتے ہیں کہ "ان (عبد اللہ ابن زبیر) پر خلیفہ عبد الملک نے خروج کیا"۔ تو عبد اللہ بن زبیر ایک مورخ کی نظر میں سلسلہ بہ سلسلہ اور مستقل خلیفہ نہ ہوئے (۳) اسی طرح سلسلۂ عباسیہ کے پہلے چھکّے کے لیے انھوں نے ہارون الرشید کے بعد بجائے مامون کے امین کو جو بالکل خلیفہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا مستقل خلیفہ مان کر اُس کے قتل سے اپنے کلیے کو مضبوط کیا ہے (۴) سلسلۂ عباسیہ میں تاریخ سے ۳۷ خلیفہ ثابت ہیں۔ چھ چھ کے چھ مجموعے بنانے سے ایک بچ رہتا ہے۔ متعصم باللہ کو مضمون نگار صاحب نے آخری اور چھٹے مجموعے کا چھٹا بادشاہ مانا ہے جو صاف بتا رہا ہے کہ کلیے کے پورا کرنے کے لئے ایک کو قصداً حذف کر دیا گیا (۵) شاہان کرمان میں چھٹا نام سلطان مظفر الدین محمد شاہ کا ہے جس کا نہ حکومت سے دست بردار ہونا نہ معزول یا مقتول ہونا ثابت کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی جب یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کے بعد قطب الدین شاہ جہاں برائے نام بادشاہ تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ فرمانروائی چاہے "وہ برائے نام" ہی کیوں نہ ہو چلا تو سہی

Marfat.com

اور ایسی حالت میں جب کہ سلاطین مغلیہ کا سلسلہ ابوظفر محمد بہادر شاہ تک چلا گیا ہے جو" برائے نام" کی تعریف میں بدرجہ اتم آتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بے چارہ قطب الدین شاہ جہان سلسلہٗ فرماں روایان کرمانی میں نہ آئے (۶) یہی اعتراض سلسلۂ شاہان مالوہ کے متعلق ہے جس کا چھٹا بادشاہ ناصر الدین خلجی نہ دست بردار ہوا نہ معزول و مقتول اور جس کے بعد محمود ثانی بادشاہ رہا۔ چاہے وہ زمانۂ بادشاہت میں بقول مضمون نگار صاحب "آنسو ہی پونچھتا رہا" لیکن اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت کا خاتمہ چھٹے پر نہیں ہوا (۷) دہلی کے سلاطین مغلیہ میں" چھکے" کی مناسبت سے شیر شاہ کا داخل کرنا ایسی تاریخی جسارت ہے جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی (۸) علیٰ ہذا القیاس قسطنطنیہ کے سلسلۂ عثمانیہ میں سلطان محمود خان اول کا نادر شاہ سے مغلوب ہونا اور نیز (۹) دوسرے "چھکے" کے آخری بادشاہ سلطان محمود ثانی کا سلطنت کے پرزے ڈھیلے کر دینا نہ دست برداری ہے نہ عزل نہ قتل اور نہ ان پر اختتام سلطنت ہوا۔ لہٰذا ان دونوں کا وجود مضمون نگار صاحب کے کلیے کی بہت بڑی شکست کا باعث ہے (۱۰) خاندان صفویہ کے چھٹے بادشاہ اسماعیل ثانی کی نسبت یہ کہنا کہ اس نے" برائے نام ہی سلطنت کی" اُس کے دست بردار یا معزول یا مقتول ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ (۱۱) سلاطین بہمنیہ میں نظام شاہ کی نسبت جو پہلے" چھکے" کے بعد پانچواں بادشاہ ہے۔ مضمون نگار صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ" نہ معزول ہوا نہ قتل کیا گیا بلکہ اپنی طبعی موت سے مرا اور یہی ایک بادشاہ ہے جس پر بہارا چھ کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے" مگر ہم دکھاتے ہیں کہ اسی طرح اُن کا سلسلہ کئی جگہ ٹوٹتا ہے۔ مثلاً سلسلہ امویہ میں مروان حمار پر حکومت ختم ہوئی جو دو چھکوں کے بعد تیسرا تھا۔ سلاطین اسماعیلیہ میں عاضد الدین اللہ پر حکومت تمام ہوئی جو دو چھکوں کے بعد پہلا تھا۔ اتابکان شام میں فرمانروائی کا سلسلہ معز الدین ارسلان پر ٹوٹا جو پہلے چھکے کے بعد چوتھے بادشاہ اور نیز مصر کے سلاطین الیوبیہ کے پہلے چھکے کے بعد چوتھے پر حکومت ختم ہوئی۔

صحیفہ کے اس پرچے میں مولانا سید اشرف صاحب شمسی کا مضمون کیمیا کے متعلق ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس مبسوط و مشرح مضمون کے بعد جو اسی مبحث پر البیان بابت ماہ شوال میں چھپ چکا تھا کون سی بات رہ گئی تھی جس کے پورا کرنے کے لیے شمسی صاحب نے

یہ مضمون لکھا۔ شمسی صاحب کے مضمون کا ماحصل کئی کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی سمجھ میں آنا مشکل ہے اس واسطے کہ اُن کا طریقۂ استدلال ایسا مبہم اور پیچیدہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں اور کیا ثابت کر رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں بہتر ہے کہ مولوی محمد اکبر علی صاحب اس قسم کے تشنہ اور غیر مفید مضمون چھاپنے کے بجائے اس قسم کے سائنٹیفک مضامین چھاپیں جیسے۔

سائنس و تعلیم (لاہور۔ بارہ آنہ سالانہ) جیسے قابلِ قدر اور نہایت درجہ مفید پرچے میں نکلتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس پرچے کے کل مضامین نہ صرف چھوٹے بچوں بلکہ نوجوانوں کے پڑھنے کے قابل ہیں اور ایسی حالت میں جب کہ اس کی سالانہ قیمت صرف بارہ آنے ہے اور وہ بھی معہ محصول ڈاک ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی قسم کا ایک دوسرا پرچہ۔

رہنمائے تعلیم (لاہور۔ دو روپے سالانہ) ہے جو اگرچہ سائنس و تعلیم کا نہ علمی حیثیت سے اور نہ ارزانی کے لحاظ سے کسی طرح مقابلہ کر سکتا ہے۔ تاہم بچوں کے لیے مفید ہے۔ فروری نمبر میں دو ایک مضمون اچھے ہیں۔ نظموں کے لیے اگرچہ موضوع اچھے تجویز کیے گئے ہیں مگر افسوس کہ دادِ سخن نہیں دی گئی۔ "ماں باپ کی اطاعت" اور "کفایت شعاری" ایسے مضامین تھے کہ چھوٹے بچوں کے لیے سہل سہل الفاظ میں اچھے اچھے خیال لکھے جاتے اور طالب علم انھیں حفظ یاد رکھتے سوالات کا سلسلہ اچھا ہے۔ ہماری رائے میں زیادہ مناسب ہوتا اگر سوالات کے جوابات بھی ساتھ ساتھ درج کر دیئے جاتے۔ "رہنمائے ریاضی" کے عنوان سے جو سوالات حل کیے گئے ہیں ہندسی گورکھ دھندوں کے بجائے وہ طریقہ اختیار کرنا بہتر ہوتا جسے ولایت میں "ہر دلعزیز طریقہ" کہتے ہیں اور جس کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ اہم اور کام کے مسائل بچوں کو نہایت آسان طریقے اور عبارت میں سمجھائے جائیں۔ یہ طریقہ۔

منروا (امرتسر۔ ایک روپیہ آٹھ آنے سالانہ) کے جنوری نمبر کے اُس مضمون میں برتا گیا ہے جس کا عنوان "چاند کا فاصلہ زمین سے" ہے اور جسے رائے دیوان چند صاحب ایم۔ اے

Marfat.com

ڈسٹرکٹ جج ہوشیارپور نے لکھ کر اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ ایک محب قوم وملک کو باوجود اپنے اہم سرکاری فرائض کے ملک کے بچوں کا کس درجہ خیال ہے۔ ہم مولوی غلام قادر صاحب فرخ ایڈیٹر منروا پر رشک کرتے ہیں کہ ان کے قلم سے ایسے نایاب مضامین نکلتے ہیں جیسے "خیالی دربار امیر حبیب اللہ خاں" خیالی مضامین میں عملی پالیٹکس کو سمجھانا حقیقت میں انھیں کا کام ہے۔ تعجب ہے کہ ایسے خوش مذاق ایڈیٹر نے ایسے اونچے درجے کے پرچے میں ادنیٰ درجہ کے حل طلب معموں کا چھپنا کیوں گوارا کیا۔ بالفرض کسی نے اس معمے کا حل لکھ کر بھیجا کہ منروا ہے تو بجز اس کے کہ پرچے کے تفاخر کا ایک پہلو نکلے اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں ہم منروا کے ہم شہر ہندرہ روزہ باتصویر رسالہ۔

دلچسپ (امرتسر۔ دو روپے سالانہ) کی رائے سے متفق ہیں جو اشاعت معمہ جات کو کچھ بہت ضروری نہیں خیال کرتا تاوقتیکہ کوئی خصوصیت یا خاص فائدہ نظر نہ آئے۔ عام طور پر اس قسم کی اشاعت اس کے نزدیک محض بازیچۂ اطفال ہے۔ اس پرچے کا دعویٰ ہے کہ تمام ہندوستان میں ایسا دلچسپ اور اتنا کم قیمت کوئی رسالہ نہیں۔ اس دعوے کی شق آخر کو ہم بلا کسی قسم کی چون وچرا کے تسلیم کرتے ہیں لیکن شق اول کو بلا شرط تسلیم کرنے میں ہمیں تامل ہے۔ اگر ایڈیٹر صاحب رسالہ کا نام "دلچسپ" رکھ دینا اپنے دعویٰ کی دلیل قطعی سمجھتے ہوں تب تو دوسری بات ہے ورنہ ہم ان سے باادب گزارش کریں گے کہ ابھی اس کی دلچسپی کی تکمیل کے لیے انھیں بہت کچھ محنت کرنی پڑے گی اور وہ محنت نہ صرف اس کی ظاہری حیثیت بلکہ اس کے معنوی محاسن کے متعلق ہوگی۔ ۱ فروری کے پرچے میں "زعفران زار" کے عنوان سے جو لطائف درج کیے گئے ہیں وہ پیش پا افتادہ اور عامیانہ ہیں۔ مذاق لطیف "دلچسپ" جیسے پرچے سے اس سے اعلیٰ درجے کی بذلہ سنجی کی توقع رکھتا ہے۔

عالم نسواں میں ڈچس آف لیڈس کا نام ایسا مشہور ہے کہ ان کے حالات کی تجسس ہوتی اور جن پر روشنی ڈالنے سے "دلچسپ" پبلک کی شکرگزاری کا مستحق سمجھا جاتا۔ نہ خود حالات ایسے ہیں کہ صاحبۂ حالات کا نام یاد رکھنے کے قابل ہو۔ مارواڑی عورتوں کا نکاح ثانی نہ کرنا اور

Marfat.com

ان میں طلاق کی رسم کا نہ ہونا اور مردوں کا انھیں مار پیٹ کرنا گو ان سے کچھ بھی خطا ہوئی ہو اور عصمت کو ان کا عنصر خاص قرار دینا ایسی باتیں نہیں ہیں جو مارواڑی عورتوں کی خصوصیات میں سے سمجھی جائیں۔

مارواڑی عورتوں کے حالات کی ذیل میں یہ لکھنا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت تھوڑی قومیں ہیں جن میں پردہ کا رواج ہے اور بہت سی پیشہ ور اور محنت مزدوری کرنے والی قومیں ہیں جن میں پردہ کا مطلق رواج نہیں ہے ایڈیٹر صاحب کی باخبری اور واقفیت تامہ کی دلیل ہے۔ اس لحاظ سے کہ مسلمانوں میں پردے کے رواج کو موقع بے موقع بے حیثیت کرکے دکھایا گیا ہے" دلچسپ" مولوی محب حسین صاحب کی خاص تعظیم کا مستحق ہے۔ "دلچسپ" میں ایک کالم "طبی نکات" کا ہوتا ہے جو اگرچہ مفید ہے لیکن ہماری رائے میں زیادہ مناسب ہو اگر یہ کام ان پرچوں کے لیے چھوڑ دیا جائے جن کا مبحث مطلقاً طب و حکمت ہے اور جن میں توجہ سے دیکھے جانے کے لائق۔

دار الشفاء (الہ آباد۔ ایک روپیہ سالانہ) اور

حکمت (لاہور۔ ایک روپیہ ایک آنہ سالانہ) ہیں۔ ان دونوں میں دار الشفاء تو ایک عرصے سے نکل رہا ہے اور "حکمت" ابھی حال ہی میں نکلا ہے۔ ہم دونوں کی کامیابی کے لیے دعا کرتے ہیں اور ایڈیٹر صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہوتے ہیں۔

دکن ریویو، بمبئی ــــــــــ ملّائے سومالی

ٹائمز بلڈنگ

Marfat.com

مستانی جوگن اور اورنگ زیب

(۱)

ریلوے اسٹیشن جیسا ویرانہ آباد نما مقام رہا ہے وہ لکھنؤ شریف ہی کا ہو! اور پھر اس پر سردی، تنہائی اور بیکاری جیسے ایک چھوڑ تین تین دشمنانِ سکونِ خاطر۔ نتیجہ یہ کہ میں پریشان تھا اور سخت پریشان۔ ویٹنگ روم میں جا کر آرام کرنے اور ریفریشمنٹ روم میں بیٹھ کر ناشتہ کھانے کے لیئے روئے باید و فیشنے شاید۔ لیکن میرے پاس چنٹی ڈاڑھی اور میلی اچکن کی وجہ سے نہ یہ نہ وہ۔ وہیلر کمپنی کی دوکان بند، ہیوٹ اسکول کی دوکان بند، بائیبل سوسائیٹی کی دوکان بند، عجائبات لکھنؤ کی دوکان بند، چار و ناچار رہی آہنی تپائی یا پلیٹ فارم پیمائی۔ کچھ وقت اسٹیشن کی دیواروں کے کالے پیلے تجارتی اشتہاروں کی دیکھ بھال میں گزارا اور کچھ ٹائم ٹیبلوں کی جانچ پڑتال میں۔ لیکن اب بھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ اف وہ یہ کالا پہاڑ کیسے کٹ پائے گا۔

"حضور کچھ کتابیں ملاحظہ فرمایئے گا؟"

اگر میں کتابوں کا کیڑا بھی نہ ہوتا تب بھی اس شخص کے لیے جو ایک سو اسی منٹ کی خلیج ہائل کو دیکھ دیکھ کر بدحواس ہو رہا ہو یہ آواز جس حد تک ایک نغمۂ سکون آور اور نوائے روح پرور کا کام دے سکتی ہے اس کا اندازہ آپ فرما سکتے ہیں۔

"نہایت خوشی سے۔ دکھایئے کیا کیا کتابیں ہیں؟"

(کتابوں کا پشتارہ کھول کر)

"یہ ملاحظہ کیجیے۔ کپتان کی لڑکی، دو جورو کا شوہر، ایک بی بی چار میاں، شیطان کا غلام، لنگڑا ہیرا، لولا صاحب، جنٹلمین بنا کے کیوں میری مٹی خراب کی، بنگالہ کی مینا، الو اور الو کا پٹھا، ٹائیں ٹائیں فش، اڑا اڑا دھم، چوں چوں کا مربا، غنچۂ ناٹک، قانون راگ، کلید ہارمونیم۔"

"معاف کیجیے، یہ کتابیں میرے لائق نہیں۔"

Marfat.com

"اچھا سرکار یہ لیجیے۔ خنجرِ ہجر، تیغِ فراق، لذتِ وصل، تمھیں پر پہلے مرتے تھے تمھیں پر اب بھی مرتے ہیں۔ حسنِ بے پردہ، بمبئی کی ساری، بنارس کا لہنگا، لکھنؤ کا پائجامہ، پیرس کا گون، بتانِ خلخ، لعبتانِ فرنگ، خوبانِ زرد شتی، سبزہ رنگانِ بنگالہ۔"

"معاف کیجیے۔ میں ان کے لائق نہیں۔"

"اچھا حضور۔ یہ رسوا صاحب کے ناول ہیں۔ یہ عاشق صاحب کے ناول ہیں۔ یہ اودھ پنچ صاحب کے ناول ہیں۔ یہ دلگداز صاحب کے ناول ہیں۔"

"یہ سب دیکھے ہوئے ہیں۔"

اگرچہ وقت کا معتدبہ حصہ اس طرح ختم ہوا لیکن مجھے افسوس تھا کہ اس تودۂ مطبوعات، اس انبارِ مصنفات میں ایک کتاب بھی ایسی نہ نکلی جو سودمندی کے لحاظ سے نہ سہی احسان مندی کے اظہار کے لیے ہی خرید لیتا۔ کتب فروش کے مایوس چہرہ نے مجھے بھی متاسف کیا۔

"یہ باقی دو کتابیں کیا ہیں۔ کام کی ہوں تو لاؤ یہی خرید لیں۔"

اس ایک ذرا سے فقرے۔ اس ایک شعاعِ امید نے اس کی آنکھوں، اس کے ہونٹوں بلکہ اس کے دل میں ایک ابتساعی اور ابتہاجی کیفیت پیدا کر دی۔

"حضور یہ 'متانی جوگن' ہے۔ بڑا بانکا ناول ہے اور یہ حیاتِ اورنگ زیب ہے نہایت عمدہ کتاب ہے۔ سویرے سویرے کچھ تو خریدیے۔"

(دل میں) "متانی جوگن۔ اس نام کا حافظے پر ہلکا سا نقش ہے مگر یاد نہیں کہاں سنا یا دیکھا یاد آ گیا۔ جنوری کے 'الناظر' میں اشتہار تھا جسے میں نے نادیدہ چھوڑ دیا تھا۔"

چنانچہ دونوں کتابیں نکلوا کر دیکھیں۔ حیاتِ اورنگ زیب کا مبحث و مضمون تو نام ہی سے ظاہر ہے لیکن یہ دیکھ کر ایک نہایت خوشگوار تعجب ہوا کہ متانی جوگن بھی اس زمانے کا قصہ ہے جب شاہ جہاں کے چاروں بیٹوں نے تختِ ہندوستان کی بازی بد کر چوسر کھیلنی شروع کی تھی۔ مجھے عرصے سے جنون ہے کہ جہاں تک دست رس ہو ہر اس کتاب کو جس میں مرحوم و مظلوم اورنگ زیب اعلی اللہ مقامہ کا موافق یا مخالف خفیف سا بھی تذکرہ ہو ایک نظر دیکھ ضرور لوں۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں کتابیں بے تابی کے ساتھ خرید لیں۔ اب پڑھنے کی جلدی پڑی

اور اب اس ہندوستانی ٹھیکہ کمپنی اس گشتی کتب خانے کا منٹ بھر ٹھہرنا دوبھر ہوگیا چنانچہ بے چارے کو کسی قدر کج خلقی کے ساتھ جس کا مجھے بہت افسوس ہے رخصت کر دیا گیا۔

(۲)

یہ بالکل صحیح ہے چاہے بجا نہ ہو کہ مصنف کی شخصیت کو کتاب کی وقعت کے اندازے میں بڑا دخل ہے۔ مجھے اورنگ زیب کے حالات زندگی کی تلاش وجستجو ہے۔ میری عمر نہیں کہ نظیر آباد ناول ایجنسی یا لاہور بک ڈپو کے ٹکے گز کے ناول پڑھ پڑھ کر زندگی کے سوکھے درخت کو ہرا کروں۔ لہذا مجھے چاہیئے تھا کہ اگر ایک ناول خرید بھی لیا تھا تو خیر مگر ہاتھ پہلے حیات اورنگ زیب ہی کو لگاتا اور جب تک اسے ختم نہ کر چکتا مستانی جوگن کی طرف آنکھ نہ اٹھاتا۔ مگر مجھے خجالت آمیز اعتراف ہے کہ مسٹر رومیش چندر دت کی جلالت قدر نے مجھے مرعوب ومسحور کر دیا اور اجازت نہ دی کہ مادر ہند کے ایسے بلند پایہ فرزند کو زحمت کش انتظار چھوڑ کر کسی غیر مشہور آدمی سے تکلم وتخاطب کروں۔

ابتدائی چند اوراق کا میدان رہرو نگاہ نے نہایت عقیدت مندانہ مرعوبی ومسحوری کے عالم میں طے کیا۔ اصل ناول چونکہ بنگالی حروف ولغت میں تھا اور یہ اس کا ترجمہ ہے! اس لیے زبان کے متعلق جہاں کہیں راستے میں پستی وبلندی اور خس وخاشاک پایا اس کا ذمہ دار مترجم وکاتب کو قرار دے کر آگے بڑھ گیا۔

اب کہیں کہیں خیالات کے چھوٹے ذرے جو باعتبار حقیقت اعتراضات کے اجزائے دیمقراطیسی ہیں راستے میں حائل ہو جاتے ہیں مگر رہرو انھیں منتشر کر دیتا ہے باہم گرمتحد ہو کر متشکل نہیں ہونے دیتا۔

"ہیم لتا چپ تھی۔ اس کے چہرے پر انتہائی درجے کی اداسی برس رہی ہے۔ جھکی ہوئی آنکھوں میں ڈبڈبا آنے والے آنسو اس زمین پر گر رہے تھے جہاں دو حرماں نصیب..... کھڑے ہوتے ہیں"۔

ہیم لتا "پیارے نویندر۔ یہ کیسی باتیں کرتے ہو کیا ہیم کو چھوڑ دوگے کیا تم نے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی..... کیا آپ کا ارادہ بے راہ لے جاکر

عشق کی دشوار گزار گھاٹیوں اور پیچ دار راستوں میں گم کردہ راہ بنا کر چھوڑے گا۔ کیا ہیم کی جان آپ کی جان سے زیادہ عزیز ہے اور اس کا گوشت پوست آپ کا نہیں۔ ہیم کی جان آپ کے ساتھ ہے جہاں جائیں گے سایے کی طرح رہے گی۔ جس راہ کو اختیار کر رہے ہو میرے خیال میں کسی طرح مناسب نہیں

نریندر۔" آہ تمھارا خیال سر سے نہیں جاتا۔ تمھاری یاد دل سے نہیں جاتی طبیعت سنبھلی اور پھر تمھاری موہنی مورت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس کمبخت دل کو لاکھ لاکھ سمجھاتا ہوں مگر یہ تمھارا کچھ ایسا طرفدار ہوگیا ہے کہ میری ایک نہیں سنتا۔ ہائے تمھاری مفارقت وہ نوکیلی سنان ہے جو دل پر لگی اور جگر کو چھیدتی ہوئی پار نکل گئی۔ میں جاتا ہوں جنم بھر کے لیے جاتا ہوں۔ رخصت کر دو۔ زمین کا گز بنوں گا۔ کوہ و صحرا کی خاک چھانوں گا اور تمھاری یادیں سر دُھن دُھن کر عدم کی راہ پکڑوں گا۔ ایشور چاہے تو پرلوک میں ملیں گے۔"

ہیم کا صبر جاتا رہا۔ چیخ اٹھی۔ گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"پیارے نریندر مجھے جیتے جی مارے جاتے ہو۔ ہیم تمھاری ہے۔ تمھارے سوا کوئی اس کا ہاتھ چھو نہیں سکتا" ہیم کے آنسو جاری ہیں۔ سسکیاں بھرتے بھرتے ہچکیاں آنے لگیں۔ نریندر نے ہیم کا ہاتھ نہایت پریم سے سینے پر رکھ کر چھوڑ دیا۔۔۔۔ ہیم ہائے ہائے کر رہی ہے۔ مرضِ عشق کی سودائی ہے کوئی سمجھاتا نہیں۔ سر دُھنتی ہے کوئی سنبھالتا نہیں۔ "پیارے نریندر کہاں جاتے ہو۔ خانہ برباد نریندر ادھر تو دیکھو تمھاری داسی ہیم بلک رہی ہے سمجھاتے نہیں۔"

کیا یہ شعلہ پوش تصویریں ایک بارہ تیرہ برس کی کنواری کنیا اور چودہ پندرہ سال کے ناتجربہ کار لڑکے کی تصویریں اور کیا یہ گرم جوش تقریریں دو ٹھنڈے خون والے بھولے بھالے معصوموں کی تصویریں ہو سکتی ہیں۔ دبستان محبت میں ان بچوں کا پہلا سبق اور اس روانی سے منتہی کتابیں فرفر سنائیں کہ دلی لکھنؤ کے کہنہ مشق واسوخت نویس اور نوحہ نگار شاعر بھی عشش مان جائیں۔ مگر شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ مصنف عالی مرتبت خود بنگالی سوسائٹی

کارکنِ فاعل اور ساتھ ہی اس کے انسانی جذبات و احساسات کا مصوّر کامل ہے۔ جب وہ یقین دلائے تو کیوں نہ باور آئے۔ یقیناً کام روپ دیس میں پریم کا روپ پھولنے سے آگے پھیلتا ہوگا اس خدشے کو دفع کرکے میں نے پڑھنا شروع کیا۔

شاہ شجاع (صوبہ دار بنگال اپنے دارالحکومت ڈھاکہ میں) یارانِ جلسہ کی صحبت میں بیٹھا ہے۔ امراء و روساء افغان مغل فوجی جرنیل بہادر راجپوت مودّب بیٹھے ہوئے ہیں۔

عقیق خاں۔ اڑیسہ کی لڑائی میں نریندر کی بسالت و شجاعت دیکھی تھی۔ اس دربار میں بہت سے زورآور قوی پٹھان اور مغل بہادر ہیں مگر نریندر سے زیادہ جواں مرد اور قوی جوان غلام کی نظروں سے آج تک نہیں گزرا۔"

حضّار مجلس عقیق خاں کی باتوں سے برگشتہ طبیعت ہوگئے۔ ایک کافر کی اس قدر تعریف داخل کفر سمجھا۔ چہرے لال ہوگئے۔ داڑھیوں کے بال دانتوں میں۔

شاہ شجاع۔ (مسکرا کر) "تم نے کافر کی بہت تعریف کی۔"

(نریندر زخمی ہوگیا اور جے سنگھ کے کیمپ میں بغرض علاج رکھا گیا۔ یہاں شہزادی جہاں آرا کی سہیلی زلیخا خدا جانے کیسے آئی اور نریندر پر عاشق ہوگئی۔ مسرور نریندر کو قتل کرنا چاہتا ہے)

زلیخا۔"۔۔۔۔۔ بے قصور کو مارنے سے کیا تم کو خوشی ہوگی۔"

مسرور۔"کس لیے اس کافر کو یہاں لائی ۔۔۔۔۔ زلیخا کیا اس کا یہ قصور نہیں؟"

یہ اور اس قسم کے اور خیالات دیکھ کر میرے پائے عقیدت کو لغزش ہوئی اور مولانا روم کا وصل و فصل والا شعر گنگنا کر آگے پڑھنا شروع کیا۔

اورنگ زیب نے جام زرّیں مئے لالہ فام سے بھر کر پیش کیا۔ مراد بے غل و غش پڑھا گیا۔

اورنگ زیب۔" آج آپ کی خدمت کرکے آپ کو آسودہ کرچکا ہوں۔ آج ہماری مراد برآئے گی۔"

مراد۔" تم سا فرماں بردار برادر نہیں پا سکتا ۔۔۔۔۔"

اورنگ زیب" ۔۔۔۔ پروردگارِ عالم اور حضرت رسولؐ خدا کہیں میری ہوس پوری کردیں

Marfat.com

تو اس زندگی میں فقیری لے کر مکّے چلا جاؤں" (یہ کہہ کر ایک گلاس بھر کر مراد کو دیا)۔

مراد:" اورنگ زیب تم حقیقت میں بڑے ایماندار اور خدا دوست ہو"۔

اورنگ زیب۔" معزز برادر آج تو جاتا ہوں جنگ کے موقع پر ملاقات ہو گی"۔

مراد:" جائیے۔ تمھاری سعادت اور برادرانہ سلوک سے دل از حد مسرور ہے"۔

اورنگ زیب کے مراد کو شراب پلانے کے تاریخی جھل بلکہ گھناؤنے بہتان اور رکیک طوفان سے قطع نظر کر کے کیا ہندوستان کی قدیم وجدید تاریخ کے مصنف و ماہر کو اتنا بھی علم نہیں کہ اورنگ زیب مراد سے ایک برس نہیں دو برس نہیں پورے چھ برس بڑا ہے اور اگر یہ علم ہے تو کیا اتنی بھی خبر نہیں کہ بڑا بھائی چاہے کتنا ہی مکار و عیار اور چھوٹا بھائی کتنا ہی مغرور و سرشار کیوں نہ ہو پھر بھی مسلمان شہزادے تو درکنار مسلمان پڑھے لکھے معمولی درجے کے آدمی بھی بالمشافہ تخاطب میں بڑے بھائی کے لیے" تم سا فرماں بردار" اور" اورنگ زیب تم ایمان دار ہو"۔" تمھاری سعادت سے دل مسرور ہے" اور چھوٹے بھائی کے لیے" آپ کی خدمت" اور" معزز برادر" استعمال نہیں کرتے۔ یہ تصویر صحیح تو نہ اتری پھر آگے بڑھنا شروع کیا۔

پرتاب تو دھن ہے۔ دنیا میں تیری مثال کوئی نہیں۔ تو دیوتا ہے یا انسان۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سیلاب بھارت ورش میں پھیل چکا تھا۔ ماڑواڑ کے بڑے بڑے راجے سر اطاعت خم کر چکے تھے۔ ہندو راجوں کی لڑکیاں شاہی حرم میں داخل ہوتی جاتی ہیں۔ راجہ مان سنگھ کی بہن جودھا بائی محل خانہ شاہی کی زینت بن چکی۔ مہاراجہ مان سنگھ اکبر کے سالے اور شہزادے سلیم کے سسرے تھے۔۔۔۔ اکبر نے اس ممتاز شخص کو مہارانا پرتاب سنگھ کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ اور ریاستوں کی طرح شاہی تعلقات بڑھائے۔ مان سنگھ چاہتا تھا کہ پرتاب سنگھ کے ساتھ صحبت گرم ہو۔ ایک ہی تھالی میں کھانا کھائے۔ لیکن مہارانا پرتاب کی طبیعت گوارا نہ کر سکی کہ ملکشوں کے سالے مان سنگھ سے باہمی خورد و نوش ہو۔۔۔۔۔ واہ رے دھرم کے پکّے پرتاب دھن ہے۔ تو نے چھتریوں کا نام ڈوبنے نہیں دیا۔

خدا کی شان سب سے پرانا ہندوستان زا سولین جو عرصے تک ہندو مسلمان رعایا کا داعی رہا ہو جو ہندی قومیت متحدہ کی ادعائی مجلس کی صدر نشینی کر چکا ہو جو اتحاد و اتفاق کے

Marfat.com

مفاد اور اختلاف و افتراق کے مضار سے کماحقہ واقف ہو ایسی باتیں لکھ لکھ کر مسلمانوں کی منافرت کی خلیج کو اپنے قلم کی نوک سے کھود کھود کر اور چوڑا اور گہرا کرے" در ہند چو او یکے وآں ہم مفسد "۔

جس درجہ مرعوب و مسحور ہو کر کتاب شروع کی تھی مجھے اعتراف ہے کہ اسی درجہ مایوس و منغض ہو کر ختم کی۔ ریویو نگاری یا نقائص شماری منظور نہیں۔ آزاد رائے یہ ہے کہ مصنف نے جس تصویر کو کھینچنا چاہا ہے یہی نہیں کہ وہ ہو بہو کھنچ نہ سکی بلکہ کہیں کھی سے بہنیسا ہو گئی۔ کہیں ہاتھی سے چیونٹی۔ ترتیب و تسلسل مفقود ہے اور توازن و تناسب معدوم تاریخیت کی بو ہے نہ واقفیت کا رنگ، تعصب و تنافر کے کالے کالے دھبوں سے تصویر نہ صرف بیکار بلکہ گھناؤنی اور ڈراونی ہو گئی۔

شاہ جہاں کی دلی میں درک شالیوں کے دود کشوں سے دھواں اوٹھ رہا ہے۔ تاتار کا چار دہ سالہ مسلمان فقیر دھونی رمائے بی لمبی جٹاؤں کا جوڑا باندھے آسن مارے بیٹھا ہے سامنے پیسے پڑے ہیں۔ شاہزادی جہاں آرا کے زنانہ دربار میں نریندر ناتھ جی دندناتے گھس جاتے ہیں۔ جہاں نازنینیں شانِ دلربائی کے ساتھ آمین آمین کہتی ہوئی تخت کے پاس سربسجود کھڑی نظر آتی ہیں۔

دل کسی طرح قبول نہیں کرتا کہ یہ مسٹر رومیش چندر دت کی تصنیف ہے لیکن اگر اس بھیانک اور کاواک تصویر کا کیمرہ حقیقتاً بکینٹھ آشیانی کا دماغ ہی تھا جس میں ہمیں یقین ہے کہ یورپ کے ہزارہا بہتر ناولوں کے عکس پڑ چکے ہوں گے تو اقتصادیات ہند۔ خطوط موسومہ لارڈ کرزن اور تاریخ تمدن ہند کے قدیم فاضل مصنف کی افسانہ نگاری کے کوچے میں واماندگی دیکھ کر دلگداز[۱] کے بڈھے ناولسٹ کی وقعت و عظمت ہماری نظروں میں دو چند بلکہ صد چند بلکہ ہزار چند ہو جاتی ہے کہ وہ غریب نہ سول سروس پاس ہے نہ لندن کی یونیورسٹی کالج میں پروفیسر رہ چکا ہے۔ نہ براعظم یورپ میں سالہا سال توطن و اقامت کر چکا ہے۔ نہ ولایت کے ناموں

---

[۱] یعنی مولانا عبدالحلیم شررؔ اردو کے ناول نگار اور رسالہ "دلگداز" کے مدیر۔ مولف

مدبّروں اور انشا پردازوں سے ہمسرانہ و دوستانہ مراسم رکھتا ہے پھر بھی جو تجویز اس کا دست قلم لکھ جاتا ہے اس پر فوٹوگراف کی بے جان تصویر نہیں بلکہ سینیموٹوگراف کی چلتی پھرتی تصویر کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ جس ملک اور جس زمانے کے جن لوگوں کا نقشہ کھینچ جاتا ہے پڑھنے والا اگر تنقید کی عینک اور تاریخ کی دوربین لگا کر بھی دیکھے تو سچ سچ یہی پائے گا کہ وہ اسی ملک میں چل پھر رہا ہے۔ اسی زمانے میں رہ سہہ رہا ہے۔ انھیں لوگوں سے مل جل رہا ہے۔ وہ ٹھیک انھیں کے خیالات و معتقدات کو سنتا اور انھیں کے تمدن و معاشرت کو دیکھتا ہے۔ شرر کی استادی، قبولیت اور کامیابی کا اصلی راز یہی ہے کہ وہ اپنے ہر فقرے، ہر جملے بلکہ ہر لفظ کو قصّے کے ملک قصّے کے لوگوں اور قصّے کے زمانے کی عین مطابقت اور مناسبت سے ڈھالتا ہے ورنہ طول و عرض ہند میں ایسے ناول نگاروں کی کمی نہیں ہے جن کا جاپانی ہیرو خواجہ حافظ کی زبان مستعار لے کر اظہار تعشّق کرتا ہے اور اپنی لندنی محبوبہ کے پان خوردہ اور مسی مالیدہ لب کے بوسے لے لے کر دماغ کے اشعار میں اپنی خوش نصیبی پر اتراتا ہے۔ اب میں دوسری کتاب شروع کرتا ہوں۔

(۳)

کتاب کے ابتدائی اوراق پڑھتے ہی اسٹینلی لین پول کی ایک چھوٹی سی نیلی جلد والی کتاب کی صورت اسی طرح آنکھوں میں پھر گئی جس طرح کسی جانے پہچانے شخص کی سڑی گلی لاش کو دیکھ کر اس کے زمانہ حیات کی شکل و صورت آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ پہلے سات صفحوں پر اکبر اعظم کی مدح و ثنا میں قصیدہ منثور پڑھا گیا ہے۔ مناقب و فضائل کی خوشبو اس قدر اُڑی ہے کہ مصائب و رزائل کی بدبو دب کر رہ گئی۔ میں خوش ہوں کہ ممدوح ایک مسلمان بادشاہ ہے۔ چاہے وہ مسلمان بادشاہ آذر افروز ہُنوم سوز، مجدرا ساز، ناقوس نواز، راکھی پیرا، قشقہ آرا، درشن نکٹ نما، سنگھاسن سوار، پوجا گزار، تثلیث سرا، بادہ پیما، وحد اللہ شناس رسول شناس، اسلام شناس، شرع شناس، کلمہ مداں، قرآن مداں، ختنہ مداں، نکاح مداں، روزہ مگزار، نمازہ مگزار، حج مگزار، زکوٰۃ مگزار ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کرے مصنف صاحب پر دادا کی نیکیوں کے طفیل میں پوتے کی "برائیوں" کو بخش دیں۔ ہائیں یہ کیا قصہ۔

Marfat.com

"داراشکوہ کے طرزِ عمل، چال چلن اور خیالات سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ وہ استحکام سلطنت کے لیے ہر ضروری بات کو روا رکھتا۔ وہ اکبر کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اگر وہ وارث تاج و تخت ہوتا تو یقین کیا جاتا ہے کہ مغلیہ خاندان کی حکومت کو ہندوستان میں اس قدر جلد زوال کی رونمائی نہ ہوتی جس قدر جلد کہ اورنگ زیب کے ہاتھوں سے تباہی آتی۔ شجاع تیز فہم اور دوراندیش چست و چالاک اور بہادر تھا۔ اسے ہندو سرداروں پر موہنی ڈالنی آتی تھی۔ اس نے مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ کو جو اس زمانے میں سرآمد راجگان ہند کہلاتا تھا اپنا حامی و مددگار بنالیا تھا وہ ایرانیوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لیے اپنے کو شیعہ کہا کرتا تھا لیکن اس کی ذات میں بڑا نقص یہ تھا کہ وہ عیش پرستی کو اپنا شعار سمجھتا تھا۔ وہ زنان خانہ کے اندر جاکر متعدد بیویوں میں رات رات اور دن دن بھر رقص و سرود اور مے نوشی میں گزار دیتا تھا اس لیے کاروبار سلطنت میں اکثر ابتری واقع ہوتی تھی۔"

یہ سارے کے سارے فقرے ذہن میں ایسے تازے ہیں جیسے ابھی پڑھ چکا ہوں مگر آج تو صرف مثانی جوگن ہی پڑھی ہے۔ لاؤ اسی میں دیکھوں، ورق گردانی کرتے کرتے پچیسواں صفحہ یہ لو یہ کیا ہے۔

"داراشکوہ کے طرزِ عمل، چال چلن اور خیالات سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ وہ استحکام سلطنت کے لیے ہر ضروری بات کو روا رکھتا۔ وہ اکبر کے قدم بہ قدم چلتا۔ اگر وہ وارث تاج و تخت ہوتا تو یقیناً مغلیہ خاندان کی سلطنت اس قدر جلد زوال کی رونما نہ ہوتی۔ جس قدر جلد اورنگ زیب کے ہاتھوں سے تباہ ہوئی۔ شجاع تیز فہم اور دور اندیش چست و چالاک اور بہادر تھا۔ اسے ہندو سرداروں پر موہنی ڈالنی آتی تھی۔ اس نے مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ کو جو اس زمانے میں سرآمد راجگان ہند کہلاتا تھا اپنا حامی و مددگار بنالیا تھا۔ لیکن اس کی ذات میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ عیش پرستی کو اپنا شعار سمجھتا تھا وہ زنان خانے میں جاکر متعدد بیویوں میں رات رات دن دن بھر رقص و سرود اور مے نوشی میں گزار دیتا تھا اس لیے کاروبار سلطنت میں اکثر ابتری واقع ہوتی تھی۔"

فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں "قدم بہ قدم چلنا چاہتا تھا" اور دوسرے میں "قدم بہ قدم

چلتا"۔ پہلے میں "یقین کیا جاتا ہے کہ" دوسرے میں "یقیناً"۔ پہلے میں" حکومت کو ہندوستان میں اس قدر زوال کی رونمائی" ہے دوسرے میں "سلطنت اس قدر جلد زوال کی رونما" پہلے میں "تباہی آئی" ہے دوسرے میں" تباہ ہوئی" پہلے میں "وہ ایرانیوں کو۔۔۔ شیعہ کہا کرتا تھا" دوسرے میں یہ فقرہ حذف کر دیا گیا ہے۔ پہلے میں" کے اندر" ہے دوسرے میں "میں" پہلے میں رقص و سرود" ہے دوسرے میں" رقص اور سرود"۔ باقی جوں کا توں۔ الہیٰ یہ توارد ہے یا ۴۲۰۔ لیکن رائے قائم کرنے میں جلدی نہ چاہیئے۔ چنانچہ میں نے ٹھنڈے دل سے کتاب پڑھنی شروع کی۔ جہاں ایسے فقرے ملے جن کا نقش لوح حافظہ پر تازہ تھا ان پر نشان کرتا گیا اور ختم کرنے کے بعد پہلی کتاب سے مقابلہ کیا۔ میری اس تفتیش کا نتیجہ ثبت ذیل ہے۔

حیاتِ اورنگ زیب	مستانی جوگن	حیاتِ اورنگ زیب	مستانی جوگن
ص۱۳ سطر ۷، ۸	ص ۲۵ سطر ۸، ۹	ص۲۲ سطر ۱ تا ۱۲	ص ۶۲ سطر ۲۵ و ص
ص۱۴ سطر ۱۳ تا ۲۵	ص ۶۵ سطر ۹ تا ۱۹		۶۳ سطر ۱ تا ۱۳
ص۱۴ سطر ۷، ۸	ص ۲۵ سطر ۱۹	ص۲۲ سطر ۱۳ تا ۱۹	ص ۵۶ سطر ۷ تا ۱۳
ص۱۴ سطر ۹ تا ۱۵	ص۶۳ سطر ۴ تا ۱۸	ص ۲۳ سطر ۱ تا ۸	ص ۵۶ سطر ۱۳ تا ۲۰
ص۱۴ سطر ۱۹ تا ۲۱	ص ۳۳ سطر ۲۵ و ص ۳۴	ص ۲۳ سطر ۹ تا ۲۵	ص ۶۷ سطر ۱۰ تا ۲۱
	سطر ۱، ۲	ص۲۴ سطر ۱ تا ۴	ص ۶۷ سطر ۲۱ تا ۲۵
ص۱۹ سطر ۱۹ تا ۲۵	ص ۲۹ سطر ۱۲ تا ۱۸	ص۲۴ سطر ۶ تا ۲۵	ص ۱۱۰ سطر ۱۲ تا ۲۰
ص ۲۰ سطر ۲ تا ۸	ص ۲۹ سطر ۱۸ تا ۲۴	ص ۲۵ سطر ۴ تا ۷	ص ۱۱۰ سطر ۲۳ تا ۲۵
ص ۲۰ سطر ۱۹ تا ۲۱	ص ۳۰ سطر ۲ تا ۴		ص ۱۱۱ سطر ۱۔
ص ۲۰ سطر ۲۴، ۲۵	ص ۳۰ سطر ۴ تا ۶	ص ۲۵ سطر ۱۲ تا ۱۴	ص ۱۱۱ سطر ۶، ۷
ص۲۱ سطر ۱ تا ۸	ص ۳۰ سطر ۶ تا ۱۱۲	ص ۲۵ سطر ۱۵ تا ۲۵	ص ۱۱۱ سطر ۱۸ تا ۲۵
ص۲۱ سطر ۹ تا ۲۵	ص ۶۲ سطر ۱۲ تا ۲۵		ص ۱۱۲ سطر ۱، ۲

Marfat.com

حیات اورنگ زیب	مستانی جوگن	حیات اورنگ زیب	مستانی جوگن
ص ۲۶ سطر ۱ تا ۱۷	ص ۱۱۲ سطر ۲ تا ۴	ص ۳۵ سطر ۲۰ و ۲۱	ص ۱۱۳ سطر ۲۰ و ۲۱
ص ۲۶ سطر ۱۸ تا ۲۲	ص ۱۱۲ سطر ۱۹ تا ۲۲	ص ۳۵ سطر ۲۲ تا ۲۵	ص ۱۱۳ سطر ۲۱ تا ۲۴
ص ۲۶ سطر ۲۳ تا ۲۴	ص ۱۱۲ سطر ۲۴	ص ۳۶ سطر ۱ تا ۲	ص ۱۱۳ سطر ۲۴ و ۲۵
ص ۲۷ سطر ۲ تا ۴	ص ۱۱۲ سطر ۲۵ و ص	ص ۳۶ سطر ۴ و ۵	ص ۱۱۳ سطر ۲۵ و ص
	۱۱۳ سطر ۱ و ۲		ص ۱۱۴ سطر ۱ ۔
ص ۲۷ سطر ۸ تا ۱۱	ص ۱۱۳ سطر ۲ تا ۵	ص ۴۲ سطر ۴ تا ۹	ص ۱۱۴ سطر ۲۲ تا ۲۵
ص ۲۷ سطر ۱۲ و ۱۳	ص ۱۱۳ سطر ۵ و ۶		ص ۱۱۵ سطر ۱ ۔
ص ۲۷ سطر ۱۴ تا ۱۵	ص ۱۱۳ سطر ۶ تا ۸	ص ۴۴ سطر ۲۴ و ۲۵	ص ۹۴ سطر ۱۱۳، ۱۴
ص ۲۷ سطر ۲۲ و ۲۳	ص ۱۱۳ سطر ۹ و ۱۰	ص ۴۵ سطر ۱ تا ۶	ص ۹۴ سطر ۱۴ تا ۱۹
ص ۲۷ سطر ۲۴، ۲۵	ص ۱۱۳ سطر ۱۰ و ۱۱	ص ۴۵ سطر ۷ و ۸	ص ۹۶ سطر ۱۹ و ۲۰
ص ۲۸ سطر ۳ تا ۷	ص ۱۱۳ سطر ۱۴ و ۱۵	ص ۴۶ سطر ۱ و ۲	ص ۵۰ سطر ۲، ۴
		ص ۴۷ سطر ۱۳ تا ۱۵	ص ۱۱۵ سطر ۲ تا ۴

غضب خدا کا، ڈیڑھ سو صفحے کی ایک کتاب اور چھہتر کی دوسری دونوں میں چالیس جگہ توارد جن میں اکثر مقامات پر بجز چند لفظی الٹ پھیر کے صفحے کے صفحے نقل مطابق اصل۔ میں نیک نیتی سے مان لیتا کہ تاریخی واقعات دونوں نے ایک ہی کتاب سے لیے ہوں گے۔ لیکن مستانی جوگن تو مسٹر رومیش چندر دت کی اصل بنگالی تصنیف کا اردو ترجمہ ظاہر کیا جاتا ہے اور حیات اورنگ زیب کسی صاحب ساغر الہ آبادی کی مستقل اردو تالیف کی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے اس لیے اگر کسی فارسی یا انگریزی مشترک ماخذ سے تاریخی واقعات لیے بھی گئے ہوں تو ضرور ہے کہ ایک طرف بخط مستقیم بنگالی میں اور دوسری طرف براہ راست اردو میں لیے گئے ہوں اور جب عرصے بعد بنگالی سے اردو میں ترجمہ ہوا تو معنوی یکسانی رہتی

Marfat.com

تو رہتی ایسی لفظی یکسانی کہ وہی اسما، وہی افعال، وہی صفات، وہی ترتیب و تقسیم فقرات، وہی مرکبات اضافی وہی مرکبات توصیفی، وہی اشعار بھی نہیں بلکہ جو غلطیاں لفظی یا معنوی یا تاریخی یا جغرافی ایک میں ہیں وہی دوسری میں جن کی نہایت موٹی موٹی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ "عیش پرستی کو اپنا شعار سمجھتا تھا" (۱۳ح/۴۵م) بجائے "عیش پرستی کو اپنا شعار کرلیا تھا۔ مراد کو خط لکھا جس میں اسے سوات پر قبضہ کرلینے پر مبارک باد دی (۲۱ح/۶۳م)۔ مراد نے اس زمانے میں کبھی سوات پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ "آیا وہ واقعی وعدے کو نباہے گا اس کا بیڑا منجدھار میں غرق کرے گا۔" (۲۲ح/۶۳م) دونوں جملوں کے بیچ میں 'یا' رہ گیا ہے۔" اورنگ زیب نے اپنے وعدے کے موافق آخر ۱۶۵۰ء برہان پور سے مع فوج کے چل دیا" (۲۲ح/۶۳م)۔ اس میں ایک غلطی تو زبان کی ہے اور ایک تاریخ کی۔ پنجاب میں جہاں حیات اورنگ زیب شائع ہوئی ہے ممکن ہے کہ "اورنگ زیب نے مع فوج کے چل دیا" بولتے ہوں مگر اس شہر میں جو زبان کی اہلیت کے متعلق دلّی کا رقیب ہو شاید ہی کوئی کہے کہ "منے صاحب نے مع نوکر کے چل دیا"۔ تاریخی غلطی یہ ہے کہ تمام مورّخ متفق ہیں کہ اورنگ زیب نے ۲۵ جمادی الثانی ۱۰۶۸ھ کو برہان پور سے کوچ کیا ہے۔ مابعد کے مورّخین نے جنھوں نے ہجری عیسوی سنین کا تطابق کیا ہے صاف ۲۵ جمادی الثانی ۱۰۶۸ھ مطابق مارچ ۱۶۵۸ عیسوی لکھا ہے (دیکھو ذکاءاللہ)۔ اس لیے مارچ ۱۶۵۸ء کو آخر ۱۶۵۰ نہیں کہتے۔ یہ صریح غلطی ہے۔" اس نے دارا کی فوج کے سپہ سالاروں کے پاس خفیہ پیغام بھیجے کہ اگر وہ اس کا ساتھ دیں تو دولت و منصب سے مالا مال و نہال کر دیے جائیں گے اور جو لوگ اس پر آمادہ ہو گئے ان کو بیعانہ کے طور پر تھوڑی تھوڑی رقمیں بھجوادی گئیں" (۲۳ح/۵۶م) یہ زر پیشگی بیعانہ نہ تھا۔" فوج کی سرغنائی" بجائے "سرداری" یا سرکردگی۔ "پھر شکوہ شہزادہ محمود پر جا پڑا" (۲۵ح/۱۱۱م) دونوں میں اورنگ زیب کے ایک بیٹے کا نام شاہزادہ محمود دکھایا گیا ہے مگر کوئی تاریخ اورنگ زیب کے کسی بیٹے کا نام محمود نہیں بتاتی۔ "خیال کیا کہ چپکے سے اپنے ہاتھی سے اتر کر اورنگ زیب کے ہاتھی کی زنجیر کاٹ دے (۲۶ح/۱۱۲م) باعتبار واقعہ غلط ہے۔ چپکے سے اتر کر ایسی آسانی سے زنجیریں کچے دھاگے کی طرح کیسے

کاٹ دیتا۔" اس نے آواز نکالی" (۲۶ ح / ۱۱۲م) پنجاب میں تو بولتے ہیں لیکن کیا لکھنؤ بھی پنجاب کا مقلد ہو گیا۔" وزیر آصف خاں کے بیٹے شائستہ خاں اور ممتاز محل کے بھائی نے اس کی طرف داری کا وعدہ کیا" (۲۶ ح / ۱۱۲م) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آصف خاں کا بیٹا شائستہ خاں اور تھا اور ممتاز محل کا بھائی کوئی اور شخص تھا۔ جس کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ طرز ادا کی غلطی ہے۔ آصف خاں کا بیٹا اور ممتاز محل کا بھائی ہی شائستہ خاں تھا۔ ان حالات میں کیسے یقین کر لوں کہ یہ یکسانی اتفاقی ہے۔

حیات اورنگ زیب بجائے خود تاریخ ہے اور متانی جوگن تاریخی قصہ اس لیے کیا یہ مانا جائے کہ مسٹر رومیش چندر دت جیسے تاریخ کے دریائے ذخار کا منبع و مخرج ایک چھوٹا سا ساغر ہے یا یہ سمجھا جائے کہ اورنگ زیب کی سوانح عمری لکھنے میں فرضی قصہ کہانیوں سے کام لیا گیا ہے۔ اصل ناول کا سنہ تصنیف تو معلوم نہیں لیکن ترجمے کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۱۴ء کو سید علی عباس خوش نویس نے آخری صفحہ ختم کیا اور ۱۹۱۴ء ہی میں پہلی بار ترجمہ بنام متانی جوگن شائع ہوا۔ لیکن حیات اورنگ زیب ۱۹۱۲ء ہی میں چھپ چکی تھی۔ اس لیے اس بات کو ماننے کے سوا چارہ نہیں کہ جن چالیس مقامات پر عبارت یکساں ہے۔ وہ اگر لی گئی ہے تو حیات اورنگ زیب ہی سے لی گئی ہے لیکن میں نہیں مان سکتا کہ مسٹر رومیش چندر دت نے انگریزی فارسی مستند تاریخیں چھوڑ کر ایک غیر مشہور مؤلف کی پچھتر صفحے کی کتاب سے مدد لی ہو جس کا کاغذ قابل افسوس جس کی چھپائی قابلِ شکایت۔ جس کی اردو قابلِ اعتراض اور جس کے واقعات قابلِ اشتباہ ہیں اور مدد بھی اس طرح کہ بنگالی زبان کے ناول میں اس کتاب کی اصل اردو عبارت بہ خط بنگالی لکھ دی ہو ورنہ ناممکن ہے کہ بنگالی سے اردو میں ترجمہ کرنے والے نے حیات اورنگ زیب دیکھے بغیر وہی الفاظ لکھے ہوں جو ساغر صاحب کے قلم سے نکلے تھے۔

میری بڈھی عقل کے گھسے ناخن تو اس گتھی کے سلجھانے سے قاصر ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی تیز طبع جوان اس عقدے کو حل کر سکے۔ اب رہی حیات اورنگ زیب اس کے متعلق میں مطلق کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا کیونکہ جس کتاب کی تاریخی صداقت کی یہ کیفیت ہو کہ۔

Marfat.com

۱۔ اُس (یعنی شاہ جہاں) کی وفات کے بعد بھی داراشکوہ اور اورنگ زیب کی تخت نشینی میں جہاں آرا اور روشن آرا نے بڑی مدد کی۔ صفحہ ۱۵۔

۲۔ شاہ جہاں کی وفات ۱۶۵۷ء میں ہوئی۔ صفحہ ۱۸۔

۳۔ شاہ جہاں کی وفات ۱۶۹۶ء میں ہوئی۔ ۷۶ برس کی عمر میں صفحہ ۲۷۔

۴۔ ۱۶۶۶ء میں شاہ جہاں کا انتقال ہوگیا۔ صفحہ ۵۳۔

۵۔ اورنگ زیب نے شروع میں ایک کتاب لکھی جسے فتاوائے عالمگیری کہتے ہیں۔ صفحہ ۱۶۔

۶۔ مسلمانوں نے اورنگ زیب کے حالات ہی قلمبند نہیں کیے ہیں۔ صفحہ ۳۱۔

۷۔ شاہ جہاں نے اپنے باپ جہانگیر کو قتل کرکے تخت و تاج حاصل کیا۔ صفحہ ۳۲۔

۸۔ میر جملہ جو دراصل بہمنی خاندان کی ایک شاخ عادل شاہی میں سے تھا صفحہ ۵۶۔

۹۔ عبدالرزاق لاری اورنگ زیب کی فوج سے مقابل ہوتے ہی مارا گیا۔ صفحہ ۶۵

اُس میں اورنگ زیب کی نسبت عیار، مکار، گندم نما جو فروش، چال باز، بے اعتبار قاتل، چنگیز اور قبلائی خاں، تیمور اور یلدرم اور بونا پارٹ سے بدتر مثیل نیرو و قیصر روما اور اس کے سوا اور جو کچھ بھی لکھنا ہے سب صحیح ہے۔ ایسی کتاب کے متعلق کچھ بھی لکھنا رچاہے وہ اعتراضاً ہی ہو) اس کی شہرت و وقعت کو بڑھانا ہے اور اس گناہ کو میں اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔

الناظر، لکھنؤ ________ ملا مصون العلی

حصۂ پنجم

Marfat.com

Marfat.com

حدیث دیگراں

(۱۸)

حیدر آباد میں ظفر علی خاں اور میر محفوظ علی صاحب ساتھ رہتے تھے اور یک جان دو قالب کے پورے مصداق تھے۔ اگرچہ سید محفوظ علی صاحب مضمون نگاری یا دوسری ادبی خدمات سے ہمیشہ کوسوں دور رہتے تھے لیکن مبداء فیاض نے اُن کے دماغ کو ادب و شاعری کے لیے ایسا موزوں بنایا تھا کہ اگر وہ اس میدان کے مرد بننا چاہتے تو انشا پردازی میں آج اُن کا کوئی مثیل و نظیر نہ ہوتا آپ کی صحبت سے ظفر علی خاں کو جس قدر فیض پہنچا اس کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ ایڈیٹر "زمیندار" کو زبان اردو پر جو قدرت حاصل ہے وہ محض آپ ہی کے طفیل ہے۔ باشندگان پنجاب میں آج ظفر علی خاں کی سی نثر لکھنے والا دوسرا نہیں اور ان کی نظم میں بھی جو صفائی، شستگی اور روانی ہے اس کی مثال نہ ملے گی۔ اور یہ سب اسی بدایونی کی بدولت ہے۔

شاہانِ مغلیہ کے آخری دور میں دہلی کے "بادشاہ گر" سید مشہور تھے۔ ہمارے میر صاحب بادشاہ نہیں تو شاعر اور انشا پرداز بنا دیتے ہیں۔ راقم الحروف کو جو ٹوٹی پھوٹی چند سطریں جوڑنا آتا ہے۔ یہ بھی سب اس سید زادے کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے۔

کتاب الاشعار ظفر الملک علوی

میر محفوظ علی مرحوم کا شمار اردو کے چیدہ اور برگزیدہ انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ مگر ان کا کارنامہ بہ لحاظ مقدار، نہ بہ لحاظ منزلت، زیادہ نمایاں نہیں ہاں ہم کم نویسوں میں بھی وہ اپنے اسلوبِ نگارش کے لئے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ طبعاً عزلت پسند واقع ہوئے تھے۔ اور شاید

اس وجہ سے بھی اہلِ قلم کی حیثیت سے اُن کا کام اس طرح جانا پہچانا نہیں گیا جس طرح اس کا حق تھا۔

مکتوب لاہور بنام مولف ۔۔۔۔ حمید احمد خاں

۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

آگے جو مضمون " افریقہ کا مسافر" آرہا ہے وہ دراصل حمید احمد خاں صاحب کے بھائی مولانا ظفر علی خاں کے نام سیّد محفوظ علی صاحب کا ایک مکتوب ہے جو " دکن ریویو" میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ خط ۱۶ر نومبر ۱۹۰۴ء کو" منگو لیا "جہاز سے ارسال کیا گیا تھا جب سید صاحب ججی کے تقرر پر سومالی لینڈ جا رہے تھے۔ جب وہ اپنی منزل بربرہ پہنچ کر کارِ منصبی میں منہمک تھے تو وہاں ان کے دیرینہ دوست مولانا ظفر علی خاں بھی جا پہنچے۔ ان دونوں نے تجارت کا ایک ابتدائی منصوبہ یہیں بنایا تھا جس کے انجام کی داستان بڑی ترشی اور تلخی کے ساتھ مولانا ظفر الملک علوی نے، سید صاحب کی اطلاع و اجازت کے بغیر، شائع کردی، جس کی مزید تشہیر میں مولوی عبدالحق کے بڑے بھائی شیخ ضیا الحق مدیر "پیشوا" نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ۱۹۱۶ء یا اس کے لگ بھگ مولانا ظفر علی خاں پر دو کتابیں لکھی گئی تھیں جن میں مذکورہ بالا تجارت کا تذکرہ تھا۔ پہلی کتاب کا نام "کتاب الاشرار" ہے اس کے مصنف خود مولانا ظفر الملک تھے۔ دوسری کتاب کا نام " پولٹیکل گرگٹ " تھا جو شیخ ضیا الحق نے تالیف کی تھی۔

بہر حال سید محفوظ علی صاحب کے تعلقات مولانا ظفر علی خاں سے ہمیشہ دوستانہ و برادرانہ رہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ جب مولانا سید صاحب کے ہاں بدایوں آتے تو سیّد صاحب کاغذ، قلم، دوات کا خاص انتظام پہلے سے کراتے تھے۔ کہا کرتے تھے۔ " نہ جانے 'زمیندار' کے مدیر کو کس وقت آمد آجائے" ایسے ہی ایک موقع پر مولانا

ظفر علی خاں سید صاحب کے ہمراہ بدایوں کی جامع مسجد شمسی میں جمعہ کا دوگانہ ادا کرنے گئے۔ اس وقت مولانا عبد الماجد بدایونی کا تو وصال ہو چکا تھا۔ امامت اُن کے چھوٹے بھائی مولانا عبد الحامد قادری کے ذمے تھی۔ مولانا حامد میاں تشریف لائے اور مولانا ظفر علی خاں اور سید محفوظ علی صاحب سے کچھ سرگوشی کی۔ اس کے بعد موذن عنایت اللہ نے اعلان کیا "حضرات، بعد نماز تشریف رکھیں۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب تقریر فرمائیں گے" نماز کے بعد جلسہ کا آغاز مولانا عبد الحامد صاحب نے کیا۔ سید محفوظ علی صاحب کو صدارت سونپی لیکن سید صاحب نے صدارت کے فرائض مکمل خاموشی سے ادا کیے۔ مولانا ظفر علی خاں منبر پر پہنچے تو پہلے انھوں نے اپنی ایک نعت سنائی جس کا پہلا شعر ہے ؎

اے کہ ترا جمال ہے زینت محفل حیات
دونوں جہاں کی نعمتیں ہیں ترے حسن کی زکات

سید محفوظ علی صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "صاحبو، آپ مجھے جو کچھ بھی سمجھتے ہوں یا میں جو کچھ بھی ہوں، وہ سب اِس چھوٹے قد کے سفید داڑھی والے آپ کے ہم وطن کی جوتیوں کا طفیل ہے جو سامنے بیٹھا ہے۔" اس کے بعد تقریر کی۔ مسجد کا بلند اور فراخ گنبد "اللہ اکبر" اور "مولانا ظفر علی خاں زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ آخر میں مولانا نے دعا کی جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا۔ "الٰہی میری عمر کے پانچ سال کم کر کے محفوظ علی کی عمر میں شامل کر دے جو ملت کے لیے خاموشی سے بڑے مفید کام کر رہے ہیں۔"

اسی تاریخ رات میں ہنود نے مولانا ظفر علی خاں کی شان میں جلسہ منعقد کیا۔ مقام بدایوں کا گھنٹہ گھر تھا۔ سامعین میں ہندو مسلمان بڑی تعداد میں موجود تھے مولانا کی تقریر کا موضوع ہندو مسلم اتحاد تھا۔ مولانا کے اعجاز خطابت نے "اللہ اکبر" کے نعرے نہ صرف مسلمانوں سے بلکہ ہندوؤں سے بھی لگوا دیئے۔ اس وقت

Marfat.com

میرے ذہن میں بار بار مولانا کا ایک پرانا شعر گشت لگا رہا تھا ؎

جو مولوی نہ ملے گا تو مالوی ہی سہی
خدا خدا نہ سہی رام رام کریں گے

سیّد محفوظ علی صاحب کا مضمون "افریقہ کا مسافر" ان کے ابتدائی دور کا پرانا مضمون ہے، لیکن طرزِ بیان، زورِ عبارت، محاورہ بندی اور منظر کشی صاف بتا رہے ہیں کہ وہ شروع ہی سے ایک پختہ کار، طبّاع، محنتی اور بلند پایہ ادیب تھے۔

مولف ـــــــــــ

اپنے مضمون "افریقہ کا مسافر" میں اتوار کے روز جہاز میں گرجا کی نماز ہوتی ہے تو یہ اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس مذہبی عبادت میں کتنے لوگ شریک تھے اور وہ کس حیثیت اور نوعیت کے تھے۔ ملاحظہ کیجیے۔ "مردوں میں ایک تو اسّی سے متجاوز پادری تھے اور دوسرے ایک تیمور لنگ فوجی افسر تھے جو ٹانگ میں گولی چھپا کر تبت سے بھاگے تھے اور بہ حصولِ رخصتِ علالت ولایت جا رہے تھے۔ چھت کے اوپر عین نماز کے وقت تاش ہو رہا تھا چونکہ چھت پر سے نماز کا کمرہ صاف نظر آ رہا تھا، لہٰذا ایک بڑے میاں نے جو شریکِ صحبتِ تاش تھے بہ مقتضا اس تعلقِ خاطر کے جو آخر عمر میں مذہب سے ہو جاتا ہے، اتنا کیا کہ کرسی چھت کے کنارے کی طرف رکھ لی تھی کہ تاش کھیلتے کھیلتے جب دنیا کی بے ثباتی کا خیال آ جائے تو مناجات کا بھی ایک آدھ حرف سُن لیں خدا کا شکر ہے کہ مسلمان دلوں پر مذہب کی حکومت ابھی بہت کچھ ہے"۔ اس آخری جملے میں طنز قابلِ دید ہے۔

مضامینِ محفوظ علی ـــــــــــ عبدالحق

افریقہ کا مسافر

از جہاز "منگولیا"۔ ۱۶ ر نومبر ۱۹۰۴ء

ڈیر ظفر[۱]

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آرزو پوری ہوگئی اور ایسی جگہ رہنے کو ملنے والی ہے جہاں حقیقت میں نہ کوئی ہم نشین ہوگا نہ ہم زبان۔ جو شخص اتنا کٹ ھرا اور اکل کھرا ہو۔ جو اپنے اعزا و اقربا، احباب و رفقا سے اس بے مروتی کے ساتھ رسّی تڑا کر بھاگا ہو اور جو دیارِ غریب میں جانے کی آرزو پوری ہونے پر خدا کا شکر کرے۔ اس کی سزا تو یہ تھی کہ اس کی مشایعت کے لیے جانا کیسا کوئی اس کی صورت نہ دیکھتا۔ بات نہ پوچھتا۔ مگر شکر ہے کہ میرے عزیزوں اور دوستوں نے بجائے عدل کے عفو سے کام لیا۔ میرے دوست نہ صرف دو دو اسٹیشن بلکہ دو دو دن کی راہ تک ساتھ آئے۔ کجا بدایوں اور کجا بمبئی۔ مگر شکر ہے کہ یہاں ہار پہنانے، گلدستے دینے، خدا حافظ کہنے اور رومال ہلانے کو بہت سے خدا کے بندے موجود تھے جہاز کا سفر اب اس قدر عام ہوگیا ہے اور دریائی سفر کے حالات اس قدر کثرت سے دیکھنے سننے میں آتے ہیں کہ مجھے اب انھیں پرانی باتوں کو دہراتے ہوئے گھن سی آتی ہے۔ اس کے علاوہ پانچ دن کا سفر کر کے میں کون سا ایسا بڑا سیاح یا سندباد دوراں ہوگیا کہ حالاتِ سفر لکھوں۔ مگر تمھاری ہٹ سے مجبور ہوں۔ لو سنو۔

میں ۹ ر نومبر کو بمبئی پہنچ گیا تھا۔ دو دن صاحب ایجنٹ جنرل بہادر سے ملاقات اور سامان سفر کی درستی میں گزرے۔ ۱۲ ر نومبر ۱۹۰۴ء کو دو بجے دن کے پی اینڈ او کمپنی کے

---

[۱] مولانا ظفر علی خاں۔ مولف

ڈاک کے جہاز "منگولیا" نامی کی معرفت میں نے اپنے آپ کو بحیرۂ عرب کی موجوں کے حوالے کیا۔

" منگولیا" منجملہ ان چار بڑے بڑے جہازوں کے ہے جو بلیفاسٹ کے بڑھئیوں کی صنعت جہاز سازی کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اسی سال پی اینڈ او کمپنی کی طرف سے سمندر کی سینہ شگافی کے لیے مامور ہوا ہے۔ اس جہاز کی طاقت بارہ ہزار گھوڑوں کی ہے اور ساڑھے نو ہزار ٹن (من نہیں ٹن) بوجھ لے جاسکتا ہے۔

میں نے اپنا سب سامان صبح سویرے ہی پٹھانؔ[۱] کے ہاتھ بندر پر بھیج دیا تھا۔ ۱۲ بجے خود بیلرڈ پیر (BALLARD PIER) پہنچا۔ جسٹس بدرالدین طیّب جی کے خاندان کے ایک صاحبزادے بغرض تکمیل تعلیم قانونی انگلستان جارہے تھے ان سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹری معائنہ ہوا اور سب مسافر (جن میں میرے اور مسٹر طیب جی کے علاوہ انگریز ہی انگریز تھے) ایک اسٹیم لانچ (دخانی چھوٹی کشتی) میں ٹھونس کر جہاز کی طرف بلٹی کر دیے گئے۔ جہاز کنارے سے ایک میل کے فاصلے پر کھڑا ہوا ہمیں پکار رہا تھا۔ دس منٹ میں ہم جہاز تک پہنچ گئے۔ سیڑھی لگائی گئی۔ ہم کھٹ کھٹ اوپر چڑھ گئے۔ اوپر کی سیڑھی کے برابر اسٹیوارڈ (یعنی کمروں کے خدمت گار) جو سب کے سب ولایت زاد تھے پرا جمائے کھڑے تھے۔ میں نے ایک سے کہا کہ مجھے کمرہ نمبر ۲۰۴ میں لے چلو۔ وہ ایک دوسرے کو بلا لایا اور کہا کہ آپ کے کمرے کا خدمت گار یہ ہے۔ چنانچہ وہ مجھے کمرے تک لایا۔ آکر دیکھتا ہوں تو سب سامان قرینے قاعدے سے لگا ہوا ہے۔ جہازی چارپائی پر نہایت صاف ستھرا بچھونا بچھا ہوا ہے۔ تکیے لگے ہیں، سرہانے کی طرف ایک الماری سی ہے جس کے اوپر کے خانے کے تختے میں منہ دیکھنے کا آئینہ لگا ہے تختہ کھولو تو اندر ایک بلوّریں صراحی ہے جس میں ٹھنڈا برف سا پانی بھرا ہوا ہے اور دو خالی گلاس رکھے ہیں۔ نیچے چار خانے ہیں۔ جن میں کنگھا، برش، منجن کی ڈبیہ اور دانتوں کا

---

[۱] سید محفوظ علی صاحب کے ملازم محمد زمان خان سے مراد ہے۔ مولف۔

Marfat.com

برش رکھنے کے لیے جگہ ہے۔ اس کے نیچے میں ایک اور تختہ ہے جس میں بٹن لگا ہے۔ اس کے دباتے ہی تختہ نیچے آجاتا ہے اور اچھی خاصی ایک میز بن جاتی ہے۔ جس میں منہ ہاتھ دھونے کے لیے چینی کا ایک ظرف جڑا ہوا ہے۔ صابن اسفنج کے لیے جگہ بنی ہوئی ہے۔ پاس تولیہ رکھا ہے۔ ظرف کے کنارے پر ایک ٹونٹی لگی ہوئی ہے۔ پیچ گھماتے ہی ٹونٹی میں سے پانی نکلتا ہے۔ بالفاظ دیگر تختے کا بٹن دباتے ہی سیلابچی، آفتابہ، صابن، تولیہ سب کچھ موجود ہو جاتا ہے۔ سرکار کو صرف منہ ہاتھ دھو کر تولیہ سے پونچھنے کی تکلیف کرنی پڑتی ہے۔ انگریزوں کی عقل کی ترقی روز بروز اسی طرح رہی تو بہت جلد یہ تکلیف بھی نہ کرنی پڑے گی اور محض خیال دل میں آیا کہ سب کام ہو گیا۔ اس کے بعد خیال کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔

یہاں کی باتیں دیکھ دیکھ کر جادو کے قصے یاد آتے ہیں۔ الہ دین نے ذرا چراغ رگڑا اور جن موجود۔ انگوٹھی کو ایک خفیف سا گھسا دیا اور موکل حاضر۔ اسی طرح کمرے میں کال بیل لگا ہوا ہے۔ لیٹے ہی لیٹے اس کا بٹن دبا دیجیے۔ ابھی بٹن پر سے انگلی نہ ہٹی تھی کہ دروازہ کھلا اور خادم (خادم بھی خاص لندنی اور مجھ سے کروڑ درجے گورا چٹا۔ وجیہہ و شکیل) ہاتھ باندھے کھڑا ہے کہ سرکار نے کیوں یاد فرمایا۔ ایک اور بٹن ہے۔ ایک دفعہ دبا کر گھماؤ داہنی طرف کا برقی لیمپ چشم زدن میں روشن ہو جائے۔ دوسری دفعہ گھماؤ بائیں جانب کا لیمپ جلنے لگے۔ تیسری دفعہ گھماؤ دونوں لیمپ خاموش ہو جائیں۔ پھر گھماؤ داہنے طرف کا روشن ہو جائے۔

کمرے کے قریب ہی غسل خانہ وصحت خانہ ہے۔ سنگ مرمر کا ایک نہایت ہی عمدہ حوض رکھا ہوا ہے جس میں آدمی اچھی طرح لیٹ سکے۔ گرم ٹھنڈے سمندری میٹھے پانی کے ٹیپ لگے ہوئے ہیں جس پانی سے نہانے کو جی چاہے پیچ گھماؤ۔ چاہے حوض میں بھر لو اور غوطے لگاؤ چاہو تھوڑا تھوڑا بدن پر بہاؤ۔ اگر چاہو کہ سر پر پانی کی تڑتڑ پڑے تو ٹونٹی لگی ہوئی ہے۔ پیچ گھمانے کی دیر ہے اس میں بھی تفریق ہے، مہین پھوہار، پتلی دھار، موٹی دھار، زور کی تڑتڑ۔ اس سے بھی زیادہ زور کی اور اس کے بعد ایسی کہ کھوپڑی بھنّا جائے اور اونچے پرنالے کے نیچے نہانے کا مزہ آجائے۔ پھوہار یا دھار یا تڑتڑ یا پرنالے کو چاہو سر پر ڈالو چاہو گلے پر، سینے پر، پسلیوں پر، ٹانگوں پہ۔ غرض کہ پیچ کو جدھر اور جس زاویے پر چاہو گھما دو۔ صابن، اسفنج، تولیہ سب کچھ قرینے سے

Marfat.com

رکھا ہوا ہے۔ رفع حاجت کے لیے سچّی چینی کے ظروف علیحدہ علیحدہ نصب ہیں اور ان میں ادویہ دافع تعفن پڑی ہوئی ہیں۔ ایک بٹن دبا دو غلیظ خود بخود سمندر کی تہہ میں چلا جائے اور پانی کی ایسی زبردست تڑیڑ پڑے کہ قدمچہ خود بخود صاف ہو جائے۔ جہاز کی ہر چیز کو دیکھ کر یہی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ عمر رواں' آب رواں' پر ہی بسر کیجیے۔ مگر ان جادوگروں نے خشکی میں بھی تو یہی ناؤ چلائی ہے۔

ہنوز جہاز بندرگاہ ہی میں تھا کہ گھنٹی بجی۔ معلوم ہوا کہ میز تیار ہے (یعنی کھانا میز پر موجود ہے) کالج کی طرح یہاں بھی گھنٹیوں کی بھرمار ہے۔ گھنٹی سنتے ہی آؤ۔ جتنا چاہو کھاؤ اور چپکے سے چلے جاؤ۔ نہ آؤ گے اپنا ہی نقصان کرو گے۔ کسی کے لڑکے کی شادی تھوڑی ہے کہ مناتا پھرے۔

یہ امر مسلّم ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں اس وقت سب سے زیادہ اکال انگریزوں کی قوم ہے۔ سارا دن بکری کی طرح منہ چلتا ہی رہتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان کے جبڑے دُکھ نہیں جاتے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ یہ اُن لوگوں میں نہیں جن پر " کھانے میں شیر کمانے میں بھیڑ" کی مثل صادق آتی ہو۔ جس طرح ڈٹ کر کھاتے ہیں اُسی طرح ڈٹ کر کام بھی کرتے ہیں۔ جہاز پر کھانے کا حال سنیئے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی دیکھا کہ چارپائی کے پاس تپائی پر ایک پیالہ چائے کا دو توس مکھن لگے ہوئے اور کچھ پھل رکھے ہوتے ہیں۔ اگر زیادہ نفاست کی طرف میلان طبع ہو تو کلّی کر لو ورنہ اس قدر پانی بھی کیوں خرچ کرو۔ آخر ذرا دیر میں غسل تو کرنا ہی ہے۔ چائے پینے کے بعد اوپر کے ڈک پہ جاؤ، ورزش کرو، بھاگو، دوڑو، ناچو، کودو، جو چاہو کرو، آ کر غسل کرو، کپڑے بدلو، ساڑھے آٹھ بجے گھنٹی بجی، ناشتہ کے لیے ڈائننگ روم (DINING ROOM) میں آتے۔ خوب پیٹ بھر کر ناشتہ کیا ناشتہ بھی کھچڑی اور املی کی چٹنی کا نہیں۔ بلکہ بلا مبالغہ آٹھ دس چیزیں، ڈیڑھ بجے دوپہر کا کھانا تیار ہوا۔ اس کے بعد چار بجے پھر چائے ملی۔ ساڑھے چھ بجے شام کا کھانا کھایا۔ دس بجے سونے سے پہلے کچھ میوہ کھایا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اتنا کھانے پر بھی معدہ آہستہ آہستہ نہیں بڑے زور سے ہل من مزید ہل من مزید پکارتا ہے۔ سمندر کی ہوا میں امل بید کے چورن کی تاثیر ہے۔ ادھر کھایا ادھر ہضم،

یہاں انسان اس دعا کے مانگنے سے مستغنی ہوجاتا ہے کہ ؎

الٰہی نہ رنجد ز من معدہ من
دگر ہر چہ رنجد بر نجیدہ باشد

میں اپنے پہلے وقت کے کھانے کا حال بیان کرتا ہوں۔ یہ ظاہر کرنا کہ میں نے اپنی اس غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ بجائے اس کے کہ میری تاریک خیالی کا یقین دلائے جو ایک حد تک قابلِ معافی ہے ممکن ہے کہ مجھے اس سے زیادہ سنگین جرم کا مجرم بنائے۔ مگر حاشا کہ مجھے در پردہ اظہارِ تقدس منظور نہیں۔ میں خود اپنی احتیاط کو مراق کی حد تک پہنچا ہوا سمجھتا ہوں۔ مگر چونکہ ایک مزے کی بات ہے اس لیے اس کا سنانا خالی از لطف نہ ہوگا۔

میں نے ہیڈ اسٹیوارڈ کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مجھے ہر قسم کا گوشت نقصان کرتا ہے۔ اس لیے میں صرف ترکاری اور انڈے ہی کھانا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ جو نوکر ہے اسے بھی چاول ترکاری اور انڈے ہی دیے جائیں۔ اسٹیوارڈ سرِ تسلیم خم کر کے چلا گیا کھانے سے فارغ ہو کر میں کمرے میں آیا تو دیکھا کہ پٹھان بھی کھانا لے آیا ہے اور کھانے کے لیے ہاتھ دھو رہا ہے۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا اور پٹھان نے کھانے کے لیے رکابی کا سرپوش اٹھایا اور روٹی کا لقمہ توڑا۔ معاً میری آنکھ رکابی پر پڑی دیکھتا ہوں کہ آلو ہیں۔ گوبھی ہے، انڈے ہیں اور ان کے برابر ہی کوئی ڈیڑھ چھٹانک بحت بکین صاحب (لحم الخنزیر) بھی تشریف رکھتے ہیں۔ مجھے زمانۂ ملازمت خیرپور میں بہ مواقع تشریف آوری گورنر صاحب بمبئی ان سے دور کی روشناسی کا امتیاز حاصل ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی پہچان گیا۔ تم میرا بارہا امتحان کر چکے ہو کہ جسے ایک دفعہ دیکھ لیتا ہوں ہمیشہ ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں۔ پٹھان نے رکابی میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ میں چارپائی سے کودا اور بجلی کی سی سرعت

Marfat.com

کے ساتھ ایک ہاتھ اس کی کلائی پر اور دوسرا رکابی پر تھا۔ رکابی اٹھا کر میں سیدھا باورچی خانے میں گیا اور اسٹوارڈ سے پوچھا یہ کیا ہے۔ وہ ہندوستان میں رہ چکا تھا اور جانتا تھا کہ مسلمان یہ چیز نہیں کھاتے چنانچہ دیکھتے ہی آگ ہوگیا اور اپنے ماتحتین سے کہنے لگا کہ یہ کھانا کس نے دیا ایک انگریز باورچی نے کہا کہ میں نے دیا اس پر بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ میں ابھی تم سب سے کہہ گیا تھا کہ ان صاحب کے نوکر کو محض ترکاری دینا۔ اس کے بعد آپ کے اس عاجز کی اس قدر دھاک بندھ گئی کہ ہر روز پوچھا جاتا تھا کہ اگر کوئی خاص چیز پکوانا منظور ہو تو ارشاد فرمایئے۔ مگر یہاں جب فرمائش ہوتی تو بھاجی کی، ترکاری کی، دال کی مٹر کی، پھلیوں کی، نارنگیوں کی، کیلوں کی، بادام کی، انجیر کی، ایک روز شامت جو آئی مینو (MENU) میں آئس کریم دیکھ کر فرمائش کی کہ "بہت سی آئس کریم لاؤ" کیونکہ بظاہر اس میں کوئی خرابی نظر نہ آئی، چونکہ اس روز اور چیزیں میرے کھانے کے لائق نہ تھیں لہذا سارا زور آئس کریم پر رکھا اور خوب پیٹ بھر کے کھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ دماغ چکرانے لگا۔ ہیڈ اسٹیوارٹ تو نہ ملا اس کے اسسٹنٹ سے پوچھا کہ آئس کریم میں کوئی منشی چیز تو نہیں ڈالتے ہو۔ کہنے لگا اور تو کچھ نہیں ذائقہ درست کرنے کے لیے تھوڑی سی شراب ڈالتے ہیں۔ یہ سن کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا اور چپ ہو کر بیٹھ رہا کہ خود ہی مانگ کر کھائی تھی سچ ہے ؎

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل پارسائی کا

کھانا کھانے کے بعد ہم جہاز کے سب سے اوپر کے حصے یعنی ڈیک پر تماشہ دیکھنے گئے۔ بمبئی چھوڑنے کے بعد جہاز کنارے کنارے نہیں چلتا بلکہ بسم اللہ کر کے بیچ سمندر میں منہ اٹھا کر چل دیتا ہے اس لیے نہ کہیں زمین نظر آتی ہے نہ پہاڑ، جدھر دیکھو پانی ہی پانی ہے سمندر کی یہ کیفیت کہ بالکل ساکت و صامت، تموج کا کہیں نام نہیں۔ سمندر کا ہے کو ہے گچ چونے کا پختہ فرش ہے۔ جس پر لاجوردی رنگ بھرا ہوا ہے۔ نیلا سمندر نیلا آسمان جیسی شعلہ کی ویسا ہی سائبان، جہاز کے پچھلے حصے پر کھڑے ہو کر دیکھو تو ایک سڑک سی معلوم ہوتی

Marfat.com

ہے۔ یہ جھاگ ہیں جو جہاز کے نقشِ قدم کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ سہ پہر کو دو ایک جگہ ابر کے سپید ٹکڑے نظر آئے جنھیں دیکھ کر مجھے اپنے سال گزشتہ کے دورے کا خیمہ یاد آ گیا۔ جس کا نیلا استر اسحاق کی شرارت سے جل گیا تھا اور جس میں ٹنڈیل نے سپید لنکلاٹ کا پیوند لگا دیا تھا۔

سنا ہے کہ آٹھ مہینے سمندر کے سکوت کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ بالفاظ دیگر آٹھ مہینے یہاں نیپچونؑ علیہ ما علیہ سوتے ہیں اور بلی تانے سوتے ہیں کہ ان کے کلیجے پر مونگ موٹھ دلو، آرے چلاؤ ممکن کیا کہ کان پر جوں رینگ جائے۔ جون کا مہینہ آیا اور انھوں نے کروٹ لی اور آنکھ کھولتے ہی عصائے پیری ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ دوست دشمن سب کو ایک لکڑی سے ہانکنے لگے مگر یہ انگریز بچے نیپچون صاحب کے بھی کان کترتے ہیں۔ چاہے بڑے میاں کتنا ہی بڑبڑائیں اور کتنے ہی گدے رسید کریں یہ اپنا بیڑا پار لگھائے جاتے ہیں۔

خدا جانے ہم ہندوستانی لوگ باہر جانے سے عموماً اور سمندر کے سفر سے خصوصاً کیوں اس قدر گھبراتے ہیں۔ جن اعزا اور احباب کو میرے سفر کی اطلاع ہوئی ان میں بہت ہی کم ایسے تھے جنھوں نے میرے ارادے کو بہ نظر استحسان دیکھا ہو ورنہ عام طور پر سبھی نے ڈرایا کہ سمندر کا سفر اور ایک نہ دو آٹھ دس روز کا سفر۔ کیا تمھیں اپنی جان دو بھر ہے۔ بھیا ہم تمھارے بھلے کی کہتے ہیں۔ تمھارے والد نے (خدا انھیں زندہ و تندرست رکھے) بڑھاپے میں تکلیفیں اٹھا کر محنتیں کر کے تمھارے لیے اتنا کر دیا ہے کہ مزے سے دال روٹی ملی چلی جائے خدا کے لیے گوشت پلاؤ کے لیے زندگی کو خطرے میں نہ ڈالو ؎

بدریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت بر کنار است

میں اس قابل قدر نصیحت کو سعادت مندانہ ادب کے ساتھ سنتا تھا اور ہر ہر لفظ

ؑ NEPTUNE ۔ یونانی علم الاصنام میں سمندر کے دیوتا کا نام ہے۔ مولف

Marfat.com

کو ناصح کی دلی محبت کا مقیاس سمجھتا تھا۔ چاہے یہ محبت کاہلی، تنگ خیالی، تن آسانی ہی کیوں نہ سکھاتی ہو اور چاہے اس سے یہی کیوں نہ مترشح ہوتا ہو کہ ہم ہٹے کٹے تندرست پڑھے لکھے نوجوانوں کی نسبت یہاں تک حسن ظن ہے کہ ہم سے دنیا کمانے کا کام خاک نہیں ہوسکتا لہذا ہمیں چاہیے کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر اپنے باپ دادا کے اندوختے پر تکیہ کیے بیٹھے رہیں اور آہستہ آہستہ یا جلدی جلدی کل جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کو اپنے معدے کی طرف منتقل کر کے خود مجسّم صبر و قناعت ہو جائیں۔

یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ایک اقبال مند قوم کے لچھن اور ہی ہوتے ہیں اُن کی ترقی کے لیے سمندر اور پہاڑ ایک سے ہیں۔ میں لکھ چکا ہوں کہ اس جہاز کے مسافروں میں صرف ہم دو دیسی ہیں۔ مزید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ صرف ہم دو مسلمان ہیں کیونکہ ہمارے ساتھیوں میں دو پارسی جنٹل مین اور ایک نیم بلکہ چہارم ہندوستانی لیڈی ہے یعنی ڈبلیو، سی بنرجی کی لڑکی۔ مسافروں کی کل تعداد ۸۰ ہے جس میں ۲۷ مرد (۲۳ انگریز، دو مسلمان، دو پارسی) ۳۸ عورتیں (۳۷ انگریزنیں اور ایک بنگالن یعنی وہی مس بنرجی) اور ۱۵ بچے ہیں۔ اس تعداد سے خود اندازہ کر لینا چاہیئے کہ انگریز سمندر کے سفر سے کس قدر ڈرتے ہیں کہ چھ مہینے کے شیر خوار سے لے کر دس برس کے بچوں اور ضعیف البنیان عورتوں کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیا ہے۔ مسافروں میں زیادہ تعداد ایسی عورتوں کی ہے جو تن تنہا سفر کر رہی ہیں یعنی ان کے ساتھ خاوند نہیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے جہاز کے اونچے سے اونچے مقام پر پھدکتے پھرتے ہیں۔ ہندوستانی ماں تو ماں بجائے خود ڈاڑھی والے باپ کا کلیجہ دھل جاتے کہ ہے ہے بچہ سمندر میں نہ گر جائے! مگر یہ گٹ بھری انگریزی مائیں ہیں کہ کھڑی مسکرا رہی ہیں اور بچہ جہاز کے کنارے کی رسی میں ٹنک ٹنک کر پینگ بڑھا رہا ہے

راہ کی بے خطری کے ساتھ راہبر اس قدر واقف کار اور اپنے فن میں ہوشیار ہیں کہ جہاز کو بالکل اسی طرح لیے جا رہے ہیں جس طرح عرب یا ترکمان اپنے گھوڑے یا اونٹ کو۔ آدھی رات کو سمندر کے بیچوں بیچ جہاں نہ سنگ فرسنگ ہے نہ پیلپایۂ میل وہ آنکھ میچ کر بتا سکتے ہیں کہ ہم کس مقام پر ہیں اور یہاں سے فلاں مقام کتنی دور ہے۔ میں نے

Marfat.com

کپتان کے مددگار سے پوچھا "کیا آپ مہربانی فرما کر بتا سکتے ہیں کہ ہم بمبئی سے تقریباً کتنی دور نکل آئے ہیں؟ کہنے لگا "تقریباً کی بھی ایک ہی کہی ہم گزوں تک کا بھی حساب بتا سکتے ہیں"۔ یہ کہہ کر مجھے اپنے کمرہ میں لے گیا اور ایک نقشہ دکھایا جس میں جہاز کا راستہ اور روزانہ طے کردہ مسافت درج تھی۔

ہمارے ہم سفروں میں سب سے زیادہ ممتاز تبت کے مہاتما کرنل ینگ ہسبنڈ ہیں جو معہ اپنی بوڑھی بی بی کے تبت مشن کی کامیابی کے اعزاز و افتخار کے ہار پہنے ولایت جاتے ہیں۔ دیکھ لینا ان پر خطابات و اعزازات کی بارش اسی طرح ہو گی جس طرح انھوں نے گیانشی میں پرانی خانقاہ پر گولہ باری کی تھی۔

خبر ہے کہ جہاز "منگولیا" کو آگے چل کر بحر احمر میں بالٹک فلیٹ ملے گا۔ ایک صاحب ناچتے پھرتے تھے کہ ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ بالٹک فلیٹ دیکھ سکیں گے مگر ایسے دقیانوسی بیڑے کی زیارت محض اس کی قدامت کی وجہ سے شاید خوش قسمتی سمجھی جائے تو ہو سکتی ہے ورنہ اس کی حالت تو یہ ہے کہ دو کشتیاں تو ابتدائے سفر ہی میں خراب ہو گئیں۔ آگے چل کر خدا جانے کتنی بتاشے کی طرح گھل جائیں گی۔ سنا ہے کہ بالٹک فلیٹ میں کچھ جہاز کچی مٹی کے بنے ہوئے ہیں جو روسی صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور کچھ کاغذ کی ناویں ہیں جو روس نے جاپان کو یہ دکھلانے کے لیے بنائی ہیں کہ "تم کاغذ کی بہت سی چیزیں بنا سکتے ہو، ہم بھی تمہارے مقابلے کے لیے کاغذ ہی کی ناؤ لے کر آئے ہیں"۔ بلکہ میں نے یہاں تک سنا ہے (راست و دروغ برگردنِ راوی) کہ اس بیڑے میں وہ کشتی بھی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے نے باپ کی دیکھا دیکھی طوفان سے بچنے کے لیے بنائی تھی اور جو کوہ ارارٹ کی سیاحت کے وقت پیٹر دی گریٹ کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس فلیٹ کے امیر البحر کی بہادری تو ملاحظہ فرمائی ہی ہو گی کہ انھوں نے کیسی چوبے پر تلوار چلائی۔ بڑے اکڑتے بررتے آ رہے تھے کہ انگلستان کے شمال میں دور سے کچھ کشتیاں نظر آئیں۔ بوکھلاہٹ کا خدا بھلا کرے، سمجھے کہ جاپانی آ گئے۔ پھر کیا تھا مارے توپوں کے چیتھڑے بکھیر دیئے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ غریب ماہی گیروں کے کھوسے تھے۔

خوش قسمتی سے ہمارے جہاز پر سوار ہونے کے دوسرے ہی دن یعنی اتوار کو اتوار آ پڑا اور

مجھے اس امر کے جانچنے کا اچھا موقع مل گیا کہ انگریز اپنے مذہب کے کس قدر دلدادہ اور ادائے فرائض مذہبی کے لیے کس قدر آمادہ ہیں۔ شام کے سات بجے ہی تھے کہ جہاز کے اسٹیوارڈ ہر طرف آکر پکارنے لگے۔ "جناب گرجا تیار ہے"۔ سب سے اوپر کی ڈک پر جہاں میں کھڑا تھا وہیں پانچ سات انگریز بھی کھڑے چرٹ پی رہے تھے۔ اسٹیوارڈ نے اُن سے بھی آکر کہا کہ چلیے حضرت گرجا تیار ہے۔ پادری صاحب تشریف لایا چاہتے ہیں۔ ایک کہنے لگا "کہاں کی واہیات" دوسرا کہنے لگا "اچھا جی سُن لیا"۔ بیچارہ اسٹیوارڈ اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ اب اسموکنگ روم میں جہاں مرد بیٹھ کر گپ زنی کرتے ہیں اور جس کے برابر ہی لیڈیوں کا کمرہ ہے گرجا یعنی ہمارے اسلامی محاورے میں نماز شروع ہوئی۔ امام صاحب (پادری صاحب) مجمع دمعمّم ہو کر تشریف لائے۔ غیر مذہب والوں اور بچوں کو چھوڑ کر گرجا میں آسکنے والے عیسائی ساٹھ تھے اور چونکہ ہمیشہ بہ مقابلہ پروٹیسٹنٹ کے رومن کیتھولک عیسائی کم ہوتے ہیں لہذا اس تعداد میں سے دس رومن کیتھولک بھی نکال دیجیے۔ کم ازکم پچاس ایسے تھے جنھیں نماز میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ مگر میں نے خوب اچھی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور وہم کے ساتھ انھیں تین تین دفعہ گنا مگر نصف درجن عورتوں اور چہارم درجن مردوں سے زیادہ دکھائی نہ دیئے ۔۔۔ مردوں میں ایک تو ۸۰ سے متجاوز پادری صاحب تھے اور دوسرے ایک تیمورلنگ فوجی افسر تھے جو ٹانگ میں گولی چھپا کر تبت سے بھاگے تھے اور بہ حصولِ رخصتِ علالت ولایت جا رہے تھے۔ ایک ہندوستان کے کسی مدرسے کے پروفیسر تھے اور ایک اکیس بائیس برس کا نوجوان تھا جو ایک ناکتخدا لیڈی کو اتنی دیر کے لیے بھی تنہا چھوڑنا مناسب نہ سمجھ کر اس کے برابر آبیٹھا تھا۔ چھت کے اوپر عین نماز کے وقت تاش ہو رہا تھا۔ چونکہ چھت پر سے نماز کا کمرہ صاف نظر آتا تھا لہذا ایک بڑے میاں نے جو شریک صحبت تاش تھے بمقتضائے اُس تعلق خاطر کے جو آخر عمر میں مذہب سے ہو جاتا ہے اتنا کیا کہ کرسی چھت کے کنارے کی طرف رکھی تھی کہ تاش کھیلتے کھیلتے جب دنیا کی بے ثباتی کا خیال آجائے تو مناجات کا بھی ایک آدھ حرف سن لیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمان دلوں پر مذہب کی حکومت ابھی بہت کچھ ہے۔

Marfat.com

یہاں دن بھر ایک تماشہ رہتا ہے۔ ادھر تو مسافر بہ محاورۂ بمبئی "گمت" کرتے ہیں اور ادھر خلاصی و ملازمینِ جہاز ہر قسم کی مشق کرکے اپنا دل بہلاتے ہیں اور خطرات کے اوقات کے لیے مہارت حاصل کرتے ہیں۔ ایک بیوگل ہوا۔ "یہ کیسا بیوگل ہے؟" "یہ آگ کا بیوگل ہے" "آگ۔ جل تو جلال تو آئی آفت ٹال تو۔ پانی میں آگ کیسی؟" "آگ واگ کچھ نہیں ہے۔ یہ لوگ مشق کر رہے ہیں۔" لاحول ولا قوۃ عجیب نڈر لوگ ہیں ایسی بدفالی اچھی نہیں۔"

اب سنیئے سینکڑوں خلاصی اسٹیوارڈ پانی کی بالٹیاں لیے دوڑے جا رہے ہیں اور بالکل اسی طرح ہانپتے کانپتے جیسے سچ مچ آگ لگی ہو۔ کھٹا کھٹ پمپ کھولے جا رہے ہیں اور نلوں کے ذریعے سے پانی کے فوارے چھوڑے جا رہے ہیں۔ اس جہاز پر چالیس کشتیاں ہیں جو خطرے کے مواقع کے لیے جہاز کے مناسب مقامات پر لٹکی ہوئی ہیں۔ سیٹی ہوتے ہی ہر کشتی کے پاس دو دو خلاصی آکھڑے ہوئے اور کشتی کے تسمے اور زنجیریں کھول ڈالیں کہ بیوگل ہوتے ہی چشم زدن میں سب کشتیاں پانی میں اتار دی جائیں اور مسافران میں سوار کر دیے جائیں۔ ہر کشتی کے پاس ایک ایک صندوق ڈال دیا گیا۔ میں نے ایک صندوق کھول کر دیکھا۔ دو ایک پتھر پرانے جوتے۔ خالی دیا سلائی کی ڈبیاں پڑی ہوئی ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ کہا اس میں کھانا بسکٹ ڈبل روٹی۔ دیا سلائی۔ چرٹ۔ پانی۔ شراب ہے۔ جب کشتی نیچے گرائی جائے گی یہ بھی اس میں ڈال دیا جائے گا تاکہ مسافروں کے پاس دو ایک وقت کا تو آذوقہ رہے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی کہ جس طرح چھوٹے بچے اینٹ کی سرخی کا آٹا اور ٹھیکریوں کا گوشت اور مٹی کی شکر بنا کر کھیلتے ہیں اسی طرح ہمارے ڈاڑھی مونچھ والے بچے پتھروں کی ڈبل روٹیاں۔ جوتوں کی بوتلیں بناتے ہیں۔ خدا جانے خطرے کے وقت اُن کے اوسان درست رہتے ہوں گے یا نہیں مگر اس وقت تو اشاروں میں کام کرتے ہیں۔

ہم اوپر ہی تھے کہ ایک افسر جہاز نے ایک بڑا سا صندوق جہاز کے کنارے پر سے پھینکا اور فوراً بیوگل ہوا۔ یہ کیا تھا۔ واضح رہے کہ اب مجھے سوال کرنے اور جواب پانے میں مزہ آنے لگا تھا۔ یہ جو صندوق پھینکا گیا یہ فرض کرو کہ ایک آدمی تھا جو جہاز سے نیچے گر گیا۔ ایسے موقع پر جو کچھ کیا جاتا ہے اس کی مشق ہوتی ہے۔ ایک آدمی بیوگل سنتے ہی فوراً اوپر مستول پر پھدک بیٹھا اور جس

مقام پر چھپاکا ہوا وہاں نظر جمائے رہا۔ ایک اور دوڑا ہوا گیا اور چمڑے کا ایک حلقہ جسے بوائے (BUOY) کہتے ہیں لے آیا۔ اس میں فاسفورس بھرا ہوا ہے اور اپنے مواقع پر ٹھیک اس جگہ پھینک دیا جاتا ہے جہاں آدمی گرا ہو۔ حلقے کے پانی میں گرتے ہی فاسفورس میں آگ لگ جاتی ہے اور جب تک غرق شدہ آدمی کے نکالنے کے لیے کشتی نہ آئے فاسفورس جلتا رہے گا۔ انتظام تو سب کچھ ہے مگر کہیں "تا کشتی بہ او رسد او بہ کام نہنگ رسد" کا مضمون نہ ہو جائے۔

جہاز میں پوسٹ آفس ہے۔ بمبئی میں ولایتی ڈاک کے خطوط بلا تفریق و امتیاز تھیلے میں بھر بھر کر جہاز پر لاد دیئے جاتے ہیں جن کی تہذیب و ترتیب جہاز میں ہوتی ہے۔ پوسٹ آفس کے ملازموں کی تعداد مع چپراسیوں کے ۲۹ ہے۔ ان میں کچھ یوریشین ہیں۔ کچھ نیٹیو کرسچین، کچھ پارسی۔ مسلمان "ایاز قدر خود بشناس" کے اصول کے مطابق چپراسیوں اور تھیلی بند کرنے والوں سے اونچے نہیں چڑھ سکتے۔ افسوس کہ مسلمانوں کی قسمت میں تھیلیں ہی بھرنا لکھا ہے۔ تاہم غنیمت ہے کہ کسی حیثیت سے ہوں اس وقت تو کہیں کہیں صورت تو دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہی لیل و نہار رہا اور اس دوڑ میں پھسڈی ہی پھسڈی رہتے چلے گئے تو چپراسی بھی ملنا محال ہے۔ مدراسی گریجویٹ بہت سے منہ کھولے تاک میں بیٹھے ہیں۔ میں یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ کان میں آواز آئی کہ ساحل نظر آنے لگا۔ ڈک پر آ کر دیکھا تو حقیقت میں عرب شریف کی سرزمین مقدس کا ساحل دھندلا دھندلا نظر آنے لگا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر اڑ جاؤں اور اس متبرک زمین سے آنکھیں ملوں، سبحان اللہ، سبحان اللہ یہی وہ ملک ہے جہاں سے چشمۂ ہدایت ابلا تھا۔ یہیں سے نیّر اسلام طلوع ہوا تھا۔ اے ارض مقدس، خدا کرے مجھے تیرے دشت و جبل پر جبہہ سائی اور تیرے متبرک مقامات کی جاروب کشی نصیب ہو۔ زندگی بھر تجھ میں رہنے کو جگہ ملے اور مرنے کے بعد میری خاک تیری پاک مٹی کا پیوند ہو جائے اور خدا کے اس برگزیدہ بندہ کے پائیں مزار جگہ ملے جو خیر خلق اللہ اور نور من نور اللہ تھا۔ جس نے تجھے اقطاع عالم میں خیر الممالک اور تیرے باشندوں کو خیر الامم بنایا۔

Marfat.com

اللهم صلّی علی سیدنا و مولانا سید المرسلین خاتم النبین
شفیع المذنبین رحمتہ للعالمین محب الفقراء و الغرباء و المساکین
وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین ؕ

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد (غالب)

دکن ریویو حیدرآباد ـــــــــ محفوظ علی
دسمبر سنہ ۱۹۰۴ء

Marfat.com

Marfat.com

حصۂ ششم

مسئلہ زمان

Marfat.com

Marfat.com

اردو ہندی

ملک اور اہلِ ملک کی بدنصیبی سے اردو ہندی کا ناخوشگوار مسئلہ ایک عرصے سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں بین الاقوامی منافرت اور مخاصمت کی جولانگاہ بنا ہوا ہے جس ناعاقبت اندیش اور کوتاہ بیں گروہ نے اس مسئلے کو چھیڑا ہے اس نے اپنی ناواقفیت یا تنگ خیالی سے ایک طرف تو اردو کی نسبت یہ مغالطہ دہ خیال اپنے دل میں جمالیا ہے کہ وہ خالصتاً مسلمانوں کی زبان ہے جو عربی فارسی کے بدیشی الفاظ اور رسم الخط کی وجہ سے ملک کے مذاق کے خلاف اور اہلِ ملک کو جہالت اور پستی میں رکھنے والی ہے اور دوسری طرف ہندی کی نسبت یہ سخسطہ آمیز حسن ظن قائم کر رکھا ہے کہ وہ اہل ملک کی مقدس زبان ہے جس کا رواج ملک کو مغیض ادبار سے اوجِ اقبال پر پہنچا دے گا۔ انھیں خیالات سے متاثر ہوکر اس گروہ نے کم وبیش نصف صدی سے اردو زبان اور فارسی حروف کے خلاف کوئی کوشش نہیں جو اٹھا رکھی ہو۔

اردو جو عہدِ شاہجہانی سے بنگالہ سے لے کر گجرات تک اور پنجاب سے لے کر دکن تک کل ممالک کی مادری اور کاروباری اور رواجی زبان اور قیام سلطنتِ انگلیشیہ کے بعد سرکاری طور پر ۱۸۳۷ء سے صوبۂ بہار، ممالک مغربی و شمالی اور ممالک متوسط کی اور ۱۸۴۹ء سے صوبۂ پنجاب کی اور ۱۸۵۶ء سے صوبۂ اودھ کی علمی و عدالتی زبان تھی اس کے خلاف غالباً سب سے پہلی کوشش ۱۸۶۷ء میں ہوئی جب کہ بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء ہی میں اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا اور مسئلے کی شقِ ثانی یعنی فارسی خط کی موقوفی اور دیوناگری حروف کے اجرا کی درخواست صوبہ ہذا

کی گورنمنٹ میں پیش کی گئی جو نامنظور ہوئی۔

مگر مخالفین اردو اس ہمت شکن نامنظوری سے مطلق مایوس نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنی خفیہ اور علانیہ کوششوں میں کسی قسم کی کمی نہ کی بلکہ اپنے دائرۂ سعی میں صوبہ بہار کو بھی لے لیا جہاں ۱۸۷۲ء میں یہ مسئلہ چھیڑا گیا کہ مدارس ابتدائی میں ہندی زبان اور دیوناگری حروف کا عام رواج ہو۔ چنانچہ اس میں انھیں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

۱۸۷۳ء میں یہ مسئلہ نہایت بلند آہنگی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ صوبۂ ہذا میں پھر چھیڑا گیا اور ایک عرضداشت ناگری کے اجرا کی درخواست کی شکل میں لکھ کر اہل ہنود کی قوم میں دستخط ہونے کی غرض سے پھرائی گئی جو آخر کار گورنمنٹ کی خدمت میں پیش ہوئی۔ مگر سر جان اسٹریچی صاحب بہادر نے جو اس زمانے میں صوبۂ ہذا کے لفٹیننٹ گورنر تھے یہ جواب عنایت فرمایا کہ اس صوبے میں گورنمنٹ اردو ناگری کی حالت میں کوئی تغیر کرنا نہیں چاہتی۔

مخالفینِ اردو کو جب اس صوبے کی گورنمنٹ سے مایوسی ہوئی تو انھوں نے اپنی کوششوں کا رخ پھر دوسری طرف پھیرا اور صوبۂ بہار و ممالک متوسط میں ریشہ دوانیاں کرنی شروع کیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۱ء میں صوبۂ بہار اور ممالک متوسط میں تمام دفاتر اور مدارس میں اردو بہ خطِ فارسی کی جگہ ہندی بہ خطِ ناگری یا کیتھی جاری ہوئی اور یہ پہلا موقع تھا کہ ہندی نے اردو کے ممالکِ مقبوضہ میں سے ایک کثیر الرقبہ حصہ فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

جب حامیانِ ہندی کو اپنی مساعی میں اس درجے کامیابی ہوگئی تو انھوں نے اپنی پوری قوت پھر ممالک مغربی و شمالی و اودھ (یعنی صوبۂ ہذا) پر صرف کی اور سترہ سال کی مسلسل اور متواتر تگ و دَو اور ساز باز کے بعد ۲ مارچ ۱۸۹۸ء کو اردو ناگری حروف کے متعلق ایک میموریل صوبۂ ہذا کی گورنمنٹ میں پیش کیا۔

جناب معلی القاب سر اینٹونی میکڈانل صاحب بہادر نے جو اس وقت صوبۂ ہذا کے لفٹیننٹ گورنر تھے اس میموریل کے پیش کرنے والوں کو جو جواب دیا اس نے حامیانِ ہندی

Marfat.com

کے سمند کوشش کو خواہ کتنا ہی تازیانہ کا کام کیوں نہ دیا ہو لیکن جناب ممدوح نے ستم ظریفی سے اس میں کچھ پہلو ایسے رکھے تھے کہ اگر حامیان اردو ان سے سبق لیتے اور اردو کی حمایت میں پیہم کوششوں کا سلسلہ جاری رکھتے تو شاید بہت مشکل تھا کہ ہندی بولی باوجود اپنے حمایتیوں کی خفیہ و علانیہ ریشہ دوانیوں کے اس قدر جلد دفاتر سرکاری میں زبان اردو کی حریف قرار دی جا سکتی۔ سر انٹونی میکڈانل صاحب بہادر نے میموریل کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس میں سے چند فقرے پیش کیے جاتے ہیں۔

"چار کروڑ پچاس لاکھ آدمیوں میں سے (جو ہندی یا ہندی کی کوئی اور بولی بولتے ہیں) تیس لاکھ سے کسی قدر کم آدمی لکھ پڑھ سکتے ہیں اور خواندہ اشخاص کی تعداد میں ایک بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی شامل ہے جو اردو بولتے ہیں اور فارسی خط کا استعمال پسند کرتے ہیں میں خیال کرتا ہوں کہ آپ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ان واقعات کے لحاظ سے یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے کہ جو تحریر آپ نے پیش کی ہے اس کی کوئی خاص اشد ضرورت ہے"۔

اس وقت صوبۂ بہار میں یہ تبادلہ (یعنی اردو کی جگہ ہندی کا رواج) پورے طور سے مکمل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ تبادلہ سرکاری زندگی کی پوری ایک نسل میں جا کر کہیں مکمل ہو پایا اور میں ذاتی تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ تبادلے کا زمانہ ہر اس شخص کے واسطے جسے اس کام سے تعلق تھا نہایت پریشانی اور دقت کا زمانہ تھا۔ اب اگر یہ مشکلات اس حصے میں پیش آئیں جس پر مغلیہ زمانے کے طریقوں کا اثر صوبۂ ہذا کے مقابلے میں بہت کم پڑا تھا اور جہاں سرکاری ملازمت میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد اس سے بہت کم ہے جو صوبۂ ہذا میں پائی جاتی ہے تو آپ یہ بات بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ممالک مغربی و شمالی و اودھ میں آپ کی تجاویز کے عمل درآمد میں سخت مشکلات حائل ہیں"۔

"مسلمان اس تبادلے کی مخالفت کریں گے مگر آپ نے ان کی مخالفت کو بے سلاح کرنے کا اب تک کوئی انتظام نہیں کیا یہ بھی کوشش کی ہے کہ انھیں اس حد تک راضی کر لیا جائے کہ اگر وہ آپ کے خیالات بہ تمامہا تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو کم از کم مصالحت پر ہی مائل ہوں"۔

Marfat.com

"یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ تین سو برس کا رواج ایک دن میں موقوف نہیں ہو سکتا ہمیں کوئی ایسی بات جو واقعات مسمہ کے خلاف ہو اور صدیوں کے رواج کی درہم اور برہم کرنے والی ہو جلدی کے ساتھ نہیں کرنی چاہیئے۔"

اقتباسات بالا سے ظاہر ہے کہ سر انیٹونی میکڈانل صاحب بہادر نے ان سخت مشکلات کی طرف اشارہ کر کے جو اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں آخر میں صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمان اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ مگر مسلمانوں کی غفلت اور ہمت شکستگی نے ثابت کر دیا کہ ان کی مخالفت پہلے ہی سے بے سلاح ہو چکی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی سال میں صدیوں کا رواج درہم و برہم نہ کر دیا گیا تو کم از کم اس رواج کے مقابلے میں ایک ایسی نئی رسم قائم کر دی گئی جو پرانے رواج کی حفاظت نہ کرنے کی حالت میں اسے نیست و نابود کر کے رہے گی۔ یعنی ۲ مارچ ۱۸۹۸ء سے دو برس پر دو مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور و معروف رزولیوشن پاس ہوا جس کی رو سے دو ایسے غیر جنس جانداروں کو ایک قفس میں بند کر دیا گیا ہے جن میں سے ایک بوجہ اپنی متانت کے اگر لاکھ طرح دینا اور چار و ناچار بسر کرنا چاہے بھی تو دوسرا اپنی شرارت سے باز نہیں آتا۔

اگرچہ صوبۂ ہذا کی گورنمنٹ نے محض ان لوگوں کی خاطر سے جو سوائے ناگری حروف کے اور کسی رسم الخط سے واقف ہی نہیں دفاتر سرکاری میں ناگری کو اردو کے شریک کیے جانے کی اجازت دی ہے مگر اس اجازت کا عام اثر آج یہ ہے کہ ـــ

۱۔ اُس گروہ کی طرف سے جو نہ اردو جانتا ہے نہ ناگری اور اس لیے جس کے نزدیک دونوں رسم الخط ایک ہی جیسے ہیں بعض جگہ ہندی داں مفت نویس ناگری میں عرضیاں لکھ لکھ کر پیش کر رہے ہیں اور اس طرح اردو عرضیوں کی جگہ ناگری کی عرضیوں سے چھنوائی جا رہی ہے۔

۲۔ اس گروہ کی طرف سے جو اردو بہت اچھی طرح جانتا ہے اور ناگری کا ایک حرف بھی نہیں جانتا مگر اہلِ غرض ہونے کی وجہ سے مجنون یا اہل تعصب ہونے کی وجہ سے اندھا ہے ناگری میں درخواستیں دلوا دلوا کر دفاتر میں ناگری کے رواج کی

کثرت ثابت کرائی جارہی ہے۔

۳۔ مسلمان جو سوائے ملازمت پیشہ افراد کے من حیث القوم ناگری مطلق نہیں جانتے مگر ایک دوسری مروّجہ عدالتی زبان (اردو) میں نوشت و خواند کے عادی ہیں ان پر ناگری سمنوں کی جبریہ تعمیل کرا کر مسلمانوں میں ناگری داں عنصر کا وجود منوایا جارہا ہے

اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کا تماشہ دفعتہً بند ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے جو اپنے حقوق کی مسلسل پائمالی کو نظر استغنا ۔ سے دیکھتے رہنے کے ہمیشہ سے عادی ہیں ایسی خاموشی اختیار کی کہ اس وقت ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے مگر حامیانِ ہندی نے اس دس سال کے عرصے میں بہت کچھ کرلیا۔ اب بھی بہت کچھ کر رہے ہیں اور اگر ان کی ان کوششوں کا سختی سے مقابلہ نہ کیا گیا جو وہ اردو کو نقصان پہنچا کر ہندی کی ترویج و اشاعت میں کر رہے ہیں تو بہت کچھ کیا سب ہی کچھ کرلیں گے۔

ناگری پرچارنی سبھا جس نے ہندی جیسی مردہ زبان کی سڑی گلی ہڈیوں پر امرت جل چھڑک کر اس بوسیدہ ڈھانچے میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت پیدا کردی ہے ہم یہاں اس کے کارناموں کی فہرست پیش کرنا نہیں چاہتے بلکہ ایک نوزائیدہ جلسے کی کارروائی کا اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں جو ۱۰، ۱۱، ۱۲ اکتوبر کو بنارس میں منعقد ہوا۔ یہ جلسہ جس کا نام ہندی لٹریری کانفرنس ہے تبدیلِ لباس ناگری پرچارنی سبھا ہی ہے جو ناگری کے پرچار کے مقصد کو پورا کر کے اب ہندی کے پرچار کے لیے کمر باندھ کر اٹھی ہے اس کی کارروائی کے اقتباسات ذیل ۱۴ اکتوبر کے (PIONEER) پائنیر سے لیے گئے ہیں۔

۱۔ گورنمنٹ سے استدعا کی جائے کہ جن لوگوں کو ضرورت ہو ان کے لیے خاص طور پر بیانات اور فیصلے وغیرہ بہ زبانِ ہندی جاری کیے جائیں۔

۲۔ صوبہ جات متحدہ کا گورنمنٹ گزٹ ہندی میں شائع کیا جائے۔

۳۔ گورنمنٹ کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ اس امر کی ضرورت ہے کہ کل رسیدیں اور کاغذات جو ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے دفاتر سے جاری ہوں وہ ہندی میں چھپے ہوئے ہوں۔

Marfat.com

۴ - جو مراسلت مابین بہار و صوبہ جاتِ متحدہ ہو وہ آیندہ سے بجائے اردو حروف کے ناگری حروف میں ہو۔

۵ - والیانِ ریاست سے استدعا کی جائے کہ اپنی اپنی ریاستوں میں ہندی جاری فرمائیں۔

۶ - افسوس ظاہر کیا گیا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے ہنوز کالج کلاسوں میں ورناکیولر زبانوں کو لازمی مضامین کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔ باوجودیکہ یونیورسٹی کمیشن نے اس کے متعلق سفارش کی تھی۔

۷ - افسوس ظاہر کیا کہ کلکتہ پریزیڈنسی کالج نے ہندی پڑھانے کا انتظام بند کر دیا۔

۸ - یہ طے ہوا کہ کاشی اور آرا کی ناگری پرچارنی سبھائیں اور نیز اس قسم کی دوسری سبھائیں اپنے اپنے قائم مقام اسکول ٹیکسٹ بک کمیٹی میں بھیجنے کے مجاز ہیں۔

۹ - ہندی کو ہندوستان کی رواجی زبان (لنگوا فرینکا) بنایا جائے۔

۱۰ - دیوناگری کے حروف کو سارے ملک میں رواج دیا جائے۔

۱۱ - ہندوستانی سکوں پر دیوناگری حروف منقوش ہونے کی درخواست کی جائے

۱۲ - صوبے میں مختلف اقوام کی جو کانفرنسیں قائم ہیں ان سے اور نیز دوسری جماعتوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی اپنی کارروائی ہندی میں قلمبند کیا کریں۔

۱۳ - ہندی زبان کی ایک ڈکشنری شائع کی جائے۔

۱۴ - صدر نشین جلسہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ مندرجہ ذیل تار ہز اکسیلنسی وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری اور نیز فینانس ممبر کو روانہ کریں۔

" پہلی ہندی لٹریری کانفرنس منعقدہ بنارس گورنمنٹ سے استدعا کرتی ہے کہ گورنمنٹ براہ عنایت احکام صادر فرمائے کہ ہر قسم کے سکوں اور ٹکٹوں پر ہز میجسٹی ملک معظم کا اسم گرامی اور نیز سکوں اور ٹکٹوں کی قیمت ہندی زبان میں تحریر کی جائے کیونکہ ہندی زبان کو ملک معظم کی رعایا کا حصہ کثیر جانتا ہے۔

جس گروہ نے ۲ مارچ ۱۸۹۸ء کو گورنمنٹ سے صرف اسی قدر استدعا کی ہو

Marfat.com

کہ سرکاری عدالتوں میں ہندی زبان کی نہیں بلکہ صرف ناگری حروف کے استعمال کی اور وہ بھی نہ بہ اخراج بلکہ بہ شمول اردو اور انگریزی کی اجازت مل جائے آج اسی کی زبان سے اتنے طویل و عریض مطالبے سن کر اب غالباً اس امر کے متعلق زیادہ غور کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی ہوگی کہ اگر آپ نے اس تشویش افزا اور طمانیت سوز خطرہ کا پیش از پیش انتظام نہ فرمایا اور اگر حامیان ہندی کو اپنے منصوبہ بازیوں میں یوں ہی دن دونی رات چوگنی کامیابی ہوتی رہی تو اردو کا اور اس کی وجہ سے ہماری آبرو، ہماری شائستگی، ہمارے تمدن اور ہماری قومیت کے تشخص کا کیا حشر ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے اس گزارش کے ابتدائی سطور میں عرض کیا یہ نہایت تنگ خیالی بلکہ تاریخی جہالت ہے کہ اردو کو محض مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے۔ اردو محض مسلمانوں کی نہیں بلکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ ناقابل ابطال واقعہ ہے کہ اس مشترکہ کارخانے کے چلانے میں مسلمانوں کی طرف سے جو سرمایہ لگایا گیا ہے وہ سب سے زیادہ مختلف الجنس سب سے زیادہ نایاب۔ سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ کارآمد ہے۔ مسلمان شرکیوں نے صاف نیتی اور نیک طینتی اور راست معاملگی سے جو ان کی قومی خصوصیات ہیں اس مشترکہ کارخانے کی رونق بڑھانے میں نقد و جنس کسی چیز سے دریغ نہ کیا اور دھڑا دھڑ سکا گانٹھ گرہ کا جو کچھ تھا پائی پائی نکال اور تنکہ تنکہ حاضر کر دیا۔ علم القرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، تاریخ، اسماء الرجال، قصص، حکایات، منطق، فلسفہ، حکمت، اخلاق، تصوف، شاعری اور طب کے سارے وہ خزانے جو عربی، فارسی اور ترکی کی ٹکسالوں سے نکل کر ان تک پہنچے تھے لا لا کر اس سرمایہ میں شامل کیے۔ اب اگر ہمارے شرکاء اس کارخانے کو جو نہایت خوبی سے چل رہا ہے محض اپنے تلون مزاجی کی وجہ سے توڑ کر کوئی دوسرا کارخانہ قائم کریں تو اب نہ ہماری گانٹھ میں اتنے دام ہیں اور نہ ہمارے جسم میں ایسی سکت ہے کہ پہلے کارخانے کی طرح اس نئے کارخانے میں فراخ دلی سے سرمایہ لگائیں اور تندہی سے کام کر سکیں۔ لہٰذا اس میں ہماری حیثیت محض قلیوں اور مزدوروں کی سی ہوگی۔

استعارہ موقوف اور کنایہ برطرف، صاف الفاظ میں یہ گزارش ہے کہ اگر اردو مٹ

Marfat.com

گئی اور اس کی جگہ ہندی آئی تو چونکہ ہماری مذہبی معلومات ہمارا تمدن، ہماری شاعری، ہمارا ادب و انشاء، ہمارا علم اخلاق سب کچھ اسی زبان میں ہے اس لیے ہماری تین سو برس کی گاڑھی کمائی رائیگاں جائے گی۔ ہماری پولیٹیکل ہستی معدوم ہو جائے گی اور ہماری قوم ایک ایسی قوم سے مدغم ہو جائے گی جس کے تمدن اور ہمارے تمدن، جس کے روایات اور ہمارے روایات، اور سب سے زیادہ یہ کہ جس کے مذہب اور ہمارے مذہب میں قدر مشترک محض صفر ہے۔

اس نقصانِ عظیم کی تصویر صوبۂ ہذا کے چند معزز و سربرآوردہ مسلمانوں نے اس یادداشت میں جو ۱۸۹۸ء میں حمایت اردو کے متعلق شائع کی تھی نہایت واضح اور صاف و صحیح رنگ میں کھینچی ہے جسے ہم ان حضرات سے معافی طلبی کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

گو ظاہر میں اردو کا زایل ہونا فقط کتابت کا تغیر ہے اور اس کو ہماری معاشرت سے بہ ظاہر کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا مگر جن اہلِ بصیرت کو قوموں کے اقبال و ادبار و بلندی و پستی کی تاریخ پر عبور ہے ان پر بخوبی منکشف ہے کہ قانون قدرت کا اقتضا یہ ہے کہ انسان کی کسی ایک چیز میں تغیر یا تبدل واقع ہونے سے رفتہ رفتہ اس کی تمام چیزوں میں تغیر ہو جاتا ہے اور کوئی امر ایسا نہیں ہوتا جو قوم کی سیاسی حالت پر اثر نہ ڈالے اور اسے بلند یا پست نہ کرے۔ ادب یا اخلاق یا طرز معیشت یا تمدن یا امور سیاست صرف تصور میں جدا ہوتے ہیں وجود خارجی میں وہ ہرگز ایسے الگ الگ نہیں پائے جاتے کہ ایک کی برتری یا ابتری کا اثر دوسرے پر نہ پڑے۔ جسم انسانی میں دل، دماغ، امعا، شش، جگر وغیرہ اگرچہ جدا جدا ہیں مگر ایک کا فساد خواہ مخواہ دوسروں تک پہنچتا ہے اور بالآخر اس کا اثر زندگی پر پڑتا ہے۔ ایسا ہی جب کسی لازمۂ زندگی میں خواہ وہ علمی ہو یا اخلاقی، تمدنی ہو یا سیاسی خلل پڑتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ دوسرے امور پر بھی اثر کرتا ہے اور قومی زیست آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے اردو کی محافظت نہ فقط اس لیے کہ وہ ہماری زبان ہے اور اس کے جانے سے ہماری علمی و شاعرانہ و اخلاقی و تمدنی و مذہبی معلومات گم ہو جائیں گی بلکہ یقیناً ہم نہایت ذلیل اور سیاسی ادبار میں گرفتار ہوں گے اور جس طرح عربی و فارسی کی تعلیم مسلمانوں میں

دینوی امور میں غیر ضروری سمجھے جانے کی وجہ سے متروک ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح اردو کی تعلیم بھی کم ہو جائے گی۔ اردو میں تصانیف کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ جو کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں وہ بے قدر و بے مصرف ہو جائیں گی۔ اخبارات جو اس وقت بہ نسبت ناگری کے اردو میں بہ کثرت ہیں رفتہ رفتہ بند ہو جائیں گے۔ جو افعال کہ قوم پر اثر کرنے والے ہیں ان کے نتائج ایسے پیچ در پیچ اور تو بر تو اور دیر آیند اور غیر یقینی ہوتے ہیں کہ ان کا ادراک قبل از وقوع معمولی عقلوں کا کام نہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کوئی قومی ترمیم یا تبدیلی ایسی نہیں ہوتی جو قوم کی مجموعی حالت پر اثر نہ کرے اور کوئی ایسا قومی اثر نہیں ہوتا جو کسی قوم کے سیاسی رتبے پر اثر نہ ڈالے۔ اس لیے جن صاحبوں کو اردو بلکہ مسلمانوں کے باعزت باقی رہنے میں دلچسپی ہے ان پر فرض عین ہے کہ ایسی عملی تدبیریں کریں جس سے اردو باقی رہے۔

دکن ریویو، حیدرآباد

۱۹۱۰ء

Marfat.com

صوبجات متحدہ[1]

بدایون اور بدایوں کی معزز پبلک اردو کی ترقی میں جس دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے اُس کے بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔

آل انڈیا اردو کانفرنس جس وقت کامیابی کی منزل پر پہنچے گی۔ اردو دنیا خود بخود اہلِ بدایوں کی مساعی جمیلہ کی جو وہ اپنی مادری زبان کی ترقی میں کر رہے ہیں اعتراف کرنے لگے گی۔ اس مہینے میں خاص معززین شہر نے اردو کی حمایت میں ایک جلسہ ۱۲ اگست کو منعقد کیا۔ اس جلسے میں اردو کانفرنس سے اظہار ہمدردی کے علاوہ ایک خاص مسئلہ پر بحث ہوئی جس کی تفصیل سید محفوظ علی بی اے (علیگ) کی اس دلچسپ تقریر میں ملتی ہے جس کو ذوالقرنین نے اپنے ۲۸ اگست کے پرچے میں شائع کیا ہے اور جو درج ذیل ہے۔"

آپ نے فرمایا کہ سرکاری رزولیوشن میں ایک مسکین اور معصوم سا فقرہ یہ بھی ہے۔ "کمیٹی اس ضمن میں اس زبان کے متعلق بھی غور کرے گی جو ان ریڈروں میں استعمال کی جائے گی" صاف لفظوں میں اس کے معنی میرے خیال میں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ کمیٹی غور کرے گی کہ ریڈریں کس زبان میں لکھی جائیں۔ چوں کہ یہ کمیٹی اس صوبے کی گورنمنٹ نے قائم کی ہے۔ اس صوبے میں

---

[1] یہ مضمون رسالہ "فصیح الملک" اگست ۱۹۱۰ء (جلد ۵ شمارہ ۸) سے پروفیسر ابراہیم خلیل صاحب کے ذریعے ہمیں ملا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

Marfat.com

اجلاس کرنے والی ہے اس صوبے کے حکام اور روسا اور اہل علم حضرات سے مرکب ہے اس صوبے کی دیہاتی تعلیم پر بحث کرے گی۔ اس لیے لفظ "زبان" سے پشتو یا سندھی یا مرہٹی یا تلنگی یا تامیل یا اڑیا یا بنگالی تو مراد ہو نہیں سکتی جو اس صوبے میں رائج و مستعمل ہے اور جو اردو ہے۔

جب یہ امر طے شدہ ہے کہ صوبے بھر کی صرف ایک ہی زبان ہے۔ اور وہ اردو ہے تو کیا یہ سوال کہ " ریڈریں کس زبان میں لکھی جائیں "

ایک معما ہے جو گزٹ میں چھاپا گیا ہے۔ لیکن جب کہ انگلستان تک کے اکثر موقت الشیوع پرچے اپنے ناظرین کی تفنن و تفریح کے لیے اکثر معمے چیستاں اور لطیفے چھاپتے رہتے ہیں مجھے بالیقین معلوم ہے کہ گورنمنٹ گزٹ باوجود موقت الشیوع اور چندہ ستاں پرچوں کے زمرے میں آنے کے اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کا کوئی ایسا اہتمام و انتظام نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں اس سوال کے صرف دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ اردو جو اس صوبے بھر کی ملکی اور مادری اور علمی اور کاروباری اور عدالتی زبان ہے اب اس کے مقابلے میں کوئی اور بولی بطور مستقل زبان کے گھڑی ہوئی ہے اور اس لیے کمیٹی غور کرے گی کہ ریڈریں اردو میں تیار کی جائیں یا دیہاتی زبان میں۔ پہلے مطلب کے متعلق میں عرض کروں گا کہ اتنی مختصر کمیٹی کو ایسے جدید مہتم بالشان، خاردار اور ناخوش گوار مسئلے کے متعلق اتنی جلد اور ایسے علانیہ تصفیہ کرنے کی اہم ذمہ داری کبھی ہرگز سپرد نہ ہوئی ہوگی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ دوسرا مطلب ہی صحیح ہوگا۔ فرض کیجیے کہ یہی صحیح ہے۔ اب اگر کمیٹی کا یہ فیصلہ ہوا کہ ریڈریں دیہاتی زبان میں تیار کی جائیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ دنیا کے ممالک متحدہ میں یہ کوشش اپنی قسم کی پہلی مثال قائم کرے گی رورل ایجوکیشن یعنی دیہاتی تعلیم گریٹ برٹن و آیرلینڈ میں کثرت سے جاری ہے اور اس کے متعلق صدہا کتابیں تصنیف اور شائع ہو چکیں اور آئے دن ہوتی ہیں لیکن جہاں تک میرا محدود علم ہے وہ سب کتابیں اسی انگریزی میں ہیں جو شہری ہے اور جو اسی اعتبار سے ملکی اور علمی اور کاروباری اور عدالتی زبان ہے۔ اگر انگلستان میں یہی اصول زیر بحث مرعی رکھا جاتا یعنی دیہاتی تعلیم دیہاتی زبان میں ہو تو ضرور ہوتا کہ یہ کتابیں یارک شایر لنکا شایر

Marfat.com

سامرسٹ شایر یا ویلس یا اسکاٹ لینڈ کی مفصلاتی بولیوں میں ہی تصنیف و شائع ہوتیں نہ کہ لندن کی علمی زبان میں، ایسی حالت میں جب کہ انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور ویلس اور آئرلینڈ کے دیہات کے گنواروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے بھی سرکاری طور پر لندن ہی کی ٹکسالی زبان منتخب ہوئی ہے تو اس صوبے کے دیہات کے گنواروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے بھی وہی زبان کیوں نہ منتخب کی جائے — جو اس صوبے بھر کی مسلّم اور مستند علمی اور کاروباری اور عدالتی زبان ہے اور وہ اردو ہے۔

اگر یہ امر طے بھی ہوگیا کہ یہ ریڈریں دیہاتی زبان ہی میں تیار کی جائیں تو لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ صوبجات متحدہ کے کس حصے کی دیہاتی زبان میں تیار ہونی چاہیں کیوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے (اور حاضرین میں سے بہت سے حضرات اس کی تصدیق فرماسکیں گے) اس صوبے کے ہر حصے کے مواضعات میں دیہی ضروریات تک کی چیزیں علیحدہ علیحدہ ناموں سے پکاری جاتی ہیں پس ممکن نہیں کہ جو کتابیں قسمت گورکھپور کے قرب وجوار کے دیہات کے الفاظ کے اجزا سے مرکب ہوں وہ ضلع سہارن پور و مظفر نگر کے قرب وجوار کے مواضعات کے باشندوں کی سمجھ میں بلا کوشش آسکیں۔ جب یہ کیفیت ہے کہ وہ کتاب جو ایک حصہ صوبہ کے دیہات کے باشندوں کی بولی میں لکھی جائے دوسرے حصہ صوبہ کے دیہات کے باشندوں کی سمجھ میں بلا کوشش نہ آسکتے تو کیا ضرور ہے کہ دوسرے حصہ صوبہ کے دیہاتی طلباء کو پہلے حصہ صوبہ کے دیہات کے ایسے الفاظ سکھانے پر مجبور کیا جائے جنھیں وہ بلا کوشش نہیں سمجھ سکتے مگر صوبے بھر کی عام علمی اور کاروباری اور عدالتی زبان یعنی اردو کے ایسے الفاظ سکھانے پر مجبور نہ کیا جائے جنھیں بالفرض وہ بلا کوشش نہ سمجھ سکتے ہیں۔ چونکہ دیہات میں عموماً جہلا و عوام ہی بستے ہیں جن کی واقفیت اشیاء محدود اور جن کی ضروریات اشیاء محدود تر ہوتی ہیں۔ اس لیے شہر کے تمدن کے مقابلے میں دیہات کا تمدن ہمیشہ اور ہر جگہ ابتدائی حالت میں ہوتا ہے اور اسی لیے دیہات کی ڈکشنری شہر کے مقابلے میں نہایت مختصر ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جدید طریقۂ کاشت کاری، اصول حفظ صحت، صفائی دیہات اور دوسرے مضامین مفید طلبائے دیہی کی تعلیم کے لیے دیہات کی زبان کو منتخب کرنا ایسا ہے جیسا کہ الہ آباد کی نمائش میں جس میں دور دور کے مہمانانِ جلیل القدر تشریف لانے والے ہیں ہر قسم کے

Marfat.com

سامان خورد ونوش وراحت وتفریح کی بہم رسانی کے لیے کسی گانوں کے بنیے کی دوکان کو منتخب کرنا جس میں سوائے چنوں کھیلوں، آٹے دال اور گڑ بتاسوں کے اور کچھ نہ ہو لیس اے حضرات اس فقرے کا کہ ریڈریں کس زبان میں تیار ہوں خواہ یہ مطلب ہو (میرے خیال میں نہیں ہو سکتا) کہ ریڈریں اردو میں تیار ہوں یا کسی دوسری ایسی بولی میں جو اردو کے مقابلے میں لبطور زبان کے کھڑی کی گئی ہے یا ــــــ۔ (جو میرے خیال میں ہوسکتا ہے) کہ ریڈریں شہری زبان میں تیار ہوں یا دیہاتی بولی میں۔ دونوں اردو کے لیے خالی از خطرہ نہیں کیونکہ اگر کسی طرح خدانخواستہ اردو کے خلاف فیصلہ ہوا اور ریڈریں علمی اور شہری اردو کے سوا اور بولی میں بنیں تو یہ اردو کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگا ایسی حالت میں آپ کا فرض ہے کہ اس کے متعلق ابھی سے چارہ کار سوچیں۔ اب فرض کیجیے کہ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ ریڈرس اردو میں تیار کی جائیں تو اس مسکین اور معصوم فقرے کے اس جزو کے کیا معنی ہوئے کہ اس زبان میں صرف وہی الفاظ ہوں گے جنھیں مدارس ابتدائی کے طلباء بلا کوشش سمجھ لیں۔ میں ان لوگوں میں ہرگز نہیں ہوں جو الفاظ کو کھودتے کھودتے پاتال تک کنواں بنا دیتے ہیں اور معنی کو پانی کی تہ سے نکال کر لاتے ہیں۔ اس لیے میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہ جزو دراصل اس حاشیے کا متن ہے جو کچھ عرصے سے مخالفین اردو کو ازبر ہے اور جس کا کھلے لفظوں میں یہ مطلب ہے کہ اردو میں سے فارسی عربی کے وہ الفاظ بھی نکال پھینکے جائیں جو آج تک خاص وعام کی زبان پر ہیں۔ میں اس کے یہ معنی سمجھتا ہوں کہ دیہاتی طلباء کی تعلیم کی راہ میں آسانی پیدا کرنے کا خفیف سے خفیف پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مگر میں نہایت ادب سے گزارش کرتا ہوں کہ میری رائے میں آسانی کی لے حد سے زیادہ بڑھانی بے سود نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ جب کسی بچے کو (خصوصاً جب کہ وہ بچہ دیہاتی ہو) کسی زبان میں کوئی کتاب (خصوصاً ایسی کتاب جس میں جدید طریقہ کاشت کاری۔ اصول حفظ صحت۔ صفائی دیہات اور دوسرے مضامین مفید تعلیم دیہی ہوں) سکھائی جائے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زبان اور وہ علوم اسے آجائیں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دیہات کی ڈکشنری نہایت مختصر ہوتی ہے۔ اب اس پر اتنا اور اضافہ کرتا ہوں کہ اس ڈکشنری کے الفاظ کا تلفظ اکثر گنواری ہوتا ہے۔ فرض کیجیے

کہ اردو کی ریڈریں کسی ایسے الفاظ کے لانے کی ضرورت ہو جو اب تک گانوں والوں کے یہاں موجود نہیں ہے اور جو بلا کوشش طلباء کی سمجھ میں نہ آئے گا تو کیا وہ لفظ لایا ہی نہ جائے اور دیہاتی طلبا کے علمی اور لسانی واقفیت کو گانوں کے چند الفاظ تک ہی محدود رکھا جائے؟ با فرض کیجیے کہ اردو کی ریڈر میں کسی ایسے لفظ کے لانے کی ضرورت ہو جو اب تک گانوں والوں کے یہاں گنواری تلفظ کے ساتھ موجود ہے اور جو صحیح تلفظ کی شکل میں بلا کوشش طلباء کی سمجھ میں نہ آئے گا تو کیا وہ لفظ صحیح تلفظ کی شکل میں نہیں بلکہ گنواری تلفظ کے ساتھ لایا جائے۔

اگر ان دونوں باتوں کا جواب اثبات میں دیا جائے تو دیہاتی طلبا پر ظلم ہوگا کہ پڑھے لکھوں کے زمرے میں آنے کے بعد بھی ان کی تحریر و تقریر ویسی ہی ناتراشیدہ رہی جیسی ان کی ان پڑھ اور ان گھڑ باپ دادوں کی تھی۔

ایک دیہاتی جو تعلیم سے (چاہے وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو) بہرہ یاب ہو چکا ہے بالطبع یہ چاہے گا کہ وہ ضرورت کے وقت شہر میں جائے اور شہری دکان داروں اور شہری برادروں سے مل کر گفتگو کرے اُن پر اثر ڈالے اور اپنے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت دے وہ ضرورت کے وقت عدالتوں میں جائے اور بلا دقت اور بلا وساطت اپنا کام نکالے۔ اور اس طرح اپنے علم سے کام لے وہ ضرورت کے وقت پڑھے لکھوں سے لکھت پڑھت کرے اور گھر بیٹھے بیٹھے اپنا کام نکالے۔ وہ کسب معاش علم ادب اور اخلاق اور تفریح کی ان کتابوں سے فائدہ اٹھائے جو اردو دانی کی بدولت اس کے دست رس میں ہیں۔ ان سب کے لیے اسے ایسے علم کی ضرورت ہے جس کے سکھاتے وقت الفاظ پر پہرے نہ لگائی گئی ہوں اور جسے پڑھ کر دماغ میں اس کے ایسے الفاظ کا کافی سرمایہ موجود ہو جو پڑھے لکھوں کی زبان پر ہیں جو عدالت کی کارروائیوں میں مستعمل ہیں اور جو روزمرہ کی کتابوں میں داخل ہیں۔

حضرات ایسی حالت میں میری رائے ہے کہ دیہات کی تعلیم خواہ با اعتبار مضامین کے شہر کی تعلیم سے مختلف یا ادنےٰ درجے کی ہو کیوں کہ اس میں دیہاتی طلباء کا سخت نقصان ہے۔

Marfat.com

حصۂ ہفتم

تحقیقات عالیہ

Marfat.com

Marfat.com

حدیثِ دیگراں

(۱۹)

مجھے سیّد محفوظ علی مرحوم بدایونی کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہوا لیکن مولانا ظفر علی خاں مرحوم، مولانا محمد علی مرحوم، شعیب قریشی مرحوم اور بہت سے اکابر و احباب کی زبانی ان کے اوصاف و محاسن سنتا رہا۔ اُن کے بعض مضامین و مقالات مختلف رسالوں میں پڑھے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے چند بہترین لکھنے والوں میں سے تھے۔

سنجیدہ مقالات کے علاوہ سیّد مرحوم کو مزاحی مضامین لکھنے میں جو کمال حاصل تھا وہ میں نے دورِ حاضر کے بہت کم اصحاب میں دیکھا۔

مکتوب لاہور بنام مولف ——— غلام رسول مہر

۱۰ راگست ۱۹۶۹

میر صاحب دین دار، با اخلاق، وسیع المطالعہ انسان تھے۔ مزاج میں مزاح بھی تھا لیکن متانت کے ساتھ، قومی تحریکات کی روح و رواں مگر نمایاں ہونے سے پرہیز۔ ادب سے بڑا شغف لیکن شہرت سے گریز، لکھنے کا بڑا دلکش انداز تھا۔ اس کو کیا کیا جائے کہ جب لکھا فرضی نام سے لکھا۔ میر صاحب کی گفتگو صرف ادب و مزاح کا خزینہ نہیں، مفید معلومات کا بھی گنجینہ ہوتی تھی۔ عام تاریخ، خصوصاً تاریخ ہند اور تاریخ اسلام پر ان کی مبصرانہ نظر تھی۔

مکتوب دہلی بنام مولف ——— ضیا احمد بدایونی

۲ر نومبر ۱۹۶۹ء

Marfat.com

سیّد محفوظ علی صاحب کو الفاظ کی بیخ و بن تک پہنچنے کا ملکہ تھا۔ وہ لفظ کا ایسا عکس دے کرتے کہ اس کے سارے اجزا بیجز نظر کے سامنے نمایاں ہو جاتے تھے۔ جس طرح وحیدالدین سلیمؔ نئے الفاظ وضع کرنے کے ماہر تھے، اسی طرح سیّد محفوظ علی کو رائج الفاظ کی کنہ دریافت کرنے کا گرؔ آتا تھا۔ یہ دونوں ادیب گویا ایک ہی سکّے کے دو رخ تھے۔

لغات کی ترتیب کے سلسلے میں مولوی عبدالحق نے انھیں پہلے اورنگ آباد اور پھر دہلی آنے کی دعوت بار بار دی، لیکن میر صاحب کو اس کام میں ہاتھ ڈالنے کی فرصت نہ تھی۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں ـ" چند سال بعد دوبارہ حیدرآباد گئے۔ اتفاق سے ان دنوں میں بھی دلّی سے حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ کئی روز بہت پرلطف صحبت رہی۔ دلی اگرچہ بدایوں سے قریب ہے مگر وہاں ان سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا، ملاقات ہوئی تو حیدرآباد دکن میں۔ انجمن اورنگ آباد سے دلّی منتقل ہوئی تو میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ دن انجمن میں آکر رہیں اور اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ وعدہ کرتے رہے مگر کبھی دلّی آنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میں ہی ایک آدھ بار بدایوں گیا"۔ حقیقت یہ ہے کہ "ہمدرد" اور مولانا محمد علی مرحوم کی یادیں دلّی سے کچھ اس طرح وابستہ تھیں کہ میر صاحب دلّی جانے کے خیال سے ملول ہو جاتے تھے۔ یہ یادیں دراصل ایک واپس نہ آنے والے عہد کے ذہنی نقوش تھے جو عناں گیر ہوتی تھیں۔

مولوی عبدالحق کے اعتقادات کے بارے میں ہمیشہ بڑے بڑے شبہات کا اظہار کیا جاتا رہا، گو خود وہ یہی صفائی پیش کرتے تھے کہ جس کا نام ہی "عبدالحق" ہو وہ بھلا کیوں کر "دہریہ" ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب کے خلاف ایک الزام یہ بھی تھا کہ انھیں نماز پڑھتے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ نماز میں ان کی شرکت کی ایک مثال کا شاہد خود میں ہوں۔ جیسا کہ مولوی صاحب نے خود فرمایا ہے کہ وہ بدایوں گئے اور میر صاحب کے مہمان ہوئے۔ میر صاحب

ہمیشہ بدایوں میں جمعہ کی نماز جامع مسجد شمسی میں ادا کرتے تھے، شیروانی پہنے، گرمیوں میں دوپلی ٹوپی اور جاڑوں میں عمامہ زیب سر کیے، چاندی کی گول موٹ کی چھڑی ہاتھ میں لیے میر صاحب اپنی حویلی سے جامع مسجد کو پیدل جاتے تھے۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے سید سبط علی ان کے ہمراہ ہوتے اپنے قیام کے دوران مولوی عبدالحق نے بھی جمعہ کی نماز میر صاحب کے ہمراہ اسی مسجد میں ادا کی۔

جب ایک بار مولوی عبدالحق کو اپنے کسی مقالے کے سلسلے میں اردو میں داخل ہونے والے غیر زبانوں کے الفاظ کی مثالیں درکار ہوئیں تو اس بارے میں انھوں نے سید محفوظ علی ہی سے مدد طلب کی۔ چنانچہ مولوی صاحب فرماتے ہیں ـ" سید صاحب، صاحب ذوق تھے۔ ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ الفاظ کی تحقیق کا بہت شوق تھا۔ اس کا کافی ذخیرہ جمع کیا تھا" میر صاحب کی تحقیقات الفاظ پر مبنی ایک طویل گوشوارہ کبھی "علی گڑھ میگزین" میں شائع ہوا تھا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سبطین احمد بدایونی فرماتے ہیں ـ" میر صاحب کی تحقیقات عالیہ کے اس حصے پر جو لغات سے متعلق تھا اور شرمندۂ تحریر ہو چکا تھا، علی گڑھ میگزین کے موجودہ اڈیٹر صاحب[1] چھاپہ مار چکے ہیں۔ باقی جو میر صاحب کے حافظے میں رہ گیا وہ گرتے کے ان گہر ہائے نایاب کی طرح، کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہہ میں سمندر کی، دریا برد ہو چکا۔" افسوس کہ "علی گڑھ میگزین" کا وہ شمارہ کوشش کے باوجود مجھے دستیاب نہیں ہوا۔

تحقیقات الفاظ کی چند مثالیں جو میں نے وقتاً فوقتاً خود میر صاحب سے سنی تھیں اور جو میرے ذہن میں رہ گئی ہیں وہ مشتے نمونہ از خروارے

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ مولف

کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

سنترہ یہ لفظ اسی طرح درست ہے۔ سنگترہ یا رنگترہ ٹھیک نہیں۔ جس طرح "مالٹا" جزیرہ مالٹا سے منسوب ہے اور "موسمبی (موسمی نہیں) موزمبیق سے، اسی طرح "سنترہ" جس کا بیج پرتگال میں سنترہ نامی جگہ سے آیا، اسی نام سے موسوم ہوا۔

نارنگی بھگت کبیر تو "رنگی کو نارنگی کہیں" یہ سوچ کر روتے لیکن ممکن ہے کہ یہ لفظ "نار" اور "رنگ" سے مرکب ہے یعنی اس پھل کا رنگ آگ جیسا سرخ ہوتا ہے۔

کسوٹی یہ لفظ "کسنا" اور "وٹی" سے مرکب ہے۔ "کسنا" یہاں جانچنے کے معنی میں ہے اور "وٹی" کے معنی چھوٹے پتھر کے ہیں۔ کسوٹی، یعنی وہ پتھر جس پر سونا جانچا یا پرکھا جاتا ہے۔

بالٹی اپنی طرف کی زبانوں میں کوئی ملتا جلتا لفظ نہیں۔ انگریزی لفظ بکٹ (BUCKET) ہے، اس سے بھی مماثلت نہیں۔ البتہ بمبئی کی طرف "بالڈی" بولتے ہیں۔ مزید تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ "بالڈی" پرتگیزی زبان کا لفظ ہے جو ہندوستان میں داخل و رائج ہوا۔ بالٹی اسی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

سلپچی یہ لفظ اغلباً "سیلاب چی" تھا کیونکہ استعمال کرتے وقت اس میں پانی کا چھوٹا سا سیلاب ہی تو آتا ہے۔

ایسی تیسی یہ اسی طرح کا روزمرہ ہے جیسے "فلاں"۔ جو غیر معلوم شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "فلاں ابن فلاں" یا ؎

نیکی کن اے عزیز و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

جس طرح "فلاں" اس شئے کے لیے بھی اشارۃً استعمال کرنے لگے جس کا نام لینے سے حجاب آتا ہے، اسی طرح ایک ناقابلِ بیان شے یا فعل کے لیے "ایسی تیسی" استعمال کیا جاتا ہے "فلاں" پر سیّد صاحب کی شوخ تضمین جو انھوں نے راجہ غلام حسین کے عقد ثانی کے موقع پر فرمائی تھی، ملاحظہ ہو ؎

شادی کن اے رفیق و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

——— مولف

میں اوائل عمری سے میر محفوظ علی مرحوم کے شستہ و پاکیزہ انداز تحریر کا مداح رہا ہوں۔ "میاں" کے عنوان سے ان کا جو مضمون ۱۹۱۰ء کے "پنجاب ریویو" میں شائع ہوا تھا عجیب و غریب محققانہ شان رکھتا ہے اور میر محفوظ علی کی مخصوص لطافت بیان اس پر مستزاد ہے۔ طنزیہ ڈراما لکھنے میں میر صاحب نے جو کمال دکھایا ہے اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ اسی طرح سفر نامہ کی تحریر میں میر صاحب کا بے مثال حسن نگارش اور اس میں ظرافت کی چاشنی ایک خاص لطف رکھتی ہے۔

میر محفوظ علی ہمارے صاحب طرز نثر نگاروں میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ مضمون اور اسلوب کے باہمی ربط کا جو کامل احساس میر محفوظ علی کو تھا اس کی برابری ہمارے نامور نثر نگاروں میں بھی معدودے چندہی کو نصیب ہوتی ہے۔ لفظوں پر ان کی گرفت ایسی ماہرانہ ہے کہ ہم میر صاحب کا ایک ایک جملہ پڑھتے ہیں اور حسن و صحتِ ادا پر عش عش کرتے ہیں۔

مکتوب لاہور بنام مولف ——— (پروفیسر) حمید احمد خاں
۱۷ر مئی ۱۹۷۲ء

Marfat.com

میاں

(۱)

کچھ عرصہ ہوا کہ پنجاب کے کسی اخبار میں ہم نے یہ عجیب و غریب خبر پڑھی تھی کہ ہز ہائینس مہاراجہ سر پرتاب سنگھ، سنگھ صاحب بہادر والیٔ جموں و کشمیر نے اپنی شصت سالہ سالگرہ کی مبارک تقریب پر یہ حکم نافذ فرمایا ہے کہ ان کی تمام راجپوت رعایا کا امتیازی لقب آئندہ سے بجائے میاں کے ٹھاکر ہو۔

جس اخبار میں ہم نے یہ خبر پڑھی تھی اس میں اس معاملے پر اس سے زیادہ روشنی نہیں ڈالی گئی تھی کہ "اس تبدیلی کی وجہ شاید یہ معلوم ہوتی ہے کہ میاں کا لفظ عام طور پر مسلمانوں کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے"۔

چونکہ مسلمانوں کے بہت سے قومی خطابات و القاب ایسے ہیں جو غیر مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہیں اور یہ نسبت اشتراک صدہا سال سے برابر چلی آتی ہے اور چونکہ حضور مہاراجہ صاحب بہادر جیسے بیدار مغز روشن ضمیر اور نکتہ رس فرمانروا سے اس تنگ خیالی کو بلا وجہ مرجہ نسبت دینا کہ حضور ممدوح اس قسم کے حکم کے نفاذ سے اپنی کثیر التعداد مسلمان اور قلیل الشمار غیر مسلمان رعایا کے درمیان ایک غیر خوش آیند امتیاز قائم کرنا چاہتے ہیں ناسب کی پست نظری پر دال ہے۔ لہذا اخبار مذکور کے قیاس کو قطعی اور یقینی وقعت نہ دے کر ہم از سر نو اس حکم کی مصالح اور وجوہ تحریک پر نظر انتقاد ڈالتے ہیں۔

ہماری رائے میں اس حکم کے نفاذ کی محرک صرف تین وجوہ ہو سکتی ہیں۔

اول: ہز ہائی نس نے یا تو بطور خود یا چند متعصب اور تفرقہ پرداز آریہ اخبارات کی اشتعال انگیز تحریرات سے متاثر ہو کر اور یا اپنی غیر مسلم رعایا کی درخواست پر لفظ "میاں" کو اہانت آمیز تصور فرما کر حکم دیا کہ اس سراپا حقارت لفظ کے اضافے سے ان کی راجپوت رعایا اپنے نام کی عزت کو داغ نہ لگائے۔

دوم۔ چونکہ لفظ "میاں" مسلمانوں کے نام کے ساتھ بھی لبطور ایک اعزازی لقب کے مستعمل ہوتا ہے لہذا ہز ہائی نس نے اپنی مسلم اور غیر مسلم رعایا میں ایک غیر ضروری، اور غیر خوش آئند امتیاز قائم کرنے کی ابتدا کی اور اعزازی خطابات تک میں دونوں فریقوں کی شرکت نامناسب سمجھی۔

سوم۔ "میاں" چونکہ مسلمانوں کا لفظ ہے اور اس لحاظ سے فارسی الاصل یا عربی الماخذ ہے لہذا ہز ہائی نس نے بھارت کی زبان کو فارسی۔ عربی کی آمیزش سے پاک کرنے کی کوشش میں عملی کارروائی کا آغاز فرمایا۔

ہم ان میں سے ہر ایک صورت پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) اگر شق اول صحیح ہو تو ہم افسوس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہز ہائی نس کو لفظ "میاں" کی تاریخ پر غور فرمانے کا اتفاق نہیں ہوا (جس سے ہم آگے چل کر بصراحت بحث کریں گے) ورنہ حضور ممدوح اس لفظ کو راجپوتوں اور سکھوں کے لیے حقارت آمیز خیال کرنے کے بجائے سب سے زیادہ معزز و موقر خطاب تصوّر فرماتے۔ حضور ممدوح نے شاید اس ضمن میں اپنے شجرۂ نسب کو بھی نظر انداز فرمادیا ورنہ اُن کے جد امجد مہاراجہ گلاب سنگھ بہادر سورگ باشی بانیٔ سلسلۂ موجودہ کے دادا میاں زورآور سنگھ کے اسم گرامی میں " زورآور سنگھ" پر "میاں" کا اضافہ صاف بتادیتا کہ اس لفظ کو اُن کے آباد اجداد کس وقعت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ حضور ممدوح اس واقعے کی طرف سے بھی خالی الذہن ہو گئے کہ ریاست جموں وکشمیر کا ولی عہد مسند حکومت کی رونق افروزی سے پہلے اب تک "میاں" ہی کے لقب سے ملقب ہوتا چلا آیا ہے۔ چاہے آئندہ سے نہ ہو۔

(۲) اگر شق دوم صحیح ہو تو دیکھنا یہ ہے کہ ہز ہائی نس کی مسلم اور غیر مسلم رعایا میں یہ امتیاز کہاں تک نبھ سکتا ہے۔ آجکل سب سے زیادہ ہمہ گیر۔ سب سے زیادہ وسیع اور سب سے زیادہ قابلِ تمنا خطابات وہ ہیں جو حکومت عالیہ برطانیہ اپنی رعایا کے وفادار اور کارگزار طبقے کو عطا فرماتی ہے۔ یہ خطابات دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انگریزی الاصل ہیں اور بلا تخصیص و امتیاز انگریزوں اور ہندوستانیوں کو جن میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل

Marfat.com

ہیں یکساں مرحمت ہوتے ہیں۔ مثلاً کے، سی، ایس، آئی یا سی، ایس، آئی، وغیرہ۔ دوسرے خطابات مشرقی الاصل ہیں جو صرف ہندوستان کے باشندوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان میں سے اکثر خطابات ایسے ہیں جو مسلم اور غیر مسلم رعایا کے لیے مخصوص ہونے پر بھی جزءً مشترک ہیں جیسا کہ ذیل کی فہرست سے معلوم ہوگا۔

ا۔ صاحب جو راؤ اور رائے کے ساتھ ہندوؤں کو اور خان کے ساتھ مسلمانوں کو عطا ہوتا ہے۔

ب۔ بہادر جو راؤ اور رائے کے ساتھ ہندوؤں کو اور خان کے ساتھ مسلمانوں کو عطا ہوتا ہے۔

ج۔ سردار جو بہادر کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو برابر اور بلا امتیاز عطا ہوتا ہے۔

د۔ دیوان بہادر کے ساتھ جو مشترکہ ہے ہندوؤں کو عطا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک نہایت وسیع اور وقیع میدان جس میں سرکار انگریزی کی مسلم اور غیر مسلم رعایا اپنے فرائض جاں نثاری ادا کرنے کو دوش بدوش جمع ہوتی ہے۔ محکمہ فوج ہے اور ظاہر ہے کہ فوج میں جس طرح مسلمان رسالہ دار میجر بہادر، صوبہ دار میجر بہادر رسالہ دار بہادر، صوبہ دار بہادر، رسالہ دار، رسائی دار، جمعدار، حوالدار اور دفعدار ہوتے ہیں۔ بس تاوقتیکہ حضور مہاراجہ بہادر جموں و کشمیر کی غیر مسلم رعایا نے جنھیں اب تک بجلدوئے حسن خدمات رائے صاحب، رائے بہادر، سردار بہادر، دیوان بہادر کے قابل رشک خطابات ہوتے رہے ہیں اور جن کے حصول کی تمنا میں ہز ہائینس کی رعایا اور عہدہ داران ریاست متاعِ حیات تک گرو رکھنے کو تیار ہیں اور نیز تاوقتیکہ حضور ممدوح کی راجپوت اور سکھ رعایا نے جوق کے جوق افواج سرکاری میں شامل ہوکر تاج برطانیہ کے لیے سر دینے کو موجود ہیں اور جو اب تک رسالہ دار میجر بہادر، صوبہ دار میجر بہادر، رسالہ دار بہادر، صوبہ دار بہادر، جمعدار، حولدار اور دفعدار کے عہدوں پر سرفراز ہوتے آئے ہیں یہ تہیہ اور تصفیہ نہ کرلیا ہو کہ ان تمام عہدوں اور خطابوں سے دست بردار ہوجائیں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مشترک الخطاب ہونے سے کس طرح

Marfat.com

بچ سکتے ہیں۔

(۳) اگر شق سوم صحیح ہو تو بھی ہم نہیں جانتے کہ ہز ہائی نس کی یہ کوشش کہ دیسی زبان سے بدیسی الفاظ نکال دیئے جائیں کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ جب یورپ باین ہمہ سطوت وجبروت اور باین ہمہ ادعائے علم وفضل اس احسان عظیم اور اکرام عمیم کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو فارسی اور عربی نے اس کے ذخائر میں گراں مایہ اضافہ کرنے سے کیا ہے اور جسے بجز اس کے چارہ نہیں کہ اپنی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کو نمایاں طور پر جگہ دے کر ابد الآباد تک اپنی احسان مندی کا عملی اعتراف کرتا رہے تو بے چارہ ہندوستان اور اس میں بھی غریب کشمیر جس کے خون تک میں عربیت اور فارسیت سرایت کر گئی ہے کس شمار و قطار میں ہے۔

فارن آفس کی اُس طویل الذیل فہرست میں جو دولتِ عالیہ برطانیہ کے جاہ وجلال کا زرّین مرقع ہے اور جس میں ہندوستان کے فرماں روایانِ ذوی الاحتشام کے اسمائے گرامی مع خطابات مندرج ہیں ہم کشمیر کے جلیل القدر فرماں روا کی کلاہِ افتخار کو "سپرِ سلطنت" کے عجمی العربی طرّے سے مزیّن دیکھتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہز ہائی نس جیسے باخبر فرماں روا کو اس امر کا علم ہے کہ دولت برطانیہ اُنھیں "سپرِ سلطنت" کے پر شکوہ خطاب سے مخاطب فرما چکی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہز ہائی نس جیسا نکتہ داں رئیس جسے وہ علمی روایات ترکے میں پہنچی ہیں جن کے لیے ہز ہائی نس مہاراجہ رنبیر سنگھ بہادر جی۔ سی۔ ایس آئی سور گباشی کی علم پرورذات مشہور ہے۔ "سپرِ سلطنت" کی ترکیب اور دونوں الفاظ کی اصلیت سے نابلد نہیں ہو سکتا ایسی حالت میں ناممکن ہے کہ ایسا روشن خیال اور نکتہ سنج عالم جو خود "سپرِ سلطنت" ہو محض اس بنا پر "لفظ میاں" کے استعمال کی ممانعت کرے کہ وہ عربی یا عجمی الاصل ہے۔ اگر حضور ممدوح نے اس لفظ کی ممانعت اس وجہ سے فرمائی ہوئی ہے کہ اس میں عربیت یا عجمیت کی بو آتی ہے تو حضور انور کی منطق آفریں طبیعت سے ہمیں امید تھی کہ امتناعی احکام کے نفاذ سے پہلے ایک خریطہ (جسے فارسی الفاظ کے استعمال سے روکے جانے کی حالت میں ہم تھیلا کہہ سکتے ہیں) گورنمنٹ عالیہ کی بارگاہ میں بدیں استدعا روانہ فرمایا ہوتا کہ حضور ممدوح کا خطاب

آئندہ سے بجائے "سپرِ سلطنت" کے "راج دی[1] ڈھال" ہو۔

پس ممکن نہیں کہ ہز ہائی نس جیسے علم دوست، صلح کل اور وسیع الخیال فرماں روا نے ان تینوں شقوں میں سے کسی شق کی بنا پر یہ حکم جاری فرمایا ہو اور اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس حکم کی محرک کوئی نہایت ہی دقیق مصلحت ہو گی جس کے سمجھنے میں ہمارا فہم نارسا قاصر و عاجز ہے۔

لیکن اگر شومئی قسمت سے ہمارا یہ حسن ظن غلط ہو اور حقیقت میں ہز ہائی نس نے "میاں" کے لفظ کو راجپوتوں اور سکھوں کے لیے باعثِ حقارت سمجھا ہو یا اپنی مسلم اور غیر مسلم رعایا میں غیر مسلموں کو اس کے استعمال سے روک کر ایک غیر ضروری اور ناخوشگوار امتیاز قائم کرنا چاہا ہو یا ملک کی زبان میں سے عربی اور فارسی عنصر کے اخراج کی کوشش کی پہلی مثال قائم فرمائی ہو تو ہم نہایت افسوس کے ساتھ مجبور ہیں کہ اپنا خیال بدلیں۔ لیکن اس حالت میں بھی بجائے اس کے کہ ہم ناراض ہوں ہمیں ہز ہائی نس کا ممنون ہونا چاہیئے کہ حضور ممدوح نے ہمارے ایک نہایت ہی معزز و موقر خطاب کو جس پر مسلمانوں کی پولیٹیکل کمزوری کی وجہ سے سکھا شاہی قبضہ ہو گیا تھا جہاں تک حضور ممدوح اور اُن کی ہم مذہب رعایا کا تعلق تھا ہمیں پھر واپس عطا فرمایا۔ اس موقع پر مسلمانوں کی طرف سے حضور ممدوح کی شکر گزاری کے اظہار کی وہی صورت ہونی چاہیئے جو اُن مساجد کی واگزاشت پر وقتاً فوقتاً ہوئی ہے جن میں سکھا شاہی دست برد نے اصطبل بنا دیا تھا۔

(۲)

اب ہم لفظ "میاں" کی اصلیت کا پتہ لگاتے ہیں جس سے معلوم ہو گا کہ یہ لفظ کس قدر معزز و وقیع ہے "میاں" کا لفظ جن مواقع پر استعمال ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) سادات کے لیے۔ مثلاً۔

صوبہ بمبئی میں۔ سید شمس الدین میاں قادری اورینٹل ٹرانسلیٹر ٹو گورنمنٹ آف بمبئی۔

---

[1] پنجابی میں "کی" "کو" "دی" کہتے ہیں۔ سپر سلطنت کا ترجمہ ٹھیٹ ہندی میں راج کی ڈھال ہوا جسے پنجابی میں "راج دی ڈھال" کہیں گے۔ (مصنف)

Marfat.com

سید گلاب میاں۔ رئیس و مصاحب خاص حضور والیٔ ریاست پالن پور۔
حکیم سیّد راجو میاں اکبر میاں حکیم و مصاحب خاص حضور والیٔ دھرول۔
سیّد اعظم میاں ٹکو میاں کمانڈنگ آفیسر امپیریل سروس ٹروپس ریاست جوناگڑھ
صوبہ جات متحدہ میں۔ سیّد نور اللہ میاں سینٹرل ناظر جی شاہ جہاں پور۔
سیّد قاسم علی میاں گگڑا کلاں۔ شاہ جہاں پور۔

(۲) پیرانِ طریقت اور پیرزادوں کے لیے۔ مثلاً۔
صوبہ جات متحدہ میں۔ حضرت اچھے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ مارہرہ شریف۔
حضرت میاں شاہ فضل غوث صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ بریلی۔
حضرت مذاق میاں صاحب (حضرت مولوی محمد دلدار علی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ۔ بدایوں۔
حضرت احمد میاں صاحب سجادہ نشین گنج مراد آباد شریف۔
مولانا علی احسن صاحب عرف شاہ میاں، ایڈیٹر "فصیح الملک مارہرہ شریف۔
صوبہ بہار میں۔ مولانا حسن میاں صاحب، صاحبزادہ حضرت قاری شاہ سلیمان صاحب پھلواری۔
پنجاب میں۔ میاں میر۔ ان کا اصلی نام شیخ محمد تھا۔ دارا شکوہ کے پیر ملا شاہ کے پیر تھے ربیع الاول ۱۰۴۵ھ ہجری میں انتقال فرمایا اور لاہور کے قریب موضع ہاشم پور میں مدفون ہوتے جو اُن کے مزار کی وجہ سے "میاں میر" کہلاتا ہے اور جس کی چھاؤنی مشہور ہے۔
میاں غلام فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

(۳) عام درویشوں کے لیے مثلاً۔
"سلطان جی صاحب میں ایک نئے میاں صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں"۔

(۴) عام مسلمانوں کے لیے جو سادات، پیران طریقت، پیرزادوں میں سے نہیں ہیں لیکن جنھوں نے اسے معزز لقب سمجھ کر اپنے ناموں کے ساتھ شامل کر لیا ہے مثلاً۔
صوبہ بمبئی میں۔ میاں صاحب فیض اللہ بھائی لقمان جی۔ بی۔ اے ہیڈ ماسٹر انجمن

Marfat.com

اسلام اسکول بمبئی۔

جناب موٹا میاں صاحب والیٔ ریاست واجھا واقع ماہی کنٹا۔

سینٹرل انڈیا میں ۔ جناب میاں خدابخش صاحب ۔ رائی دوگری واقع ریاست بھوپال

جناب میاں کریم بخش صاحب والیٔ کھجوریا واقع ریاست بھوپال۔

جناب میاں یوسف محمد صاحب والیٔ جبریہ بھیل واقع ریاست بھوپال۔

پنجاب میں ۔ آنریبل خان بہادر جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب جج چیف کورٹ پنجاب

آنریبل خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب ۔ بیرسٹرایٹ لا ممبر ۔ پنجاب لیجسلیٹیو کونسل۔

میاں عبدالحمید صاحب بہادر، سب جج، گوجرانوالہ۔

میاں چراغ محمد صاحب رئیس جالندھر

(۵) معمولی گداگروں کے لیے مثلاً ۔ "میاں صاحب اس وقت برکت ہے۔"

(۶) ہندوستان کی غیر مسلم اقوام عموماً مسلمانوں کو اس نام سے خطاب کرتی ہیں مثلاً "میاں بھائی" ۔ "میاں جی" ۔ "میاں لوگ" ۔

(۷) ہندوستان کی غیر مسلم اقوام نے یہ دیکھ کر یہ لفظ اس قدر معزز ہے خود اپنے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا یا انھیں اسلامی درباروں سے بطور خطاب امتیازی عطا ہوا مثلاً۔

صوبہ پنجاب ۔ کشمیر میں ۔ خود حضور مہاراجہ صاحب بہادر جموں وکشمیر کے حکم سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

ضلع انبالہ میں ۔ میاں امر سنگھ و میاں سکھ درشن سنگھ رؤسائے رام گڑھ

میاں گوردروسن سنگھ و میاں پردمن سنگھ رؤسائے انبالہ۔

ضلع کانگڑہ میں ۔ میاں دلاور سنگھ رئیس تلوک پور، میاں کیوتھ سنگھ ولد میاں رودرا چند رئیس لمباگراؤں، میاں کشن سنگھ رئیس رائی، میاں اودھم سنگھ رئیس پرتھی پور، میاں نریندر سنگھ پسر میاں ہری سنگھ، میاں پرتھی سنگھ، میاں سچیت سنگھ و میاں شیر سنگھ برادران راجہ امر چند صاحب بہادر والیٔ نادون۔

ضلع ہوشیارپور، میاں رگھوناتھ سنگھ رئیس جسوان و میاں سورماچند رئیس ہوشیارپور

Marfat.com

کوہستان شملہ۔ رائے میاں ہیرا سنگھ بہادر والئ سانگری۔

چمبا۔ میاں بھورے سنگھ صاحب بہادر سی آئی ای۔

صوبہ بمبئی میں۔ میاں ابھے سنگھ جی امر سنگھ جی والئ تپا دراوالئ ماہی کنٹا۔

صوبہ بنگال میں۔ جہاں قطعی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ ہندو عصبیت نے مسلمانوں کی کوئی یادگار باقی چھوڑی ہوگی وہاں بھی ہندو بنگالیوں کے نام کے ساتھ میاں کا لقب شامل ہے مثلاً میاں بسنت کمار رائے و میاں سرت کمار رائے برادران بالو یہ مولا ناتھ رائے زمیندار راج شاہی۔

(۸) مالک و مملوک کے سلسلے میں مالک کو میاں کہتے ہیں مثلاً "میاں میاں اوپر غلام غلام نیچے"۔

(۹) آقا نوکر کے سلسلے میں آقا کو میاں کہتے ہیں مثلاً "نہ میاں کو اور نہ نوکر کو ٹھور۔

(۱۰) جورو خاوند کے سلسلے میں خاوند کو میاں کہتے ہیں مثلاً میاں بیوی کی لڑائی دودھ کی ملائی"۔

(۱۱) اردو بولنے میں عموماً ہر مخاطب کے لیے مثلاً " ارے میاں بیٹھو بھی کہاں جاؤ گے یا مثلاً اس شعر میں:

نازکی جس نے نہ دیکھی ہو رگِ گل کی کبھی
ہو میاں کیونکر اسے تیری کمر کا امتیاز

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ عام طور پر مسلمانوں اور ان کی دیکھا دیکھی بعض جگہ غیر مسلمانوں کے لیے تعظیماً استعمال ہوتا ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ زیادہ تر سادات کے لیے مستعمل ہوتا ہے اور باقی فرقے یا تو ان کی تقلید میں یا ان جیسی تعظیم خواہی کی خواہش میں اسے استعمال کرتے ہیں۔

(۳)

تحقیقات کا سلسلہ اس سے آگے چلنا مشکل تھا کہ ایک بزرگ کے تصرف سے یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ میں ایک دن بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں حضرت سید سالار مسعود

Marfat.com

غازی رحمت اللہ علیہ کا ذکر تھا۔ اس میں ایک جگہ اُنھیں میراں مسعود غازی لکھا تھا چونکہ انھیں عام طور پر غازی میاں کہتے ہیں اس لیے دفعتہً خیال آیا کہ عجب نہیں کہ میاں میراں کا مخفف ہو۔ اس خیال کو "میراں شیخ سدّو" کے نام سے اور تقویت ہوئی جنھیں عموماً "امروہے والے میاں" کہتے ہیں۔ غرض میں نے لفظ "میراں" کی مثالیں جمع کرنی شروع کیں جن سے معلوم ہوا کہ میراں کا لفظ جن مواقع پر استعمال ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) سادات کے لیے مثلاً۔

میراں جی (یعنی میراں عبدالقادر یعنی حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ)

میراں سیّد حسین جنگ سوار (جن کا مزار اجمیر شریف میں اوپر کی پہاڑی پر واقع ہے)

میراں سید سالار (مسعود غازی جن کا مزار بہرائچ میں ہے)

میراں سلم شہید رحمتہ اللہ علیہ (سیّد سالار مسعود غازی کے استاد جن کا مزار بدایوں میں ہے)

میراں سیّد (بدایوں کے محلے سیّد باڑہ کے ہر ایک سیّد کے نام کے ساتھ لفظ "میراں" لگایا جاتا تھا)

میراں کی سرائے (واقع بدایوں جس میں سیّد رہتے ہیں اور جسے علاءالدین شاہ دہلی کے بیٹے سید میراں حیدر نے تعمیر کیا تھا)

میراں صدر جہاں اکبر کے زمرۂ علماء میں ایک جیّد عالم و فاضل سیّد تھے جو تقریباً ۱۵۸۵ء میں بہ شرکت حکیم ہمام اکبر کی طرف سے عبداللہ خاں ازبک والیٔ توران کے دربار میں بطور سفیر گئے تھے (جہانگیر انھیں اپنی توزک میں جابجا میراں صدر جہاں لکھتا ہے)

(۲) پیرانِ طریقت اور پیرزادوں کے لیے مثلاً۔

صوبہ بمبئی میں۔ میراں داتار (ان بزرگ کی زیارت گجرات میں مہاراجہ گائیکوار کے علاقے میں ہے)

صوبۂ پنجاب میں۔ میراں بخش (عام نام ہے اور ولی داد کا ہم معنی ہے)

صوبۂ متحدہ میں۔ میراں جلال بدایونی (سکندر شاہ لودھی کے ہم عصر اور مولانا شاہ رفیع الدین کے شاگرد تھے۔ تقریباً ...ا ھ میں انتقال فرمایا۔ بدایوں میں مدفون ہیں)

(۳) عام درویشوں کے لیے۔ مثلاً۔

صوبہ جات متحدہ میں۔ میراں شاہ قاری (یہ صاحب کچھ عرصے تک دار العلوم ندوہ میں قرأت سکھاتے رہے)۔

میراں پور کٹرہ (جس میں مولانا قاسم علی شاہ کلیمی کا قیام ہے)

(۴) عام مسلمانوں کے لیئے جو سادات پیرانِ طریقت پیرزادوں اور درویشوں میں سے نہیں ہیں، لیکن جنھوں نے اسے معزز لقب سمجھ کر اپنے ناموں کے ساتھ شامل کرلیا ہے۔ مثلاً

ا۔ امیر تیمور صاحب قراں کے بیٹے کا نام میراں شاہ تھا جو باپ کی زندگی میں عراق آذربائیجان اور دیار بکر کا حاکم تھا اور جو تیمور کی وفات سے تقریباً تین سال کے بعد ۱۴۰۸ء میں قرا یوسف ترکمان سے لڑکر مارا گیا۔

ب۔ فرماں روایان خاندیش جن کی سلطنت ۱۳۷۰ء سے ۱۵۹۹ء تک رہی۔ اُن میں سات تاجداران ذیل کے نام کے ساتھ میراں کا لفظ ہے۔

(۱) میراں عادل خاں فاروقی ۱۴۲۷ء سے ۱۴۴۱ء تک

(۲) میراں مبارک شاہ فاروقی اول ۱۴۴۱ء سے ۱۵۰۳ء تک

(۳) میراں غنی عادل خاں فاروقی ۱۴۵۷ء سے ۱۵۰۲ء تک

(۴) میراں داؤد خاں فاروقی ۱۵۰۳ء سے ۱۵۱۰ء تک

(۵) میراں محمد شاہ فاروقی اول ۱۵۱۰ء سے ۱۵۳۷ء تک

(۶) میراں مبارک شاہ فاروقی ثانی ۱۵۳۷ء سے ۱۵۶۶ء تک

(۷) میراں محمد شاہ فاروقی ثانی ۱۵۶۶ء سے ۱۵۷۶ء تک

ج۔ احمد نگر کے خاندان نظام شاہی میں ایک تاجدار میراں حسین نظام شاہ ہوا ہے جو ۱۵۸۷ء یا ۱۵۸۸ء میں تخت نشین ہوا اور اگلے ہی سال مارا گیا۔

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ "میراں" ایک تعظیمی لفظ ہے جو زیادہ تر سادات کے لئے اور اُن کی تقلید میں غیر سادات کے لیئے استعمال ہوتا تھا۔ مرورِ زمانہ اور کثرتِ استعمال سے اس لفظ کی رائے مہملہ حذف ہوگئی اور "میاں" زبان زد خاص وعام ہوگیا۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے "حضرت" کو آج کل خاص موقعوں پر "حضت" کہتے ہیں۔

اس پر بظاہر ایک اعتراض عاید ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ میراں جمع کا صیغہ ہے جو میر پر الف اور نون دونوں لگانے سے بنا ہے پس وہ شخص واحد کے لیے کس طرح استعمال کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جمع کے اکثر صیغے بطور واحد اب بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً۔

رعایا۔ "میں تو آپ کی رعایا ہوں۔" حالانکہ رعایا رعیت کی جمع ہے۔

اولیا۔ "حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ"۔ حالانکہ اولیا ولی کی جمع ہے۔

اصول۔ "میرا یہ اصول نہیں۔" حالانکہ اصول اصل کی جمع ہے۔

ارباب۔ "ارباب شاہ پسند خاں صاحب رئیس پشاور۔" حالانکہ ارباب رب کی جمع ہے۔

مخادیم۔ "تم ایسے کہاں کے بڑے مخادیم بن کر آئے۔" حالانکہ مخادیم مخدوم کی جمع ہے۔

بوجوہ بالا ہمیں یقین ہے کہ "میاں" کا لفظ اصل میں "میراں" تھا جو کثرت استعمال سے مخفف ہو کر "میاں" ہوگیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میراں کو بھی حذف و تخفیف کے اسی سانچے میں ڈھلنا پڑا ہے جس میں میاں ڈھالا گیا۔ یعنی میراں بھی دراصل کچھ اور تھا۔

ہم نے اس کے متعلق بھی مزید تفحص کیا جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ میراں اصل میں میر میراں تھا اور وہ سادات اور ان کی تقلید میں عام مسلمانوں کا نام یا خطاب یا عہدہ ہوتا تھا اس کے ثبوت میں ہم ذیل کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) ابن بطوطہ ۷۴۲ھ میں واقعات کا ذکر کرتے ہوئے عین الملک کی بغاوت کے حالات میں لکھتا ہے: "میرا ہمراہی ایک شخص میر میراں کرمانی تھا۔"

(۲) حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف کے گرد خلیل اللہ خاں نے بعہد شاہ جہاں ۱۰۶۳ھ میں جو غلام گردش سنگِ سرخ کی تعمیر کرائی اس کے دروازۂ جنوبی پر یہ عبارت کندہ ہے۔

"درعہد اعلیٰ حضرت صاحبقران ثانی احقر العباد خلیل اللہ خاں ابن میر میراں الحسینی نعمت الہٰی کہ حاکم شاہ جہان آباد بود ایں ایوان را بر دور روضۂ متبرک مرتب نمود۔"

Marfat.com

(۳) تاریخ نادری میں مرزا مہدی خان نادر شاہ کا میر منشی ۱۱۴۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے۔

"ما ہیچہ رایت جہاں کشا نیز از یں طرف بہ باغ میر میراں دو فرسخے....... پرتو وصول افگند"۔

اس تمام تحقیقات اور گنج کاوی سے ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ "میاں" لفظ جسے ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بہادر والئی جموں و کشمیر اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ ان کی غیر مسلم رعایا کے ناموں کے ساتھ شامل ہو اصل میں "میر میراں" تھا جو باعتبار ترکیب خان خانان اور پیر پیران کا ہم پلّہ ہے اور جو بلحاظ معنی سید السادات اور امیر الامرا کا ہم پایہ ہے اور جو ریخ کھسٹ کر اپنی موجودہ شکل میں بھی ہزار ہا مسلمان و غیر مسلمان باشندگانِ ہند کا امتیازی اور اعزازی لقب ہے۔

پنجاب ریویو ——— سید محفوظ علی

۵ار اکتوبر ۱۹۱۰ء سید باڑہ، بدایوں

حدیثِ دیگراں

(۲۰)

مضمون "خطاب" اس زمانے میں رقم کیا گیا تھا جب کہ تحریک ترکِ موالات کل اہلِ ملک کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور خطاب یافتہ ہندوستانیوں میں ترکِ خطاب کی تبلیغ جاری تھی۔ "ملا صاحب" نے اپنے ولولۂ دینی میں مضمون تو حسبِ عادت بڑی تحقیق و تلاش کے بعد لکھ ڈالا مگر گمنامی کی خواہش، یا حد درجے کے انکسار کے باعث، یا بعض تنگ مزاجوں کے نزدیک "سرکاری مہمان" بنائے جانے کے اندیشے سے اُس زمانے میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ اب جو یہ مضمون شائع کیا جارہا ہے تو اس کی غایت تبلیغ نہیں ہے، بلکہ میں اسے ضروری جانتا ہوں کہ "ملا صاحب" کی محنت رائیگاں نہ جائے اور ادبِ اردو ان کی اس قیمتی تحریر سے محروم نہ رہے۔

لوگ، خصوصاً مسلمان خطاب یافتہ اپنے اعزازِ صلیبی سے دستکش ہو جائیں تو ان کے لیے یقیناً موقع ہے۔

دیباچہ رسالہ "خطاب" ظفر الملک علوی

"خطاب از ملا جی" ایک رسالہ کی صورت میں ترکِ موالات کے زمانے میں شائع ہوا۔ واپسی خطاب کے سلسلے میں لکھا گیا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ جتنے انگریزی خطاب ہیں یہ عیسائیت و فروغ تثلیث کے ہیں اور خلافِ مذہب ہیں۔

ذوالقرنین۔ بدایوں محمد سلیمان بدایونی

بدایوں نمبر

Marfat.com

خطاب

(انگریزی حکومت کی طرف سے جو خطابات دیئے جاتے ہیں ان کی علت حقیقت نوعیت اور ماہیت)

حکومت کا اپنے متوسلین و منتسبین کو خلعت و انعامات کے علاوہ خطابات سے سرفراز کرنے کا دستور بہت پرانا ہے۔ یونانی خطاب دیتے تھے۔ رومی خطاب دیتے تھے۔ ہندو خطاب دیتے تھے۔ مسلمانوں میں تو عہدِ رسالت ہی میں صدیق۔ عتیق۔ فاروق۔ ذوالنورین اسداللہ۔ سیف اللہ۔ امین الامتہ۔ وابستگانِ دامنِ شفاعت کے لیئے ذریعہ افتخارِ دارین ہو گئے تھے۔ خلافتِ عباسیہ بوجہ اپنی جلالت قدر کے بڑے بڑے تاجداروں تک کو خطاب عطا فرماتی اور وہ تبرکاً سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ محمود غزنوی کو اس کی فتوحات کی وجہ سے تاریخ چاہے اسکندرِ اعظم کا ہمسر ہی کہے مگر وہ اپنے مآثر تفاخر میں یمین الدولہ کے طرّے کو پایانِ عمر تک سرمایۂ نازش سمجھتا رہا۔ ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں میں بھی ابتدا ہی سے یہ طرزِ نوازش بہت عام تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے آخری زمانے میں تو خطاب باری کا طوفان اس درجے زوروں پر تھا کہ ایک ظریف رکنِ حکومت کے شوخ نگار قلم کو لکھنا پڑا "خانی در ہر خانہ ورائی در ہر بازار"۔

انگریز بھی اپنے ملک میں بہت پرانے خطاب بخش تھے مگر جب یہاں آئے تو سوداگر کا روپ بھر کر آئے تھے۔ اس لیے جب تک ترازو کی جگہ تاج نے نہ لے لی تقسیم خطابات کے لیے ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ اگرچہ کلکتے کا گودام علی ویردی خاں مہابت جنگ کے مرتے ہی سلطنت کا گہوارہ بن گیا تھا مگر ہمیں مطلق علم نہیں کہ صاحبانِ عالی شان کمپنی بہادر نے اپنی ساری تجارتی زندگی میں یعنی ۱۸۵۸ء سے قبل کسی ایک ہندوستانی کو بھی اپنی طرف سے کوئی باضابطہ خطاب عطا کیا ہو۔[1]

---

[1] تاریخ کی ورق گردانی کے بعد ایک مثال ملتی ہے اور وہ بھی اس کلیئے کا مستثنےٰ ثابت نہیں (باقی اگلے صفحے پر)

Marfat.com

انگریزوں کو خطاب دینا تو بڑی بات ہے معلوم ہے یہ تک انگریز جو میدان پلاسی
جیت کر اپنے آپ کو ہندوستان کا مالک مطلق سمجھنے لگے تھے خود ہی ذات کے لیے خطاب
چاہتے تو ایک ادنیٰ ہم کے بے اعتبار پیسے کے منصوبے مہر شخص ہاتھ ہی کا حرف رکتے تھے۔
انگریزی تاریخیں تو ایسی کوئی بات کہیں لکھتے نہ تھیں جس سے ان کا یہ پیسو دریعی عزت
نظر آتے۔ فارسی تاریخوں سے پوچھو کہ کرنل ثابت جنگ کون تھے؟ یہ ہندوستان میں
برطانوی قصر شاہنشہی کے معمار اول تھے جو لارڈ کلائیو (CLIVE) ہونے سے پہلے ثابت
جنگ بننا ہی اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور سنو۔ دلیر جنگ بہادر یہ کون تھے؟ یہ
ایڈمرل واٹسن (ADMIRAL WATSON) تھے۔ اور سنو۔ امیر الدولہ فتح جنگ بہادر
یہ کون تھے؟ یہ کمپنی کی افواج کے کمانڈر ان چیف جنرل گوڈرڈ (GODDARD) تھے۔
اور سنو۔ کرنل کیلیو (CALLIAUD) یہ کیا تھے؟ یہ کرنل سیف جنگ بہادر تھے۔
اور سنو۔ دو اور بھائی تھے جن کے ماں باپ نے تو ان کے نام محض ہنری اور جارج
(ونسی ٹارٹ) رکھے تھے مگر ہندی دفاتر کے قلموں کی زبانیں پہلے کو شمس الدولہ نصیر الملک
بہادر اور دوسرے کو ہوشیار جنگ بہادر کے ناموں سے پکارتی تھیں۔ جانتے ہو

(بقیہ صفحہ گزشتہ)
ہوتی۔ نواب مبارک علی خاں ہمایوں جاہ نے جو میر جعفر کے پوتے کے پوتے مرشد آباد
کے پنشن خوار نواب اور نظامت بنگالہ کی تربت کے مجاور تھے ۱۸۳۲ء میں اپنے ایک
معتمد ڈبلیو چینری (W. Chinery) کے ہاتھ ملکہ وکٹوریہ کے چچا شاہ ولیم چہارم
(۱۸۳۰ء تا ۱۸۳۷ء) کی خدمت میں کچھ تحفے و ہدایا بھیجے۔ جن کے بدلے میں شاہ ولیم
نے نواب کو گرانڈ کراس آف دی رائل ہنوویرین گلفک آرڈر Grand Cross
of the Royal Hanoverian Guelphic order.
کا خطاب و خلعت روانہ کیا۔ نواب صاحب بہادر خلعت پہن کر اور تمغہ لگا کر بہت
کچھ محظوظ و مفتخر ہوئے۔ دربار کیا۔ انعام اکرام دیا۔ مگر تھوڑے ہی دن گزرے تھے
کہ تمغے کے جواہرات کلکتے کے بازاروں میں بکتے پھرے۔ مصنف

Marfat.com

خود بدولت ناظم بنگالہ کس خطاب سے مخاطب تھے ؟ عماد الدولہ جلادت جنگ وارن ہیسٹنگز (WARREN HASTINGS) بہادر جنرل لیک (LAKE) فاتح علی گڈھ و بھرت پور کا نام جن الفاظ کو مدتوں اپنا سرتاج بنائے رہا وہ شاہ عالم کے بخشے ہوئے خطاب ہی کے اجزا تھے۔ انگریز تو انگریز فرانسیسی بھی اس قسم کے خطابوں کو اپنی کلاہِ تفاخر کا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ نواب آصف جاہ دکن کے تیسرے بیٹے صلابت جنگ جب مسند آرائے سلطنت ہوئے تو فرانسیسی سردار مسیو بوسی (MONSIEU BUSSEY) کو انھوں نے سیف الدولہ عمدۃ الملک غضنفر جنگ بہادر خطاب۔ ہفت ہزاری منصب مع علم نقارہ و ماہی مراتب عطا کیا اور اپنی سفارش سے بادشاہ دہلی سے خلعت و سرپیچ و فیل خاص دلوایا (دولت آصفیہ و حکومت برطانیہ)

مسٹر کول بروک۔ منصور جنگ ضیاء الملک روشن الدولہ بہادر (تذکرۂ کاملان رام پور صفحہ ۱۱)

سر چارلس مٹکاف (CHARLES METCALFE) اخلاص یار خاں صولت جنگ مختار الملک منتظم الدولہ بسر چارلس مٹکاف بہادر بیرونٹ گورنر آگرہ (تذکرۂ کاملان رامپور صفحہ ۴۶۷)

مسیو بوسی۔ سردارِ نصاریٰ فرانسیسی بہ خطاب عمدۃ الملک سیف الدولہ ناموری اندوخت (مآثر الامرار جلد اوّل صفحہ ۲۵)

یہی نہیں بلکہ کمپنی بہادر کا ناظم اعلیٰ جب کبھی اپنے کسی متوسل کی عزت افزائی خطاب کی شکل میں چاہتا تو اس کے دینے کی خواہش پنشن خوار شاہ عالم یا اطاعت شعار نواب ناظم ہی سے کی جاتی۔ مثلاً جب مرشد آباد کے جگت سیٹھ خوشحال چند کی جگہ اس کا عزیز ہرک چند بٹھایا گیا تو جگت سیٹھ کا خطاب دربار دہلی سے منگایا تھا یا مثلاً جب موجودہ مہاراجہ قاسم بازار سرمانندرچندر نندی کے مورث اعلیٰ کانتا بابو (کرشنا کانت نندی) کو نوازنے کی ضرورت ہوئی تو وارن ہسٹنگز بہادر نے اس کے بیٹے ترلوکی ناتھ کو مرشد آباد کے نواب ہی سے مہاراجہ بہادر کا خطاب دلوایا تھا۔

Marfat.com

گورنمنٹ برطانیہ اب جو خطابات دیتی ہے وہ محض بہ جلدوے کارگزاری ہی نہیں ہوتے بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جنھیں پیش نظر رکھ کر خطابی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اگر ہمیں بدمذاقی کا الزام نہ دیا جائے تو ان سب صورتوں کے لیے کسی قدر تکلّف و آورد سے کام لے کر ذیل کے عنوانات قائم کریں:

صلۂ خدمت۔ ملازمین و متوسلین حکومت کی جا و بے جا جاں فروشیوں کی داد دہی۔

ثمرۂ لیاقت: صاحبانِ علم و فن کی ہمت افزائی و قدر فرمائی۔

طرّۂ ریاست: والیانِ حکومت و ریاست و ارباب دولت کی علو مرتبت کا اظہار یا ان کی مہمان نوازی و وفا شعاری کا اعتراف۔

ہدیۂ محبّت: ممالک غیر کے بادشاہوں۔ شاہزادوں اور اعیان سلطنت سے تبادلۂ اخلاق۔

معاوضۂ اعانت: کسی غیر سلطنت یا ریاست کے کسی ایسے مدار علیہ یا رکن رکین کی تالیف و تدہین جس کے کسی فعل یا ترکِ فعل سے اُس سلطنت یا ریاست کے دربار میں نفع یا نقصان واقع ہو یا ہوتا یا ہو سکتا ہو اور وہ نفع یا نقصان برطانوی مقبوضات یا برطانوی اغراض و مقاصد پر کوئی مفید یا مضر اثر ڈال چکا یا ڈلتا یا ڈال سکتا ہو۔ نیز ہر اُس غیر اور بے تعلق شخص کی عزت افزائی جو برطانوی اغراض و مقاصد کی حفاظت و اشاعت میں امداد و اعانت پر مجبور و مکلف نہ ہونے کے باوجود مدد دے چکا یا دے رہا یا دے سکتا ہو۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ سرکار جو خطاب عطا کرتی ہے اُن میں سب سے اونچا "سر" ہے لیکن یہ اصلیت شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ "سر" اصل میں کوئی خطاب نہیں بلکہ محض ذریعۂ اظہار اعزاز خطاب ہے۔ جو شخص اپنے نام سے پہلے "سر" لکھنے کا استحقاق رکھتا ہے ضرور ہے کہ وہ نائیٹ (KNIGHT) یا بیرونٹ (BARONET) کا خطاب رکھتا ہو اور جو شخص نائیٹ کا خطاب رکھتا ہو وہ یقیناً اپنے نام سے پہلے "سر" لکھنے کا استحقاق رکھتا ہے۔ چنانچہ سر سالار جنگ اعظم سے لے کر سر عمر حیات خاں ٹوانہ تک جتنے سر ہیں سب کے سب نائیٹ ہیں۔

ایسی حالت میں ضرور ہوا کہ پہلے نائیٹ کی تشریح و تعریف کی جائے۔

نائیٹ

KNIGHT

مغربی قرون وسطیٰ کے دورِ تاریک میں جب کہ زور حق کا مرادف سمجھا جاتا تھا جب کہ جان و مال کی حفاظت نیروئے دست اور قوتِ بازو ہی کے سر تھی اور جب کہ کسی شخص کا زبردست ہونا ہی اس امر کا ثبوت تھا کہ اسے کمزور کے جان و مال اور عزت و آبرو پر ہر قسم کا اختیار حاصل ہے یورپ میں بہادری کا ایک نظام تھا جسے شولری (SHIVALRY) کہتے ہیں۔

کوئی شخص جو جسم میں طاقت اور دل میں ہمت رکھتا تھا اپنی شجاعت کے جوہر اس وقت تک نہیں دکھا سکتا تھا جب تک وہ اس نظام کے ماتحت بہادروں کے زمرے میں شامل نہ ہولے اور بہادروں کے زمرے میں وہ صرف اسی وقت شامل ہو سکتا تھا جب وہ باقاعدہ نائیٹ بنالیا جائے[1] نائیٹ بن جانے کے بعد اسے اپنی زندگی جنگجوئی کے مصائب، نام آوری کی خواہش اور صنف نازک کی خدمت کے لیے وقف کرنی پڑتی تھی[2]

نائیٹی[3] کی رسم یورپ کی بربریت و بت پرستی کی یادگار ہے۔ جو مسیحیت کے غلبے کے بعد بھی بہ ادنیٰ تغیر قائم رہی۔ جو شخص نائیٹوں کے گروہوں میں شامل ہونا چاہتا تھا لازم تھا کہ وہ ایک معتدبہ زمانہ تک کسی بڑے نائیٹ یا رئیس کی خدمت

---

[1] نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا (مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء) جلد ۹ صفحہ ۲۱۳۔ مصنف

[2] نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا (مطبوعہ لندن ۱۹۰۶ء) جلد ۳ صفحہ ۳۱۹ مصنف

[3] جس طرح ڈاکٹر سے ڈاکٹری، اسسٹنٹ سے اسسٹنٹی اور مجسٹریٹ سے مجسٹریٹی بنالیے گئے ہیں اسی طرح ہم نے نائیٹ سے نائیٹی بنایا تو قابل معافی ہیں مصنف

[4] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ، مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۸ ہ و ۹ ہ۔ مصنف

Marfat.com

میں پہلے خادم کی حیثیت سے اور اس کے بعد سلاح دار کے طور پر رہ چکا[1] ہو کم از کم اکیس (۲۱) سال کی عمر کے جوان کو نائیٹ بنایا جاتا تھا۔ خاص حالات مستثنیات میں[2] تھے۔ مخصوص رسوم کی بجا آوری کے بعد اُس سے چند عہد لیے جاتے۔ اس کے بعد کوئی پرانا نامی نائیٹ اس کے ہاتھ میں تلوار دے کر کہتا۔ "میں تجھے نائیٹ بناتا ہوں۔ اپنے عہد پر قائم رہنا" اس وقت سے یہ نو ساختہ نائیٹ سرفروشی و نبرد آزمائی اور پرستاریٔ صنفِ نازک کے لیے کمربستہ رہتا۔

یورپ میں نائیٹی کی یہ حالت تھی کہ یکایک گیارہویں صدی کے آخر میں وہ زبردست طوفان اٹھا جس کے تلاطم سے مغربی نظام رسمی و عملی کی کوئی عمارت دیر یا بعد خاویۃ علیٰ عروشہا ہونے سے نہ بچ سکی۔ اس زبردست طوفان کو جس نے مغرب کے پاپائی تنور سے ابل کر سارے مشرق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تاریخ جس نام سے یاد کرتی ہے وہ ہے" حروب صلیبیہ[3]"۔ جب "حروبِ صلیبیہ" کے ہیجان عظیم نے پاپائے اعظم کی معصوم زبان سے جہاد کا اعلان کرایا اور مسلمان دشمن دین کے ناپاک ہاتھوں سے پاک سرزمین کو نکل لینے کے لیے لڑائی کرنا ایک مقدس فرضِ مذہبی قرار دیا تو مسیحی کلیسا نے منجملہ اور طاقتوں کے اس فرقے کی طاقت سے بھی کام لیا۔ صلیبی لڑائیوں ہی نے نائیٹی میں ایک مذہبی شان پیدا کر دی[4]۔ چنانچہ اعلانِ جہاد کے بعد نائیٹی مسیحیت کا ایک رکن قرار پائی اور عہدِ ظلمت کے پرانے مراسم و مواثیق میں حسبِ موقع تبدل و ترمیم کے بعد کلیسا کے زیرِ عاطفت نائیٹ بنائے جانے لگے جن کا رتبہ اولیائے مذہب کے مساوی تسلیم کیا

---

[1] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۹ صفحہ ۲۱۴ و جلد ۳ صفحہ ۳۱۰۔ مصنف

[2] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۳۲۰۔ مصنف

[3] "حروبِ صلیبیہ" پر جو حاشیہ مصنف نے تحریر کیا تھا وہ اس مضمون کے ضمیمہ اوّل میں درج کیا جاتا ہے۔ مولف۔

[4] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۳۲۰ و ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ ٹی۔ اے آرچر (T.A.ARCHER) سی۔ ایل کنگسفورڈ (C.L.KINGSFORD) مطبوعہ شام اودھ پریس صفحہ ۱۹۹۔ مصنف

گیا[۱]۔ نائیٹی کا امیدوار روزہ رکھتا، غسل کرتا اور مقتدایانِ مذہب کے روبرو اپنے گناہوں کا اقرار کرتا[۲]۔ وہ ان الفاظ کا بھی اعادہ کرتا جو بپتسمہ دیتے وقت کہے جاتے ہیں۔ پھر اس سے طرح طرح کے عہد لیے جاتے[۳]۔ اس کے بعد نائیٹ بنانے والے پادری اس کے دینی باپ کی تلوار اس کے ہاتھ میں دے کر خدا، حضرت مریم اور سینٹ میکائل (St. MICHAEL) یا سینٹ جارج (St. GEORGE) کے نام پر اسے نائیٹ کا خطاب دیتے[۴]۔ نائیٹ بنانے وقت تلوار کے پھل کے چپٹے حصے سے امیدوار کی گردن چھو کر یہ الفاظ کہے جاتے "میں خدا اور سینٹ میکائل (St. MICHAEL) (یا باپ یا بیٹے اور روح القدس) کے نام پر تجھے نائیٹ بناتا ہوں۔ وفادار رہ بہادر رہ اور خوش نصیب رہ[۵]"

جو محبت، نائیٹ کو حضرت مریم سے ہوتی وہ متبرک سمجھی جاتی اور اس کی شان اس اطاعت میں نظر آتی جسے وہ خاصتہً اس نازنین کے مقابلے میں ظاہر کرتا جو اس کے دل کی مالک ہوتی۔ نائیٹ غیر شخص کی منکوحہ پر بھی عاشق ہو سکتا تھا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا[۶]۔

اگر افسانے کو تاریخی مواد میں شامل سمجھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیوں کے نزدیک نائیٹ کا عہدہ کسی بے دین (مسلمان) کو حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے شخص کو یہ

۱؎ ترجمہ تاریخ حروبِ صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۴۸، ۴۹ مصنف

۲؎ نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۳ صفحہ ۳۲۰۔ مصنف

۳؎ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ۔ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۵۰۔ یہ سینٹ میکایل اور سینٹ جارج وہی ہیں جن کے نام پر خطابی کے مخصوص طبقے قائم ہوتے جن کے حالات آگے چل کر پڑھو گے۔ مصنف

۴؎ نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۳ صفحہ ۳۲۰۔ مصنف۔

۵؎ نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد صفحہ ۳۲۰۔ مصنف

۶؎ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس لکھنؤ صفحہ ۵۰۔ مصنف

۷؎ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ۔ مصنفہ آرچرو کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ صفحہ ۱۹۹۔ مصنف

رتبۂ عطا کرنا ایسا تھا جیسا کسی مزبلے کی عفونت کو حریر و دیبا میں لپیٹنا۔[1]

حروب صلیبیہ کے زمانے میں نائیٹی کے جو تین زبردست اور قابلِ اعتنا جنگجو طبقے قائم ہوئے جنھوں نے ایک طرف تو مسلمانوں کی خوں ریزی کر کے دینی برکت اور دوسری طرف فتوحات نقدی و ارضی پاکر دنیوی ثروت حاصل کی ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ نائیٹس ہاسپٹلرس KNIGHTS HOSPITALERS

۲۔ نائیٹس ٹیمپلرس KNIGHTS TEMPLARS

۳۔ ٹیوٹانک TEUTONIC KNIGHTS

ہر ایک کا تھوڑا تھوڑا حال سنو۔

نائیٹس ہاسپٹلرس (KNIGHTS HOSPITALERS)

یہ ایک نہایت مشہور مذہبی فوجی طبقہ تھا جسے نائیٹس آف سینٹ جان (St. JOHN) نائیٹس آف روڈس (RHADES) اور نائیٹس آف مالٹا (MALTA) بھی کہتے تھے۔ عربی تاریخوں میں فرقۂ اسبتاریہ[2] اسی طبقے کا نام ہے۔

شہر ایملفی (AMALFI) واقع اٹلی کے چند تاجروں نے ظاہر لاعزاز دین اللہ[3] ابو ہاشم علی بن حاکم خلیفہ مصر کی اجازت سے تقریباً ۱۰۲۳ء[4] میں غریب اور علیل عیسائی زائروں کی خدمت کے لیے بیت المقدس میں یوحنا اصطباغی کے نام پر ایک ہسپتال اور ایک

---

[1] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچر و کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ صفحہ ۱۹۹۔ مصنف

[2] اسبتار، ہسپتال کا معرب ہے۔ جن مقامات میں عربی بولی جاتی ہے وہاں آج بھی ہسپتال کو اسبتار یا اسبتال بھی کہتے ہیں۔ مصنف

[3] مصر کا ساتواں فاطمی خلیفہ جس نے ۴۱۱ھ مطابق ۱۰۲۰ء سے ۴۲۷ھ مطابق ۱۰۳۶ء تک حکومت کی۔ مصنف

[4] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچر و کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ صفحہ ۱۲۲۔ مصنف

خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ جب حروبِ صلیبیہ کا طوفان برپا ہوا تو مریضوں اور ضعیفوں کی خدمت کرتے ہی کرتے یہ مرتاض راہب دفعتاً جنگجو سپاہی ہو گئے اور جہاں ہاتھ پڑا وہاں قطعاتِ ملک پر قبضہ کر بیٹھے۔ یہاں تک کہ ۱۱۱۸ء میں انھوں نے ایک زبردست فوجی طبقے کی صورت اختیار کرلی اب خدمتِ خلق کے علاوہ ان کا بڑا فرض "بے دینوں" کے مقابلے میں کلیسا کی حمایت قرار پایا۔[۴۲] یہ طبقہ پونے دو سو برس تک مسلمانوں کے مقابلے میں صف آرا رہا۔ جب سلطان خلیل ملک الاشرف ابن منصور قلاؤن نے عکہ کو (جو سو برس سے عیسائیوں کے قبضے میں تھا) ۱۲۹۱ء میں فتح کر کے لاطینی سلطنت کے کھنڈر کی اینٹ تک نکال پھینکیں تو یہ طبقہ عکہ سے نکل کر پہلے جزیرۂ قبرص پر اور وہاں سے بھی نکالے جانے پر ۱۳۰۹ء میں رودس پر قبضہ کر کے تقریباً دو سو برس تک وہاں جمع رہا۔ جب عثمانی سلطان سلیمان ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۵۲۲ء میں اسے رودس سے بھی نکالا تو عرصے تک اٹلی و فرانس کے بہت سے مقامات کی خاک چھاننے کے بعد چارلس پنجم شہنشاہ جرمنی و شاہ فرانس (۱۵۱۶ء تا ۱۵۵۶ء) نے اسے ۱۵۳۰ء میں تین جزیرے مالٹا، گوزو (GOZO) اور کامینو اس شرط پر دیئے کہ وہ ہمیشہ "بے دینوں" سے برسرِ پیکار رہے۔[۴۳] چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس طبقے نے اپنی مدتِ حیات تک اس شرط کو اپنے مقدور بھر پورا کیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک ترکوں سے برابر دست و گریباں رہا۔[۴۴]

اب یہ طبقہ دوسرے عالم میں اپنے بانیوں کی مہمانی سے بہرہ اندوز ہو رہا ہے۔ اس عالم میں اس کے نام لیوا آرڈر آف سینٹ جان آف جیروسلم (ST. JOHN OF JERUSALEM) اور سینٹ جانس ایمبولینس ایسوسی ایشن (ST. JOHN'S AMBULANCE ASSOCIATION) رہ گئے ہیں۔ آخر الذکر کی فہرست اراکین میں بہت سے اہلِ ہند کا نام اور اس کے صندوق خزانہ میں "بے دینوں" کا روپیہ ہے۔

اس طبقے میں تین درجے یعنی نائیٹ (مسلح سپاہی) ائمہ مذہب (پادری) اور خدام (بیماروں اور زائرین کے خدمتی) ہوتے تھے سردار اعلیٰ کا لقب گرانڈ ماسٹر

---

[۴۲] نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۸ صفحہ ۴۶۔ مصنف

(GRAND MASTER) تھا۔ مذہبی امور کا نظم و نسق ایک مجلس کے ہاتھ میں تھا جسے چیپٹر (CHAPTER) کہتے تھے۔ گرانڈ ماسٹر اس چیپٹر کا صدر ہوتا تھا۔ اس طبقے کے نائیٹ سیاہ لمبا چوغہ پہنتے اور سینے پر طلائی ہشت گوشہ مالٹائی صلیب لگاتے تھے۔[1] گرانڈ ماسٹر کے ماتحت ایک عہدہ نائیٹ کمانڈر بھی ہوتا تھا۔[2]

نائٹس ٹمپلرس (KNIGHTS TEMPLARS)

برگنڈی (BURGUNDY) کے ایک سورما ہیوڈی پین (HUGH DE PAYENS) نے جو بارھویں صدی کے اوائل میں زیارت بیت المقدس کو آیا تھا[3]۔ جب دیکھا کہ ہاسپٹلر نائیٹ تیمار داروں کے مرنجا مرنج لباس کی جگہ فوجی وردی پہن کر خادم سے مخدوم اور مملوک سے مالک ہو گئے تو اس کے دہان آز میں پانی بھر آیا اور اپنے آٹھ رفیق نائیٹوں کی مدد سے اس نے ۱۱۱۸ء ہی میں[4] اس طبقے کی بنیاد ڈالی۔ بالڈون ثانی شاہ یروشلم[5] نے خاص شہر مقدس میں ہیکل سلیمانی سے مشرقی

---

[1]۔ نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۸ صفحہ ۴۶۔ مصنف

[2]۔ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچرڈ کنگسفورڈ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنؤ صفحہ ۱۲۳
خطابی نائیٹوں کے تقریباً ہر طبقے میں بھی گرانڈ ماسٹر ہوتا ہے اور تقریباً ہر مجلس طبقے کو اب بھی چیپٹر ہی کہتے ہیں اور بعض طبقوں میں اب بھی نائیٹ کمانڈر (KNIGHT COMMANDER) ہوتے ہیں۔ نائیٹوں کے اکثر طبقوں میں اب بھی چوغہ داخل خلعت ہے اور ہشت گوشہ مالٹائی صلیبیں اب بھی تمغوں میں داخل ہیں جیسا کہ آگے پڑھو گے۔ مصنف

[3] ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچرڈ کنگسفورڈ۔ مطبوعہ شام اودھ پریس لکھنو صفحہ ۱۲۲۔ مصنف۔

[4] نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۶۲۔ مصنف

[5] مصنف کا درج کردہ حاشیہ اس مضمون کے ضمیمۂ ثانی میں ملاحظہ ہو۔

(مولف)

Marfat.com

جانب خانقاہ کے لیے زمین عنایت کی[۵۱]۔ اس طبقے والوں نے مسجد اقصیٰ کو اپنا گرجا قرار دیا[۵۲]۔ اسی وجہ سے انھیں ٹیمپلرس (اہلِ معبد) کہنے لگے۔ عرب مورخین اسی طبقے کو فرقہ دادیہ کہتے ہیں۔

ابتدا ہی سے جنگجوئی اور ملک گیری اس طبقے کا مطمح نظر اور "بے دین" مسلمانوں کے مقابلے میں مذہبِ مقدس اور مقبرۂ مبارک کی حفاظت و صیانت مقصدِ حیات تھا۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک ہر جگہ مسلمانوں کے مقابل صف آرا رہا۔ ۱۲۹۱ء میں جب ہاسپٹلرس کی طرح یہ بھی سرزمین قدس سے نکالا گیا تو جزیرۂ قبرص ہی میں آیا۔ اس طبقے کی طاقت و دولت، نخوت و رعونت یورپی طاقتوں کی نظر میں شروع ہی سے کھٹکتی تھی۔ چنانچہ یورپی طاقتوں ہی کے ہاتھوں چودھویں صدی کے آغاز میں اس کا قلع قمع ہو گیا[۵۳]۔

اس میں بھی تین درجے نائیٹ، مصاحب اور خدام تھے۔ بعد میں پادری بھی شامل کیے گئے[۵۴]۔ اس کے سردارِ اعلیٰ کا لقب بھی گرانڈ ماسٹر ہی تھا جو بوجہ تقدسِ طبقہ بادشاہِ ملک کا ہمسر سمجھا جاتا تھا۔ اور باعتبار جلال و جبروت یورپ کے بڑے سے بڑے تاجدار کو خاطر میں نہ لاتا تھا[۵۴]۔

نائیٹ سفید چوغہ پہنتے اور سرخ ہشت گوشہ مالٹائی صلیب قلب پر لگاتے تھے[۵۵]۔

ٹیوٹانک نائیٹس
(TEUTONIC KNIGHTS)

فریڈرک ڈیوک آف سوابیا (FREDERICK DUKE OF SUABIA) فریڈرک اول باربروسہ (FREDERICK I BARBAROSA) شہنشاہ جرمنی کا بیٹا تھا جو باپ کے ساتھ تیسری صلیبی لڑائی میں شریک ہو کر مشرق میں آیا۔ جب جون ۱۱۹۰ء میں فریڈرک باربروسہ مرا تو یہ باپ کی جگہ جرمن لشکر کا سردار مقرر ہوا اور ۸ اکتوبر ۱۱۹۰ء کو زمرۂ محاصرین میں شریک ہونے کے لیے عکہ پہنچا[۵۶]۔ دوران محاصرہ میں اس نے ہاسپٹلرس اور ٹیمپلرس کی

۵۱۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵ نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۶۲۔ مصنف

۵۲۔ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۹۵۔ مصنف

۵۶۔ نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۲۰۴۔ مصنف

دیکھا دیکھی مرنے سے تین مہینے پہلے اکتوبر ۱۱۹۰ء میں اس طبقے کی بنیاد ڈالی جس کے اراکین صرف اپنے اہلِ وطن ہی مقرر کیے۔

ظاہر ہے کہ اس طبقے کا مقصد و منشا وہی تھا جو نہ صرف ہاسپٹلرس اور ٹمپلرس کا بلکہ ہر صلیبی بہادر کا تھا یعنی "بے دینوں" کے مقابلے میں مذہب کلیسا کی حفاظت و صیانت[1]۔ اس مقدس مقصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس طبقے نے دولت و حکومت میں بڑی ترقی کی[2]۔ پہلے اس کا صدر مقام بھی عکہ ہی تھا۔ جب ۱۲۹۱ء میں اور طبقوں کی طرح یہ بھی ارض مقدس سے نکالا گیا، تو پہلے وینس (VENICE) میں اور وہاں سے ۱۳۰۹ء میں میرین برگ (MARIENBERG) میں آیا۔ یہیں پندرھویں صدی کے آغاز میں بدر ہوا اور یہیں محاق شروع ہو کر آخر میں پھر ہلال ہو گیا۔ پولینڈ (POLAND) سے لڑائی ہونے کے بعد مشرقی پروشیا (PRUSSIA) طبقے کے ہاتھ سے نکل کر گرانڈ ماسٹر کی ذاتی ملکیت ہو گیا۔ آخر میں یہ طبقہ اپنے سابقہ جاہ و جلال کا محض لفافہ ہی لفافہ رہ گیا تھا۔ نپولین نے اس لفافے کو بھی پھاڑ کر پرزے پرزے اڑا دیئے اب آسٹریا کے ایک نواب نادرے کو برائے نام اس طبقے کا سردار رکھا جاتا ہے[3]۔

اس طبقے میں بھی نائیٹ (مسلح سپاہی)، ائمہ مذہب (پادری) اور خدام (بیماروں اور تیمارداروں کے خدمتی) تھے بلکہ ایک درجہ اخوان[4] کا زیادہ تھا۔ سردار اعلیٰ کا لقب بھی گرانڈ ماسٹر ہی تھا[5]۔

نائیٹوں کا لباس سیاہ تھا جس پر وہ سفید چوغہ پہنتے اور نقرئی کناروں والی سیاہ صلیب لگاتے تھے[6]۔

یہ نائیٹوں کے وہ ممتاز طبقے تھے جو اُس زمانے میں جبکہ مذہبی آندھیاں زور شور سے چل رہی

۱؎ نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۷۴۔ مصنف

۲؎ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچر و کنگسفورڈ شام اودھ پریس ص ۱۲۹ مصنف

۳؎ نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۷۴۔ مصنف

۴؎ ترجمہ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ آرچر و کنگسفورڈ صفحہ ۱۲۹۔ مصنف

۵؎ و ۶؎۔ نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۷۴۔ مصنف

Marfat.com

تھیں مذہبی آسمان کے نیچے اور مذہبی زمین کے اوپر قائم ہوئے۔ یہیں انھوں نے "بے دینوں" سے جدال و قتال جاری رکھ کر اپنا مقصد آفرینش پورا کیا۔ یہیں وہ دولت و حکومت حاصل کی جس کے باعث آگے چل کر محسود اقران و اماثل ہوئے۔ جب یورپ کے تاجدار انھیں ارض مقدس میں پھلتا پھولتا دیکھ کر اپنے اپنے ملک کو سدھارے تو انھی کے نمونوں پر انھوں نے اپنے یہاں بھی نائیٹوں کے طبقے جاری کیے۔ مگر وہاں کا زمین و آسمان ہی اور تھا۔ وہاں "بے دین" کہاں تھے جن سے سرگرم جنگ رہ کر ان کی گرمیٔ بازار ہوتی۔ اس کے علاوہ حکومت کو کب منظور تھا کہ ایک مستقل جداگانہ خودسر اور جنگجو فوج بنا کر آستین میں سانپ پالے۔ لہذا بجائے اس کے کہ یہ طبقے بدمزاج، کھردرے، جنگجو اور مذہب کے دلدادہ سپاہیوں پر مشتمل ہوتے جن کا کام سر دینا اور سر لینا ہوتا، خوش مزاج چکنے چپڑے، صلح پسند اور سوسائٹی کے فریفتہ رنگیلوں سے مرکب ہوئے۔ جن کا کام دل دینا اور دل لینا تھا۔ صلیبی نائیٹ اپنی دلیری سے میدان رزم کو گرماتے تھے۔ خطابی نائیٹ اپنی دلبری سے مجلس بزم کو گرمانے لگے۔ باقی ہر اعتبار سے یہ نائیٹ انھیں مردوں کی عکسی تصویر تھے یعنی وہی چوغہ، وہی صلیب، "دی گرانڈ ماسٹر"، "دی کمانڈر"، وہی مصاحبی۔ پہلی نائیٹی کا محرک مذہب تھا اب اس کی جگہ فیشن ہوا۔ پہلے انتقام تھا اب اقتدار ہوا۔ یوں سمجھو کہ صلیبی نائیٹی ایک گرجا تھی جس کے نقشے اور نمونے پر یورپ نے اپنے اپنے ڈرائنگ روم (DRAWING ROOM) کی بنا ڈالی اور جب وہ گرجا ٹوٹا تو اسی کے ملبے اور عملے سے ڈرائنگ روم کی عمارت مکمل کی اور اسی کے فرنیچر اور سامان آرائش سے اسے سجایا۔ چنانچہ نگاہ تعمق فوراً بتا دے گی کہ وہی گرجا کی متبرک تصویریں ہیں جو دیواروں پر لٹکتی ہیں وہی صلیبیں ہیں جو گوشوں میں کھڑی ہیں وہی قربان گاہ کی شمعیں، وہی مالائیں، وہی متبرک پانی اور عشائے ربانی کے پیالے ہیں جو کارنس پر چنے ہوتے ہیں۔

دولت برطانیہ نے خطابی نائیٹی کے جو طبقے وقتاً فوقتاً قائم کر کے صلیبی زمانے کی یاد تازہ کی ان کی تعداد جہاں تک ہمیں معلوم ہے دس ہے ان میں سے دو تو بہت قدیم انگلستانی طبقے ہیں۔ ایک اسکاٹ لینڈ کے شمول کے بعد اس کی خاطر سے اور آئرلینڈ کے الحاق کے بعد اس کی خاطر سے بڑھایا گیا ہے۔ ہندوستان بڑا خوش نصیب ہے کہ اس کے ساتھ

سلطنت کو جو دوہری محبت ہے اس کا اظہار دو طبقوں کی شکل میں ہوا ہے۔ اہلِ ہند کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ کھانے کو چاہے روٹی ملی یا نہ ملی مگر پہننے کو تو ایک چھوڑ دو دو تمغے ملے باقی چار طبقے تمام ممالک محروسہ زیر قلم رو برطانیہ و نیز ممالک خارجیہ کے لیے عام ہیں۔

ہم نے جو یہ کہا ہے کہ ہندوستان کے نام سے دو طبقے قائم کیے گئے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ محض اہلِ ہند کے لیے مخصوص ہیں اور ہندوستانیوں یا ان انگریز حکام کے سوا جو ہندوستان میں ملازم و موجود ہیں اور کوئی شخص ان میں شامل ہی نہیں ہو سکتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ یورپی جس نے ملازمت، تجارت، سیاحت یا اور کسی خفیہ یا علانیہ غرض سے ہندوستان میں قدم رنجہ کیا ہو یا ولایت ہی میں اسے ہندوستان سے کوئی مادی یا ذہنی واقعی یا خیالی قریب یا بعید تعلق ہو یا رہ چکا ہو اور نیز ہر وہ ایشیائی جس نے کالے کوسوں گھر بیٹھے اپنے آپ کو زیر عنوان "معاوضہ اعانت" مستحق خطاب ثابت کیا ہو ان دونوں طبقوں کا رکن بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ خدیو مصر، سلاطین زنجبار و مسقط و عمان و لاہج و جوہور، شہزادہ سلطان مسعود مرزا امین الدولہ ظل السلطان ایران، ہز اکسیلینسی حسین قلی خاں مختار الدولہ ایران، ہز مجسٹی شہنشاد کوریا اور اس قسم کے بہت سے مغربی و مشرقی جن کے نتھنوں میں کبھی ہندوستان کی ہوا اور جن کے دماغ میں کبھی ہندوستان کے دھندلے سے خیال کا بھی گزر نہیں ہوا اور دو ستارہ ہند اور کشور ہند کے نائیٹ گرانڈ کمانڈر اور نائیٹ کمانڈر بن چکے ہیں۔

یہ بھی سن لو کہ ان دس طبقوں میں سے نو پورے ہیں اور ایک ادھورا، نو بھرے ہیں اور ایک خالی۔ تفصیل سب کی آگے آتی ہے۔

شریف ترین طبقہ گارٹر

THE MOST NOBLE ORDER OF THE GARTER

یہ انگلستانی نائیٹی کا طبقہ ہے۔ اس کی اصلیت کے متعلق دو قصے مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ رچرڈ اوّل (RICHARD I) شاہ انگلستان (۱۱۸۹ء تا ۱۱۹۹ء) نے جو اہل انگلستان کی طرف سے تیسری صلیبی لڑائی میں گیا تھا محاصرہ عکہ میں اپنے سرداروں کے گھٹنوں پر چمڑے کے تسمے بندھوا دیے تھے۔ تاکہ ممالک غیر کے محاصرین سے تمیز کیے جا سکیں[1]۔ اس طبقے کی بنیاد انھیں

---

[1] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ صفحہ ۹۴ مصنف

Marfat.com

مسلم نواز صلیبوں کی یاد تازہ کرنے کو ڈالی گئی ہے۔

دوسرا قصہ (جس سے طبقے کے عجیب نشان خصوصی اور عجیب ترین سجع کی لم صاف سمجھ میں آجاتی ہے) یہ ہے کہ ایڈورڈ سوم (EDWARD III) شاہ انگلستان (۱۳۲۷ء تا ۱۳۷۷ء) کے عہد میں ایک رات کسی جلسے میں ایک امیر کبیر کی زوجہ محترمہ (کاؤنٹس آف سالسبری COUNTESS OF SALISBURY) ناچ رہی تھیں کہ ان کا موزہ بند پنڈلی سے کھل پڑا۔ بادشاہ نے فرط تعلق سے وہ موزہ بند اپنے ہاتھ سے اٹھا کر خاتون کے ساق سیمیں پر باندھ دیا۔ موزہ بند اٹھاتے وقت بادشاہ کی ہمہ بین آنکھ نے دیکھ لیا تھا کہ رشک و رقابت کی آگ بادشاہ بیگم کے چہرے پر نفرت و حقارت کی چنگاریاں اڑا رہی ہے۔ لہذا موزہ بند باندھتے وقت بادشاہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"اسے جو برا سمجھے اس کا برا ہو۔"[1]

چنانچہ سرگرم رقص خاتون کا وہی موزہ بند آج تک طبقہ کا نشان خصوصی اور خدمتگار حسن بادشاہ کے الفاظ سجع ہیں۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ اس کا قیام بہ حیثیت طبقہ شولری (نائیٹی) (CHAVALRY) ۱۳۴۸ء میں ہوا۔ یہ طبقہ تثلیث مقدس حضرت مریم۔ سینٹ ایڈورڈ (ST. EDWARD) اور سینٹ جارج (ST. GEORGE) کے مربع حصار حمایت میں چین کرتا ہے۔ سینٹ جارج[2] جو انگلستان کے محافظ ولی اور صلیبوں

---

[1] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ صفحہ ۹۴۔ مصنف

[2] یہ بزرگ شہر لدا کے رہنے والے تھے جو یافہ کے قریب ہے۔ رومی شہنشاہ ڈایوکلیشن (DIOCLETIAN) (۲۸۴ء تا ۳۰۵ء) کے زمانے میں مارے گئے ۴۹۴ء میں پوپ گلاشیش نے انھیں رومی کلیسا کے ولیوں میں شامل کرلیا۔ ان کی وفات سے تقریباً سات سو برس بعد صلیبی بہادروں کو مسلمانوں کے خلاف بہت کچھ مدد دی چنانچہ پہلی لڑائی میں کبھی وہ انطاکیہ کے میدان میں صلیبی بہادروں کے جوش کو ابھارتی پھرتی تھی (دیکھو حروب صلیبیہ مطبوعہ دگلداز پریس لکھنؤ صفحہ ۷۳) کبھی یوروشلم میں کوہ زیتون پر

(باقی اگلے صفحے پر)

کے مربیِ خاص ہیں (جن کے نام پر نائیٹ بنائے جاتے تھے) اس طبقے کے حامی و سرپرست ہیں۔ اسی لیے جہاں اس کا نام آرڈر آف دی گارٹر (ORDER OF THE GARTER) (طبقہ موزہ بند) ہے وہاں آرڈر آف سینٹ جارج (طبقہ ولی جارج) بھی ہے۔

ممالک غیر کے بادشاہ اور شہزادے ہمیشہ اسی طبقے میں نایٹ بنائے جاتے ہیں۔ اس میں صرف ایک ہی درجہ ہوتا ہے۔ شامل ہونے والے کو نائیٹ آف دی گارٹر کا خطاب ملتا ہے جس کا مخفف کے۔جی (K.G.) ہے۔ اگرچہ خطابی قاعدے کے مطابق خطاب یافتہ کے نام سے پہلے سَر اور بعد میں کے۔جی لکھا جانا چاہیئے لیکن اس طبقے میں شامل ہونے والے

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) محافظانِ روضۂ مسیح کا دل بڑھاتی تھی (دیکھو حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۷۹) اسی بنا پر صلیبیوں نے انھیں اپنا مربی خاص قرار دیا اور یورپ والیس جاکر ان کی باقاعدہ پرستش رائج کر دی (دیکھو نیو پاپولر انسائیکلو پیڈیا جلد ۲ صفحہ ۱۷۳)۔ انگلستان نے بھی اس صلیبی امداد کی وجہ سے انھیں اپنے ملک کا محافظ ولی قرار دیا ہے۔ طبقہ گارٹر اور طبقہ سینٹ میکائیل و سینٹ جارج انہی کے نام پر رائج ہوا ہے۔ مصنف

۵۲ ہمارے ایک انگریزی داں صوفی دوست نے اعتراض کیا کہ نائیٹ کا پہلا حرف تو نون ہونا چاہیئے یہ کاف کیوں ہے۔ ہم نے سمجھایا کہ پہلا حرف کاف ہی ہے جو کتاب میں آتا ہے۔ مگر تلفظ میں خاموش ہے۔ اس پر وہ اپنے انداز خاص میں اپنی نیم باز آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے اور سر ہلا کر فرمانے لگے: "پالیا ہے۔ پالیا ہے۔ جاتا کہاں ہے۔ یہ کاف بھی صوفی ہے کہ ہے تو موجود مگر معدوم ہے"۔ مصنف۔

صوفی دوست سے وحید احمد مدیر نقیب بدایوں مراد ہیں۔ جو برائے تعلیم اعلیٰ انگلستان گئے تھے۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے ہنگامے میں واپس آگئے۔ صوفی منش بزرگ ہیں اور ملک کی سیاست میں نمایاں تھے۔ یو۔پی اسمبلی کے ممبر رہے اور پارلیمانی سکریٹری بھی۔

(مؤلف)

یا تو ہز مجسٹی فلاں یا ہز رائل ہائی نس یا ہز ہائی نس یا مارکوئیس یا ارل یا وائی کاؤنٹ یا بیرن فلاں فلاں ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں اس چھوٹے سے "سر" کی پروا نہیں ہوتی۔

طبقے کا خلعت حسب ذیل ہے[1]۔

۱۔ گلوبند۔ طلائی زنجیر جس میں چھبیس کڑیاں ہوتی ہیں۔ ہر کڑی یکے بعد دیگرے موزے بند اور عقد محبت کی شکل کی ہوتی ہے۔ موزہ بند کی ہم شکل کڑی پر سجع منقوش۔ درمیانی کڑی میں تمغہ لٹکتا ہے۔

۲۔ تمغہ۔ طلائی قرص۔ بیچ میں سینٹ جارج کی تصویر جس میں جواہرات جڑے ہوتے ہیں

۳۔ ستارہ۔ ہشت گوشہ یعنی دوہری صلیب سے مرکب۔ وسط میں سینٹ جارج کی مخصوص سرخ صلیب۔ دور پر موزہ بند کی شکل جس میں سجع منقوش۔ ٹھیک قلب کے اوپر ٹکایا جاتا ہے۔

۴۔ چوغہ۔ گہرے نیلے مخمل کا، جاروب کش دامنوں والا۔ جس کے سینے پر بائیں جانب یعنی ٹھیک قلب کے اوپر ستارہ مع سینٹ جارج کی صلیب کے کڑھا ہوتا ہے۔

۵۔ موزہ بند۔ نیلگوں فیتے کا جس کا حاشیہ سنہرا اور متن میں ہوتا ہے دونوں سروں پر طلائی بکسوے بیچ میں طلائی آویزہ۔ بائیں پنڈلی پر گھٹنے کے نیچے باندھا جاتا ہے۔

بادشاہِ وقت طبقہ کا بادشاہ ہوتا ہے۔ عہدہ دار ہمیشہ مقتدایان مذہب عیسوی ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

ونچسٹر (WINCHESTER) کا بشپ۔ مستقل پریلیٹ۔	PRELATE
آکسفورڈ (OXFORD) کا بشپ۔ مستقل چانسلر	CHANCELLOR
ونڈسر (WINDSOR) کا ڈین۔ مستقل رجسٹرار[2]	REGISTRAR

معزز ترین طبقہ باتھ

(THE MOST HONOURABLE ORDER OF THE BATH)

یہ بھی انگلستانی نائیٹی ہی کا طبقہ ہے۔ باتھ انگریزی میں غسل کو کہتے ہیں۔ نائیٹ بنتے وقت

۱۔ جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۸۔ مصنف

۲۔ جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۸۔ مصنف

جو رسمیں ادا کرنی پڑتی تھیں چونکہ ان میں ایک خاص رسم غسل کی بھی ہوتی تھی لہذا اس طبقے کے نائیٹوں کو نائیٹس آف دی باتھ (بہادران غسل) کے نام سے موسوم کیا گیا۔[1]

یہ طبقہ ۱۳۹۹ء میں قائم ہوا۔ اس لیے کہ ہنری (HENRY) چہارم شاہ انگلستان ۱۳۹۹ء تا ۱۴۱۳ء) نے اپنی تاجپوشی کے دن چھیالیس امرا کو نائیٹ بنا کر اس طبقے میں شامل کیا تھا۔ جب سے شاہان انگلستان اپنی تاج پوشی۔ شہزادوں کی ولادت و ازدواج اور ایسی ہی تقریب پر امراء و معززین کو اس میں شامل کیا کرتے ہیں۔[2]

خطاب

درجہ اول۔ نائیٹ گرانڈ کراس[3] آف دی آرڈر آف دی باتھ۔ جس کا مخفف جی سی بی (G.C.B.) ہے نام سے پہلے "سر" اور بعد میں جی۔ سی۔ بی لکھا جاتا ہے۔

درجہ دوم۔ نایٹ کمانڈر[4] آف دی آرڈر آف دی باتھ جس کا مخفف کے۔ سی بی (K.C.B.) ہے۔ نام سے پہلے "سر" اور بعد میں کے۔ سی۔ بی (K.C.B.) لکھا جاتا ہے

درجہ سوم۔ کمپینین[5] آف دی آرڈر آف دی باتھ جس کا مخفف سی۔ بی (C.B.) ہے

---

[1] ہمیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۲۔ جب اس طبقے کی بنیاد پڑی ہے تو عیسائیوں کو طہارت و صفائی سے قطعاً بیگانگی تھی۔ وہ برسوں تک غسل نہیں کرتے تھے اور مہینوں تک منہ ہاتھ نہیں دھوتے تھے۔ سینٹ برنارڈ (ST. BERNARD) ٹیمپلرس ان کے محامد گناتے ہوئے لکھتا ہے۔ وہ کم منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ کنگھی نہ کرنے سے ان کے بال چکٹے اور گرد و غبار سے خاک میں اٹے رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ غسل کو اس قدر مہتم بالشان رسم سمجھا گیا مصنف

[2] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ صفحہ ۷۰۔ مصنف

[3] نایٹ گرانڈ کراس یعنی صلیب اعظم کا بہادر۔ مصنف

[4] کمانڈر کا عہدہ ہاسپٹلرس میں بھی ہوتا تھا۔ مصنف

[5] کمپانین یعنی مصاحب کا عہدہ ٹیمپلرس میں ہوتا ہے۔ مصنف

Marfat.com

چونکہ خطاب یافتہ نائیٹ نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی.بی (C.B.) لکھا جاتا ہے

خلعت

۱۔ گلوبند۔ طلائی زنجیر جس میں سترہ کڑیاں ہوتی ہیں۔ نو کڑیاں تاج انگلستان کی اور باقی آٹھ گلاب[۱] اور تھسل[۲] (THISTLE) اور شمراک[۳] (SHAMROCK) کی شکل کی۔ درمیانی کڑی میں تمغہ لٹکتا ہے۔

۲۔ تمغہ۔ طلائی مالٹائی ہشت گوشہ صلیب۔ ایک تاج اوپر اور دو ادھر اُدھر صلیب کے گوشوں پر چار شیر سجع (جو مذہب تثلیث کا سہ آتشہ مقطر ہے) ثلاثہ واحد میں شامل ہیں[۴]۔

۳۔ ستارہ۔ جس کے وسط میں مالٹائی صلیب اور تین انگلستانی تاج ہیں۔ سینے پر لٹکایا جاتا ہے۔

بادشاہِ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت گرانڈ ماسٹر[۵] ہوتا ہے۔ آج کل اس طبقے کے گرانڈ ماسٹر ڈیوک آف کناٹ (DUKE OF CONNAUGHT) ہیں۔ اس طبقے کے گرجا جہاں رسم نائیٹی ادا ہوتی ہے کلیسائے ہنری ہفتم واقع ویسٹ منسٹر ایبے (لندن) ہے اور ویسٹ منسٹر کا ڈین (DEAN) ہی طبقے کا ڈین بھی ہوتا ہے[۶]۔

قدیم ترین طبقہ تھسل
(THE MOST ANCIENT ORDER OF THE THISTLE)

اسکاٹ لینڈ کی نائیٹی کا طبقہ ہے۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ اعالیوس شاہ اسکاٹ لینڈ

۱، ۲، ۳۔ گلاب انگلستان کا مخصوص پھول اور تھسل اسکاٹ لینڈ کا اور شمیراک آئرلینڈ کا مخصوص پودا ہے۔ مصنف

۴۔ نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۲، صفحہ ۶۸، مصنف

۵۔ جیکس ریفرنس بک صفحہ ۲۰۸، مصنف

۶۔ نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۲، صفحہ ۶۷، ۶۸۔ مصنف

Marfat.com

نے جو دسویں صدی کے وسط میں حاکم تھا اتھیلسٹن (ATHELSTAN) شاہ انگلستان (۹۲۵ء تا ۹۴۰ء) پر فتح پانے کے دن سے اگلی رات آسمان پر ایک چمکتی صلیب دیکھی جو ہو بہو ویسی تھی جس پر سینٹ اینڈریو (ST. ANDREW) مصلوب ہوتے تھے۔ یہ طبقہ اسی واقعے کی یادگار میں قائم ہوا ہے مگر اصل یہ ہے کہ ۱۶۸۷ء سے قبل اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا! اس سال جیمس دوم (JAMES II) شاہ انگلستان (۱۶۸۵ء تا ۱۶۸۹ء) نے اس طبقے کے قواعد مرتب کرائے۔[۱]

یہ طبقہ اینڈریو[۲] ولی کی خاص حمایت میں ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام آرڈر آف سینٹ

---

[۱] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۴ صفحہ ۹۴۔ مصنف

[۲] یعنی اینڈریاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور پطرس حواری کے حقیقی بھائی۔ حضرت عیسیٰ کے بعد مدتوں مختلف ممالک میں وعظ و تلقین فرماتے رہے۔ عام روایات کے مطابق یہ بھی مصلوب ہوتے (نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۲۰۷) ان کی روح کی نسبت بھی یہ افترا و بہتان اٹھایا جاتا ہے کہ صلیبی لڑائیوں میں مسلمانوں کے خلاف دلچسپی لیتی تھی۔ چنانچہ انھیں کی روح نے ریمنڈ آف ٹولوز کے پادری پطرس بارتھولومی کو خواب میں بشارت دی تھی کہ انطاکیہ میں پطرس ولی کے گرجے میں وہ اصلی برچھی مدفون ہے جس سے رومی سپاہی نے حضرت مسیح کا پہلو صلیب پر چڑھانے کے بعد زخمی کیا تھا۔ اس برچھی کی برکت سے صلیبیوں کو "بیدینوں" پر فتح حاصل ہوگی۔ (حروب صلیبیہ مطبوعہ دلگداز پریس صفحہ ۷۵) افترا اور بہتان ہم نے اس لیے کہا کہ جب خود استاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہادی انام یعنی بانیٔ اسلام (روحی فداہ) کی بشارت دی ہے تو شاگرد (حواری) کو اسلام اور اہل اسلام سے اس قدر بغض اور بیت المقدس سے اسلامی قبضہ اٹھائے جانے کے متعلق اس قدر کد و کوشش ناممکن ہے۔

(مصنف)

Marfat.com

اینڈریو بھی ہے۔ اس میں صرف ایک ہی درجہ ہے۔ شامل ہونے والے کو نائیٹ آف دی آرڈر آف دی تھیسل کا خطاب ملتا ہے جس کا مخفف کے، ٹی (K.T) ہے۔ اس کے ارکان بھی "سَر" سے اونچے ہی ہیں۔

خلعت حسب ذیل ہے[۱]۔

۱۔ گلوبند، طلائی۔ جس میں سولہ کڑیاں تھسل کی ہوتی ہیں۔ وسط میں تمغہ لٹکتا ہے۔

۲۔ تمغہ، سینٹ اینڈریو کی تصویر اپنی مخصوص صلیب لیے ہوئے۔

۳۔ ستارہ، سینٹ اینڈریو کی نقرئی صلیب جس کے گوشوں میں سے شعائیں نکلتی ہیں۔ وسطی حصہ سنہرا جس میں تھسل بنا ہوا اور اس کے گرد سجع جس کے الفاظ ہیں "کوئی بے خطری سے مجھے مشتعل نہیں کرسکتا"۔ ستارہ قلب پر لٹکایا جاتا ہے۔

بادشاہ وقت طبقہ کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اس طبقے کا ڈین بھی اسکاٹ لینڈ کے کسی گرجا کا پادری ہی ہوتا ہے۔

نامی ترین طبقہ سینٹ پیٹرک

(THE MOST ILLUSTRIOUS ORDER OF ST. PATRICK)

آئرلینڈ کی نائیٹی کا طبقہ ہے جسے جارج سوم شاہ انگلستان (۱۷۶۰ء تا ۱۸۲۰ء) نے ۵ فروری ۱۷۸۳ء[۲] کو قائم کیا۔ یہ طبقہ سینٹ پیٹرک کی حمایت میں ہے جو آئرلینڈ کے ولی و مربی خاص ہیں۔

اس میں بھی صرف ایک ہی درجہ ہوتا ہے۔ شامل ہونے والے کو نائیٹ آف دی آرڈر آف سینٹ پیٹرک کا خطاب ملتا ہے۔ جس کا مخفف کے۔ پی (K.P) ہے خلعت حسب ذیل ہے[۳]۔

۱۔ گلوبند طلائی جس کی کڑیاں رباب کی شکل کی ہوتی ہیں۔ وسط میں ایک طلائی رباب ہوتا ہے جس میں تمغہ لٹکتا ہوتا ہے۔

[۱]، [۲]، [۳]۔ جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۲۔ مصنف

Marfat.com

۲۔ تمغہ۔ طلائی قرص جس کے دور میں شیمراک کا ہار اور طبقے کا سجع ہوتا ہے سجع کے الفاظ یہ ہیں "کون جدا کرے گا"۔[1]

۳۔ ستارہ۔ جس کی شعاعیں نقرئی ہوتی ہیں۔ بیچ میں سینٹ پیٹرک کی سرخ صلیب، نیچے سجع اور تاریخ قیام طبقہ، ستارہ قلب پر پہنا جاتا ہے۔

بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے اور گرانڈ ماسٹر[2] آئرلینڈ کا لارڈ لیفٹیننٹ۔

ممتاز ترین طبقہ سینٹ میکائیل وسینٹ جارج

(THE MOST DISTINGUISHED ORDER OF ST. MICHAEL & ST. GEORGE)

یہ طبقہ ۱۸۱۸ء میں باشندگان جزائر یونانیہ ومالٹا اور نیز ان اشخاص کے لیے جو بحر روم میں مناصب جلیلہ پر فائز ہیں قائم ہوا تھا۔ ۱۸۶۸ء میں کل مستعمرات برطانیہ کے باشندوں کے لیے اس میں توسیع کی گئی[3]۔

خطاب[4]

درجہ اول۔ نائیٹ گرانڈ کراس آف دی آرڈر آف سینٹ میکائیل اینڈ سینٹ جارج مخفف جی، سی، ایم، جی (G.C.M.G)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں جی، سی، ایم، جی (G.C.M.G) لکھا جاتا ہے۔

درجہ دوم۔ نائیٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف سینٹ جارج مخفف کے، سی، ایم، جی (K.C.M.G)۔

---

[1] یہ استفہام غالباً آئرلینڈ کو انگلستان سے علیحدہ کرنے کے متعلق ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا جواب سن فینز (SINN FEINS) جماعت کے ارکین اچھی طرح دے سکتے ہیں۔ مصنف

[2] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۲۔ مصنف

[3] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۳۔ مصنف

[4] وہٹکرس المینک (WHITAKER'S ALMANAC) بابتہ ۱۹۲۰ء۔ مصنف

Marfat.com

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں کے، سی، ایم، جی (K.C.M.G) لکھا جاتا ہے۔

درجہ سوم، کمپینین آف دی آرڈر آف سینٹ میکائیل اینڈ سینٹ جارج مخفف سی، ایم، جی (C.M.G)

چونکہ خطاب یافتہ نایٹ نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی، ایم، جی (C.M.G) لکھا جاتا ہے۔

خلعت[1]

۱۔ گلوبند۔ طلائی جس میں بائیس کڑیاں ہوتی ہیں۔ چھ کڑیاں تاج پوش انگلستانی شیروں کی شکل کی، آٹھ کڑیاں، مالٹائی صلیب کی شکل کی، چار حروف ایس ایم (سینٹ میکائیل) کی شکل کی اور باقی چار حروف ایس جی (سینٹ جارج) کی شکل کی۔ بیچ میں ایک قرص جس پر سینٹ مارک (ST.MARK) کے دو پردار شیر آمنے سامنے کھڑے ہوئے، دونوں کے ایک ہاتھ میں انجیل اور دوسری میں سات تیروں کا مٹھا۔

۲۔ تمغہ۔ طلائی صلیب چہاردہ گوشہ، ایک رخ پر میکائیل فرشتے کی تصویر جو شیطان کو پیروں تلے روندتے ہیں۔ دوسرے رخ پر سینٹ جارج کی اسپ سوار تصویر جو دیو کے نیزہ مارتے ہیں۔ صلیب پر تاج انگلستان۔

۳۔ ستارہ، سات شعاعیں وسط میں سینٹ جارج کی سرخ صلیب جس کے اوپر سینٹ میکائیل کی تصویر۔

۴۔ چوغہ نیلی ساٹن، قرمزی ریشمیں استر، بائیں طرف ستارہ کڑھا ہوا۔ بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت گرانڈ ماسٹر جو آج کل پرنس ویلز ہیں طبقے کا پریلیٹ (PREATE) نوآبادیوں میں سے کسی مقام کا بشپ ہوتا ہے۔

عالی ترین طبقہ ستارۂ ہند

THE MOST EXALTED ORDER OF THE STAR OF INDIA

ہندوستان کی خاطر جو دو طبقے خاص طور پر وضع کیے گئے ہیں ان میں پہلا

---

[1] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۳۰۸۔ مصنف

طبقہ وہ ہے جو ۲۳ فروری ۱۸۶۱ء کو قائم ہوا[۱]۔

خطاب[۲]:

درجہ اول۔ نائیٹ گرانڈ کمانڈر آف دی اسٹار آف انڈیا۔ مخفف جی، سی، ایس، آئی (G.C.S.I)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں جی، سی، ایس، آئی (G.C.S.I) لکھا جاتا ہے۔

درجہ دوم۔ نائیٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا۔ مخفف کے، سی، ایس، آئی (K.C.S.I)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں کے، سی، ایس، آئی (K.C.S.I) لکھا جاتا ہے۔

درجہ سوم۔ کمپنین آف دی آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا۔ مخفف سی، ایس، آئی (C.S.I)

چونکہ خطاب یافتہ نائیٹ نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی، ایس، آئی (C.S.I) لکھا جاتا ہے۔

خلعت:

۱۔ گلوبند، جس کی کڑیاں سرخ و سفید گلاب اور نیلوفر کے پھول کی شکل کی ہوتی ہیں وسط میں تاج انگلستان جس میں تمغہ لٹکتا ہے۔

۲۔ تمغہ، بادشاہ کی تاج دار تصویر اور سجع "آسمانی روشنی ہماری رہنما"۔

۳۔ ستارہ، طلائی باون شعاعوں والا۔ جس کے اندر ایک پانچ شعاعوں والا ستارہ۔

۴۔ چوغہ، ہلکی نیلی ساٹن کا جس میں سفید ریشم کا استر، بائیں جانب ستارہ کڑھا ہوا۔

بادشاہِ وقت طبقے کا بادشاہ اور وائسرائے ہند گرانڈ ماسٹر ہوتا ہے۔

---

[۱]، [۲]، جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۳ مصنف

رفیع ترین طبقہ کشور ہند

THE MOST EMINENT ORDER OF THE INDIAN EMPIRE

یہ دوسرا طبقہ ہے جو اہل ہند اور واسطہ داران ہند کی قدر افزائی کی خاطر وضع اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو قائم کیا گیا[1]

خطاب:

درجہ اول۔ نائیٹ گرانڈ کمانڈر آف دی آرڈر آف دی انڈین ایمپائر، مخفف جی سی، آئی، ای (G.C.I.E)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں جی، سی، آئی، ای (G.C.I.E) لکھا جاتا ہے۔

درجہ دوم، نائیٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف دی انڈین ایمپائر۔ مخفف کے، سی آئی، ای (K.C.I.E)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں کے، سی، آئی، ای (K.C.I.E) لکھا جاتا ہے۔

درجہ سوم۔ کمپنین آف دی آرڈر آف دی انڈین ایمپائر، مخفف، سی، آئی، ای (C.I.E)

چونکہ خطاب یافتہ نائیٹ نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی، آئی، ای (C.I.E) لکھا جاتا ہے۔

خلعت:

۱۔ گلوبند۔ طلائی، جس کی کڑیاں ہاتھی، مور، نیلوفر اور گلاب کی شکل کی ہوتی ہیں۔ وسط میں تاج انگلستان۔

۲۔ تمغہ۔ طلائی گلاب جس کے وسط میں بادشاہ کی تصویر۔

۳۔ ستارہ۔ پانچ طلائی اور پانچ نقرئی شعاعیں، وسط میں بادشاہ کی تصویر۔

---

[1] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۳۔ مصنف

۴۔ چوغہ۔ ارغوانی ساٹھن، سپید ریشمیں استر، بائیں جانب ستارہ کڑھا ہوا۔
بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ اور والسرائے ہند گرانڈ ماسٹر ہوتا ہے۔

طبقہ شاہی وکٹوریہ

THE ROYAL VICTORIAN ORDER

یہ طبقہ ۲۱ اپریل ۱۸۹۶ء کو ان اشخاص کی منزلت افزائی کے لیے قائم کیا گیا ہے۔
جنھوں نے بادشاہ وقت کی غیر معمولی یا مہتم بالشان یا ذاتی خدمات کی تقدیم کی ہے[1]

خطاب[2]:

درجہ اوّل۔ نائیٹ گرانڈ کراس آف دی رائل وکٹورین آرڈر، مخفف جی، سی، وی، او (G.C.V.O)

نام سے پہلے "سر" اور بعد میں جی، سی، وی، او (G.C.V.O) لکھا جاتا ہے۔

درجہ دوم۔ نائیٹ کمانڈر آف دی رائل وکٹورین آرڈر، مخفف کے، سی، وی، او، (K.C.V.O)

نام سے پہلے "سر" اور بعد کے، ی، وی، او (K.C.V.O) لکھا جاتا ہے۔

درجہ سوم۔ کمانڈر آف دی رائل وکٹورین آرڈر مخفف سی، وی، او (C.V.O)
چونکہ خطاب یافتہ نائیٹ نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی، وی، او، (C.V.O) لکھا جاتا ہے۔

درجہ چہارم و پنجم۔ ممبر آف دی رائل وکٹورین آرڈر، مخفف ایم، وی، او (M.V.O)۔

صرف نام کے بعد ایم، وی، او (M.V.O) لکھا جاتا ہے۔

خلعت[3]:

---

[1]، [2]، [3]۔ جیکس ریلائنس بک صفحہ ۸۰۳۔ مصنف

۱۔ تمغہ، سفید چینی شدہ ہشت گوشہ مالٹائی صلیب؛ وسط میں قرمزی بیضاوی حلقہ جس میں بادشاہ کا نام سنہرا لکھا ہوا، اوپر شاہی تاج فیتے کے ساتھ سینے کے دھنے جانب ٹکایا جاتا ہے۔

۲۔ ستارہ۔ نقرئی ہشت گوشہ یعنی دوہری صلیب
بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔

خوب ترین طبقہ کشور برطانیہ

THE MOST EXCELLENT ORDER OF THE BRITISH EMPIRE

نائیٹی کا یہ جدید ترین طبقہ ہے جسے بادشاہ حال نے ۱۹۱۷ء میں ان متوسلین و متوسلان سلطنت کی افزائش جاہ و مرتبت کے لیے قائم کیا جنھوں نے برطانیہ یا مقبوضاتِ برطانیہ کے اندر خدمات جلیلہ انجام دی ہیں۔ اس طبقے میں ذکور و اناث دونوں کے لیے خطاب بخشی کا اہتمام ہے[۱]

خطاب[۲]

درجۂ اول
برائے ذکور نائیٹ گرانڈ کراس آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر۔
برائے اناث، ڈیم[۳] گرانڈ کراس آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر۔
مخفف جی، بی، ای (G.B.E)

نام سے پہلے "سر" یا "ڈیم" اور بعد میں جی، بی، ای (G.B.E) لکھا جاتا ہے۔

درجۂ دوم۔ برائے ذکور، نائٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر مخفف کے، بی، ای (K.B.E)

برائے اناث۔ ڈیم کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر مخفف ڈی، بی، ای (D.B.E)

---

[۱]، [۲] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۳ مصنف

[۳] ڈال کو بالکسر پڑھنا چاہیے۔ بالفتح پڑھتے ہی خطاب کی تاثیر فوراً الٹ جائے گی۔ مصنف

Marfat.com

نام سے پہلے "سر" یا "ڈیم" اور بعد میں کے۔ بی۔ ای۔ یا ڈی۔ بی ای لکھا جاتا ہے۔

درجہ سوم برائے ذکور و اناث کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر مخفف سی۔ بی۔ ای (C-B-E)

چونکہ خطاب یافتہ نایٹ یا ڈیم نہیں ہوتا اس لیے صرف نام کے بعد سی۔ بی۔ ای (C.B.E) لکھا جاتا ہے۔

درجہ چہارم۔ برائے ذکور و اناث آفیسر آف دی برٹش ایمپائر مخفف او بی ای (O.B.E) صرف نام کے بعد او۔ بی۔ ای لکھا جاتا ہے۔

درجہ پنجم۔ برائے ذکور و اناث، ممبر آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر مخفف ایم۔ بی۔ ای (M.B.E)

صرف نام کے بعد ایم، بی، ای (M.B.E) لکھا جاتا ہے۔

خلعت:

۱۔ تمغہ۔ نقرئی صلیب، وسط میں قرمزی حلقہ جس میں برطانیہ کی قاعد تصویر اور سجع: "اللہ اور حکومت کے لیے"۔[۱]

۲۔ ستارہ۔ جو درجہ اول و دوم ہی کو دیا جاتا ہے۔ نقرئی ہشت گوشہ یعنی دوہری صلیب بادشاہ وقت طبقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔

مجرد نایٹ

KNIGHTS BACHELOR

یہ وہ نایٹ ہیں جو متذکرہ بالا طبقوں میں سے کسی کے تحت میں نہیں آتے اگرچہ سب سے نیچے ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا مجرد نایٹ کے سوا نہ ان کا کوئی لمبا چوڑا خطاب ہے نہ طبقہ، نہ خلعت ہے نہ تمغہ۔ انگریزی حروف ابجد کے وہ پھول بھی جو خطاب یافتہ نام کو گلستان

---

[۱] جیکس ریفرنس بک صفحہ ۸۰۳۔ مصنف

Marfat.com

در بغل" بناتے ہیں۔ اس بوم شورہ زار میں نہیں کھلتے۔ شاید اسی لیے ان لوگوں کا نام نایٹ بیچلر ہے۔ یعنی یہ نائیٹی کے پورے درجے پر فائز نہیں ہیں۔[1] پھر بھی ہمارے بہت سے برادران ملک و ملت اس ادھوری عزت ہی کو لاکھوں کھو کر پاتے ہیں۔ ہندوستان کے خطابی سروں کی مکمل فہرست دیکھو اور نہ صرف سرسری طور سے بلکہ غور سے پڑھو تب ظاہر ہوگا کہ ان میں کتنے خالی "سر" ہیں اور تب ہی واضح ہوگا کہ بہت سے ہندوستانی جن میں بڑی ناک والے روسا بھی ہیں اور اونچی کرسی والے حکام بھی، جھولی گون والے وکلا بھی ہیں اور بھاری جیب والے تجار بھی۔ اسی زنجیر کی کڑیاں اور اسی ہار کی لڑیاں ہیں جو انگلستان بت تراشوں اور تصویر سازوں، نقالوں اور ارغن نوازوں کے ساتھ مسلسل و منسلک کر دیے گئے ہیں۔ یقین نہ ہو تو خروار میں سے یہ چند دانے حاضر ہیں۔

پیشہ	نام	خطاب
مصوّر	سر جارج فریمپٹن۔ بت تراش و سنگ تراش	نایٹ بیچلر
بت تراش	سر جان لیوری۔ مصوّر	ایضاً
سنگ تراش	سر ایڈون لیٹنس[2]۔ مصوّر و بت تراش	ایضاً
	سر ڈیوڈ مرے۔ مصوّر	ایضاً
	سر ولیم ہماری کرافٹ، بت تراش و سنگ تراش	ایضاً
گانے بجانے والے	سر اے۔ سی میکنزی۔ معلم و مرتب نغمہ	نایٹ بیچلر
دھن قائم کرنے	سر فریڈرک برتج، ارغن نواز ولیٹ منسٹر ایبی	ایضاً
والے گانا سکھانے	سر ای سی دی اسٹینفورڈ۔ معلم نغمہ۔	ایضاً
والے	سر ایڈورڈ ایلگر۔ معلم و مرتب نغمہ	ایضاً
	سر ہنری جے ووڈ۔ معلم نغمہ	ایضاً

[1] ہیوپا پولر انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۴۳۴ و ۴۳۵۔ مصنف

[2] جنھوں نے اب نئی دلی کی تعمیر میں بہت حصہ لیا ہے۔ مصنف

Marfat.com

خطاب	نام	پیشہ
نائیٹ بیچلر	سر اسکوائر بینکرافٹ۔ لندن کا بہترین ایکٹر	ناٹک میں روپ بھرنے والے اور ڈرامہ لکھنے والے
ایضاً	سر فینگ آربینس، مشہور معروف ایکٹر	
ایضاً	سر جان ہیر، لندن کے نامی تھیٹروں کا مشہور ایکٹر و ڈرامہ نویس۔	
ایضاً	سر آرتھر پیزو، مشہور ایکٹر و ڈرامہ نویس	
ایضاً	سر جانسٹن فوربس رابرٹسن، نامی ایکٹر	

بڑے خطابوں یعنی نائیٹی کے دسوں طبقوں کی تفصیل تو پیش کی جا چکی۔ اب چند چھوٹے موٹے امتیازی خطابات کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

تمغہ	اہلیت و وجہ حصول	تاریخ قیام	مخفف	خطاب
طلائی صلیب جس کے ایک رخ پر تاج انگلستان اور دوسرے رخ پر بادشاہ وقت کے نام کے حروف۔ تمغہ قلب پر لٹکایا جاتا ہے	عہدیداران افواج بری و بحری کو جن کا تذکرہ مراسلت فوجی میں ہو چکا ہے۔ بجلدوئے خدمات جلیلہ	۶ ستمبر ۱۸۸۶ء	ڈی۔ ایس۔ او D-S-O	ڈسٹنگوشڈ سروس آرڈر THE DISTINGUISHED SERVICE ORDER
طلائی قرص جس کے ایک طرف بادشاہ شہنشاہ اور دوسری طرف بجلدوئے خدمات وفادارانہ ... انگلستان ... قلب پر لٹکایا جاتا ہے	عہدہ داران دیوانی کو بجلدوئے قدامت و جلالت خدمات	۲۶ جون ۱۹۰۲ء	آئی۔ ایس۔ او I.S.O	امپیریل سروس آرڈر۔ THE IMPERIAL SERVICE ORDER

Marfat.com

خطاب	مخفف	تاریخ قیام	اہلیت و وجہ حصول	تمغہ
آرڈر آف مرسی ORDER OF MERCY	او-مر O. MER	۱۸۹۶ء	بجلدوئے رفع مصائب و تکالیف عامہ	طلائی سرخ صلیب جس پر تاج انگلستان اور پرنس آف ویلز کی کلغی۔ وسط میں تصاویر۔
آرڈر آف میرٹ ORDR OF MERIT	او-ایم O. M.	۲۶ر جون ۱۹۰۴ء	اشخاص جلیل القدر کو بجلدوئے خدمات حربی و علمی و ادبی	ہشت گوشہ سرخ صلیب جس کے ایک رخ پر بجلدوئے "قابلیت" اور دوسری طرف "بادشاہ و شہنشاہ" اوپر تاج انگلستان
کمپینین آف آنر COMPANION OF HONOUR	سی-ایچ C. H	۱۹۱۷ء		
وکٹوریہ کراس VICTORIA CROSS	وی-سی V. C.	۲۹ر جنوری ۱۸۵۶ء	عہدیداران فوجی کو بجلدوئے شجاعت	برنجی صلیب جس کے وسط میں تاج انگلستان اور اس پر قائم شیر۔ یہ صلیب قلب پر لٹکائی جاتی ہے۔

Marfat.com

رایل ریڈ کراس Royal Red Cross	آر۔آر۔سی	۲۳ر اپریل ۱۸۸۳ء	طبقہ اناث کو بجلدوئے تیمارداریٔ سپاہیان مریض و مجروح	طلائی سرخ صلیب جس کے ایک گوشہ پر الیقان۔ دوسرے پر امید تیسرے پر امداد چوتھے پر سنہ ۱۸۸۳ء۔ وسط میں ملکہ وکٹوریہ کی تصویر صلیب قلب پر لگائی جاتی ہے
ملٹری کراس MILITARY CROSS	ایم۔سی	یکم جنوری ۱۹۱۵ء	ادنیٰ عہدیدارانِ فوج کو بجلدوئے خدماتِ جلیلہ	نقرئی صلیب جس کے ہر گوشے پر تاج انگلستان، وسط میں "جارج شاہ و شہنشاہ"

خان بہادر

ولایتی طبقے اور خطاب تو سب ختم ہو چکے کنٹری (COUNTRY) خطابوں میں ہم صرف خان بہادر کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ یہ اس قابل تو نہ تھا کہ کے۔جی اور جی۔سی۔آئی، اور جی، سی، ایس، آئی کے پہلو میں جگہ پاتا لیکن اس کو کیا کیجیے کہ لکھے لکھا جاہ پرست ہستیوں کے زعم میں کاخ رفعت کا یہی سنگِ بنیاد اور نخل عزت کا یہی ثمر پیش رس ہے۔ ہم اپنے تشنگانِ تمغہ اور گرسنگانِ خطاب دوستوں کو مایوس کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا کمخواب میں کمبل کا پیوند لگانا پڑتا ہے۔

خان بہادر کی وقعت کا اندازہ اگر گزوں سے کرنا چاہو تو خیال کی آنکھ پر تصوّر کی دوربین لگا کر دیکھو۔ ایک وسیع میدان میں ہز مجسٹی شہنشاہ جارج پنجم کا دربار منعقد ہے۔ بارگاہ شاہی کے بائیں سمت سے ایک لمبی قطار شروع ہوتی ہے جس میں ہز رائل ہائینس پرنس آف ویلز بہادر کے تخت کے لب۔ شاہزادگان خاندان سفرائے دول خارجہ اور اعلیٰ اراکینِ حکومت چوکیوں پر بیٹھے ہیں۔ ان کے بعد برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ کے ڈیوک اور مارکویس اور ارل وائیکاونٹ اور بشپ اور بیرن اور بیرونٹ مع اپنے اپنے فرزندوں کے اپنے اپنے درجے کے مطابق اور ان کے لب کل طبقوں کے نائٹ مع اپنے اپنے فرزندوں کے اپنے اپنے رتبے کے موافق کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ ان کے بعد نائٹی کے کل طبقوں کے غیر نائٹ اراکین اور ان کے بعد ہندوستان کے ارضی نہیں بلکہ عرضی راجے

مہاراجے۔ نواب سب تپائیوں پر بیٹھے ہیں اور قطار کی لمبائی ہزار ہا گز تک پہنچ چکی ہے۔ اب کہیں جا کر بے چارے خان بہادر گروہ کے کھڑے ہونے کا نمبر آتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ایسے دربار میں شامل بھی کیا جائے۔ اور بشرطیکہ کوئی اُس سے زیادہ حق دار اُس سے پہلے نہ کھڑا ہو جائے قطار کی لمبائی دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ خان بہادر کو بادشاہ سے اُس سے زیادہ بعد وفصل ہے جتنا اسے خدا سے ہے۔

خان بہادر کو سینے پر لگانے کو ایک طلائی تمغہ اور نام کے ساتھ لگانے کو دو لفظ[۱] ملتے ہیں بس فقط۔ تمغہ ستارہ کی شکل کا ہوتا ہے جس میں دو متحد المرکز چھوٹے بڑے دائرے اور بیچ میں بادشاہ کی تاجدار تصویر ہوتی ہے۔ دونوں دائروں کے فصل میں الفاظ "خان بہادر" انگریزی میں لکھے ہوتے ہیں۔ ستارہ کے سر پر تاج انگلستان ہوتا ہے۔

تاج انگلستان

مختلف طبقوں کے گلو بندوں۔ تمغوں اور ستاروں کی ترکیب وتشکیل میں تاج انگلستان کو اس قدر دخل ہے کہ اس کی تشریح نہ کرنے سے مبحث کے تشنہ رہ جانے کا خوف ہے۔

تاج انگلستان جسے ولیم فاتح نے ۱۰۶۶ء میں زیب سر کیا تھا سونے کا ایک سادہ حلقہ تھا جس پر پتیاں بنی ہوئی تھیں۔ جب سے اب تک اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔

فی زمانناً وہ سونے کا ایک چوڑا حلقہ ہے جس کے دور پر جا بجا موتی اور جواہرات قرینے سے جڑے ہوئے ہیں۔ حلقے کے بالائی لب پر چار مالٹائی صلیبیں اور چار سر برگے یکے بعد دیگرے کنگروں کی طرح اونچے اُٹھے ہوئے ہیں۔ ہر صلیب کے اوپر سے مقابل صلیب کے اوپر تک ایک

---

[۱] یہ لفظ بسا اوقات مخفف ہو کر دو حرف ہی رہ جاتے ہیں یعنی K.B. خ۔ ب۔ اگر اردو کے ان دو حرفوں کو بے معنی رکھنا ہو تو اختیار ہے۔ علیحدہ علیحدہ رہنے دو لیکن یہ دونوں حرف باہم مل کر ایک بامعنی لفظ بھی بناتے ہیں۔ معنی کے لیے عربی کے پڑھے طالب علم یا عربی کی لغت سے مدد لو۔ مصنف

Marfat.com

طلائی قوس ہے جس پر موتی جڑے یا بنے ہیں۔ دونوں قوس سر پر تقاطع کرتے ہیں۔ مقام تقاطع پر کلغی کی جگہ ایک صلیب کا مجسم ہے۔

یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کلغی والی صلیب چو رخی ہے یا یک رخی۔ اگر چو رخی ہے تب تو ایک تاج کی ذرا سی تصویر آٹھ صلیبوں کا مجموعہ ہوگئی ہے لیکن اگر صرف ایک ہی رخ صلیب کی شکل کا ہے تو ہر تاج میں کم سے کم پانچ صلیبوں کے ہونے میں تو شک ہی نہیں۔

صلیب

خطابوں کے متعلق اتنے سفید صفحے سیاہ ہوچکے لیکن ابھی اُس چیز کا تذکرہ باقی ہے جو تمغوں کی جان اور خطابوں کی شان ہونے کی وجہ سے "سبب تالیف کتاب" کہی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لہٰذا نگاہ کو جہاں اتنی تکلیف دی ہے تھوڑی تکلیف اور دو۔

عیسائی کہتے ہیں کہ جب یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم سے آتش بر پا ہوئے تو یہودی ـــ

"سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر (متی ب ۲۷ (۲) قتلِ کرے گئے۔ (یوحنا ب ۱۸ - ۲۸) اور پیلاطیس (PONTIUS PILATE) حاکم کے حوالے کیا (متی ب ۲۷ - ۲) پیلاطیس نے یسوع کو کوڑے لگوا کر (مرقس باب ۱۵ - ۱۵) سپاہیوں کے حوالے کیا۔ (لوقا باب ۲۳ - ۲۵) تاکہ صلیب[1] دی جائے (متی باب ۲۷ - ۲۶) پس وہ یسوع کو لے گئے اور وہ اپنی صلیب اٹھائے ہوئے اس جگہ تک باہر گیا جو کھوپڑی کی جگہ کہلاتی ہے جس کا ترجمہ عبرانی میں گلگوتا (GOLGOTHA) ہے (یوحنا باب ۱۹ - ۱۷) پھر دن چڑھتا تھا جب انھوں نے اس کو صلیب پر چڑھایا (مرقس باب ۱۵ - ۲۵) تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا 'ایلی - ایلی لما سبقتنی' یعنی "اے میرے خدا - اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔۔۔

---

[1] مصنف کا درج کردہ حاشیہ اس مضمون کے ضمیمۂ ثالث میں ملاحظہ فرمائیے۔ مولف

Marfat.com

یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا (متی ب ۲۷-۵۰) کہ "تمام ہوا" اور سر جھکا کر جان دے دی (یوحنا ب ۱۹-۳۰)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کیے جانے کی شہادت تم نے متی۔ مرقس۔ لوقا اور یوحنا کے الفاظ میں سن لی (ذالك قولهم بافواهھم) مگر اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں اتنی صاف صحیح اور زبردست شہادت ہے (والحمد للہ علیٰ ذالک) جس سے بڑھ کر صاف اور صحیح اور زبردست شہادت اس کرۂ ارض پر تو کیا ایتھر کے کسی سیارے میں بھی نہیں اور اس شہادت کی بنا پر ہمارا ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کیے گئے نہ صلیب دیئے گئے۔

اس وقت جزیرۃ العرب میں اور نہ جزیرۃ العرب میں بلکہ خود مدینہ طیبہ ہی میں یہودی بھی بہ کثرت موجود تھے اور عیسائی بھی۔ یہودی نہایت مغرورانہ تمسخر سے کہتے تھے کہ ہم نے مسیح ناصری کو جس نے خدا کے نبی اور بنی اسرائیل کے بادشاہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا صلیب پر چڑھا کر مار ڈالا۔ عیسائی اسی قدر مظلومانہ تفاخر سے کہتے تھے کہ ہاں یہودیوں نے زندہ خدا کے بیٹے مسیح (متی ب ۱۶-۱۶) اور اسرائیل کے بادشاہ (یوحنا ب ۱-۴۹) کو صلیب دے دی۔ قرآن کریم نے دونوں کی موجودگی میں برملا اور علی الاعلان اپنے صاف اور صریح اسلوب میں اس واقعے کی ایسی تردید و تکذیب کی کہ کسی کو جواب میں لب ہلانے کی ہمت و جرأت ہی نہ ہو سکی۔

وَقَوۡلِهِمۡ إِنَّا قَتَلۡنَا ٱلۡمَسِيحَ عِيسَى ٱبۡنَ مَرۡيَمَ رَسُولَ ٱللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمۡۚ وَإِنَّ ٱلَّذِينَ ٱخۡتَلَفُواْ فِيهِ لَفِي شَكّٖ مِّنۡهُۚ مَا لَهُم بِهِۦ مِنۡ عِلۡمٍ إِلَّا ٱتِّبَاعَ ٱلظَّنِّۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينَۢا بَل رَّفَعَهُ ٱللَّهُ إِلَيۡهِۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمٗا (سورہ نساء ۲۲)

اب تم سمجھ سکتے ہو کہ جب قصۂ قتل بذریعہ صلیب صحیح ہی نہیں تو پھر صلیب کی تعظیم و تکریم و تقدیس کیسی۔ یہی وجہ تھی کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنے یہاں جس چیز پر صلیب کی تصویر بنی ہوئی ملاحظہ فرماتے اسے فوراً مٹا دیتے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لایترك فی بیتہ شیاء فیہ صلیب الانقضہ۔

Marfat.com

حضرت عدی بن حاتم جب حاضر خدمت ہوئے تو پہلے چونکہ وہ عیسائی تھے اور ان کے گلے میں حاضری کے وقت صلیب پڑی تھی حضور نے فرمایا" اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے اتار پھینکو"۔ عدی نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ عیسائیوں کی تمثال ہے" اس پر حضور نے فرمایا "یہ بت ہی ہے۔"

خطاب والوں سے خطاب

بزرگو، بھائیو، عزیزو۔

خطابوں اور تمغوں کے متعلق تم وہ سب باتیں سن چکے ہو جو ہمیں معلوم ہیں یا معلوم ہو سکیں۔ خطابوں کی ابتدائی وارتقائی تاریخی حالت، ان کی ماہیت، ان کی غایت، ان کے تمغوں اور ستاروں کی شکل وصورت ان میں صلیبوں اور تصویروں کی کثرت، صلیب کی عبادت، تقدس صلیب کے خلاف خدائے علیم وخبیر کی شہادت اور تمثال صلیب سے رسول بشیر ونذیر کی نفرت۔ یہ سب باتیں بے کم وکاست تمہارے سامنے اتمام حجت کے طور پر پیش کی جا چکیں اب تم اپنے دلوں کو ٹٹولو کہ ان میں اللہ، اللہ کے رسول اور اللہ کے دین کی محبت ہے یا ان خطابوں، تمغوں اور گلوبندوں کی۔ کیا تم یہ جواب دو گے کہ تمہارے دل کے تنگ گوشے میں دونوں محبتیں جمع ہیں۔ مگر تمہارا یہ جواب صحیح نہ ہوگا کیونکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ ظلمات و نور اور ظل وحرور جمع نہیں ہو سکتے۔ اچھا پھر کیا یہ جواب دو گے کہ تمہارے سینے میں ایک کی جگہ دو دل ہیں۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ بھی صحیح نہ ہوگا کیونکہ ۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَیۡنِ فِیۡ جَوۡفِہٖ (اتل ما وحی۔ سورۂ احزاب)

لہٰذا اب مذبذبین بین ذالک بننے کا وقت نہیں۔ لازم ہے کہ یا تو اللہ، اللہ کے رسول اور اللہ کے دین کی محبت سے اپنے دل قطعی خالی کردو یا خطابوں سے اپنے نام گلوبندوں سے اپنے گلے اور تمغوں سے اپنے سینے۔

مسلمانو۔ کیا تم اپنے خطابوں کو خطاب دہندوں کی دی ہوئی عزت سمجھ کر رکھتے ہو۔
اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَھُمُ الۡعِزَّۃَ فَاِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا (والمحصنت سورۂ نسا)

Marfat.com

پھر کیا تم اپنے خطابوں کو ان کی رضامندی کے لیے رکھتے ہو۔

وَاللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (واعلمو۔ سورۃ توبہ)

یا کیا تم اپنے خطابوں کو ان کے ڈر سے رکھتے ہو۔

اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ (واعلمو. سورۃ توبہ ۲)

اگر ان سب باتوں کو سننے اور سمجھنے کے بعد بھی تم جو مسلمان باپوں کے بیٹے اور مسلمان بیٹوں کے باپ ہو صلیبوں کے ہار گلے میں ڈال کر صلیبوں کے تمغے اور ستارے تلب پر لگا کر اور صلیبوں کے چوغے جسم پر پہن کر۔

فِیٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (ومن یقنیت سورۃ یٰس)

وطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ (واعلمو سورۃ توبہ)

اور قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ (اقترب للناس، سورۃ الحج)

میں ہم اور ہم کی دوہری ضمیروں کا موضوع اپنے آپ کو بنانا ہی چاہتے ہو تو ــــــ

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ۔

(واعلمو سورۃ توبہ)

خطاب از ملاجی ــــــــ ملاّ مضمون العلی

Marfat.com

خطاب ۔ ضمیمۂ اوّل

حروبِ صلیبیہ

(حاشیہ صفحہ)

وہ مذہبی لڑائیاں جو مغرب کی تثلیث پرست اقوام نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے گیارھویں صدی عیسوی کے عشرۂ آخر سے لے کر تیرھویں صدی کے عشرۂ ثامن تک لڑیں۔ ان لڑائیوں کو صلیبی (کروسیڈ) اس لیے کہتے ہیں کہ جتنے سورما مقدس جھنڈے کے تلے جمع ہو کر مسلمانوں سے لڑنے جاتے وہ پوپ کے حکم سے صلیب کا تمغہ اپنے سینوں پر لگاتے تھے۔ اقوام یورپ کو یہ دیکھ کر صدمہ ہوتا تھا کہ ارضِ مقدس جہاں "خدا کے بیٹے" نے (عیاذاً باللہ) نشو و نما پائی تبلیغ مذہب کی اور بالآخر شہادت حاصل کی جہاں نیکوکار زائر اپنے نجات دہندے کی قبر پر اپنا دکھ درد کہتے اور برکت پاتے جاتے ہیں وہ "بے دین" مسلمانوں کے نجس ہاتھوں میں ہے۔ پطرس (PETERS) راہب نے ۱۰۹۳ء میں زیارت سے پلٹ کر زائرین کے مصائب پوپ اربن ثانی (URBAN II) کے سامنے اس آب و رنگ سے بیان کیے کہ تقدس مآب کی سوکھی آنکھوں میں پانی آگیا۔ چنانچہ پاپائے موصوف نے مارچ ۱۰۹۵ء میں شہر پیا سنترا واقع اٹلی میں ایک مجلس منعقد کی جس میں حضرتِ مسیح کا پیام جو پطرس راہب کی معرفت وصول ہوا تھا عیسائی دنیا کو سنایا۔ پھر نومبر ۱۰۹۵ء میں بمقام کلیرماں واقع فرانس ایک دوسرا اجتماع عظیم ہوا جس میں پوپ صاحب کی برق ریز اور صاعقہ بار تقریر سننے کے بعد مسیحیت نے یک زبان ہو کر فیصلہ کیا کہ "ارضِ مقدس اور روضۂ مبارک کو بے دینوں" سے چھڑانے کے لیے جو لڑائی کی جائے وہ عین خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ اس طرح ۴۹۰ھ مطابق ۱۰۹۶ء میں وہ آگ بھڑک اٹھی جس کے شعلے تین صدی تک تین براعظموں کے خرمنِ امن و عافیت کو خاک سیاہ کرتے رہے۔ ذیل میں صلیبی لڑائیوں کی ایک مختصر فہرست درج کی جاتی ہے۔

Marfat.com

نمبر شمار	ابتدار	انتہا	پوپ جس کے حکم سے یا جس کے عہد میں لڑائی ہوئی	یقاتلون فی سبیل الطاغوت	یقاتلون فی سبیل اللہ	اسباب ونتائج
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
پہلی لڑائی	۱۰۹۶ء مطابق ۴۹۰ھ	۱۰۹۹ء مطابق ۴۹۲	اربن ثانی (URBAN II) وپاشل ثانی (PASCHAL II)	گاڈفرے[1] آف بوبیلون (جسے مورخین عرب کندفرے کہتے ہیں) وبالڈرین[2] برادر گاڈفرے (جسے عرب بالغدوین بردوین یا بردویل کہتے ہیں) بوہیمانڈ[3] (جسے عرب بیمند یا بیموند کہتے ہیں) ٹینکرڈ[4] (جسے عرب طنکری کہتے ہیں) ہیو[5] آف درمانڈ برادر فلپ[6] شاہ فرانس۔ رابرٹ[7] آف فلانڈرس۔ رابرٹ آف	سلجوقی سلطان داؤد قلیج ارسلان	صلیبیوں نے انطاکیہ اڈلیسہ (رہا) عکہ اور آخر کار بیت المقدس مسلمانوں سے چھین کر یوروشلم میں ایک عیسائی سلطنت قائم کرلی۔ ان لڑائیوں میں صلیبیوں کی بہیمیت بلکہ سبعیت کے حالات پڑھ پڑھ کر چاہے عیسائیت کی پیشانی پر شرم کا پسینہ نہ آئے مگر انسانیت کے جسم پر تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ بداخلاقی۔ بداعمالی۔ بے ایمانی، اور غارت گری اور قتل کی بدترین شکلیں تو ہر وقت صلیبی لشکر میں عام تھیں۔ انطاکیہ اور معرۃ النعمان کی لڑائیوں میں مردار صلیبی لشکر میں سربازار بکنا اور انسانی گوشت ہر چولہے پر پکتا تھا۔ اس مقدس شہر میں جہاں

[1] GODFREY OF BOUILON

[2] BALDWIN

[3] BOEMOND

[4] TANCRED

[5] HUGH OF VERMANDOIS

[6] PHILIP

[7] ROBERT

Marfat.com

نمبر شمار	ابتدار	انتہا	پوپ جس کے حکم سے یا جس کے عہد میں لڑائی ہوئی	یقاتلون فی سبیل الطاغوت	یقاتلون فی سبیل اللہ	اسباب ونتائج
			NORMANDY [7] WILLIAM [8] REYMOND OF THOULOUSE [9]	نارمنڈی [7] - برادر ولیم [8] ثانی شاہ انگلستان - ریمنڈ آف ٹولوس [9] وغیرہ وغیرہ - بقول سید امیر علی یہ سات لاکھ انسانوں کا سیلاب عظیم تھا جو مغرب سے مشرق پر ٹوٹ پڑا اور بے خبر اور باہم آویزش مسلمانوں کو بہالے گیا۔		مسیحی خداوند مصلوب ہوا گلی کوچوں میں اسلامی خون کی پیچ پیچ ندیاں بہہ گئیں بلکہ خود اس متبرک ہیکل میں جسے سلیمان نے بنایا اور جس میں آسمانی بادشاہت کے شاہزادے نے دربار عام کرکے دنیا کو امن ونجات کی دعوت دی ستر ہزار سے زیادہ مسلمان مسجد اقصیٰ کے صحن میں بیک وقت ذبح کیے گئے۔ جو صلیبی سوار مسجد کے جلو خانے تک گئے ان کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں تک اسلامی خون کے دریا میں غرق تھے۔
دوسری لڑائی	۱۱۴۶ء مطابق ۵۴۱ھ	۱۱۴۹ء مطابق ۵۴۴ھ	یوجینیس ثالث (EUGINIS III)	کانراڈ ثالث (CONRAD III) شہنشاہ جرمنی ولوئی سابع شاہ فرانس ۹ لاکھ	عمادالدین اتابک زنگی ابن آق سنقر کے سپوت اور نامور بیٹے سیف الدین	عمادالدین اتابک زنگی نے ۱۱۴۴ء میں ایڈلسہ (رہا) عیسائیوں سے فتح کرکے محافظ فوج وہاں چھوڑی، ۱۱۴۶ء میں جب اتابک کی شہادت پر اس کا فرزند رشید نورالدین محمود

Marfat.com

نمبرشمار	ابتداء	انتہا	پوپ جس کے حکم سے یا جس کے عہد میں لڑائی ہوئی	یقاتلون فی سبیل الطاغوت	یقاتلون فی سبیل اللہ	اسباب و نتائج
				اور فوج لے کر مشرق کو آئے۔ لوئی شاہ فرانس کے ساتھ اس کی مشہور ملکہ الینار (EALINOR) بھی تھی جس کی مسافحت و اتخاذ اخدان کے حالات مولانا شرر لکھنوی سے پوچھو۔	غازی اور نور الدین محمود (جنھیں پرانے یورپی مورخین سفاڈینوس اور نوراڈینوس لکھتے ہیں)	تخت حلب پر جلوہ آرا ہوا تو ایڈیسہ کے عیسائی باشندوں نے اسلامی محافظ فوج اور شہر کے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ نور الدین نے شہر کو پھر فتح کیا۔ اس پر یورپ سے یہ طوفان آیا مگر خاسر و خایب واپس گیا۔
تیسری لڑائی	۱۱۸۷ء مطابق ۵۸۳ھ	۱۱۹۲ء مطابق ۵۸۸ھ	گریگوری ثامن (GREGORY VIII) و کلیمینٹ ثالث (CLEMENT III) و سلسٹائن ثالث (CELESTINE III)	فریڈرک اول (FREDERICK I) باربروسہ (BARBAROSSA) (سرخ ریش) شہنشاہ جرمنی فلپ آگسٹس (PHILIP AUGUSTUS) شاہ فرانس اور رچرڈ اول (RICHARD I)	سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی رح	۱۱۸۷ء میں حضرت سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی رحمہ نے بیت المقدس کو پھر فتح کر لیا۔ اس خبر نے پرستاران صلیب میں ہلچل ڈال دی اور تین جلیل القدر بادشاہ بے اختیار فوج لے کر آئے۔ مگر یہ تثلیث بھی بیت المقدس کو سلطان فاتح کے ہاتھ سے نہ لے سکی اور پانچ سال کی جاں فروشی و جاں ستانی کا نتیجہ کچھ نہیں ہوا۔

				شاہ انگلستان بذاتِ خاص فوجیں لے کر آئے۔ کونٹ ہنری (CONUT NENRY) (جسے مورخینِ عرب کند ہری لکھتے ہیں اور اس کے پائے کے بہت سے امرائے عظام بھی ساتھ آئے		(FREDERICK) پہلے ہی ڈوب مرا تھا۔ فلپ کچھ عرصے کے بعد گھر واپس گیا۔ رچرڈ (RICHARD) دونوں سے زیادہ وضع داری بناہے گیا مگر تا کجے۔ آخر صلح کر لی جس کی رو سے صور، عکہ اور یافہ صلیبیوں کے پاس رہا۔ باقی کل شہر جن میں عیسائیوں کے مقاماتِ مقدسہ تھے مسلمانوں کے قبضے میں رہے۔
چوتھی لڑائی	۱۱۹۶ء مطابق ۵۹۲ھ	۱۱۹۷ء مطابق ۵۹۵ھ	سلسٹین ثالث CELESTIN (III) انوسنٹ ثالث INNOCENT (III)	تیسری صلیبی لڑائی کا بچا کھچا لشکر جو مشرق میں موجود تھا۔	سیف الدین ابوبکر ملک العادل برادر سلطان مرحوم	حضرت سلطان صلاح الدینؒ سے صلح ہو چکی تھی مگر ان کی وفات کی خبر سنتے ہی عیسائیوں نے اپنی عادت کے مطابق عہد توڑ دیئے اور بیروت پر قبضہ کر لیا مگر ملک العادل برادر سلطان مرحوم نے یافہ و بیروت چھین لیے۔ آخر صلح ہو گئی اور صلیبی پلٹ گئے

نمبر شمار	ابتداء	انتہا	پوپ جس کے حکم سے یا جس کے عہد میں لڑائی ہوئی	یقاتلون فی سبیل الطاغوت	یقاتلون فی سبیل اللہ	اسباب ونتائج
پانچویں لڑائی	۱۲۰۲ء مطابق ۵۹۹ھ	۱۲۰۴ء مطابق ۶۰۱ھ	انوسنٹ ثالث (INNOCENT III)	مارکوئیس آف مونٹ فراٹ (MARQUIS MONT FERAT) (جسے عرب مرکیس لکھتے ہیں) بالڈون (BALDWIN) کونٹ آف فلانڈرس (COUNT OF FLANDERS) (جسے عرب کندا فلند لکھتے ہیں) گاڈفرے آف ولہاردوِن GODFREY OF VILLEHAR-DOUIN) حاکمان آسٹریا (AUSTRIA) وینس (VENICE) وغیرہ		صلیبی بمقام وینس جمع ہوئے مگر بجائے اس کے کہ سیدھے ارض مقدس آئیں، قسطنطنیہ کو (جس پر ہنوز عیسائی بادشاہ قابض تھا) فتح اور تباہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔

اسباب و نتائج	یقاتلون فی سبیل اللہ	یقاتلون فی سبیل الطاغوت	پوپ جس کے حکم سے یا جس کے عہد میں لڑائی ہوئی	انتہا	ابتداء	نمبر شمار
شام کے ساحلی مقامات تباہ کرنے کے بعد مصر پہنچے اور دمیاط کا محاصرہ کیا۔ مسلمانوں نے نیل کے پھاٹک کھول دیئے اور صلیبی سیلاب میں گھر گئے اور صلح کرکے جلد واپس گئے۔	سیف الدین ملک العادل اور ان کی وفات کے بعد اس کے بیٹے کامل اور معظم اور	شاہ ہنگری (HUNGARY) ڈیوک آف آسٹریا (AUSTAIA) ڈیوک آف بویریا (BAVERIA) اور جرمنی کے دوسرے چھوٹے بڑے اشرف۔ شہزادے ڈھائی لاکھ فوج لے کر آئے	ہنوریس ثالث (HONORIOS III)	۱۲۲۱ء مطابق ۶۱۸ھ	۱۲۱۶ء مطابق ۶۱۳ھ	چھٹی لڑائی
بجائے شمشیر کے کام لینے کے اس نے زبان سے کام لیا اور ناصر الدین ملک الکامل (سلطان صلاح الدین کے بھتیجے) کی کمزوری اور بدعقلی سے فائدہ اٹھا کر ایک معاہدہ صلح کی رو سے بیت المقدس لے لیا۔	ملک الکامل	فریڈرک ثانی (FREDERICK II) (ابو الفداء نے فریڈریک لکھا ہے) شہنشاہ جسے عرب مورخین انبرور یا امبرطور لکھتے ہیں جو امپیرر کا معرب ہے۔ جرمنی (جسے عرب المانی لکھتے ہیں)	گریگوری تاسع (GREGORY IX)	۱۲۲۹ء مطابق ۶۲۷ھ	۱۲۲۸ء مطابق ۶۲۶ھ	ساتویں لڑائی

Marfat.com

نمبر شمار	ابتدا	انتہا	پوپ جس کے حکم سے یا جس کے عہد میں لڑائی ہوئی	یقاتلون فی سبیل الطاغوت	یقاتلون فی سبیل اللہ	اسباب ونتائج
آٹھویں لڑائی	۱۲۳۹ء مطابق ۶۳۶ھ	۱۲۴۰ء مطابق ۶۳۸ھ	گریگوری تاسع (GREGORY IX)	لوئی (LOUIS) شاہ فرانس خود نہ آسکا اپنی طرف سے امرائے فرانس بھیج دیئے جن میں ممتاز امراء کے نام یہ ہیں۔ اموری کونٹ آف مانٹ فیرانٹ (AMOURY CONNT OF MONT FERRAT) ڈیوک آف برگنڈی (DUKE OF BURGUNDY) تھیوبالڈ شاہ نوار (THEOBALD KING OF NAVARRE)	ملک الناصر داؤد بن معظم	صلیبی عکہ میں پہنچے وہاں سے یافہ آئے اور قصد کیا کہ غزہ تک حملہ کریں گے۔

Marfat.com

نمبر شمار	ابتداء	انتہا	پوپ جس کے حکم سے یا جس کے عہد میں لڑائی ہوئی	یقاتلون فی سبیل الطاغوت	یقاتلون فی سبیل اللہ	اسباب و نتائج
نویں لڑائی	۱۲۴۸ء مطابق ۶۴۶ھ	۱۲۵۴ء مطابق ۶۵۲ھ	انوسنٹ رابع INNOCENT IV AND والگزینڈر رابع ALEXANDER IV	لوئی تاسع LOUIS IX (سینٹ لوئی) شاہ فرانس (جسے مؤرخین عرب ایدا فرانس لکھتے ہیں)		سینٹ لوئی نے مصر کو جو انحطاط بغداد کے بعد مسلمانوں کا مرکز امید تھا تباہ و برباد کرنے کی غرض سے دمیاط پر چڑھائی کی اور فتح بھی کر لیا مگر شکست کھا کر بھاگا۔
دسویں لڑائی	۱۲۷۰ء مطابق ۶۶۹ھ	۱۲۷۲ء مطابق ۶۷۱ھ	گرگیوری عاشر (GREGORY X)	لوئی تاسع (LOUIS IX) (سینٹ لوئی۔ شاہ فرانس۔ چارلس (CHARLES) آف آنجو (ANJOU) شاہ صقلیہ آئے۔ جب لوئی مر گیا تو انگلستان کا شہزادہ ایڈورڈ (EDWARD) جو آگے چل کر شاہ ایڈورڈ اول بادشاہ انگلستان ۱۲۷۲ تا ۱۳۰۷ء ہوا، شریک ہونے آیا مگر جلد واپس گیا۔		یہ لشکر سلطان تیونس کو عیسائی کرنے کے لیے آیا تھا مگر بہت سے پرانے عیسائیوں کو خاک میں ملا کر پلٹ گیا۔

یہ تھیں وہ مذہبی لڑائیاں جو اسلام کو " مذہبِ شمشیر " کا طعنہ دینے والی قوموں نے محض اس غرض سے لڑیں کہ " امن کے شہزادے " کی اس قربان گاہ کو جس پر وہ گناہ گاروں کے گناہوں کا کفارہ دینے کی خاطر مطلوب ہوا تھا مسلمانوں کے قبضے سے نکالیں۔ جہاں تک تاریخ پر ہماری نظر تھی ہمیں یہی علم تھا کہ صلیب کی چھوٹی بڑی لڑائیوں کی تعداد اسی قدر ہے اور یہی خیال تھا کہ یہ سب لڑائیاں تیرھویں صدی عیسوی کی تیرہ و تار قبروں میں دفن ہو چکی ہیں اور اب اس تہذیب کے زمانے میں مذہب کی خاطر تلوار اٹھانا ناقابلِ معافی جرم سمجھا جاتا ہے مگر رچرڈ اوّل اور سایڈورڈ اوّل کی وراثت کے منتظم یعنی برطانیہ عظمیٰ کے وزیرِ اعظم مسٹر لائیڈ جارج (LLOYD GEORGE) ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ان لڑائیوں کے شمار میں بقدر ایک کے اضافہ ہوا ہے اور آخری لڑائی وہ ہے جو جنرل ایلنبی (GENRAL ALLENBY) کی تلوار سے ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس فتح ہو جانے پر ختم ہوئی۔ مسٹر لائیڈ جارج ایک طرف تو خود عیسائی ہونے کی وجہ سے صلیبی سورماؤں کی یادگار ہیں، دوسری طرف وہ اس سلطنت کی زبان و دماغ تھے جو سب سے زیادہ مسلمان گردنوں کو اپنے رقبۂ انقیاد میں رکھنے کی غیر موجہ وجہ سے " بزرگ ترین مسلم سلطنت " کہلاتی ہے۔ ان حالات میں اُن سے زیادہ کون معتبر اور ظنین کا واقفِ حال ہو سکتا ہے۔ ہم خود تو بھولے بھالے اور سیدھے سادے تھے ایسے کہ ع

خود اٹھالاتے تھے جو تیر خطا ہوتا تھا

مگر اس معتبر و واقفِ حال رکنِ سلطنت کے سمجھانے سے کیوں نہ سمجھیں اور یقین دلانے سے کیوں نہ یقین کریں کہ بیسویں صدی کی سب سے بڑی لڑائی جو برطانیہ، فرانس، اٹلی، امریکہ، یونان، بلجیم وغیرہ کی متفقہ عیسائیت نے خلافتِ اسلامی کے وارثانِ جائز ترکانِ آلِ عثمان سے لڑی صلیبی ہی تھی۔ اس یقین کے بعد کیا یہ یقین بے بنیاد ہو گا کہ صلیب پرستارانِ فرنگ نے اس لڑائی سے پہلے بھی جس جس دیس میں مسلمانوں سے معرکہ آرائی کی ہے وہ بھی صلیب ہی کی معرکہ آرائی تھی چاہے وہ معرکہ آرائی ــــ

اسکندریہ میں ہو یا الجزائر میں

بوشہر میں ہو یا بلقان میں

Marfat.com

پلاسی میں ہو یا پلونا میں
تل الکبیر میں ہو یا تھیسلی میں
طمانیب میں ہو یا طرابلس میں
غزنین میں ہو یا غرناطہ میں
قندھار میں ہو یا قرطبہ میں
کابل میں ہو یا کریمیا میں۔ اور
میسور میں ہو یا مراقش میں

خطاب۔ ضمیمۂ ثانی۔ حاشیہ صفحہ

فتح فاروقی کے بعد بیت المقدس پر صلیبی قبضے کا منظر دیکھنے کا اتفاق آج بیسویں صدی ہی کو نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے پہلے بھی مسیحی بارھویں اور تیرھویں صدیاں یہی خوابِ پریشاں دیکھ چکی ہیں۔ غیر مسلم پرچم کو کلیسہ صہیون کے منارۃ الفتح پر اُڑتے ابھی کئے دن گزرے ہیں۔ اس سے پہلے بھی تو صلیبی جھنڈا ایک دفعہ کوہچۂ موریا پر پورے نوے برس اور دوسری مرتبہ کوہچہ زیتون پر دس برس لہرا لہرا کر تار تار ہو چکا ہے۔ تم پڑھ چکے ہو کہ صلیبی لڑائیاں سنہ ۱۰۹۶ء میں شروع ہوئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلافتِ عباسیہ کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ بغداد کے تخت پر ایک شانزدہ سالہ بچہ برائے نام بیٹھا تھا۔ شام و عراق میں سلاجقہ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ مصر میں بھی فاطمین کی حکومت میں گھن لگ چکا تھا اور اُن میں اور ترکان سلجوق میں اختلافِ مذہب کی ہیزم کشی نے عداوت کی وہ آگ جلا رکھی تھی جس کے شعلے آسمان تک جاتے تھے۔ ادھر یہ حالت اور ادھر مسیحیوں کا تازہ اتفاق اور تازہ ترجوش۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیت المقدس جس پر دو تین سال قبل مصر کی محض برائے نام حکومت ہو گئی تھی (دیکھو سید امیر علی صفحہ ۳۲۰ نوٹ اور مختصر الدول ابن العبری صفحہ ۳۴۲ نوٹ) ۲۳ر شعبان ۴۹۳ھ مطابق ۱۵ر جولائی ۱۰۹۹ء کو صلیبیوں کے قبضے میں آگیا اور وہاں ایک مسیحی حکومت "یروشلم کی لاطینی بادشاہی" کے نام سے قائم ہوئی جو نوے سال تک رہی۔ اس نئے تخت پر چھوٹے بڑے نو عیسائی بادشاہ بیٹھے جن کی

Marfat.com

فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ گاڈ فرے آف بوئیلون (Godfrey of Bouilon) جسے عربی مورخ کند فرے لکھتے ہیں۔ ۱۰۹۹ء تا ۱۱۰۰ء

۲۔ بالڈوین اول (Bald win I) جسے عرب بغدوین۔ بردوین یا بردویل لکھتے ہیں۔ ۱۱۰۰ء تا ۱۱۱۸ء

۳۔ بالڈوین ثانی ۱۱۱۸ء تا ۱۱۳۱ء

۴۔ فلک آف آنجو (Fulk of Anjou) ۱۱۳۱ء تا ۱۱۴۳ء

۵۔ بالڈوین ثالث ۱۱۴۳ء تا ۱۱۶۲ء

۶۔ اماری (Almarie) جسے مورخین عرب المری لکھتے ہیں۔ ۱۱۶۲ء تا ۱۱۷۳ء

۷۔ بالڈون رابع (مجذوم) ۱۱۷۳ء تا ۱۱۸۳ء

۸۔ بالڈون خامس (طفل بنجسالہ) ۱۱۸۳ء تا ۱۱۸۶ء

۹۔ ملکہ سبیلہ (Sybilla) بشرکت گائی ڈی لوسگنان۔ (Guy de Lusignan) شوہر خود ۱۱۸۶ء تا ۱۱۸۷ء

حضرت سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی رحمۃ اللہ علیہ ورضی اللہ عنہ نے ۲۸ رجب ۵۸۲ھ مطابق ۳ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو بیت المقدس فتح کر کے اس لاطینی بادشاہت کا استیصال کر دیا۔ یمتھیں یاد ہے کہ مسیحیوں نے ۴۹۳ھ میں شعبان کے مہینے میں بیت المقدس مسلمانوں سے چھینا تھا۔ جمعہ کا دن تھا کہ انھوں نے مسجد اقصیٰ کو گرجا بنا کر اس کے گنبد پر صلیب چڑھائی۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ شعبان ہی کے مہینے میں ۵۸۳ھ جمعہ کے دن مسجد اقصیٰ کے گنبد پر سے صلیب اتاری گئی اور سلطان رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ کی نماز مسجد اقصیٰ میں ادا کی۔ قاضی دمشق امام محی الدین بن ذکی نے ایک نہایت پرجوش اور وجد آور خطبہ پڑھا۔ اس دفعہ بیت المقدس مسلمانوں کے قبضے میں ۴۵ سال تک رہا۔ تا آنکہ ۶۲۷ھ مطابق ۱۲۲۹ء میں فریڈرک ثانی (Fredrick II) شہنشاہ جرمن نے ناصر الدین ملک الکامل (برادر زادہ

سلطان مرحوم ومغفور) سے ایک صلح نامہ کی رو سے یورو شلم، بیت اللحم اور ناصرہ مع اور چند شہروں کے لے لیے۔ دس سال عیسائی اس صلح نامہ سے فائدہ اٹھانے پائے تھے کہ ۶۳۷ھ مطابق ۱۲۳۹ء میں ملک الکامل کے بھتیجے ملک الناصر نے پھر یروشلم کو مع کل از دست رفتہ شہروں کے واپس لے لیا۔ اس وقت سے کل سرزمین مقدس چھ سو بیاسی برس تک مسلمانوں کے قبضے میں رہی یہاں تک کہ باغی شریف مکہ نے ۲۱ر جون ۱۹۱۶ء کو مکہ معظمہ پر اپنا قبضہ کر کے آزادیٔ عرب کا اعلان کیا اور اس طرح عربوں کی غداری نے صلیبیوں کے لیے فتح بیت المقدس کا راستہ صاف کر دیا۔ ۲۹ر جون ۱۹۱۷ء کو جنرل ایلنبی نے محاذ بیت المقدس کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور جنوب سے بڑھ کر ۳۱ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بیر شبع پہنچ گیا۔ نومبر کے مہینے میں ساحلی مقامات غزہ اور عسقلان اور یافہ لے کر ۷ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو حبرون، ۸ر دسمبر کو بیت اللحم، اور ۹ر دسمبر کو یروشلم کے پھاٹک پر آ پہنچا اور ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو شہر میں داخل ہوا۔

مصنف

Marfat.com

خطاب۔ ضمیمۂ ثالث

صلیب

(حاشیہ صفحہ ۴۸۲)

زمانۂ قدیم میں جب کسی شدید و قبیح جرم میں کسی کی جان لینی ہوتی تو اسے صلیب پر چڑھایا کرتے تھے۔ یہ سزا رومیوں میں عام تھی ایک موٹی سی لکڑی زمین میں گاڑ کر اس پر (یا کسی سیدھے درخت کے تنے پر) ایک دوسری کسی قدر پتلی اور چپٹی لکڑی زمین سے دو قدآدم اونچی باندھ یا جڑ دی جاتی۔ یہی صلیب تھی۔ مرنے والے کے جسم کو کھڑی لکڑی سے اس کے ہاتھوں کی کلائیوں کو آڑی لکڑی کے سروں سے کس کر باندھتے اور ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور پاؤں میں لوہے کی لمبی لمبی کیلیں ٹھونک دیتے۔ مصلوب سخت جان ہوتا تو برچھیاں بھونک کر مارتے، ایسی تصویریں اور بت جن میں مسیح صلیب پر چڑھے دکھائے جاتے ہیں، تیسری صدی عیسوی ہی سے بنائے جانے شروع ہو گئے تھے جن کا رواج رومن کیتھولک گرجوں میں آج تک ہے۔ ان تصویروں اور بتوں میں مسیح صلیب پر مردہ ٹنگے ہوئے، تمام جسم برہنہ صرف کمر پر ذرا سا کپڑا لپٹا ہوا۔ دو دو کیلیں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں اور ایک دونوں پاؤں میں (جو ایک دوسرے پر رکھے ہوتے ہیں) ٹھونکی ہوئی پہلو میں زخم جس سے خون جاری ہے بنائے جاتے ہیں۔

صلیب کو ابتدائی عیسائیوں ہی نے اپنا نشان قرار دے دیا تھا۔ قسطنطین (Constantine) (شہنشاہ روم ۳۰۶ء تا ۳۳۷ء) کے زمانے سے اسے معزز ترین نشان مسیحیت سمجھنے لگے۔ قسطنطین ہی نے اسے اپنے پرچم پر منقوش کرایا۔ اس نے ہر عیسائی کے مکان کے دروازے پر صلیب بنوائی تاکہ یہودی اور عیسائی مکان میں تمیز ہو سکے۔ اسی کے زمانے میں گرجے صلیب کی وضع پر تعمیر ہوتے۔ اس کی ماں ہیلنا (Helena) کو فلسطین میں وہ اصلی صلیب ملی جس پر مسیح مصلوب ہوتے تھے۔ اصلی صلیب کی تعظیم و تکریم و تقدس کے متعلق عیسائیوں میں عجیب عجیب روایات مشہور ہیں

Marfat.com

یوروشلم سے کوئی دو میل جانب غرب ایک گرجا ہے جسے کنیسۂ صلیب کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ گرجا ٹھیک اس درخت کی جڑ پر بنایا گیا ہے جس سے اصلی صلیب بنائی گئی تھی۔ اس گرجے کے اندر دیواروں پر عبارت و تصاویر کے ذریعے سے یہ قصہ ظاہر کیا گیا ہے۔ " لوط (علیہ السلام) جب شہر سدوم سے بھاگ کر آئے تو اپنے ساتھ ایک شاخ یا جڑ لائے جسے انھوں نے یہاں نصب کیا اور وہ سرسبز ہو گئی۔ ابراہیم (علیہ السلام) کو علم تھا کہ اس درخت کی لکڑی سے وہ صلیب بنائی جانے والی ہے جو دنیا کی نجات ابدی کا باعث ہو گی۔ لہذا وہ اسے روزانہ پانی دیا کرتے تھے۔ مگر شیطان (جو چاہتا تھا کہ مشیتِ الٰہی پوری نہ ہو اور انسانوں کو نجات ابدی حاصل نہ ہو) ابراہیم (علیہ السلام) کی غیر موجودگی میں درخت کو کاٹ پھینکنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ جب وہ کلہاڑی لے کر درخت کاٹنا چاہتا تھا معاً ابراہیم (علیہ السلام) اپنے علم کے ذریعے سے واقف ہو کر وہاں آجاتے اور اسے مار بھگاتے۔ اصلی صلیب کی یہ بھی کرامت سمجھی جاتی تھی کہ اس میں سے بے تعداد ٹکڑے کاٹ لیے جائیں تب بھی اس کی اصلی جسامت میں کمی نہیں ہوتی اور اتنی کی اتنی ہی رہتی۔ اسی لیے ہر گرجے والے کو دعویٰ تھا کہ اس کے گرجے کے تبرکات میں اصلی صلیب کا ٹکڑا ہے۔ چنانچہ ہزارہا حاجت مند وہاں جا جا کر مرادیں مانگتے تھے۔ کروڑہا عیسائیوں کا یقین ہے کہ جسم پر یا ہوا میں صلیب کی شکل بنا دینے سے انسان خبیث ارواح و اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ رومن کیتھولک عیسائی عبادت کرتے وقت صلیب کی شکل بار بار ہوا میں بناتے جاتے ہیں۔ بپتسمہ دیتے وقت بپتسمہ یاب کی پیشانی پر نشان صلیب زمانہ قدیم سے بنایا جاتا ہے جس کا سبب ایک قدیم مصنف یہ لکھتا ہے کہ "گوشت پر مہر لگائی جاتی ہے تاکہ روح محفوظ رہے"۔ یہی مصنف لکھتا ہے: ہر کام کے آغاز سے پہلے ہم جب کسی مکان میں آئیں یا وہاں سے جائیں جب سفر کے لیے کپڑے پہنیں، جب غسل کے لیے جائیں، جب کھانا کھانے بیٹھیں، جب مکان میں شمع جلائیں، جب بیٹھیں یا لیٹیں، غرضیکہ جو کام ہم کریں پہلے صلیب کا نشان اپنی پیشانی پر بنا لیتے ہیں۔

مصنف

عربی ہندسے

میرے ایک دوست کو جو ماشاء اللہ ذی علم اور با فہم ہیں ایک جیبی گھڑی کی ضرورت تھی۔ انھوں نے بمبئی کے ایک کارخانے سے فہرست منگائی اور میری رائے سے ایک گھڑی پسند کی۔ جس کے متعلق فہرست میں لکھا تھا کہ وقت بتانے کے لیے اس پر بجائے رومی ہندسوں کے عربی ہندسے ہیں۔ چنانچہ کارخانے کو فرمائش بھیج کر وہ اپنے گھر چلے گئے۔

ایک روز نہایت منغض چشم وابرو کے ساتھ غریب خانے پر آئے اور بھرائی آواز میں کہنے لگے۔ "دیکھیے یہ بے ایمان تاجر کس قدر جھوٹ تھوپتے ہیں۔ آپ کی منتخبہ گھڑی محض اس لیے منگائی گئی تھی کہ اس پر ہندسے عربی ہوں گے مگر آئی تو وہی سٹرلی انگریزی ہندسے ون۔ ٹو۔ تھری" یہ کہتے ہوئے انھوں نے گھڑی نکالنے کو جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے مسکرا کر کہا۔

"مگر گھڑی پر ہندسے تو عربی ہی ہیں۔"

وہ ۔ "تو میں غلط کہہ رہا ہوں"۔ (گھڑی نکال کر) لیجیے ملاحظہ کیجیے۔"

میں ۔ (بغیر گھڑی دیکھے) "معاف فرمایئے آپ غلط کہہ نہیں رہے ہیں غلط سمجھ رہے ہیں۔"

وہ ۔ (بگڑ کر) اس میں سمجھنے سمجھانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ گھڑی کے ڈائل پر انگریزی ہندسے کیڑوں کی طرح بلبلا رہے ہیں۔ مگر آپ ضد کیے جاتے ہیں کہ مرغی کی ایک ٹانگ کی طرح ہندسے تو "عربی" ہی ہیں اور لطف یہ کہ گھڑی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھی۔ مجھے سخت رنج ہے کہ آپ مجھے جھٹلا رہے ہیں۔"

میں ۔ "آپ تو فرما چکے کہ اس میں سمجھنے سمجھانے کا کوئی سوال نہیں مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس میں ضد کرنے یا جھٹلانے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اگر آپ میری گزارش کو جو کسی قدر صبر آزما اور خاموش طلب ضرور ہوگی غور سے سن لیں تو یقین ہے کہ غلط فہمی دور ہو جائے گی اور آخر میں آپ کو نہ اپنے متعلق جھوٹا سمجھنے کا شبہ رہے گا نہ میرے متعلق ضدی اور سخن پرور ہونے کا۔"

Marfat.com

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میرے دوست نہایت سمجھدار ہیں۔ انھوں نے میری گزارش کو صبر و سکوت کے ساتھ سننے کا وعدہ کیا اور میں نے گزارش شروع کی۔ دوران گفتگو میں دو ایک مرتبہ سلیٹ پنسل کے استعمال اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور چند اور سرخ اور سبز کاہی جلدوں کی کتابوں کی ورق گردانی کا اتفاق ہوا۔

انسان نے جب دور توحش سے گزر کر دور تمدن کی سرحد میں قدم رکھا تو اسے مقدار کے صحیح اندازے یعنی گنتی شمار کی ضرورت داعی ہوئی جس کے یاد رکھنے میں ابتداً تو اس نے حافظے سے کام لیا مگر جب کتابت کا رواج ہوا تو گنتی ہر زبان کی بولی میں بالفاظہا لکھی جانے لگی۔ جب حساب کتاب کا پھیلاؤ زیادہ ہوا اور اس طریقے میں دقت محسوس ہوئی تو مختلف طور پر مختصر طریقے اختیار کیے گئے۔ ہمیں یہاں علم حساب کی تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں لہٰذا اجمالاً و ایجازاً عرض کرتے ہیں کہ مثلاً عبرانی اور یونانی زبان بولنے والی قوموں میں گنتی لکھنے کے لیے عبرانی اور یونانی ابجد کے حروف استعمال ہونے لگے۔ عبرانی ابجد میں بائیس اور یونانی میں چوبیس حروف تھے۔ دونوں زبانوں کے حروف کے تین تین حصے کیے گئے اور ہر ایک کے پہلے حصے سے اکائیوں کا دوسرے سے دھائیوں کا اور تیسرے سے سینکڑوں کا کام لیا جانے لگا۔ کمی پوری کرنے اور دیگر امتیازات کے لیے خاص خاص علامتیں مقرر ہوئیں۔ مثلاً عبرانی زبان کا آٹھواں حرف آٹھ کے لیے اور سترھواں حرف اسی کے لیے مقرر ہوا۔ انھیں حروف کو جوڑ کر سینکڑوں سے ہزاروں بنائے جاتے تھے۔ چونکہ ان زبانوں میں کتابی حروف بھی وہی تھے لہٰذا اعداد و شمار کے پڑھنے میں جو دقتیں پیش آتی ہوں گی آج کا اندازہ کر کے وحشت ہونے لگتی ہے۔

رومیوں نے بالکل ہی ابتدائی عقل کا اظہار کیا یعنی گنتی لکھنے میں لکیروں سے کام لیا۔ چنانچہ ایک کے لیے ایک کھڑی لکیر، دو کے لیے دو، تین کے لیے تین اور چار کے لیے چار کھڑی متوازی لکیریں مقرر کیں۔ پانچ کے لیے لکیریں تو پانچ رکھیں مگر اختصاراً جمع اس طرح کیں V پانچ کے داہنی طرف ہر شمار پر ایک لکیر بڑھاتے گئے یہاں تک کہ پانچ اور تین آٹھ، نو سے پہلے

دس کا حال سُن لو۔ کیونکہ دنیا کے دستور کے خلاف یہاں منزل اوّلین کی تعمیر سے قبل دو منزلہ بنایا گیا ہے۔ دس پانچ کا دونا ہوتا ہے لہذا پانچ کے دو عدد الٹے سیدھے، تلے اوپر رکھ کر دو پانچ اس طرح بنائیے X اب چونکہ نو کا عدد دس سے ایک کم ہے لہذا دس کے بائیں طرف ایک لکیر بنانے سے ایک کم دس یعنی نو ہوتے۔ اس کے بعد دس دس اور ایک (گیارہ) دس ایک ایک (۱۲)...... دس اور پانچ (۱۵) دس پانچ ایک (۱۶)...... دس ایک کم دس (۱۹) دس دس (۲۰)...... دس دس دس اور ایک کم دس (۳۹) اب پھر پہلی منزل سے پہلے دو منزلہ بنا۔ یعنی سو کے لیے ⊏ مقرر ہوا۔ اس کے اوپر والی لکیر کم کرنے سے L رہ گیا جو پچاس کے لیے مقرر ہوا اور چونکہ چالیس کا عدد پچاس سے دس کم ہے لہذا پچاس کے بائیں طرف دس لکھ کر دس کم پچاس یعنی چالیس بناتے جس کی شکل یہ ہوئی XL۔ مزخرفات کا یہ سلسلہ ننانوے تک یعنی گنتر بونت سے چلاتا آنکہ سو کے لیے جیسا ہم اوپر لکھ چکے ہیں ⊏ (جس کی شکل بعد کو C مقرر ہوئی)۔ پانچ سو کے لیے D اور ہزار کے لیے M مقرر ہوئی چنانچہ اگر ہمیں اٹھارہ سو اٹھاسی لکھنا ہو تو یوں لکھیں MDCCCLXXXVIII۔

یہ طریقہ نہ صرف سلطنت روما میں بلکہ اسپین کو مستثنیٰ کر کے سارے مسیحی یورپ میں تقریباً گیارہویں صدی عیسوی تک رہا اور اب بھی اگرچہ متروک ہے مگر مفقود و معدوم نہیں۔ ان اعداد کو رومن کیا پٹیل کہتے ہیں۔ آج بھی بعض کتابوں کی فہرست مضامین و عنوانات پر متن کتاب کے صفحات چھوڑ کر دیباچہ اور ضمیمہ جات کے صفحات پر اور بعض گھڑیوں کے ڈائل پر یہی اعداد لکھے جاتے ہیں۔

حساب نویسی کے اس اعجوبہ ترین طریقے پر تعجب مت کرو بلکہ تعجب اس پر کرو کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب کہ یورپ، دنیا کے عقل کل یورپ، علم و فن کے باوا آدم یورپ، زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے یورپ اور وقت و محنت کی قدر و قیمت سمجھنے والے یورپ کا معیار علم و عقل اس درجے پست و مبتذل تھا کہ وہ دو نہیں چار نہیں پورے چار سو برس کی طویل و عریض مدت تک اعداد کے اس گورکھ دھندے اور حساب کے اس طفلانہ پھندے ہی میں پھنسا رہا اور

اپنے وقت اور چمڑے اور پے پی رس کا بے حساب و شمار حصہ ضائع و تباہ کرکے الٹا سیدھا اپنا م چلاتا رہا۔ انصاف پسند اہل یورپ اب تسلیم کرتے ہیں اور اس میں انصاف اور ہٹ دھرمی اور تسلیم اور انکار کا کیا سوال۔ معمولی سمجھ اور موٹی نگاہ والا آدمی تک بجائے خود سمجھ اور دیکھ سکتا ہے کہ اعداد و شمار کی اس بھول بھلیاں کے ہوتے ہوئے یورپ علوم و فنون میں عموماً اور حساب میں خصوصاً کیا خاک ترقی کر سکتا تھا۔ تاریخیں پڑھو تو معلوم ہو کہ اس زمانے میں یورپ جہالت کے "ظلمات بعضہا فوق بعض" میں کس قدر گہرا اور وحشت و بربریت کے "اثقالاً مع اثقال" کے نیچے کس درجے دبا ہوا تھا۔ چنانچہ صدیوں اس کی یہی حالت رہی تا آنکہ ایک "بکری چرانے والی" قوم نے اسے اس دلدل سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔

عرب کی ریگزار اور سنگسار زمین پر خدا کی رحمت کی گھنگھور گھٹا چھائی اور رشد و ہدایت کا دھواں دھار مینہ برسا۔ جس طرح برسات کی معمولی بارش زمین کی سوتی قوتوں کو جگا کر دمن کو چمن اور راغ کو باغ بنا دیتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے کروڑہا درجہ زیادہ رحمتِ خاص کی غیر معمولی بارش نے اس ملک کے باشندوں کی سوتی قوتوں کو جگایا۔ ان کے مردہ فضائل اور پژمردہ شمائل کو جلایا اور ان کے سوکھے کانٹوں سے ایسے ایسے پھول کھلائے جن کی خوشبو سے ساری دنیا معطر ہو گئی۔

میرا مقصد حالی کے مسدس کو نثر کا لباس پہنانا نہیں مگر اس کے کہے بغیر بات نہیں بنتی کہ اسلام کی تشریف آوری سے پہلے عرب علوم سے قطعی تہی دست فنون سے مطلقاً بیگانہ اور تمدن سے یکسر ناآشنا تھے۔ ان کے پاس نہ حکمت تھی، نہ فلسفہ، نہ ہیئت تھی، نہ جغرافیہ، نہ انھیں بیرونی دنیا سے سروکار تھا نہ دنیا کو ان سے مطلب، کھجور اور اونٹ ایک ان کی پھوپھی اور دوسرا ان کا چچا اور دونوں ان کے پرانے رفیقِ حیات تھے۔ یہی ان کے پیٹ بھرنے اور تن ڈھاکنے کو کافی تھے۔ اس سے زیادہ ان کے پاس اگر کوئی چیز تھی تو وہ ان کی زبان تھی جس سے محاکات و مفاخر، مدح و ہجا اور رجز و مراثی کے ذریعہ وہ اپنے جذبات خوب ادا کر لیتے تھے۔ بس فقط و لکن اللہ یمن علی من یشاء خدا کی دین میں کس کا اجارہ۔ اس جاہل اور اس

Marfat.com

گم کردہ راہ قوم ہی پر اللہ جل شانہ کا خاص فضل و احسان ہوا کہ اس کی رحمت کا آخری پیغام اس کی زبان سے اہلِ زمین کو پہنچایا اور اس کی معرفت کا خزانہ اسی کے ہاتھ سے روئے زمین پر لٹایا گیا۔ ہوالذی بعث فی الامیین رسولا منہم یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمتہ ق وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔

"کتاب وحکمت" کے آبِ حیات سے سیراب ہو کر عربوں نے دنیوی علوم وفنون کی طرف توجہ کی۔ مجھ سے مت پوچھو کہ آبِ حیات کے بعد عرق گلاب و بید مشک پینا ترقی تھی یا تنزل۔ میں واقعات کہہ رہا ہوں۔ رائے نہیں دے رہا ہوں۔ تاریخ سے پوچھو تو معلوم ہو کہ اسلام لانے کے بعد ڈیڑھ سو برس کی قلیل المیعاد مدت ہی گزرنے پائی تھی کہ انھوں نے اپنے علوم وفنون اور اپنی تہذیب وتمدن سے اس وقت کی دنیائے معلوم کو مالا مال کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ عربوں کے پہلے استاد یونانی تھے اور ایک یونانیوں پر ہی کیا موقوف تھا۔ دانائی کی بات انھوں نے جہاں پڑی پائی فوراً اٹھا کر گانٹھ باندھی کہ الحکمتہ ضالتہ المؤمن مگر ان میں ایجاد وترقی کا اس قدر مادّہ اور تحصیل وتحقیق کا اس درجے ولولہ تھا کہ وہ اتنی سی بات ہی پر جو کسی سے معلوم ہوتی قناعت نہ کرتے بلکہ غور وفکر اور کوشش وکاوش سے اس پر بہت کچھ اضافہ کرتے تھے۔ ان کا ملک کتابِ قدرت کا ایک کھلا اور خوش خط لکھا صفحہ تھا جس کے مطالعے کے وہ عادی تھے۔ لہٰذا قدماء کی تصانیف پڑھتے ہی پڑھتے بہت جلد ان پر یہ راز کھل گیا (جسے ازمنہ متوسط کے علمائے یورپ پورے ایک ہزار سال کی محنت میں کہیں جا کر سمجھ پائے) کہ تجربے اور مشاہدے کو مشرح سے مشرح کتاب پر ترجیح ہے۔ تم رامپور لائبریری، پٹنہ لائبریری بلکہ انڈیا آفیس کی لائبریری کی سب کتابیں چاٹ جاؤ مگر جب تک تم میں خود سوچ بچار اور تحقیق وترقی کا مادّہ نہ ہو تمھارا دماغ لائبریری کی اس بے جان اور بے شعور الماری سے زیادہ دقیق نہ سمجھا جائے گا جس میں کتابیں بند رکھی ہوتی ہیں۔

جب ایک گرم خون وا[illegible]زہ دم قوم۔ علم کی تلاش میں اس جوش اور ولولے کے ساتھ

Marfat.com

اٹھے کہ نہ دن کو دن سمجھے نہ رات کو رات۔ جس کی امداد و اعانت کو سلطنت کے خزانے اور جس کی ہمت افزائی کو شاہی گھرانے موجود ہوں۔ جس کے امراء زر پاشی میں اور طلباء دماغ پاشی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں اسے حصول علم میں جس حد تک اور جس قدر جلد کامیابی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ تم خود کرلو میرے کہنے کی ضرورت نہیں۔

عربوں کے کسب علوم کی بسم اللہ خلیفہ منصور عباسی (۱۳۶ھ مطابق ۷۵۳ء تا ۱۵۸ھ مطابق ۷۷۵ء) کے زمانے میں ہوئی جس نے تعمیر بغداد کے بعد بعض فنون کے متعلق یونانی کتابوں کو ترجمہ کرا کر عربوں کو دماغی اور ذہنی مشاغل کی طرف متوجہ ہونے کا موقع دیا۔ پچاس سال کی مدت بھی کوئی مدت ہوتی ہے۔ مگر عربوں کے کمالات دماغی پر حیرت کرو کہ خلیفہ مامون الرشید عباسی (۱۹۸ھ م ۸۱۳ء تا ۲۱۸ھ م ۸۳۳ء) کے عہد خلافت میں وہ فلسفہ اور ہیئت، ریاضی و حساب، تاریخ و اسماء الرجال، جغرافیہ و علم البلدان، علم مناظر و مرایا، علم الحرکات، طبیعات، کیمیا، طب، علم نباتات و حیوانات کی تدوین و تحقیق میں انتہائی مدارج طے کر چکے تھے۔ زیجیں اور تقویمیں، اصطرلاب اور دوربینیں، دنیا کے نقشے اور کرے، پانی اور ریگ کی گھڑیاں، قطب نما، کلیں اور آلات جر ثقیل، تیزاب اور مرکبات کیمیائی، کتب خانے، رصد خانے اور شفاخانے بنا چکے تھے۔

عربوں نے دنیا کو یہ تماشا بھی جلد دکھا دیا کہ مکتب میں جس استاد سے الف ب پڑھنے بیٹھے تھے اسی کو منتہی کتابیں پڑھا کر اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر دستار فضیلت باندھی۔ صدیوں تک عیسائی اقوام یورپ کے معلم صرف عرب ہی تھے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرا ہے جب سے عربی تصانیف کے ترجمے یوروپی درسگاہوں کے نصاب تعلیم سے خارج ہوئے ہیں۔

اگرچہ ذکر تونگری در فقیری مذاق سلیم پر گراں گزرنا چاہیے لیکن بات آ گئی ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ مسلمان طلباء جب حصول علم کے لیے ممالک یورپ میں جائیں اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوں تو اہل یورپ پر (چاہے وہ اساتذہ ہوں یا تلامذہ) لازم ہے کہ اس زمانے کو احسان مندی کے ساتھ یاد کریں جب وہ خود قرطبہ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کی اسلامی یونیورسٹیوں میں طالب علمانہ حیثیت سے داخل ہونا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ ان درگاہوں

کے دفتر الٹ چکے۔ رجسٹر دریا برد ہو چکے۔ مگر تاریخ کے لوحِ حافظہ پر ایسے بہت سے لوگوں کے نام ابھی تک ثبت ہیں جنھوں نے عربی کھیتوں کی چنائی ہی کی بدولت یورپی یونیورسٹیوں کی کرسی پائی ہے۔

مسیحی دنیا میں پوپ کی شخصیت نہایت عظیم الشان سمجھی جاتی ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب جاری ہونے سے پہلے تو اس کے دینی اقتدار کا یہ عالم تھا کہ دوزخ اور بہشت کی کنجی اسی کی جیب میں رہتی تھی جس کے چاہے گناہ معاف کر دے اور جس کے چاہے عبادتیں سلب کر لے۔ دنیوی اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ بڑے بڑے گردن کش عیسائی تاجدار اپنے تاج پوش سر اس کے قدموں پر رکھتے تھے اور وہ اپنی پاپوش کی ٹھوکر سے ایک کے سر سے تاج گرا کر اپنے غلام کے ہاتھ سے دوسرے کے سر پر رکھوا دیتا تھا۔

ایسی ہستیوں میں کم از کم ایک ہستی کو تو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے حصولِ علم کی خاطر جامعہ قرطبہ میں فضلائے عرب کی جوتیاں سیدھی کی ہیں جربرٹ (Gerbert) جو پوپ سلوسٹر ثانی (Sylvester II) کے نام سے ۹۹۹ء سے ۱۰۰۳ء تک اریکہ پاپائی پر متمکن رہا ہے۔ اسلامی علوم میں یہاں تک دسترس رکھتا تھا کہ اس نے ریاضی وہیئت میں کئی کتابیں خود تصنیف کیں اور اپنے ہاتھ سے ایک گھڑی، ایک کرہ ارض اور ایک اصطرلاب بنایا۔ علم حساب و کیمیا میں جو اس نے عربوں سے خصوصیت کے ساتھ سیکھے اسے یہاں تک شغف تھا کہ ازمنہ مظلمہ کا جاہل یورپ اسے "جادوگر" کے نام سے پکارتا تھا۔ علوم و فنون کے اکثر شعبوں میں اٹلی کو باقی ممالک یورپ پر اوّلیت کا جو تفوق رہا ہے وہ سلوسٹر ثانی ہی کی رہینِ منت ہے جس نے کامیابی کے ساتھ اس سرزمین میں اسلامی علوم کی تخم ریزی کی اور لاطینیوں کے دل میں علم کی لگن لگا دی۔

وہ طلیطلہ کی اسلامی یونیورسٹی ہی تو تھی جہاں جیرارڈ قریمونی (Gerard of Cremona) (متوفی ۱۱۸۷ء) اٹلی کے مدارس سے بد دل ہو کر عرب اساتذہ سے پڑھنے گیا تھا اور جہاں سے بعد فراغِ تعلیم واپس آ کر اس نے قانون شیخ کا ترجمہ کیا جو چھ سو برس

تک یورپی مدارس کے طبی نصاب کا بہترین جزو سمجھا جاتا تھا۔ اسی جیرارڈ نے مجسطی کا ترجمہ کیا اور علامہ جابر بن افلح الضلی کی کتاب فلکیات کی شرح لکھی۔

اسی زمانے میں انگلستان کے بھی کم ازکم دو افراد کو عربی سرچشمۂ علوم سے سیراب ہونے کا امتیاز حاصل ہوا۔ ایڈیلارڈ آف باتھ (Adelard of Bath) (متوفی ۱۱۵۰ء) نے ۱۱۰۰ء سے ۱۱۲۰ء تک اپنی عمر اسلامی اسپین، ایشیائے کوچک اور وادیٔ مصر کی سیاحت میں گزاری۔ خود اس کے ہم وطنوں کا بیان ہے کہ وہ مسلمان طالب علم کے بھیس میں قرطبہ پہنچا اور وہاں سے تحریر اقلیدس کی نقل اڑا لایا۔ جس کا ترجمہ اس نے انگلستان آکر شائع کیا اور ۱۵۳۳ء تک یہی ترجمہ اس فن کی ہر کتاب کا ماخذ رہا۔ راجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۱۴ء تا ۱۲۹۴ء) نے عربی علوم کا اکثر حصہ ان لوگوں سے پڑھا جو براہ راست عرب اساتذہ کے شاگرد تھے۔ اس کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ کیمیا، طب، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور علم مناظر و مرایا میں کامل تجربہ رکھتا تھا اور قدم قدم پر بوعلی سینا، الکندی، رازی، الفارابی، الہیثم سے استناد کرتا جاتا ہے۔ اس کے فضل وکمال سے بدنصیب انگلستان اس وقت مطلق بہرہ اندوز نہ ہو سکا۔ اس نے تجویز پیش کی تھی کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں السنہ و علوم مشرقیہ کا شعبہ قائم کیا جائے۔ جس کے لیے اس نے خود اپنی خدمات نذر کیں۔ مگر اس زمانے میں یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد کی ذہنیت کا یہ تقاضا تھا کہ اس "ماہر سحر وطلسمات" کی تجویز کو پاپوش حقارت سے ٹھکرا دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مگر پادریوں کے جہل وتعصب پر ماتم کرو کہ بیچارے راجر بیکن کو دس سال تک نقل وحرکت اور تحریر وتصنیف کی آزادی سے محروم رہنا پڑا۔ تم نے دیکھا کہ جب عربوں میں ابن سینا، ابوالعلاء معرّی اور ابن رشد جیسے گستہ مہار فلسفی جن کی آزادی آخری سرحد تک پہنچ چکی تھی پیدا ہو کر مر بھی گئے اس کے صدیوں بعد انگلستان کی آزادیٔ فکر ورائے کا کیا حال تھا۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ میں کہنا کیا چاہتا تھا اور کہہ کیا گیا۔ عربوں نے سب سے زیادہ جس علم کی طرف اعتنا کی اور جسے پوری توجہ وکوشش و وقت و محنت صرف کر کے عروج

Marfat.com

کمال تک پہنچا دیا وہ علم ریاضی و حساب تھا جس کے بغیر ہیئت و جغرافیہ و طبعیات و علم الحرکات و علم مناظر و مرایا و کیمیا کسی میں بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ کیا یہ عبرت و غیرت کا مقام نہیں کہ جس علم میں عربوں نے اتنا کمال حاصل کیا اسی میں ان کے نام لیوا آج سب سے زیادہ بدشوق، تاریک دماغ، کند ذہن اور بطی الفہم سمجھے جاتے ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ علم حساب، جبر و مقابلہ، تحریر اقلید، علم مثلثات کروی اور علم مخروطات میں عربوں کے اجتہادات، اکتشافات اور ایجادات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کروں مگر اس ڈر سے کہ کہیں مجھ پر "تمدنِ عرب" کے گرامرفون ہونے کی پھبتی نہ کہی جائے زبان روکتا ہوں۔

ابتدا میں عرب بھی گنتی کو اپنی زبان کے الفاظ و عبارت ہی میں لکھا کرتے تھے مثلاً انتیس کو وہ اپنے الفاظ میں تسعہ و عشرون لکھتے تھے۔ جب وہ علم کی پیاس میں چاروں طرف بیتابانہ دوڑ رہے تھے تو ان کی نظر ہندی ارقام حسابی پر پڑی جس میں ہر مقدار کے لیے جداگانہ ایک مختصر اور سادہ شکل تھی اور جس کے باعث حساب میں نہایت آسانی ہوتی تھی۔ دنیا پر ان کا یہ احسان ابدالآباد تک یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندو، جذبۂ تنہا خوری سے متاثر ہو کر جس چیز کو محض اپنے اعلیٰ طبقے ہی تک محدود رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنے ہی ملک کے ادنیٰ افراد تک سے چھپاتے بلکہ سیکھنے کی کوشش پر سخت سزائیں دیتے تھے اسے لے کر اور اپنی طرف سے اسے باقاعدہ اور سہل و سادہ بنا کر ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ ان ارقام کو چونکہ عربوں نے ہندوؤں سے لیا تھا لہذا ان کی دیانت و احسان شناسی ملاحظہ ہو کہ ان کا نام ارقام ہندیہ ہی رکھا جو آگے چل کر ہندسہ ہو گیا۔ احسان شناسی کی بھی اکیلی مثال نہیں۔ یونان سے حکمت و فلسفہ کے چند سبق لے کر انھوں نے اپنی طرف سے ان علوم میں جو بیش بہا اضافہ کیے وہ اہلِ علم پر روشن ہیں مگر جب کہا تو حکمتِ یونانیہ اور فلسفۂ یونانیہ ہی کہا۔ اسی طرح طب کے مبادی بھی انھوں نے یونان ہی سے لیے مگر اس علم میں انھوں نے جو حیرت انگیز ترقیات و تحقیقات اور اکتشافات و اجتہادات کیے وہ یونانیوں کے اچھوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ اس طب ہی کی بدولت یورپ تلمذ و اقتدار کی شکل میں عربوں کو پانچ سو برس تک داد تحسین دیتا رہا ہے۔ مگر یہ جذبۂ احسان شناسی ہی تو ہے کہ نہ

صرف خود عربوں نے بلکہ ان کے اخلاف نے اور ان کی دیکھا دیکھی اور وں نے آج تک علم یونانی ہی کہا۔

یہ ہندسے ایک سے لے کر نو تک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ صفر کی قیمت اور درجہ عربوں نے خود ہی قائم کیا کہ کسی عدد کے داہنی طرف ایک صفر بڑھانے سے اس عدد کی قیمت اعتباری اپنی قیمت مطلق سے دس گنی اور دو بڑھانے سے سو گنی ہو جاتی ہے ان ہندسوں کی شکل وصورت عربوں نے اپنے ہاں وہی رکھی جو ہندوؤں کے ہاں تھی۔ مگر چونکہ ہندوؤں کے طریقۂ کتابت کے خلاف وہ سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کو لکھتے تھے لہذا غور سے دیکھو تو نظر آئے گا کہ ابتدا ہی میں تھوڑی تبدیلی ناگزیر تھی۔ اس کے بعد کچھ تو مرور زمانہ سے کچھ خوبصورتی کے خیال سے اور کچھ شان خط کے لحاظ سے شکل میں اور بھی فرق ہو گیا۔ آج ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہندسے ابتداً خود ہندوؤں کے ہاں کس شکل کے تھے اور اب الفیں کے ہاں ان میں کس قدر تبدیلی ہو گئی ہے۔ موجودہ شکلوں میں بعض ہندسے تو ملتے ہیں لیکن بعض میں باہم گر اختلاف ہے اور اگر یہ حقیقت پیش نظر نہ ہو کہ ابتدا میں دونوں کی شکل ایک ہی تھی تو بعض ہندسوں میں مماثلت، بادی النظر میں بے تکلف ہی معلوم ہو سکے گی۔ ہندی اور عربی ہندسوں کی موجودہ شکلیں ذیل میں دکھائی جاتی ہیں۔

ہندی شکل	ع	ص	ں	ع	Y	8	३	२	ρ
عربی شکل	۹	۸	۷	۶	۵	۴	۳	۲	۱

یہ بتانا کہ عربوں میں سب سے پہلا ریاضی دان کون گزرا ہے اور اس کے بعد علوم ریاضیہ میں کس نے کہاں تک ترقی کی اس مورخ کا کام ہے جو اسلامی علوم حساب کی تدریجی و تفصیلی تاریخ لکھے۔ ہمیں خصوصیت کے ساتھ جس مہندس کا نام لینے کی ضرورت ہے وہ الخوارزمی ہے۔

ابو جعفر عبداللہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی، دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں پیدا ہوا اور

Marfat.com

تیسری صدی کے کسی حصّے تک زندہ رہا۔ خلفائے عباسیہ کے ابتدائی دور میں علوم و فنون کی کھیتی کے لیے ساون بھادوں کے مہینے کا کام دیا۔ اس زمانے میں ذاتی شوق علم کے علاوہ سلطنت کی قدر دانی اور ہمت افزائی کے باعث علم کا چرچا ہر گھر تھا۔ ان ہی گھروں میں سے کسی گھر میں الخوارزمی بھی پیدا ہوا۔ رسمی علوم کے کل شعبوں کی تحصیل سے فارغ ہو کر اس نے ہیئت اور ہندسہ کی طرف خاص توجہ کی۔ خلیفہ ہارون الرشید ہی کے زمانے میں الخوارزمی کے فضل و کمال کی شہرت نے اسے امثال و اقران کی زبان ہی سے راس المنجمین اور امام الہندسین کا خطاب دلوا دیا تھا۔ اس نے علم حساب پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس علم کے متعلق نئے نئے قاعدے درج کیے جو آج معمولی ہونے پر بھی معمول بہا ہیں۔ جب خلیفہ مامون الرشید (۱۹۸ھ م ۸۱۳ء تا ۲۱۸ھ م ۸۳۳ء) کا دور خلافت آیا تو اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اسے طلب فرمایا اور اپنے دربار علم کا صدر بنایا۔ چونکہ اس زمانے میں الخوارزمی نے جبر مقابلہ کی تدوین کی تھی لہٰذا خلیفہ نے حکم دیا کہ اس علم پر بھی ایک عام فہم کتاب لکھے۔ چنانچہ اس نے کتاب الجبر و مقابلہ لکھی اور سبب تالیف یہ لکھا کہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو بہ حکم امیر المومنین المامون لکھی گئی۔ یورپ کی قدر دانی کو دعا دو کہ آج بھی اس کتاب کی ایک نقل آکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔

جبر و مقابلہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے پروفیسر کیلینڈ، ایڈنبرا یونیورسٹی کا معلم ریاضیات لکھتا ہے" دو کتابیں عربی سے اطالوی زبان میں پہلے ترجمہ کی گئیں۔ پہلی کتاب جبر مقابلہ کے متعلق تھی اور دوسری علم حساب کی سب سے پرانی وہ عربی کتاب تھی جسے محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے تصنیف کیا تھا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر مذکور غلطی سے جبر و مقابلہ کی کتاب کو کسی دوسرے مصنف کی تصنیف سمجھتا ہے حالانکہ اس مبحث پر وہ خود پہلے لکھ چکا ہے کہ عربوں میں جبر مقابلہ کا موجد محمد بن موسیٰ الخوارزمی ہے اور اس نے اس علم پر سب سے پہلے ایک کتاب لکھی جس کا پہلا ترجمہ اطالوی زبان میں ہوا۔ اس بحث کو دوسرے مصنفین نے صاف کر دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ الخوارزمی ہی وہ خوش نصیب شخص ہے جس کی تصانیف متعلق حساب و جبر و مقابلہ کے ترجمے سب سے پہلے لاطینی زبان میں ہوئے جنھیں پڑھ کر یورپ کی آنکھیں کھل

گئیں اور اسے اسلامی علوم وفنون کا چسکا پڑا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ الخوارزمی کی حساب اور جبر مقابلہ کی کتابوں کا ترجمہ کس شخص نے اور کس سنہ میں کیا۔ کیونکہ اس بارے میں اقوال مختلف اور متضاد ہیں مگر میری نظر میں یہ رائے قابل اعتبار ہے کہ ان کتابوں کے ترجمے کے لیے پہلا قلم جو اٹھایا گیا وہ اس شخصیت کے "مقدس" ہاتھ میں تھا جس کا حال تم ابھی سن چکے ہو۔

علم حساب میں ایک چیز ہے "لوگے رتھم" (Logarithm) کسی عدد کا لوگے رتھم قوت کا وہ درجہ ہے جس تک کسی اساسی عدد (Base) کو بڑھا کر اس اصلی عدد کے برابر کیا جائے۔ مثلاً ہمیں ۸۱ کا لوگے رتھم دریافت کرنا ہے۔ اب چھوٹے سے چھوٹا عدد جس پر ۸۱ تقسیم ہو سکے ۳ ہے جو اس عدد کا اساسی عدد قائم کیا گیا۔

اب ۳ ضرب ۳ ضرب ۳ ضرب ۳ = ۸۱

∴ $۳^{۴}$ = ۸۱

یعنی ۸۱ کا لوگے رتھم اساسی عدد ۳ کے لیے ۴ ہے۔

اسی طرح ۱۰۰۰ کا لوگے رتھم اساسی عدد ۱۰ کے لیے ۳ ہے۔

اس لفظ لوگے رتھم کی اصلیت جانتے ہو۔ نہیں جانتے ہو تو سنو۔ الخوارزمی نے علم حساب پر جو کتاب لکھی اس میں اس جدید قاعدے کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ سمجھایا جب اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا تو اہل یورپ چونکہ عربی اسماء اور عربی الفاظ کا صحیح تلفظ اور صحیح املا نہیں کر سکتے تھے لہٰذا ترجمہ میں الخوارزمی کی جگہ الگورتھم (Algorithm) لکھ گیا جو اس قاعدے کا نام ہی پڑ گیا اور رفتہ رفتہ لوگے رتھم ہو گیا۔

اگر تمھیں اس کے قبول کرنے میں پس و پیش ہو تو مجھ پر لازم ہے کہ تمھارا اطمینان کر دوں۔ اس امر کے متعلق کہ اہلِ یورپ عربی ناموں کی صورت کہاں تک بدل دیتے تھے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ابن ماجہ	Avempace	اوم پیس
۲۔ ابن رشد	Averrses	اوررُوس
۳۔ ابن سینا	Avicenna	اوی سینا
۴۔ ابوالحسن	Alboacen	البواسین
۵۔ ابوالقاسم	Albucasino	البوکے سی اس
۶۔ ابوالمظفر	Albulafar	البولفر
۷۔ البتانی	Al-bategnius	الباٹیگ نی اس
۸۔ ابومنشر	Albumezar	البومیزار
۹۔ الہثیم	Alhazen	الھازن
۱۰۔ المؤید	Alambuadad	البوم بواڈاڈ

یہ نام ایسے مشاہیر کے ہیں جن کے حالات عربی کتابوں کے علاوہ ویبسٹر کی بڑی ڈکشنری، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور سید امیر علی کی تاریخ میں اس صراحت کے ساتھ ملیں گے کہ اصلی نام یہ ہے مگر یورپ میں اس نام سے پکارے جاتے تھے۔ اگر اب بھی اطمینان نہ ہوا ہو تو قطعی ثبوت بھی حاضر ہے۔ ایف، جی، افلالو F.G. Aflalo اپنی کتاب تلمیع ہلال (Reguilding The Crescent) کے صفحہ نمبر ۹۵ پر لکھتے ہیں۔

"His

"His works on arithmetic And Algebra were translated into Latin by the name of Algorithm (Which Should have been Algorism) ------ His name is the Origin of the word "Logarithm.

جب الخوارزمی کی کتابوں کا اطالوی زبان میں ترجمہ ہوا تو مضامین کے ساتھ ارقام ہندسہ بھی یورپ پہنچے۔ اہل یورپ جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس وقت رومی لکیروں کے بھنور جال میں پھنسے ہوئے تھے انھوں نے حساب نویسی کے اس طریقے کو دیکھا تو بہت سہل اور سادہ پایا لہذا اپنے بدقوارہ اور بے کار طریقہ حساب نویسی کی جگہ آہستہ آہستہ ان ہی ہندسوں کو اپنے یہاں رواج دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آج روئے زمین کے تمام مہذب ممالک میں انھیں کا رواج ہے۔ ہم تینوں قسم کے ہندسوں کو یہاں پھر درج کرتے ہیں۔

ہندی خط میں	९	८	७	६	५	४	३	२	१
عربی خط میں	٩	٨	٧	٦	٥	۴	٣	٢	١
انگریزی خط میں	9	8	7	6	5	4	3	2	1

مثل مشہور ہے "جیسا بوؤ ویسا کاٹو"۔ کم از کم اس موقع پر تو یہ مثل بالکل صادق آتی۔ عربوں نے ان ارقام کو ہندسوں سے لے کر ان کا نام ارقام ہندیہ (ہندسہ) رکھا تھا۔ اب جو یورپ والوں نے انھیں عربوں سے لیا تو عربی ہندسے یعنی

Arabic Figure, Arabic notation, Arabic numeral.

کہتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں۔

۱۔ "ہمارے مروجہ اعداد عربی ہندسے کہلاتے جاتے ہیں جو یورپ میں عربوں کے ذریعے رائج ہوئے"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ جلد ۲ ص ۵۰۵)

۲۔ "گنتی لکھنے کے جو طریقے عربی ہندسوں کے رواج سے پہلے یورپ میں رائج تھے وہ نسبتاً بہت بھدے تھے" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۵۲۶)

۳۔ "عربی ہندسوں کو یورپ میں عربوں نے پہنچایا"۔ (نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد اول ص ۳۱۰)

Marfat.com

۴ - "عربی ہندسے یورپ میں عربوں کی وساطت سے رائج ہوئے۔۔۔۔ چھاپے کی ایجاد کے بعد ان کا رواج عام ہوگیا۔ اس لیے کہ رومی اعداد کے مقابلے میں وہ زیادہ آسان اور سادہ ہیں"۔ (پیرس سائیکلوپیڈیا ص ۱۲۳)

۵ - "عربی ہندسوں کے رواج سے قبل یورپ میں علم حساب میں کوئی قابلِ اعتنا ترقی نہ کرسکا" (پیرس سائیکلوپیڈیا ص ۱۲۳)

۶ - "وہ ایک عرب الخوارزمی ہی تو تھا جس نے ہمارے ہندسے بغداد سے یورپ پہنچائے اور ہمیں بھدّے۔ کاواک اور جہالت کی یادگار رومی اعداد سے نجات دلائی"۔ (ایف، جی، افلالو، تلمیع ہلال ص ۹۲)۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے دوست نے اعتراف کیا کہ گھڑی کے ڈائل پر انگریزی ہندسے کیڑوں کی طرح بلبلانے کی جگہ اب انھیں عربی ہندسے جگنو کی طرح جگمگاتے نظر آنے لگے اور اب انھیں نہ اپنے متعلق جھوٹا سمجھنے کا شبہ ہے نہ میرے متعلق ضدی یا سخن پرور ہونے کا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

الناظر، لکھنؤ ـــــــ ملا مضمون العلیٰ

حزینۃ السادات، بودھامئو

یکم محرم الحرام ۱۳۴۲ھ

عربی رقوم

علی گڑھ کالج کے ایک قابل اور ذہین گریجویٹ جو میرے وطن میں حکومت کی ایک اونچی کرسی پر متمکن تھے فقیر پر بے انتہا عنایت فرماتے تھے۔ معمولی شناسائی تو طالب علمی کے زمانے سے تھی یہاں آنے کے بعد چونکہ وہ کلب میں جاکر ٹینس اور ٹرمپ کھیلنے کے عادی نہ تھے لہذا شام کے وقت کبھی غریب خانے پر تشریف لے آتے۔ کبھی مجھے اپنے دولت خانے پر بلا لیتے۔ تقریباً روزانہ ملنے جلنے سے مراسم بہت زیادہ بڑھ گئے اور تکلف و تصنع کے پردے اٹھ گئے۔

ایک دن کچہری کی تعطیل تھی۔ میں اپنے مکان پر تھا کہ ان کے اردلی نے لاکر رقعہ دیا جس میں لکھا تھا:

"بھائی......

پارسل آیا ہے۔ خانساماں چلا گیا۔ راہ کی ضرورت ہے۔ شام کو دے دوں گا۔ خدا بخش کو دے دیجیے۔"

میں نے اس رقعے کو بلا مبالغہ کوئی تین چار دفعہ تو پڑھا ہوگا مگر کچھ نہ سمجھا۔ بدر چاچ کے شعر یا ریاضی کے سوال کی طرح ہر ہر لفظ پر غور کیا ہر پہلو سے الٹا پلٹا۔ سمجھنے کی پوری کوشش کی۔ طبیعت پر زور ڈالا مگر مفہوم ذہن میں نہ آنا تھا نہ آیا۔ پانچ متفرق اور غیر مربوط جملے جیسے چھوٹے بچوں کی پہلی کتاب میں ہوتے ہیں۔ "سچ بول، کواڑ کھول، کپڑا تر ہے، وہ اندر ہے۔ الٰہی یہ رقعہ ہے یا تشریح الحروف کا سبق، مجھ سے مذاق کیا ہے مگر ایسا ستھرا سنجیدہ جنٹل مین اور مجھ غریب سے مذاق اور وہ بھی ایسا بے معنی مذاق نہیں کوئی بات ضرور ہے مگر کیا بات ہے کچھ مانگا ضرور ہے، مگر کیا مانگا ہے۔ راہ، راہ کیا چیز ہے؟

دفعتاً خیال آیا کہ راہ کو باٹ بھی کہتے ہیں۔ کہیں تولنے کے باٹ تو نہ منگائے ہوں مگر بی بی کے باہر ہونے سے گھر تو بارہ باٹ ہے تو لیں گے کیا پارسل آیا ہے۔ کیا پارسل تولیں گے؟

میں۔ "ارے بھئی خدا بخش!"

خدابخش ۔ حضور

میں ۔ اس رقعے میں لکھا کیا ہے ؟

خدابخش ۔ بھلا حضور ۔ اب مجھے کیا معلوم کیا لکھا ہے ۔ لکھنے والے سرکار پڑھنے والے حضور ۔ میں بے پڑھا آدمی ۔ حکم دیا رقعہ پہنچا دو پہنچا دیا ۔ اب جو جواب حضور دیں گے سرکار کو پہنچا دوں گا ۔

میں ۔ تم سے کچھ کہا تو نہیں کہ فلاں چیز لیتے آؤ ۔ کچھ تولنا ہے ۔ باٹ منگائے ہیں ؟

خدابخش ۔ نہیں حضور مجھ سے نہ باٹ کہے نہ ترازو، خالی رقعہ دیا اور کہا ۔ سید صاحب کو دو ۔ میں لے آیا اور آپ کو دے دیا ۔

میں ۔ اچھا ٹھہرو میں خود ہی چلتا ہوں ۔

چنانچہ میں خدابخش کے ساتھ ہولیا ۔ مکان دور نہ تھا ۔ تین چار منٹ میں پہنچ گیا ۔

وہ ۔ السلام علیکم، آپ نے کیوں تکلیف کی ۔ خدابخش کو دے دیے ہوتے ۔

میں ۔ وعلیکم السلام، دے تو میں جب دیتا جب معلوم ہوتا کہ آپ کیا مانگتے ہیں ۔ آپ کے رقعے کا مطلب میری سمجھ میں تو آیا نہیں ۔

وہ ۔ یہ کیوں ۔ بھائی میں نے ذرا دیر کے لیے اکاون روپے منگائے تھے ۔ پچاس روپے بارہ آنے کی کتابوں کا ویلیو آیا ہے ۔ کم بخت خانساماں بازار چلا گیا ۔ میں نے سوچا آپ سے منگا لوں شام کو دے دوں گا ۔ کیا رقعے میں نہیں لکھا تھا ۔ (رقعہ مجھ سے مانگ کر) یہ لو یہ کیا لکھا ہے ۔ اکاون روپے کی ضرورت ہے ۔

میں نے روپے منگانے کا انتظام کر کے سلسلہ کلام جاری کیا

میں ۔ ہاں آپ رقعہ دکھایے کہاں لکھا ہے ؟

وہ ۔ یہ کیا لکھا ہے ۔

میں ۔ بھائی خدا کے واسطے انصاف کرو ۔ لکھتے ہو "راہ" کی ضرورت ہے ۔ پڑھتے ہو اکاون روپے کی ضرورت ہے ۔ راہ کے معنی اکاون روپے کے کس زبان اور کس لغت میں ہیں ۔ طرح طرح سے سوچا کہ خانساماں کے چلے جانے سے راہ کی کیا اور کیوں ضرورت پیش آئی ۔ اور وہ کیا چیز ہے ؟ جو شام کو آپ مجھے دیں گے اور میں خدابخش کو دے دوں ۔ آپ کی تفصیل

Marfat.com

اور پرائیویٹ احتیاط کے مقتضیات پر نظر کرتے سوچا کہ راہ کوئی معمہ ہے، اشارہ ہے، رمز ہے، تلمیح ہے۔ قصہ طلب واقعہ ہے۔ مگر کوئی بات ذہن میں نہ آئی، راہ، طریق، سبیل راستہ سب کو الٹا پلٹا۔ اس ضمن میں خیال آیا کہ راہ کو باٹ بھی کہتے ہیں کہیں آپ نے تولنے کے لیے باٹ نہ منگائے ہوں مگر خیال آیا کہ آپ تو ہوٹل کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خانساماں کا بل روزانہ چکا دیا جاتا ہے۔ تولنے کے لیے حافظ شیراز کا شعر یا مقدمہ کا ثبوت ہی ہے۔ جب دماغ بات سمجھنے اور جواب دینے سے قاصر رہا تو خود دوڑا آیا کہ دیکھوں معاملہ کیا ہے۔

وہ۔ (زور سے قہقہہ لگا کر) لاحول ولا قوۃ، میں نے اکاون کے ہندسے سے پہلے روپے کی رے لکھ دی تھی جیسے انگریزی میں ہندسے سے پہلے روپے کے لیے آر R اور پونڈ کے لیے £ اور ڈالر کے لیے $ لکھ دیتے ہیں۔ واقعی آپ نے راہ ہی پڑھا ہوگا۔ کاش کہ میں نے حرفوں میں اکاون لکھ دیے ہوتے مگر میرے نزدیک یہ بھدا طریقہ تھا۔ ایسے موقعوں پر انگریزی میں تعداد کو ہندسوں ہی میں لکھتے ہیں مگر روپے کے R ضرور لکھ دیتے ہیں تاکہ شبہ نہ ہو کہ روپے ہیں یا اپلے۔ اردو میں ہندسے سے پہلے رے لکھنی خاکسار کی ایجاد ہے

میں۔ اگر خاکسار اردو میں یہ ایجاد بندہ نہ فرماتا بلکہ پرانے قاعدے کے مطابق اکاون کو رقم میں لکھ دیتا تو یہ تعداد پر اپلوں کا شبہ ہوتا نہ رقعہ پر چیستان کا دھوکا۔

وہ۔ بھئی رقموں کا لکھنا تو مجھے آتا ہی نہیں۔ اگر سیکھوں بھی تو یقین ہے کہ دوسرے ہی دن بھول جاؤں گا۔ والد صاحب تو دیہات کا سارا حساب کتاب رقموں ہی میں لکھتے ہیں مگر میری سمجھ میں تو یہ ردی ناکارہ کا واک چڑیا کانٹے آتی ہی نہیں۔

میں۔ قیامت تو یہی ہے کہ ہماری آنکھوں نے نئی روشنی سے خیرہ ہو کر ہر پرانی چیز کو ردی اور ناکارہ سمجھ رکھا ہے۔ آپ خود محسوس کرتے ہیں کہ محض ہندسہ جب تک اس کی صراحت نہ ہو اس امر کے بتانے کے لیے قطعاً ناکافی ہے کہ وہ روپیہ کی تعداد ہے یا اپلوں کی، رقم میں یہ بات نہیں اس میں جو تعداد لکھی جاتی ہے وہ روپوں ہی کی سمجھی جاتی ہے نہ اپلوں کی، پرانے حساب داں اگر پچاس اپلے لکھیں تو ہمیشہ ہندسوں ہی میں۔ پچاس روپے لکھیں تو ہمیشہ رقموں ہی میں لکھیں

Marfat.com

گئے تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔ رقم اصلاً و ابتداً روپیہ ہی کے لیے ہے۔

وہ ۔ مگر رقم کا یاد رکھنا جو سخت شکل ہے۔ ایک عدد کے لیے ایک خاص بھونڈی، بھدی بے معنی لکیر ہے جس کی قیمت مفروضہ ذہن سے اتر گئی تو مطلب غائب۔

میں ۔ یہ تو ہندسوں کی لکیروں بلکہ ہر اسم کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے علم اور حافظے کا ساتھ ہے۔ اگر آپ آٹھ کے ہندسے کی قیمت مفروضہ بھول گئے یا کسی اسم مثلاً گھوڑے اور پانی کے مسمے کا تصور ذہن سے اتر گیا تو ۸ کی شکل اور گھوڑے اور پانی کے اسم سے آپ کیا سمجھیں گے۔

وہ ۔ (ہنس کر) ہندسے تو اپنی معنی کے ساتھ طبیعت میں اس درجے راسخ ہو گئے ہیں کہ شکل دیکھتے ہی ان کی قیمت مفروضہ کا تصور ذہن میں آ جاتا ہے۔

میں ۔ اسی طرح رقم کو بھی معنی کے ساتھ طبیعت میں راسخ کیجیے اور اس کے ساتھ ہی رقم کی یہ خصوصیت بھی سمجھ لیجیے کہ اس کی شکل اصلاً بامعنی ہے۔ یعنی اس کی قیمت محض فرضی طور پر مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ ہر شکل چلا کر اپنی زبان سے اپنی قیمت بتاتی ہے۔

وہ ۔ (چونک کر) یہ کیسے؟

میں ۔ آپ عربی تو جانتے نہیں۔

وہ ۔ آپ خود جانتے ہیں کہ نہیں جانتا ورنہ جتنا رعب آپ بٹھا لیتے ہیں اور کچھ نہیں تو اس سے سوایا ڈیوڑھا میں بھی بٹھا لیتا۔

میں ۔ لائیے آپ کو رقم سکھاؤں اور دعوے سے کہتا ہوں کہ بھلا آپ بھول تو جائیں مگر شرط یہ ہے کہ میں جو کچھ کہوں اس پر توجہ فرمائیں آپ خود تسلیم کر لیں گے کہ رقم بے معنی شکل اور اس کی قیمت اعتباری نہیں۔ اس کے بعد آپ داد دیں گے کہ آپ کے بزرگوں کے دماغ نے کیسا بہترین اور سادہ ترین شارٹ ہینڈ ایجاد کیا ہے جس سے بڑھ کر یورپ اپنی ذکاوت ذہانت اور فہم و فراست کے باوجود آج تک ایجاد نہ کر سکا۔ اب لائیے پنسل اور کاغذ۔

وہ ۔ یہ لیجیے حاضر ہے۔

میں ۔ پہلے یہ یاد رکھیے کہ رقم عربی گنتی کی مختصر شکل کا نام ہے اور مختصر نویسی کا پورا تجربہ آپ

Marfat.com

کو دفاتر کی زود نویسی کی وجہ سے ہو چکا ہے کہ جلدی میں بعض شوشے، گوشے بڑھ اور بعض گھٹ جاتے ہیں اور "جوہر کامل" منشی جی کے قلم کے تلے آکر "چوہے کا بل" بن جاتا ہے۔

ایک ۔ کو عربی زبان میں واحد اور احد کہتے ہیں مگر محاسبین متقدمین نے بجائے واحد یا احد کے ایک دوسرا لفظ عدد منتخب کیا جسے خط شکستہ میں لکھا جائے تو عـــہ ہوتا ہے لیکن جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا بیس کے لیے جو شکل مقرر کی گئی ہے وہ لفظ عدد بخطِ شکستہ سے اس قدر اشبہ ہے کہ جلدی میں لکھا جائے تو دونوں میں امتیاز مشکل ہو۔ لہذا اس التباس کو رفع کرنے کے لیے انھوں نے عدد بخط شکستہ کے آخر میں ایک شوشہ بہ شکل الف بڑھا دیا جس سے دونوں شکلوں میں مابہ الامتیاز پیدا ہوگیا اور ایک کی یہ شکل ہوگئی : عـــہ

دو ۔ جب ایک کو لفظ عدد سے تعبیر کر لیا گیا تو عربی قاعدے سے عدد کا دو یعنی تثنیہ عدوان ہوا جو خط شکستہ میں اس طرح لکھا جاتا ہے : عـــص

تین ۔ کو عربی میں ثلثہ کہتے ہیں۔ ہندوستان سے باہر ممالک اسلامی میں تو آج بھی تین کے لیے جو رقم مقرر ہے وہ ملـہ ہے۔ مگر ہندوستان کے سیاق والوں نے آخر کے شوشہ کو کسی قدر نیچے کو کھینچ دیا ہے اور اس کی شکل یہ ہے : ـــے ۔

چار ۔ کو عربی میں اربعہ کہتے ہیں جو خط شکستہ میں لعلعہ ہوا۔ درمیانی شوشہ بقول ایک ظریف کے کثرت استعمال سے گھس گیا اور یہ شکل قائم ہوئی : للعہ ۔

پانچ ۔ کو خمسہ کہتے ہیں جس کی شکل رقم میں بھی صاف نظر آتی ہے : صمہ ۔

چھ ۔ کو ستّہ کہتے ہیں۔ اس میں بھی آخری شوشہ کسی قدر نیچے کو کھینچ گیا ہے : ـــے

سات ۔ کو سبعہ کہتے ہیں جس کی شکل رقم میں بھی تقریباً وہی ہے۔ معہ ۔

نو ۔ کو تسعہ کہتے ہیں جس کی شکل رقم میں بھی وہی ہے : لعہ ۔

دس ۔ کو عشر کہتے ہیں۔ چونکہ رے کی کشش نیچے کو کھینچنے سے اکائیوں میں (جن کی جگہ دھائیوں کے نیچے ہے) مل کر بدنمائی پیدا کرتی لہذا کشش کو اوپر کی طرف ایک خوشنما گولائی دے دی گئی اور یہ شکل ہوئی : عـــہ

Marfat.com

گیارہ ۔ کو احد عشر کہتے ہیں۔ احد کے لفظ کو خط شکستہ میں یوں لکھتے ہیں احد۔ مگر اس میں اور نو کی رقم لعہ میں بھی التباس کا خدشہ تھا لہذا ایک کے ہر عدد کے لیے جو دھائی کے ساتھ آئے ہر جگہ یہ شکل مقرر کی گئی لہ لہذا گیارہ یوں لکھا جانے لگا = رعہ

بارہ ۔ دو کی ہر اکائی کے لیے جب وہ دہائی کے ساتھ آئے یہ شکل مقرر کی گئی عہ لہذا بارہ یوں لکھے جانے لگے = عہ

اسی طرح تین سے لے کر نو تو اکائیوں کا سرا ایک بڑی لکیر کے ساتھ دھائیوں کے نیچے قائم ہو کر تیرہ سے انیس تک یہ صورت قائم ہوئی۔

تیرہ = عہ

چودہ = للعہ

پندرہ = صعہ

سولہ = عہ

سترہ = معہ

اٹھارہ = ھعہ

انیس = لدعہ

بیس ۔ کو عربی میں عشرین کہتے ہیں جو خط شکستہ میں یوں لکھا جاتا ہے عہ مگر اس پر بھی دفتری زود نویسی کا عمل ہوا اور آخر کار یہ شکل قائم ہوئی = عہ

اسی طرح باقی دھائیوں کی صورت ہے یعنی۔

تیس = سہ

چالیس = للعہ

پچاس = صہ

ساٹھ = سہ

ستر = معہ

اسّی ۔ اس پر دفتری عمل کسی قدر زیادہ ہوا ہے اور ہندوستان میں اس کی آج کل یہ شکل

Marfat.com

ہے = لـــہ

نوّے ۔ لعـہ

سو ۔ سو کو عربی میں مائۃ کہتے ہیں جسے رقم میں بجنسہٖ رکھا گیا = ماء

دو سو ۔ کا تثنیہ مائتین ہوا جسے خط شکستہ میں مالسر لکھا جانا چاہیے ۔ چنانچہ تقریباً یہی

شکل دو سو کے رقم کی ہے = مار ۔

اسی طرح سو کے داہنی طرف اکائی کا سرا بڑھا کر نو سو تک شکل مقرر کی گئی ہے ۔

ہزار ۔ کو الف کہتے ہیں ۔ چنانچہ نہایت خفیف تغیر کے ساتھ یہی شکل معہ تنوین مقرر کی

گئی ہے = الـ ؍؍؍ ۔

یہ ہے رقموں کی داستان، مجھے امید ہے کہ اب آپ انھیں ردّی، ناکارہ، کا داک

چڑیا کانٹے نہ سمجھیں گے ۔ بلکہ ایک مفید چیز خیال کریں گے اور موجد کی ذہانت کی

داد دیں گے ۔

وہ ۔ بھئی واقعی کمال کیا ہے ۔ میں آپ کی تقریر نہایت صبر سے سنتا اور دل ہی دل میں رقم

کے ایجاد کرنے والے کی قابلیت کی داد دیتا رہا ۔ رقم حقیقتاً گنتی لکھنے کا نہایت مختصر

جامع اور کار آمد طریقہ ہے ۔ اس کی طرف سے بے توجہی انگریزی دانوں کی نافہمی ہے

میری رائے میں اردو میں روپیوں کی بڑی سے بڑی مقدار لکھنے کے لیے اس سے بہتر

اور کوئی شکل ہو ہی نہیں سکتی ۔ آپ یہ پنسل سے لکھا ہوا کاغذ مجھے دے دیجیے تاکہ میں

رقموں کی شکل ذہن نشین کر لوں ۔ آیندہ میں رقم ہی کا استعمال کروں گا ۔

میں ۔ شکر ہے کہ آپ کو بے وقوفوں کی کہی بات تو پسند آئی ۔ ممکن ہے رفتہ رفتہ اسی طرح

اور باتیں بھی پسند آئیں ۔ اندک اندک عشق برراہ آورد بے گانہ را ۔ لیکن جیسا میں

پہلے ذکر کر چکا ہوں آپ تو یورپ ہی کی ہر چیز پر ایمان لائے ہوئے اور ایشیا کی ہر چیز

میں کیڑے ڈالنے پر ادھار کھائے ہوتے ہیں ۔ اگر کبھی وقت کاٹنے، یا گماں نیک کروں

تو کہہ سکتا ہوں کہ واقفیت بڑھانے کے لیے جی چاہے تو علم قرآن کے لیے سیل اور

پامر، سیرۃ نبوی کے لیے سر ولیم میور، تاریخ و تمدن اسلام کے لیے گبن اور میکڈانلڈ

Marfat.com

ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

پس از عمرے گر از حال من بیمار می پرسی
نمی پرسی زمن آن   می پرسی

الناظر، لکھنؤ   ——— فقیر مضمون العلی
۴ر جنوری ۱۹۲۶ء

Marfat.com

شہابِ ثاقب

تاروں بھری رات میں جب نگاہ عالم بالا کی سیر میں مشغول ہوتی ہے تو ہم کو کبھی کبھی آسمان پر ایک ہوائی سی چھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایک تارا ٹوٹتا ہے، اور آسمان پر نور کی ایک لہرا اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا چلا جاتا ہے اور پھر بتدریج تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔ ان آسمانی ہوائیوں یا ٹوٹنے والے تاروں کو شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ میں اس مضمون میں مختصر طور پر ان کی ماہیت سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔

ارسطو اور اس کے ہم خیال فلاسفہ اجرام سماوی کو مدرک و خبیر سمجھتے تھے اور شہاب ثاقب کا عالم بالا پر گاہ بگاہ اس قسم کی اٹکھیلیاں کرنا ان کے اس دعوے کے لیے بمنزلہ حجت موجہ کے سمجھا جاتا ہوگا کہ ستاروں میں قوت ارادی موجود ہے مگر انسان کی عقل کو اس حقیقت کے دریافت کرنے میں زیادہ عرصہ نہ لگا کہ ستارے بھی ان موجودات غیر ذی العقول کی طرح جو کرۂ زمین پر ہمارے دیکھنے میں آتی ہیں عقل و ہوش سے عاری ہیں اس کے بعد جب علوم و فنون نے زیادہ ترقی کی اور انسان کا تجربہ بڑھا تو یہ بات علوم متعارفہ کی طرح مسلم اور یقینی سمجھی جانے لگی کہ مادّہ جس سے کائنات مرئی و محسوس مرکب ہے ہر جگہ اور ہر حالت میں یکساں خواص رکھتا ہے اور اجرام سماوی بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہاب ثاقب انھیں اجزا سے مرکب ہیں۔ جن سے ہمارے کرۂ زمین کے عام مجربات نے ترکیب پائی ہے۔

اس کے ثبوت کے لیے ہم کو بہت زیادہ تدقیق کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ آسمان سے جو چھوٹنے والے تارے بعض دفعہ روئے زمین پر خلائے بسیط میں سے ہو کر گرتے ہیں ان کے اجزا کو جب تحلیل کیا گیا ہے تو کوئی عنصر ہم کو معلوم نہیں ہوا یہ اجزا اس مادے کے اجزا سے مشابہ بلکہ مطابق ثابت ہوتے ہیں جو قعر زمین میں سے کسی کوہ آتش فشاں کی منفذ راہ سے برآمد ہوتا ہے ان اجزا کو جب کیمیاوی طور پر تحلیل کیا گیا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ ان [illegible] لوہے، سفید تانبے، سلیکا اور میگنیشیم اور آخر الذکر قسم کے چند اور فلزات پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک [illegible] کی مدھمی اور

Marfat.com

ہم نے جو نتائج شہاب ثاقب کی ماہئیت کے متعلق مرتب کیے تھے وہ استقرائی تھے یعنی زمین پر جو چھوٹنے والے تارے گرے ان کے اجزا کا ارضی اجزا سے مقابلہ کرکے اور ان کو یکساں پاکر ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ کائنات میں اور جس قدر چھوٹنے والے تارے موجود ہیں ان کے اجزاء بھی اجزائے ارضی کے مطابق ہوں گے لیکن ممکن تھا کہ یہ استقرا ناقص ہو۔ لہٰذا ہم اسپکٹرواسکوپ سے مدد لیتے ہیں اور اپنے استقرا کو کامل بناتے ہیں۔ اسپکٹرواسکوپ ایک حیرت انگیز آلہ ہے جس کی مدد سے ہم کائنات کے بعید ترین مادّی حصوں کی ماہئیت یہاں بیٹھے بیٹھے نہایت صحت و صفائی سے دریافت کر سکتے ہیں۔ جملہ اقسام منور کی شعاعوں کو خواہ ان اجسام کا فاصلہ کتنا ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ کیسے ہی اجزا سے مرکب کیوں نہ ہوں اس معجز نما آلے کی وساطت سے تحلیل کرکے ہم بتا سکتے ہیں کہ آیا وہ سیّال مایع یا متحجر حالت میں ہیں اور آیا وہ متنیر ہیں یا منیر۔ اس کے علاوہ ان اجسام کے ان رنگین خطوط کا جو اسپکٹرواسکوپ میں نظر آتے ہیں ارضی عناصر معلومہ کے خطوط رنگین سے مقابلہ کرکے ہم بتا سکتے ہیں کہ آیا اجسام مذکور ایسے عناصر سے مرکب ہیں یا نہیں جو ہم کو معلوم ہیں جو اکتشافات زمانہ حال کے علمائے سائنس نے اسپکٹرواسکوپ کی مدد سے کیے ہیں کہ اس میں ذرا شبہ نہیں رہتا کہ کائنات مادّی اپنے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے ایک نظام واحد ہے۔

تقلید کا اثر اقوام کے نشوونما پر

یہ مسئلہ کہ قومیں بنتی کس طرح ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ مسئلہ کہ قومیں موجودہ حالت پر کس طرح پہنچیں اور زمانہ قدیم میں ان کی ساخت و ترکیب کس طریقے پر عمل میں آئی اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کو دو جداگانہ حصّوں میں تقسیم نہ کیا جائے اول یہ کہ وہ کیا اسباب ہیں جو حبشی یا یورپین یا سرخ رنگ والی نسلوں کو ان کی خصوصیات مخصوصہ کے لحاظ سے قومیت کے درجے کو پہنچاتی ہیں۔ دوم یہ کہ وہ کیا بواعث ہیں جو خفیف تر امتیازات یا خصوصیات کے محرک ہوتے ہیں مثلاً وہ امتیازات جنھوں نے اسپارٹا اور ایتھنز یا اسکاٹ لینڈ اور انگلستان کے باشندوں کو ایک دوسرے سے متمیز کیا ہے جن براہین و دلائل سے اس مضمون میں کام

Marfat.com

لیا جائے گا اگر وہ درست ثابت ہوں تو بہ حالت موجودہ اقوام دو بڑی قوتوں کے عمل کا ماحصل ہیں ایک وہ قوت جس کے سانچے میں نسلیں ڈھلتی ہیں۔ یہ قوت خواہ اس کی ماہیت کچھ بھی ہو زمانہ قدیم میں عمل کر چکی اور اب معطل ہے۔ دوسری قوت جس کو اس کے صحیح معنوں میں ساخت و ترکیب اقوام کی علت اصلی کہا جاسکتا ہے۔ اب بھی اسی طرح کام کر رہی ہے جس طرح زمانہ قدیم میں کرتی تھی اور اس کی استعداد تخلیق میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔

جن مہتم بالشان اسباب نے قوموں کو بنایا اور اب تک بنا رہے ہیں ان پر سب سے زیادہ تیز روشنی وہ چھوٹے چھوٹے اسباب ڈالتے ہیں جن کا کام قوموں میں تغیر اور انقلاب پیدا کرنا ہے۔ نسلاً بعد نسل جس طریقے پر اقوام میں تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اس کو ارباب نظر استعجاب کے بغیر نہیں دیکھ سکتے اور یہ تغیر التزاماً ایسی حالت میں واقع ہوتا ہے جب کہ اس کے وقوع کے لیے کوئی وجہ موجہ موجود نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی پر دفعتہً کسی مخفی اثر کا جادو چل جاتا ہے جس کی حقیقت ہم کو پوری طرح سے معلوم نہیں۔ انگلستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو ملکہ الزبتھ اور ملکہ این کے زمانوں میں ایک اختلاف عظیم پاؤ گے۔ خارجی و مادی تبدیلی اس عرصے میں ایسی کوئی نہیں ہوئی جو قابل توجہ ہو لیکن قومی تغیر اتنا بڑا ہے کہ اس کی تفصیل کے لیے ورق کے ورق چاہئیں۔ ملکہ این کے زمانے میں بمقابلہ عہد ملکہ الزبتھ انگلستان کی طبعی حالت بہت کم بدلی ایجادات و اکتشافات بہت کم ظہور میں آئے لیکن باشندوں کی مجموعی حالت میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے بیکن سے اڈیسن اور شکسپیر سے پوپ تک آتے ہوئے ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئے۔

لٹریچر کے اعتبار سے جو تغیرات اقوام میں واقع ہوتے ہیں ان کا ذکر اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ کیا جائے گا کیونکہ صحیفۂ حیات کے مقابلے میں لٹریچر کی حدود زیادہ معین اور زیادہ تنگ ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایک کم پیمانے کی چیز میں جو تبدیلیاں واقع ہوں گی وہ کیفیت کے لحاظ سے اسی قسم کے بڑے پیمانے کی چیز کی تبدیلیوں کے لیے مثال یا نمونے کا کام دے سکیں گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مصنف کو جس کا پایہ تحریر میں چنداں بلند نہ تھا اور جسے اب کوئی جانتا بھی نہیں حسن اتفاق سے ایک ایسا موضوع سوجھ گیا جس کو پبلک نے پسند کر لیا اس پر اس نے مضامین

کا ایک تار باندھ دیا اور دوسروں نے اس کے طرزِ تحریر کی تقلید کر کے اسی روش کے مضامین لکھنے شروع کیے، یہاں تک کے ناظرین اس طرزِ تحریر کے عادی ہو گئے اور دوسرے مضامین کو خواہ وہ کسی پایے کے کیوں نہ ہوں ناپسند کرنے لگے۔ جن لوگوں کو یہ عام اور رائج الوقت طرز ناپسند تھا اور انھیں مجبوراً دوسرے زبانوں اور غیر ممالک کی تصانیف اپنی علمی خواہشیں یہ کہہ کر پوری کرنی پڑیں کہ ہم ان آج کل کے مزخرفات اور ہزلیات کو ردی میں پھینک دینے کے قابل سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے اس کہنے سے کیا ہوتا تھا۔ پبلک کو جو چیز پسند آتی تھی۔ آ چکی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اخبار لندن ٹائمس کے بانی سے کسی نے پوچھا کیوں حضرت اس کی کیا وجہ ہے کہ جتنے مضامین ٹائمس میں شائع ہوتے ہیں سب کے سب ایک شخص کے قلم کے نکلے ہوتے معلوم ہوتے ہیں؟ اس کا جواب مستفسر کو یہ ملا کہ ہمارے اخبار کو ایک نہ ایک نہایت عمدہ مضمون لکھنے والا تو ہمیشہ مل ہی جاتا ہے۔ بس جس طرز پر وہ لکھتا ہے باقی سب مضمون نگار اس کا تتبع کرتے ہیں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ بانی ٹائمس کا یہ جواب نہایت شافی تھا اور ہر اخبار پر جو طرزِ تحریر کے متعلق ایک خاص تجارتی علامات بلکہ یوں کہیے کہ ایک ناقابل بیان وحدت و یکرنگی کا نقش ثبت ہو جاتا ہے اس کی علت غائی یہی ہے رسالہ "سیٹرڈے ریویو" کے طرزِ تحریر کے جو لوگ اب سے کچھ سال پہلے موجد ہوتے اور جس کا تتبع آج کے دن ایک نوخیز نسل کر رہی ہے ان کے نام شاید بڑی آسانی سے گنائے جا سکتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ جب رسالے کا طرزِ تحریر کسی خاص مذاق کے سانچے میں ایک دفعہ ڈھل چکتا ہے تو پھر اس کے قیام و تسلسل کا کفیل مضمون نگاروں کا وہ میلان ہی نہیں ہوتا جسے قدرت نے تتبع اور تقلید کی شکل میں ہماری طبیعتوں میں ودیعت کیا ہے۔ بلکہ ایک اس سے بھی زیادہ قوی اور جابرانہ خواہش جس کو ایڈیٹر رسالہ کی ذاتی اغراض سے تعلق ہوتا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایڈیٹر اپنے پرچے کے خریداروں کے لیے گویا ٹرسٹی کی خدمت انجام دیتا ہے اور پرچے میں انہی مضامین کو درج کرتا ہے جن کی نسبت اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ ناظرین کو پسند آئیں گے ایک رسالے کے مستقل خریدار اسی قسم کے مضامین پڑھنا چاہتے ہیں۔ جس کے پڑھنے کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔ وہ پرچے کے ہر نمبر میں ایک ہی طرح کے خیالات اور ایک ہی طرح کے الفاظ دیکھنا چاہتے ہیں اور ایڈیٹر اپنا یہ فرض سمجھتا ہے کہ اس کے ناظرین کی یہ

Marfat.com

خواہش پوری ہوتی رہے۔

جو مضامین اس عام پسند معیار میں پورے اترتے ہیں ان کو تو وہ پرچے میں درج کرتا ہے اور باقی مضامین کو رد کر دیتا ہے۔ ایک موقت الشیوع پرچے کے لیے جو خدمت ایڈیٹر انجام دیتا ہے، وہی خدمت کتب بین پبلک عام لٹریچر کے لیے انجام دیتی ہے۔ یعنی ایک طرز و روش کی تصانیف کی سرپرستی کرتی ہے اور جو تصانیف اس طرز کی نہ ہوں اس کے ساتھ اعتنا نہیں کرتی

اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے اور ہر ملک میں کسی خاص طرز کے لٹریچر کی ترجیح کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی گو کہ اس وجہ کو ہم اب نہ بتا سکتے ہوں کہ کیا تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ عورتوں کے لباس کی موجودہ وضع و تراش کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے لیکن جس طرح لباس کا اختیار کیا جانا اکثر صورتوں میں کسی اتفاقی سبب پر مبنی ہوتا ہے اسی طرح ایک طرح ایک خاص قسم کے لٹریچر کے مرغوب الطبع ہونے کا باعث بھی زیادہ تر اتفاقات ہی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ پیرس کے درزی، خاتونان لندن سے جس وضع قطع کے سایوں کی سفارش کرتے ہیں وہ کہیں کارگاہ آسمانی سے سل کر تو آئے نہیں ہوتے لیکن جب ایک دفعہ یہ بیبیاں اس وضع خاص کا لباس پہننا شروع کر دیتی ہیں پھر مجال کیا جو اس میں سرمو فرق آجائے اور طرہ یہ ہے کہ چند کی دیکھا دیکھی سب ہی وہی لباس پہننے لگتی ہیں۔ خواہ انھیں پسند آئے یا نہ آئے۔ اس صورت میں جس وضع کی ابتدا محض ایک اتفاقی تحریک کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس میں تقلید و تتبع کی خواہش فوراً یکرنگی پیدا کر دیتی ہے اور وہ بھونڈا گون جو ہم نے پچھلے سال پہنا تھا نام کو نظر نہیں آتا۔ لٹریچر میں بھی فیشن اس طرح بدلتے رہتے ہیں۔ اگرچہ لباس کی طرح ان کے تغیر کی محرک محض اندھا دھند اور ناقابل فہم تقلید نہیں ہوتی۔ ایک خاص مذاق علمی کی ابتدا ہمیشہ کسی حجتِ موجہ کی بنا پر ہوتی ہے لیکن جب ایک دفعہ یہ مذاق پیدا ہو جاتا ہے تو پھر لباس کے فیشن کی طرح اس کی اشاعت بھی رک نہیں سکتی۔ وہ لوگ بھی جو اس مذاق کی تصانیف کو نہیں پڑھنا چاہتے بے اختیار ان ہی کو پڑھتے ہیں۔ کیونکہ یہ تصانیف موجود ہیں اور دوسری قسم کی تصانیف بآسانی دستیاب نہیں ہو سکتیں

Marfat.com

Marfat.com

حصّہ ہشتم

تاریخ

Marfat.com

Marfat.com

حدیثِ دیگراں

(۲۱)

میر محفوظ علی بدایونی مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۲۸ء میں بلدۂ حیدر آباد (دکن) میں ہوئی تھی۔ نواب نثار یار جنگ بہادر جو میر صاحب کے دوستوں میں تھے، اپنے ہمراہ مجھے لے گئے تھے۔ میر محفوظ علی کی صورت اتنی پاکیزہ اور نورانی تھی کہ درود پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ سرخ وسپید رنگت، دیدہ زیب ناک نقشہ، اس پر گھنی داڑھی کیا بہار دیتی تھی۔ گفتگو انتہائی محتاط، سنجیدہ اور باوقار۔ علامہ اقبال سے اُن کی خط وکتابت رہتی تھی۔ ایک دن فرمایا، میں نے ڈاکٹر اقبال کو لکھا تھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ انھوں نے جواب میں لکھا "آپ کے جد پر درود پڑھتا ہوں۔" یہی وہ اکابر ہیں جن کے دیکھنے کے لئے بقولِ شاعر "آنکھیں ترستیاں ہیں۔"

تاریخ اُن کا خاص موضوع تھا۔

مکتوب کراچی بنام مولف — ماہر القادری

۱۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء

✧

ماہر صاحب نے علامہ اقبال کا ذکر چھیڑا ہے تو اس سلسلے میں چند باتیں میں بھی عرض کرتا چلوں۔ علامہ کی عقیدتمندی کا یہ عالم تھا کہ وہ سیّد محفوظ علی صاحب کی "مریدی کے طالب" تھے (علیگڑھ میگزین، اکتوبر ۱۹۳۳ء) "علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اکثر مراسلات میں آپ کی زیارت کا اظہار کیا ہے" (علیگڑھ میگزین، جنوری ۱۹۳۹ء) جب بھی علامہ کی کوئی نئی کتاب شائع ہوتی تو وہ اس کا ایک دستخطی نسخہ میر صاحب کی خدمت میں ضرور ارسال فرماتے تھے سنہ ۱۹۳۶ء تا ۳۷ء کی بات ہے جب "بالِ جبریل" کی جلد میر صاحب کے پاس پہنچی۔ کتاب کھولی تو نظر پہلی نظم پر پڑی۔ چونک کر فرمایا۔ "بہت خوب تصرّف کیا ہے، طالب آملی کا شعر چھین لیا!" ان کا

اشارہ اِس شعر کی طرف تھا جو علامہ نے نواب صاحب بھوپال کو مخاطب کرکے کہا ہے:

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
'کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ ترماند'

میر صاحب نے طالب آملی کا شعر برجستہ زبانی پڑھ دیا:

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ ترماند

دراصل، بلامبالغہ اُنھیں ہزاروں شعر ازبر تھے جو موقع و محل کی مناسبت سے چسپاں کر دیتے تھے۔

علامہ اقبال کو بدایوں سے کئی اور بھی علائق خاطر تھے۔ جب وہ ولایت جانے لگے تو دہلی جاکر "التجائے مسافر" سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کی بارگاہ میں عرض کی۔ یہ حضرت بدایوں ہی کے ہونہار بروا تھے جنھیں خاکِ دلی نے کھینچ لیا۔ "بانگ درا" میں "ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے۔" والی نظم مولانا حالی کے شاگرد نظامی بدایونی، مالک و مدیر "ذوالقرنین" ہی کی خواہش پر تحریر فرمائی تھی۔ جب وحید احمد مسعود صاحب نے بدایوں سے "نقیب" جاری کیا تو میر محفوظ علی اور علامہ اقبال اس کے شروع سے آخر تک معاون رہے۔ علامہ کے آخر زمانے میں ضرار احمد کاظمی نے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کو مصور کرنے کی سعی احسن کی جسے علامہ اقبال کے علاوہ علامہ عبداللہ یوسف علی نے بہت سراہا علامہ اقبال نے کاظمی صاحب کو لکھا۔ "آپ بدایوں جیسے مردم خیز خطّے میں اقبال ڈے منا رہے ہیں۔ خدا آپ کو مبارک کرے۔ اگر آپ نے 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کو دنیائے اسلام کے سامنے پیش کر دیا تو اپنے فن کا ایک نیا اسکول قائم کریں گے۔ آپ محض فنِ مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے بلکہ دنیائے اسلام میں بحیثیت مصورِ اقبال ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اگر آپ نے 'جاویدنامہ' پر خامہ فرسائی

Marfat.com

کی تو ہمیشہ زندہ رہو گے۔"

کئی مرتبہ کوشش کی گئی کہ علامہ اقبال بدایوں تشریف لائیں ۱۹۳۵ء میں انھوں نے جواب میں میر محفوظ علی صاحب کو لکھا۔" مخدومی، السلام علیکم۔ میں گزشتہ ۸ ماہ سے علیل ہوں، سفر بہت کم کرتا ہوں، اگر بدایوں آتا تو ضرور آپ ہی کے ہاں ٹھیرتا، اور آپ کے روحانیات سے مستفیض ہوتا۔" ۱۹۳۸ء میں فرار احمد کاظمی صاحب کو لکھا۔" خدا سے دست بہ دعا ہوں کہ وہ آپ کو آپ کے نیک ارادوں میں کامیابی عطا کرے۔ آپ میرے لیے اللہ سے دعا کریں کہ یا تو صحت کلی دے یا ساتھ ایمان کے اٹھالے۔" یہ آخری کوشش تھی جب اہلِ بدایوں یوم اقبال منا رہے تھے لیکن علامہ سخت علیل، بلکہ بستر مرگ، پر تھے۔

رشید احمد صدیقی علیگڑھ سے یومِ اقبال کی صدارت کے فرائض انجام دینے کے لیے آئے اور سید محفوظ علی صاحب ہی کے مہمان رہے۔ اسی قیام کے دوران انھوں نے اپنی ریڈیائی تقریر" گدڑی کے لعل۔ سید محفوظ علی" کے لیے بہت کچھ مواد فراہم کیا۔ اگر قدرت کو اس موقع پر علامہ اقبال کی تشریف آوری بھی منظور ہوتی تو میر صاحب کے دولت کدے پر بیک وقت تین مقتدر ہستیوں کی زیارت ہوتی۔

علامہ اقبال کے لیے بدایوں میں بہت کچھ تھا۔ عبرت، عظمت، اور شانِ دل آویزی۔ بدایوں میں ہندو راجاؤں کے عہدِ حکومت میں ہی مسلمان آباد ہو چکے تھے، اسی طرح جیسے اجمیر، بہرائچ، قنوج، اور ناگور میں غوری حکومت کا قیام بعد میں عمل میں آیا۔ یہ دیکھیے یہ بدایوں کا گنجِ شہیداں ہے۔ شہیدوں کے مزارات نہ صرف بیرونِ شہر ہیں بلکہ اندرونِ شہر محلہ محلہ، گلی گلی، اور گھر گھر میں ہیں۔ جبھی تو استاد مصحفی نے کہا تھا ؎

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں
جس کی گلی گلی میں مزارِ شہید ہے

Marfat.com

اور دیکھیے یہ مزار ہے شہدا کے سرخیل حضرت میر ملہم شہیدؒ معروف بہ میراں جی کا' جو حضرت سالار مسعود غازیؒ کے استاد ہیں۔ اور یہ دیکھیے اس قلعے کی چوڑی چکلی فصیلوں کے شکستہ آثار جس پر غزنوی اور غوری لشکروں نے چڑھائی کی اور جسے بالآخر فتح کیا قطب الدین ایبک نے جو لاہور میں آسودۂ خاک ہے۔

اور یہ مزارات ہیں خواجہ حسن شیخ شاہی رسن تاب معروف بہ سلطان العارفینؒ اور ان کے بھائی شیخ بدرالدینؒ موئے تاب کے۔ یہ خواجہ بختیار کاکیؒ کے ہم عصر ہیں۔ ان کے والد یمن سے چل کر بدایوں میں آباد ہوئے۔ جب شیخ بدرالدینؒ دہلی میں خواجہ بختیار کاکیؒ کے پاس پہنچے تو خواجہ نے شیخ کو دیکھتے ہی کہا۔ "بیا بدرالدین شاہ ولایت بدایوں"۔ چنانچہ بدایوں کی ولایت انھیں سونپی گئی اور وہ "شاہ ولایت" کے لقب ہی سے مشہور ہوئے۔ اور یہ مزار مبارک ہے سلطان العارفینؒ اور شاہ ولایتؒ کے استاد شیخ حسام الدین ملتانی عرف حاجی جمال ملتانیؒ کا۔ جب انھوں نے شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے مزار پر حاضری دی اور دل میں آرزو کی کہ کاش اسی مزار کے پائیں انھیں اپنی قبر کے لیے جگہ مل جاتی تو ارشاد ہوا ۔" زمین دینے میں تامل نہیں لیکن خود رسول مقبولؐ نے زمین پاک تمہارے مدفن کے لیے شہر بدایوں میں مقرر فرمادی ہے" چنانچہ یہ بدایوں پہنچے۔ "فوائد الفواد" میں منقول ہے کہ ایک بار حاجی جمال ملتانیؒ نے خواب دیکھا کہ رسول اکرمؐ بدایوں میں ایک جگہ وضو فرما رہے ہیں۔ جاگے تو اس جگہ کو جا کر دیکھا اور زمین بھیگی ہوئی پائی۔ مرنے کے بعد وہ اسی جگہ مدفون ہوئے۔

حضرت شاہ ولایت کی درگاہ سے ملحق عیدگاہ شمسی ہے۔ نیز وسط شہر میں ایک عالی شان جامع مسجد شمسی ہے۔ یہ دونوں یادگاریں سلطان شمس الدین التمش کی کی ہیں جو سلطنت دہلی سے بیشتر بدایوں کا گورنر رہا تھا۔ دراصل بدایوں کی ترقی میں التمش کا بڑا حصہ ہے۔ اس نے بغداد اور بخارا میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ اوحدالدین کرمانیؒ اور قاضی حمیدالدین ناگوری جیسے

Marfat.com

صوفیائے کرام کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اس نے بدایوں میں کچھ ایسا پُرکشش ماحول پیدا کیا کہ علماء و مشائخ دور دور سے کشاں کشاں چلے آئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے بجا فرمایا کہ "مسلمانوں کے زمانے میں دہلی کے بعد علم کا موکب بدایوں آکر رکا"۔

پھر تو یہ عالم ہوا کہ بدایوں کی گورنری گویا تخت دلی کے لیے شرط اولیں قرار پائی' دہلی میں ایک "بدایونی دروازہ" بھی وجود میں آیا۔ التمش کے علاوہ رکن الدین' علاء الدین خلجی وغیرہ بدایوں میں تعینات رہے۔ یہ تقرر حد درجہ عزت و توقیر کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ تاج الدین سنجر قتلو کو بدایوں کی گورنری پر مبارک باد دیتے ہوئے طوطیٔ ہند حضرت امیر خسروؒ نے فرمایا ؎

اے ز درگاہ شہ اقطاع بداؤں یافتہ
مسندے بالاتر از بالائے گردوں یافتہ

ترک امراء میں چیدہ اور منتخب افراد ہی بدایوں بھیجے جاتے تھے۔ دور قطبی و شمسی میں بدایوں "قبۃ الاسلام" کہلاتا تھا۔ اسے "مدینۃ الاولیا" اور "پیراں شہر" بھی کہتے تھے

اور یہ روضہ ہے سلطان علاؤالدین کا جو لودی خاندان کا پیش رو بادشاہ تھا۔ اسے بدایوں اس قدر بھایا کہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ وہیں اس نے کمال بے نیازی سے بہلول لودی کو لکھ بھیجا۔ "میں کون سا سلطان ابن سلطان ہوں۔ محمد شاہ مرحوم نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اس لیے بادشاہ بن گیا۔ اب میرے پاس بادشاہی کا ساز و سامان نہیں اس لیے میں بدایوں ہی پر صبر و قناعت کرتا ہوں۔ باقی سلطنت سے تیرے حق میں سبک دوش ہوتا ہوں"۔ اسی تحریر کی بنا پر سلطان بہلول نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی اور وہ خاندان لودی کا پہلا بادشاہ ہوا۔

اور یہی سرزمین آماجگاہ ہے "مشارق الانوار" کے مصنف امام رضی الدین حسن صنعانی کی جنھیں لاہور والے لاہوری کہتے ہیں' لیکن بدایوں والے بدایونی۔ سند فوائد الفواد میں موجود ہے کہ — "او از بداؤں بود" موصوف کی تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ وہ جب بغداد پہنچے تو بڑے بڑے جیّد عالموں کے سر ان کے سامنے جھک گئے۔

اور یہ ہیں سات احمد ولیؒ کے مزارات جو بدایوں میں مختلف مقامات پر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہ گویا بدایوں کے سپہر ولایت کے بنات النعش ہیں اور انھیں کے بارے میں شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا۔ ع

ہفت احمد در بدایوں خفتہ اند

اور یہ مزارات ہیں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اجداد کے جو بخارا اور غزنی سے لاہور ہوتے ہوئے بدایوں پہنچے۔ یہ نظام الدینؒ کے جد خواجہ سید علی بخاریؒ ہیں۔ یہ نظام الدینؒ کے والد سید احمد ہیں۔ یہ نظام الدینؒ کے جد مادری یعنی والدہ محترمہ بی بی زلیخاؓ کے والد ماجد سید عربؒ ہیں۔

اور یہی قیام گاہ ہے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی جو دہلی سے بدایوں اور بدایوں سے بنگالہ پہنچے لیکن بدایوں میں اپنے نقوش قدم چھوڑتے گئے۔ اور یہ ہیں شیخؒ کے مرید خواجہ علی مولا بزرگ جو بعد میں شیخ کے قائم مقام اور نظام الدین اولیاؒ کے سرپرست بھی رہے۔ اور یہ ہیں نظام الدینؒ کے استاد مولانا علاؤالدین اصولیؒ جنھیں شیخ جلال الدین تبریزی نے اپنا خرقہ مرحمت فرمایا تھا۔ اور یہ ہیں حضرت شادی مقریؒ حافظ قرآن جن سے نظام الدین اولیاؒ نے ایک پارہ قرآن شریف کا پڑھا۔ ان کا فیض یہ تھا کہ جس نے ان سے قرآن پڑھا وہ حافظ ہو گیا۔ نظام الدینؒ بھی اس کرامت سے فیض یاب ہوئے۔ حضرت شادی مقریؒ اوائل میں ایک ہندی کے غلام تھے۔ ان کے ایک خواجہ لاہور میں تھے۔ جب ایک شخص لاہور سے بدایوں آیا اور اس نے خواجہ شادی سے لاہور کے شدید طوفانِ باراں کا ذکر کیا تو خواجہ شادی نے فرمایا۔ "کیا میرے خواجہ نے انتقال فرمایا جو لاہور پر یہ آفت نازل ہوئی؟" حقیقت یہی تھی جسے یہ شخص چھپانا چاہتا تھا۔

ماضی کے جھروکے میں چشم دل وا کر کے جھانکیے۔ بدایوں میں یہ جگہ تنگی ٹیلہ کہلاتی ہے۔ یہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے والدین سید احمدؒ اور بی بی زلیخاؓ سکونت پذیر ہیں۔ یہیں نظام الدینؒ پیدا ہوئے۔ وہ دیکھیے بی بی زلیخاؓ اپنے

Marfat.com

دست مبارک سے سوت کات رہی ہیں۔ وہ دیکھیے نظام الدینؒ مدرسے سے تمام دن درس لے کر گھر پہنچے۔ چہرے سے عیاں ہے کہ بچہ بھوک سے بیتاب ہے۔ بیوہ ماں بیٹے کی گرسنگی سے دل گیر ہو جاتی ہے۔ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہے اور جرائت مندی سے کہتی ہے۔ " نظام الدین امروز ما مہمانِ خدائیم" بھوکا بچہ مطلب سمجھ جاتا ہے، اور صبر و قناعت کا مجسمہ بن جاتا ہے۔

بی بی زلیخاؒ نے اپنے کاتے ہوئے سوت سے ایک پگڑی بنوائی۔ لیکن یہاں بھی بے بضاعتی کا یہ عالم کہ یہ کائنات چار گز سے زیادہ نہ ہوئی۔ آج نظام الدینؒ کی رسم دستار بندی ہے۔ شیخ علی مولاؒ بزرگ اور مولانا علاؤالدین اصولیؒ موجود ہیں۔ نظام الدینؒ خود وہ صافا اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے باہر مجلس علماء و مشائخ میں آئے۔ شیخ علیؒ نے دستار بندی کی اور نظام الدین خواجہ علیؒ کے روبرو جھکے ہوئے ان سے دعائیں لے رہے ہیں۔

نظام الدینؒ بارہ سال کے سن کو پہنچ چکے ہیں اور لغت علم و ادب پڑھ رہے ہیں۔ ابوبکر نامی قوال ملتان سے بدایوں آیا ہوا ہے۔ وہ نظام الدینؒ کے استاد کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے روبرو مجلسِ سماع میں یہ شعر پڑھا تھا جس کا دوسرا مصرع اسے یاد نہیں آ رہا ہے۔ نظام الدینؒ نے فوراً دوسرا مصرع پڑھ سنایا۔ شعر یہ ہے ؎

لَقَدْ لَسَعَتْ حَیَّۃُ الھَویٰ کَبِدِی
لاطَبِیْبَ لَھَا وَلا رَاقِیْ

(خواہشات کے سانپ نے میرے جگر کو ڈس لیا ہے۔ اس کا کوئی معالج ہے نہ منتری)

نظام الدینؒ حضرت زکریا ملتانیؒ کا حال خاموشی سے سن رہے ہیں، لیکن ابوبکر نے جب ہی خواجہ فریدؒ کا ذکر چھیڑا تو گویا نظام الدینؒ کا دل پکار اٹھا ع

بہ حیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدئی

اسی وقت سے غائبانہ عقیدت ہو گئی اور عبادات کے ساتھ اُن کا ذکر ہونے لگا۔

Marfat.com

خواجہ فریدؒ کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکلؒ جو دہلی میں مقیم تھے، عہدِ التمش کے درویش وجیہہ الدینؒ سے ملنے بدایوں آئے، لیکن جو عقیدت نظام الدینؒ کے دل میں خواجہ فریدؒ سے پیدا ہو چکی تھی، وہ شیخ متوکلؒ کی صحبت میں دہلی پہنچ کر پروان چڑھی۔

اور یہ ہے آخری آرام گاہ ملک الشعراء حضرت شہاب الدین مہمرہ کی جو عہدِ سلطان رکن الدین فیروز شاہ میں ایران سے چل کر آئے۔ طوطیٔ ہند حضرت امیر خسروؒ نے شعر و شاعری میں انھیں درخورِ التفات سمجھا اور اپنے ایک قصیدے میں کہا ؎

در بداؤں مہمرہ سرمست برخیزد ز خواب
گر برآید غلغلہ مرغانِ دہلی زیں نوا

ملک الملوک والکلام امیر فخر الدین عمید تولکی نے بھی مہمرہ کو "استاذی" کے خطاب سے یاد کیا ہے۔

اور یہ مہمرہ کے شاگرد اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ہم عصر خواجہ ضیا الدین بخشی کا مزار ہے۔ انھیں ہندی الفاظ کے استعمال کا ملکہ بہت جلد ہو گیا تھا۔ سلک السلوک انھیں کی شیریں کلامی کی آئینہ دار ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

زہر شہرے و ہر جائے متاعِ قیمتی خیزد
ضیا از نخشب و شکر ز مصر و سعدی از شیراز

اور یہ ہے مولد و مکتب سعدیٔ ہند خواجہ حسن سجزی کا جنھوں نے بعد میں حضرت نظام الدینؒ کے ملفوظات "فوائد الفواد" کو ترتیب دیا، جس پر امیر خسروؒ نے بھی اظہارِ رشک کیا تھا۔ خواجہ حسن فرماتے ہیں ؎

پروردہ فضلِ ایزدش، ارشادِ غیبی مرشدش
بودہ بداؤں مولدش، دہلی ست منشا داشتہ

اور یہ مسکن ہے اور وہ مدفن ہے عہدِ اکبری کے نغز گو شاعر، عظیم عالم، اور بیباک مورخ ملا عبد القادر بداؤنی کا۔ ملا جب پہلی بار اکبر کے دربار میں باریاب ہوئے تو

اُن کے علم و فضل کا رعب اکبر پر اس قدر پڑا کہ وہ پکار اٹھا ۔" بداؤں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج ٹھکانے لگا دے گا"۔ بادشاہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ اور وہ دیکھیے ملا بداؤں کی بھیانک آتش زدگی کا روح فرسا منظر دیکھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اس حادثے میں اتنے ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے کہ اُن کا شمار ناممکن ۔ جلی ہوئی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہایا جا رہا ہے ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہیں۔ ملا فرماتے ہیں ؎

چہ پرسی از بداؤں و ز احوالِ پریشانش
کہ آیات عذاب النّار نازل گشتہ در شانش

ملا کی شعر گوئی کا یہ عالم تھا کہ یہ کیفیت زا شعر انھوں نے عالم خواب میں کہا ؎

آئینۂ ما روئے ترا عکس پزیر است
گر تو نہ نمائی گنہ از جانب ما نیست

ملا کا قلم جب زہر ناکی پر اترتا تھا تو وہ طنز کے ایسے گل کھلاتے تھے کہ ان کا صید بھی صیاد کا کلمہ پڑھتا تھا۔ اُن سے ایک سلام منسوب ہے جس میں بدایوں والوں میں شاید ہی کسی کو انھوں نے بخشا ہو۔ مطلع ہے ؎

اے صبا از من ببر اہلِ بداؤں را سلام
برگ باشد یا کہ گل بل خارِ گلشن را سلام

اور یہ دیکھیے' یہ تو کل کی بات ہے' کہ لاہور کے چند زائرین ملا کی قبر فاتحہ پڑھنے کے لیے تلاش کر رہے ہیں۔ مولوی اکرام عالم مرحوم وکیل تقریباً تین صدی پرانی اس قبر کی نشاندہی کرتے ہیں بسیاح طنز کہتے ہیں ۔" اگر ملا کی قدر بدایوں والے نہیں کر سکتے تو ان کی ہڈیوں کو پنجاب بھجوا دیں"۔ تیر نشانے پر بیٹھا اور بالآخر مولوی اکرام عالم کی سرپرستی میں پختہ مزار تعمیر ہو گیا۔ ملا نے زندگی میں تو لاہور کے بہت پھیرے کیے' لیکن ان کی ہڈیوں پر بدایوں ہی کا حق تھا۔

یہ وہی مولوی اکرام عالم ہیں کہ جب وہ ایک بار لاہور کے سفر پر جانے لگے تو

ان کو میر محفوظ علی صاحب نے مشورہ دیا۔ "لاہور میں تین چیزیں قابلِ دید ہیں، انھیں ضرور دیکھنا۔ ایک علامہ اقبال، دوسرے جسٹس سر شادی لال، اور تیسرے گاما پہلوان!" علامہ اقبال تو بدایوں نہ آسکے لیکن مولوی اکرام عالم کی حیات میں گاما اور امام بخش بدایوں کے ایک دنگل میں زور آزما اور مبارز طلب ضرور ہوئے۔

اور یہ بدایوں سے دو کوس پر سوت ندی کے اس پار ہے موضع شیخوپور، شاہزادہ سلیم شیخو کے نام کا علم بردار اور عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کا مولد جو طبیب حاذق اور مرزا غالب کے چہیتے شاگرد ٹھہرے۔ مرزا انھیں لکھتے ہیں۔ "حکیم نجف خاں سنو اگر تم نے مجھے بنایا ہے، یعنی استاد اور باپ کہتے ہو، یہ امر از روئے تمسخر ہے تو خیر اور اگر از روئے اعتقاد ہے تو میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کر دو۔" مرزا صاحب کی بیگم حکیم صاحب سے پردہ نہیں کرتی تھیں مرزا جب دہلی سے باہر جاتے تو حکیم صاحب کو لکھتے تھے کہ جاؤ گھر میں اپنی استانی کو یہ خط سنا دو۔ مرزا کبھی اُن سے عمدہ چاول کی فرمائش کرتے تھے اور کبھی ماء اللحم کی۔ حکیم صاحب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہنگاموں میں دلّی سے شیخوپور آئے ہوئے ہیں۔ مرزا انھیں لکھتے ہیں۔ "اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو دیکھ لیں گے ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔" ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔ "تمھارے یہاں نہ ہونے سے جی گھبراتا ہے۔ کہو اب خیر سے کب آؤ گے۔ کے برس، کے مہینے، کے دن راہ دکھاؤ گے۔"

مرزا غالب دلّی میں اور یہ حکیم صاحب بدایوں میں "غدر" کے خون خرابے کے عینی گواہ ہیں۔ حکیم صاحب دیکھ رہے ہیں کہ آزادی کی اس جنگ میں بدایوں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ایک طرف کلکٹر ایڈورڈس بلوے کو فرو کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہے، دوسری طرف حوصلہ مند ہتھیلی پر سر لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ دیکھیے ایڈورڈس بھاگ کر بیٹیالی جا رہا ہے اور جاں نثارانِ حریت نے عدالتوں، جیل خانے اور خزانے پر قبضہ کر لیا اور بدایوں میں خان بہادر خاں کی حکومت قائم

ہوگئے۔ وہ دیکھیے ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایونی اور ان کے ساتھی برسرپیکار ہیں، وہ دیکھیے ککرالہ میں یٹی انگریزوں کی فوج کا جنرل مارا گیا۔ اب بریگیڈیر کاک شہر میں داخل ہوگیا۔ اس کے بعد انتقام شروع ہوا۔ وہ دیکھیے بارہ [۱۲] آدمیوں کو قطار میں کھڑا کرکے گولی سے اڑا دیا۔ اکیس [۲۱] افراد گولی کا نشانہ ہوئے۔ ایک سو سترہ [۱۱۷] کو پھانسی دی گئی، چار [۴] حبس دوام کی سزا پا گئے۔ ایک سو چھبیس کو دیگر سزائیں ہوئیں اور دو سو ستر [۲۷۰] کو بید لگائے گئے۔ آزادی کے "مجرموں" کا یہ میلہ ختم ہوا، لیکن ان کی خاکستر میں شرارِ آرزو باقی رہا۔ مولوی تفضل حسین، ان کے بھائی احمد حسین، اور حیدر خاں مارے گئے، لیکن وہ قوم کے سینے میں آزادی کی تڑپ اور سر میں حریت کا سودا چھوڑ گئے۔

اور اس جنگ آزادی کا درخت جب تناور ہوا تو ہندوستان کے مسلم علاقوں کی خودمختاری کے خیال نے بدایوں ہی میں تربیت پائی۔ مولوی محمد امین زبیری نے اپنے ایک مراسلے[۱] میں جو کراچی کے انگریزی روزنامہ ڈان میں شائع ہوا تھا، اس باب میں بدایوں کو اولیت کا درجہ دیا تھا، جستجو کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ بدایوں کے اخبار "ذوالقرنین" میں تقسیم ہند کی ایک تجویز مع ضروری تفصیلات کے محمد عبدالقدیر بلگرامی نے ۱۹۲۰ء میں شائع کرائی تھی۔[۲] جو بعد نظر ثانی ۱۹۲۵ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ یہ گاندھی جی کے نام کھلی چٹھی تھی جس میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان برصغیر کی تقسیم کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ مسلم اضلاع کی ایک فہرست بھی دی تھی جو بالآخر پاکستان میں شامل کردہ علاقوں سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ غالباً مولوی محمد امین زبیری مرحوم کا بیان اسی تجویز پر مبنی تھا۔ مولوی صاحب علامہ اقبال کو اس سلسلے میں چھٹا ملنہ

---

[۱] افسوس کہ ڈان کا متعلقہ پرچہ باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہوسکا۔ یہ بات ۵۷ - ۱۹۵۵ء کے زمانے کی ہے (مولف)

[۲] ملاحظہ ہو مرزا ابوالحسن اصفہانی کا مراسلہ جو کراچی کے انگریزی روزنامے "مارننگ نیوز" مورخہ ۴ مئی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ مولف

دیتے تھے۔ بہرحال جو "خیالی" منصوبہ بدایوں میں بہت پہلے ابھرا اسے سنجیدہ اور قابلِ عمل بنانے کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا۔ اس خواب کی واضح تصویر پروفیسر محمد ایوب قادری کے مضمون " تصورِ پاکستان کی ایک گم شدہ کڑی" العلم کراچی (اکتوبر ۱۹۶۸ء) اور الزبیر بہاولپور (تحریک آزادی نمبر ۱۹۷۰ء) میں ملاحظہ کی جائے۔

اور یہ مزار ہے مولانا عبدالماجد بدایونی کا جو اپنے وقت کے نامور عالم، بلند پایہ قائد، شعلہ نوا مقرر، مخلص دوست اور صاحبِ دل تھے۔ اُن کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں — " اُن کا دراز قد، بڑی ڈاڑھی، سیاہ عمامہ، بڑا کرتہ، اس پر جبہ، گلے میں کالا بڑا رومال یا چادر، مست چال، جھوم جھوم کر متانت سے چلنا، اب تک نگاہوں کے سامنے اُن کی تصویر بنا کر کھڑی کر دیتا ہے"۔ مولانا ہمیشہ آزادی کے سپاہیوں کی صف میں اول رہے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اُن کے مداحوں میں تھے۔ مولانا حسرت موہانی ان پر شیفتہ اور وہ خود سید محفوظ علی پر فریفتہ تھے۔ مولانا جب اپنے سیاسی دوروں پر جاتے تو سیّد صاحب سے مل کر اور اُن کی دعائیں لے کر جاتے اور جب واپس آتے تو اپنی والدۂ مرحومہ کے مرقد پر حاضری دے کر سیدھے سید صاحب کی خدمت میں پہنچتے تھے۔ مولانا آزادیٔ کامل کے اولین حامیوں میں تھے۔ شردھانند کی شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں اور نہرو رپورٹ کی انھوں نے بڑی دلیری سے بھرپور مخالفت کی اور تحریک خلافت میں نہایت عزم و استقلال سے پیش پیش رہے۔

اور یہ ہیں مولانا یعقوب بخش راغبؔ۔ علامہ سید سلیمان ندوی ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔ " ان کے پرنانا مولوی علی بخش صاحب صدر الصدور تھے جن سے سرسیّد کے تحریری مناظرے رہے ہیں۔ کیا عجب بات ہے کہ اس کا پرناتی جس کا پرنانا سرسیّد سے ایسا مذہبی اختلاف رکھتا تھا جس میں کفر و اسلام تک کا تفرقہ تھا، وہ سرسید کی تعلیم گاہ میں دینیات کا مدرس ہو کر رہا"۔ راغبؔ صاحب دینی مسائل اور تراجم میں سید محفوظ علی سے اکثر و بیشتر مشورے کرتے تھے۔

اور یہ ہے ظہور اللہ نوا کا مسکن جن کی فارسی گوئی کا لوہا ایران نے بھی اٹھا رہیں

صدی میں مانا۔

اور یہ ہے شوکت علی خاں فانؔی کی آبادی حویلی، وہ فانؔی جنھوں نے اردو غزل میں رنج و محن کے جذبات کو میرؔ کی سلاست اور غالبؔ کی دقیقہ سنجی کے ملے جلے سانچے میں ڈھالا اور اردو ادبیاتِ عالیہ میں "یاسیات کے امام" کہلائے فانؔی میں اقبالؔ کے شاہین کی صفات موجود تھیں۔ اُن کا وجود اُن ہی کے الفاظ میں "غیور مردن و مغرور زیستن" کا مصداق تھا۔ انھیں نہ وطن راس آیا اور نہ غریب الوطنی حیدرآباد (دکن) میں جہاں ان کی مٹّی عزیز ہوئی انھیں یہی کہتے بنی ؎

بہ غربتم کہ بہر قریہ ام وطن پیداست
بہ ہر زمیں کہ شدم زیرِ آسمانِ من است

اور بالآخر اُن کی زبان سے یہ شعر نکلا ؎

ایں خطائیست کہ عفوم نکنندش فانی
کہ من از خاکِ بدایوں وطنے ساختہ ام

لیکن یہ وہی خاک تھی جس کے بارے میں حضرت امیر خسروؒ کہہ گئے ہیں ؎

زبس کز مرقدِ اہلِ بصیرت منبعِ جود است
بجائے سرمہ در دیدہ کشم خاکِ بداؤں را

امیر خسروؒ کا مولد پٹیالی بھی تو بداؤں ہی کا قصبہ ہوتا تھا اور بدایوں میں آج بھی ایک محلہ پٹیالی سرائے کہلاتا ہے۔ اگر علامہ اقبال بدایوں آئے ہوتے تو عجب نہیں کہ اس عظمت، جبرت اور شان دلاویزی کے شہر کو وہ کچھ یوں نظم فرماتے ؎

گرفت لالۂ ایں شہر رنگِ خونِ شہید
شہید آں کہ بہ زیرِ زمیں لبا ایجا ست
مہجور مادی و دلّی ہم است ملجائے من
بداؤں دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

میں حقیقت سے افسانہ کی راہ پر لگ گیا۔ آیئے بدایوں کے یومِ اقبال کے

جلسے کی طرف واپس چلیں۔

یہ تقریب شب میں بدایوں کی میونسپلٹی کی عمارت میں منعقد ہوئی۔ رشید احمد صدیقی صاحب مسندِ صدارت پر متمکن تھے اور اُن کے ساتھ ہی اُن کے میزبان اور ممدوح سید محفوظ علی صاحب رونقِ محفل تھے۔ بدایوں میں اپنے بے شمار شاگردوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رشید صاحب نے اپنی صدارتی تقریر کچھ اس طرح شروع کی ـــ "حضرات! ....میں اس مجمع میں خود کو فارسی حکایت کے اس حکیم کی طرح محسوس کر رہا ہوں جو قبرستان سے گزرتا تھا تو اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیتا تھا۔ لوگوں نے اُس سے اس حجاب کی وجہ دریافت کی تو حکیم نے کہا کہ ندامت ہوتی ہے کہ جس قبر کی طرف نظر جاتی ہے، اپنے ہی ہاتھوں کا پہنچایا ہوا پاتا ہوں ....." پھر میر محفوظ علی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ـــ "یہ بزرگ جو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اپنے زعم میں تو بہت مستور رہیں لیکن در اصل بہت ہی مشہور۔ موصوف کسی زمانے میں ظرافت لکھا کرتے تھے، لیکن اب ستم ظریفی پر اتر آئے ہیں"۔

جلسے میں تقاریر و مقالات کے علاوہ علامہ اقبال کی نظمیں بھی پڑھی گئیں، مولوی ابوالحسن عرف نواب دولھا کے گھرانے کے ایک لڑکے نے ـــ "دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ" اور "ساقی نامے" کے چند بند بڑے اثر و ترنم سے پڑھے۔ جب وہ ساقی نامے" کے اس شعر پر پہنچا ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امّت روایات میں کھو گئی

تو میر صاحب کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار نمایاں تھے۔ اب مشاعرہ کی باری تھی۔ مجمع ساغر نظامی کو سننے کے لیے بے تاب تھا۔ اسی اثنا میں مولوی ابوالحسن بصیر[۱] کی باری

[۱] بدایوں کے افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کے بیٹے ہیں وہ نیچرل اور قومی نظمیں بڑی اچھی کہتے تھے۔ ایک مجموعہ "لمعات بصیر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مولف

Marfat.com

آئی۔ان کی نظم قومی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی، لیکن سامعین تو ساغر سے "پجارن" سننے کے لیے گوش برآواز تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بزرگ بصیر صاحب پر ہوٹنگ شروع ہوا۔ وہ بگڑ گئے، اور مجمع کو "کور ذوق" اور اسی قبیل کے خطابات سے نوازا۔ رشید صاحب نے مجمع کی نبض پہچان لی۔ کھڑے ہوئے اور بولے ــــ "حضرات! آپ نے تقاریر و مقالات سنے، رباعیات و قطعات سنے، نظمیں اور غزلیں سنیں، اور ساتھ ہی کچھ کھری کھری بھی سن لیں۔ اب آئیے فلاں صاحب کو سنیں"۔ یوم اقبال کی یہ تقریب نصف شب کے بہت بعد خیر و خوبی سے ختم ہوئی۔

رشید احمد صدیقی صاحب سے ملاقات کی غرض سے میں دوسرے دن سہ پہر کو میر محفوظ علی صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ رشید صاحب غسلخانہ میں تھے، اور میر صاحب عصر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ میں حسب معمول میر صاحب کے مطالعے کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں رشید صاحب بھی وہیں تشریف لے آئے۔ لیکن میری اُن کی بات نہیں ہوئی۔ جب میر صاحب نماز سے فارغ ہو کر آئے تو میرا تعارف کرایا۔ رشید صاحب بولے ــــ "میں تو یہاں موجود تھا، لیکن یہ حضرت تو بڑی خاموشی سے بیٹھے رہے"۔ میر صاحب نے فرمایا ــــ "یہ میرے یہاں کے حاضر باش ہیں۔ آداب و رسوم کو کیسے توڑتے۔ جب تک میں خود تعارف نہ کرا دیتا، یہ کیوں کر پہل کرتے"۔ پھر مسکرا کر بولے ــــ "ہاں میں ان لوگوں کو اب متنبہ کر دوں گا کہ رشید صاحب آئندہ آئیں تو تم کاغذ کے کپڑے پہن کر، یا دن میں جلتی مشعل ہاتھ میں لے کر آنا تاکہ رشید صاحب دور ہی سے سمجھ جائیں کہ یہ سب ان کے فریادی ہیں"۔ یوم اقبال کے بہانے رشید صاحب کی میر صاحب سے یہ ملاقات آخری ثابت ہوئی۔

یوم اقبال کا سلسلہ ہندوستان کے طول و عرض میں علامہ کی حیات ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ بدایوں کا یوم اقبال اس سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ اس تقریب کے دو دن بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو جمعہ کی نماز سے قبل مولانا عبدالحامد قادری بدایونی نے جامع مسجد شمسی میں اعلان کیا ــــ "حضرات! ریڈیو پر افسوسناک خبر آئی ہے کہ

علامہ اقبال رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"۔ اس وقت سید محفوظ علی صاحب لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور مولانا ظفر الملک علوی کے یہاں انھوں نے یہ خبر سنی' رشید احمد صدیقی بدایوں سے واپسی پر علی گڑھ کے اسٹیشن پر تھے جب انھوں نے یہ خبر سنی۔ فرماتے ہیں۔ "بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دور دراز کے سفر سے واپس آرہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا' ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے' بہت تھوڑی دیر کے لیے' کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت"۔ سید محفوظ علی پر بھی اس سانحے کا شدید اثر ہوا۔ جب "ارمغانِ حجاز" کا نسخہ جو علامہ اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا' پہنچا تو کسی قدر دل گیر لہجے میں بولے :" افسوس اس پر اقبال کے دستخط نہیں"۔ علامہ ہمیشہ اپنی کتابیں دستخط کر کے سید صاحب کے نام بھیجتے تھے۔ پھر فرمایا کہ جو منظومات اس مجموعے میں شامل ہیں وہ حج بیت اللہ کے موقع پر جس کا ارادہ اقبال کر چکے تھے پیش کیے جانے والے تھے۔ افسوس کہ اس سے پہلے ہی علامہ رحلت فرما گئے۔ سید محفوظ علی خود جب حج کا عزم کر رہے تھے تو انھوں نے اقبال سے کہا تھا کہ حضورؐ کے روضۂ مبارک پر تمھارا سلام عرض کروں گا۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال نے سید محفوظ علی کو ایک مراسلے میں فرمایا۔" میں تو اس قابل نہیں کہ حضورؐ کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جا سکوں' تاہم حضورؐ کے اس ارشاد سے جراءت ہوتی ہے۔ (الصالح ولی) یعنی گنہگار میرے لیے ہے :

میں نے ایک بار "ساقی نامے" کے اس شعر کا ذکر پھر چھیڑ دیا ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امّت روایات میں کھو گئی

تو فرمانے لگے۔" ہم لوگ عمل سے دور ہو گئے اور اس طرح کے ڈھکوسلوں پر یقین لے آتے ہیں جیسے ہماری بستی میں عقیدہ ہے کہ اگر فلاں دو مزاروں کے درمیان

سے جنازہ گزار دیا جائے تو مردے پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ گویا اعمالِ نیک کی حاجت ہی نہیں رہی"۔ — مولف

٭

ڈاکٹر اقبال سے میر صاحب کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ اپنی تصانیف میر صاحب کے پاس بھیجتے تھے "جاوید نامہ" کی جلد میر صاحب کے یہاں آئی اور ان کے شام کے بیٹھنے والوں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ میں نے عرض کی کہ میر صاحب سے پڑھا جائے، طاہر، حلاج، صادق وغیرہ وغیرہ جو نام آئے ہیں ان کے فلسفے اور حالاتِ زندگی میر صاحب بتاتے جائیں۔" جاوید نامہ" اسی طرح پڑھا گیا۔ مجھے میر صاحب کی معلومات کا اندازہ ہوا کہ کس درجہ عمیق اور وسیع عبور ان کو اسلامی تاریخ پر تھا۔ صبح کو حج بیت اللہ کو جا رہے تھے۔ چند صفحے "جاوید نامہ" کے باقی تھے۔ رات کے گیارہ بجے تک وہ ختم کیے باوجود ہم سب کے کہنے کے کہ آپ سامان ٹھیک کیجیے اور آرام فرمائیے۔

ذاتی تحریر از بدایوں — نہال الدین بدایونی

٭

جناب سیّد محفوظ علی صاحب، میرے خسر شید محی الدین صاحب کے پاس کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ اس طرح مجھے ایسی نہایت ہی اہم شخصیت سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک بار گھبرگہ شریف میں ان سے ملاقات ہوئی تو مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے "بالِ جبریل" میں "لینن خدا کے حضور میں" پڑھی۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی تک تو پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ انھوں نے فرمایا اقبال ربّ العزت کے سامنے شکایت کریں گے کہ میں نے ایک کام کی چیز لکھی اور لوگوں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ اس کے بعد میں نے اس نظم کو بار بار پڑھا۔

مکتوب کراچی بنام مولف — میجر آفتاب حسن

۱۶ اگست ۱۹۶۹ء

٭

افسانہ سے افسانہ نکلتا رہا۔ بات طویل ہو گئی۔ اسے میجر آفتاب حسن پر

ختم کرتا ہوں۔ آیئے اب سیّد محفوظ علی صاحب کا مضمون "لنگر" پڑھیں، جو مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں ان میں یہ سب سے پرانا ہے۔ یہ ان کے اولین دورِ نگارش کا اعلیٰ نمونہ ہے اور تاریخ پارینہ کا ایک کھویا ہوا باب۔ نیز لفظ "لنگر" کی وجہ تسمیہ جو سیّد صاحب نے بتائی ہے، از حد دلچسپ ہے۔ یہ مضمون نصاب کی کتابوں میں جگہ پا چکا ہے۔

—— مولف

لنگر

لنگر کا جلوس دکن کی اُن خصوصیات میں سے ہے جن کا شوقِ نظارہ ہر سال سینکڑوں انگریزوں اور ہندوستانیوں کو پایۂ تخت حیدر آباد میں لاتا ہے۔ جس دلچسپی اور اشتیاق سے یورپین لوگ اس رسم کو دیکھتے ہیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہر وہ انگریز جو دکن میں رہ چکا ہو اور تصنیف و تالیف سے شوق رکھتا ہو ناممکن ہے کہ اس جلوس کا ذکر اپنی تحریر میں نہ کرے۔ کرنل میڈوز ٹیلر نے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ دکن میں صرف ہوا اور جن کے تقریباً سب ناولوں کا سین دکن ہی میں رکھا گیا ہے اپنی ایک تصنیف میں اس جلوس کا ذکر ضمنی طور پر ایک لطیف پیرایے میں کیا ہے۔ حال ہی میں ایک اور انگریز مصنف نے اپنے ایک ناول کے پلاٹ کا دیباچہ اسی رسم کو قرار دیا ہے۔ سر رچرڈ ٹیمپل نے بھی اپنے روزنامچۂ دکن میں اس رسم کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ سالِ پیوستہ جب ہز اکسیلنسی لارڈ کرزن واردِ مملکتِ آصفیہ ہوئے تو ہز اکسیلنسی ممدوح نے اپنے پروگرام کی ترتیب میں یہ التزام مدِ نظر رکھا تھا کہ لنگر کی رسم بھی ملاحظہ فرمائیں۔

چونکہ "دکن ریویو" کے ناظرین میں سے بہت سے اصحاب رسم لنگر کی حقیقت سے ناواقف ہوں گے۔ لہٰذا اس مضمون میں اس کے حالات بالاجمال بیان کیے جاتے ہیں۔

جب دکن سلاطینِ قطب شاہیہ کے زیرِ نگین تھا۔ شہزادہ عبداللہ[1] جو سلطان محمد قطب شاہ کا بیٹا تھا ایک روز گولکنڈہ جانے کے ارادے سے اپنی سواری خاصہ کے ایک ہاتھی پر جس کا نام مورت تھا سوار ہو کر نکلا۔ اُن دنوں موسیٰ ندی طغیانی پر تھی۔ جب ہاتھی

---

[1] عبداللہ قطب شاہ اپنے والد کے انتقال پر ۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۶ء میں تخت نشین اور ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد صرف ایک بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء تا ۱۰۹۸ھ م ۱۶۸۷ء گزرا ہے۔ اس کے بعد قطب شاہی سلطنت قلمرو مغلیہ میں شامل ہو گئی۔ مصنف

Marfat.com

ندی کے کنارے پہنچا تو دفعتاً مست ہو گیا اور مہاوت کو گرا کر شہزادے کو لیے ہوئے جنگل کی طرف بھاگا۔ شہزادے کی والدہ ملکہ حیات بخشی بیگم عرف بی بی ماں صاحب نے بہ تقاضائے محبت مادری اطراف حیدرآباد میں تمام درختوں کی شاخوں میں سامان خورد و نوش لٹکوا دیا تاکہ اگر ہاتھی کسی درخت کے قریب سے گزرے تو شہزادہ ہاتھ بڑھاکر یہ سامان اتارے اور بھوک پیاس کی اذیت سے بچے۔ اس کے ساتھ ہی ملکہ نے یہ منّت مانی کہ اگر میرا بیٹا صحیح سلامت واپس آئے تو ہاتھی کے لنگر (زنجیر) کے وزن کے برابر ایک لنگر طلائی بنواکر حسینی علم پر چڑھاؤں گی۔ خدا کی شان کہ شہزادہ بقول ایک مؤرخ کے تین روز اور بقول دوسرے مورخ کے ایک مہینہ تین روز بعد صحیح سلامت واپس آیا اور ملکہ نے منہ مانگی مراد پاکر زنجیر طلائی تزک و احتشام کے ساتھ حسینی علم پر نذر چڑھائی۔

یہ ہے اصل بنیاد اس رسم کی جسے لنگر کہتے ہیں اور جس کا ہر سال محرم کی پانچویں تاریخ کو اعادہ کیا جاتا ہے اور بلالحاظ اس کے کہ اسے جناب سیّدالشہدا کی شہادت کے واقعے سے کوئی تعلق ہو۔ تین سو سال سے اس التزام کے ساتھ ادا کی جارہی ہے کہ اگرچہ

سپہر آں بساطِ کہن در نوشت
بساطِ دگر ملک را تازہ گشت

درِ دولتِ قطب شاہیہ نے زمامِ حکومت دولت ابدمدت آصفیہ کے سپرد کی پھر بھی سلطنت کی طرف سے اس رسم کی بجا آوری میں کسی طرح کا فرق نہ آیا۔ اگر کچھ فرق ہوا ہے تو صرف اتنا کہ اس پہلے لنگر میں جس کی اب ہر سال تقلید کی جاتی ہے سونے کی زنجیر حسینی علم پر چڑھائی گئی تھی جس کا وزن ایک مورخ نے چالیس من بیان کیا ہے مگر اب پھولوں کے ہار چڑھائے جاتے ہیں جن کے ساتھ سونے چاندی کے عَلم اور اشرفیاں ہوتی ہیں۔ یہ چڑھاوا نہایت تکلف کے ساتھ ایک زربفت کے شامیانے کے نیچے نکلتا ہے جس کی ڈوریاں آدمی پکڑ کر چلتے ہیں اور اس کے ساتھ سوا سو گھڑے شربت کے اور پانچ دیگیں کھچڑی کی ہوتی ہیں گھڑوں پر سنہرا رُپہلا رنگ چڑھا اور ان کے منہ پر سرخ کپڑا مقیش کے تاروں سے بندھا ہوتا ہے۔

محرّم کی پانچویں تاریخ کو صبح ہی سے لنگر دیکھنے کے شوق میں شہر کے بچے جوان بوڑھے

اُن راستوں پر آجاتے ہیں جدھر سے لنگر کا گزر ہونے والا ہے۔ متموّل لوگ سڑک کے کنارے کے مکانات دو دو تین تین مہینے پہلے سے کرایے پر لے رکھتے ہیں اور کرایے کی شرح کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے حجرے جن میں بہ مشکل دو چار پائیوں کی جگہ ہوتی ہے سو سو دو دو سو روپے کرایے پر اٹھتے ہیں۔

دوپہر ڈھلتے ہی جلوس نکلنا شروع ہوتا ہے اور مدار المہام وقت کے ایوانِ وزارت کے سامنے سے گزرتا ہوا مہاراجہ پیش کار بہادر کی دیوڑھی پر اور وہاں سے یہ محل مبارک کے نیچے آتا ہے جہاں سے اعلیٰ حضرت قدرِ قدرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی برآمدے میں سے اُسے ملاحظہ فرماتے ہیں۔

سب سے پہلے باندار ہوائیاں اور گولے چھوڑتے ہوئے نکلتے ہیں، اور ان کے پیچھے نشان کے ہاتھیوں اور اونٹوں کی ایک قطار ہوتی ہے اس کے بعد جمعیت کوتوالیٔ شہر کے سوار اور پیادے نکلتے ہیں۔ بہ اعتبارِ وضع و قطع ظاہری یہ جمعیت نہایت چست و چالاک اور بارعب معلوم ہوتی ہے۔ یہی وہ جمعیت ہے جو بلدہ و بیرون بلدہ کی تقریباً ساڑھے چار لاکھ مخلوق کے جان و مال کی محافظ اور امنِ عامّہ کی متکفل ہے۔ ابتدائی زمانے میں شہر حیدرآباد میں جو آئے دن لوٹ کھسوٹ اور مار پیٹ کی گرم بازاری ہوا کرتی تھی وہ اسی جمعیت کی بدولت اب خواب و خیال ہو گئی ہے۔ غرض کہ یہ جمعیت سود مندی اور دیدہ زیبی کا ایک قابلِ تحسین نمونہ ہے۔ جمعیت کوتوالی کے ساتھ عربوں اور روہیلوں کی جمعیت ہوتی ہے اور اُن سب کے پیچھے کوتوال صاحب بلدہ و بیرون بلدہ کا ہاتھی ہوتا ہے۔

جمعیت کوتوالی کے بعد جمعداران افواجِ بے قاعدہ اپنی اپنی جمعیتوں اور لوازم اعزازی کے ساتھ گزرنے شروع ہوتے ہیں اور بڑی دیر تک یہی تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان جمعداروں میں سے بعض عرب اور پٹھان ہیں جن کو قدیم الایام سے اس سرکار ابد قرار سے بہ جلد وئے فراہمی فوج منصب اور جاگیریں عطا ہوئی ہیں۔ ان کی وقعت اور عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سلطان مُکلّہ جو ساحلِ عرب کے مشہور فرمانرواؤں میں سے ہیں اور دہلی کے دربارِ تاج پوشی میں خاص طور سے مدعو کیے گئے تھے وہ ہماری سرکار کے ایک جمعدار ہیں اور

Marfat.com

یہاں اُن کا لقب نواب سلطان نواز جنگ بہادر ہے۔

اس کے بعد سندھیوں اور سکھوں کی جمعیت اپنے رسالداروں اور نشانوں کے ساتھ اپنی قومی وضع میں نہایت طمطراق سے نکلتی ہے۔

افواج بے قاعدہ میں عربوں کی جمعیت اِزار باندھے۔ کرتے پہنے۔ کمر میں دھاری دار پٹکے لپیٹے اور اس میں جمبیہ لگائے بارود کا سینگ کھونسے کندھے پر پرانی وضع کی توڑے دار لمبی نال کی بھاری بندوق اٹھائے طبلِ جنگ بجاتی اپنے قبیلے کے اشعار رجنیہ پڑھتی تیز تیز چلتی ہے۔ اس فوج نے اپنی شانِ بے ترتیبی کو اس ترتیب سے نبھایا ہے کہ کوئی دو سپاہی ایسے نہ نکلیں گے جن کے عمامے یا کرتے یا ازار ایک دوسرے سے ملتے ہوں۔ یہ تانتا دیر تک بندھا رہتا ہے اور اس میں بجز اس بات کے کہ عربوں کا جوش اور اُن کی رجز خوانی کا انداز دل پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے اور کوئی بات قابلِ توجہ نہیں ہوتی لیکن یکایک ایک دستۂ فوج جو اسی جمعیت بے قاعدہ کے افراد سے مرتب کیا گیا ہے اس بے ترتیبی کے طلسم کو توڑتا ہے۔ یہ پلٹن جس کا نام فوجِ میسرم یا جمعیتِ نظام محبوب ہے بہ اعتبارِ شان وشکوہ و ترتیب و آراستگی اس کل جلوس کی جان ہے۔ اور اس بات کی ایک بیّن مثال ہے کہ ایک ان گھڑ پتھر جسے ناواقف لوگ بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں وہی ایک چابک دست جواہر تراش کے ہاتھ میں آکر کیسا خوش آب و نایاب ہو جاتا ہے۔ اس فوج کے کپتان نواب جاں نثار جنگ بہادر اپنے پورے عربی لباس میں سر پر خمار و عقال باندھے ہوئے فوج کے آگے آگے چلتے ہیں اور اُن کے ساتھ میسرم بینڈ جس کا قومی راگ افغان مارچ ہے وجد لانے والے سروں میں بجتا جاتا ہے اور اس کے بعد میسرم پلٹن ایک خاص شان سے پوری فوجی ترتیب و آراستگی کے ساتھ گزرتی ہے۔

فوج بے قاعدہ کے بعد سپہ سالارِ فوج آصفیہ کی سواری ہوتی ہے جس کے جلو میں کل جمعیت باقاعدہ یعنی پلٹن ورسالہ و توپ خانہ اپنے اپنے کپتانوں اور لفٹینٹوں کے زیر کمان یکے بعد دیگرے نہایت فر و شکوہ اور شان و شوکت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس جمعیت کو کرنل نواب افسر الملک بہادر سی۔ آئی۔ ای آنریری ایڈیکانگ حضورِ ملک معظم شہنشاہِ ہند و ایڈیکانگ ملازمانِ اعلیٰ حضرت قدر قدرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی نے اپنے حسنِ انتظام اور خوش سلیقگی اور تجربہ کاری سے

Marfat.com

جس فوجی رتبے پر پہنچا دیا ہے اُس کا اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کو فوجی معاملات میں دلچسپی ہو اور اس جمعیت کو برای العین مشاہدہ کرے ۔

جمعیت کے بعد سواری خاصہ کے خالص تازی، وزیری۔ آسٹریلین۔ غرض کہ تمام مشہور نسلوں کے گھوڑے سونے چاندی کی ہیکلیں اور چھاگن پہنے جڑاؤ لگامیں اور کلغیاں لگائے گزرنے شروع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک گھوڑا قابلِ تصویر اور بلا مبالغہ ہزاروں روپے قیمت کا ہے۔ اُن کی مستانہ چال۔ ان کے سنہرے روپہلے زربفت اور کمخواب کے زین پوش اور ان کے سائیسوں کی رنگ برنگ کی زرق برق جگمگاتی ہوئی وردیاں عجب بہار دیتی ہیں۔ جن لوگوں کو گھوڑوں کی پہچان ہے وہ ایک ایک جانور کو دیکھ کر سراپا حیرت ہو جاتے ہیں ۔

غرض یہ سلسلہ کہیں رات کے نو بجے جا کر ختم ہوتا ہے ۔

لنگر کا جلوس اپنی نوعیت کے لحاظ سے حقیقت میں ایک ایسا پرشکوہ اور مہتم بالشان جلوس ہے کہ جس شخص نے اس کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو عام اس سے کہ وہ متین و لطیف الحس ایشیا نژاد ہو یا تماشا پسند ذکی الحس یورپ زاد اس کے دل پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہوتی ہے۔ مختلف قوموں اور مختلف مذہبوں کے کثیر التعداد بچوں جوانوں اور بوڑھوں کی چیخ پکار اور کشاکش افواج بے قاعدہ کی پراگندگی و بے ترتیبی اور افواج باقاعدہ کی پلٹنوں اور رسالوں کے جلوس کی ترتیب و یک رنگی ۔ ہاتھیوں، گھوڑوں، اونٹوں کی جگمگاتی ہوئی جھولوں، غاشیوں اور پاکھروں کی سج دھج ۔ امرائے روسائے جاگیرداروں اور منصب داروں کی زرق برق پوشاکوں کی آب و تاب ۔ گاڑیوں۔ رتھوں اور دوسری انواع و اقسام کی سواریوں کی بھیڑ بھاڑ ۔ ان سب کا سماں ایسا نہیں کہ مدت تک دل سے محو ہوسکے ۔

دکن ریویو، حیدر آباد

اپریل ۱۹۰۴ء

حدیثِ دیگراں

(۲۲)

سیّد محفوظ علی صاحب سے قومی جلسوں میں مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن کا قد چھوٹا تھا، رنگ گورا، ڈاڑھی سفید، خوبصورت آدمی تھے۔ مزاج میں بڑی شگفتگی تھی۔ اردو بہت اچھی لکھتے تھے۔ اُس زمانے کے ادبی رسالوں میں اُن کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ میں نے اُن کا ایک مضمون پڑھا ہے جس کا عنوان ہے "گنگا جل اور دودھ" گنگا جل انھوں نے ہندوستانی خون کو کہا اور دودھ ترکی خون کو۔ اِس مضمون میں انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ مغلوں کے جسم میں جب تک ایک چھٹانک بھی ترکی خون رہا اُن کی بہادری نہ گئی۔

مکتوب کراچی بنام مولف ——— حسن ریاض

۲۴ر نومبر ۱۹۶۹ء

ادیب، اسلامی تاریخ پر غائر نظر رکھنے والے، کم لکھتے مگر جب لکھتے تو دو چار صفحے لوگوں کے سو دو سو صفحوں پر بھاری ہوتے۔ افسوس کہ میر صاحب مرحوم نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی اور نہ اپنے مضامین یکجا کیے بلکہ کرنے نہیں دیے۔ خدا جانے مزاج میں کس درجہ استغنا تھا۔ اس وقت اُن کے چند تاریخی مضامین کے نام دہرائے جاتے ہیں۔

"نقل مکان" یہ عیسائیت پر تاریخی ضرب ہے۔ "دودھ اور گنگا جل" سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب" "سراج الدولہ پر ایک سرسری نظر"

ذوالقرنین۔ بدایوں نمبر ——— محمد سلیمان بدایونی

اپریل ۱۹۵۶ء

میر صاحب نے ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ (LOTHROP STODDARD)

Marfat.com

کی مشہور کتاب (THE NEW WARLD OF ISLAM) کے اردو ترجمے کی ترغیب و تحریک کی۔ اس کتاب میں مصنف نے مسلمانوں کے معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اس کا قرعۂ فال محمد جمیل الدین بدایونی کے نام پڑا موصوف نے یہ کام "جدید دنیائے اسلام" کے نام سے مکمل کیا اور اس کتاب کو میر صاحب ہی کے نام معنون کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

—— مولف

Marfat.com

مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب

(تیموری خون کی کیمیائی تحلیل)

بمبئی کے باؤلے تاجر کے قتل کے سلسلے میں جس بازاری عورت کے ساتھ ایک ہندو والیٔ ریاست کے ناجائز تعلقات کا چرچا آج کل اردو اور انگریزی اخباروں میں نہایت شدومد کے ساتھ ہو رہا ہے۔ پنجاب کے ایک منہ پھٹ اور زبان دراز ہندو اخبار نے حال میں اس کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں پر ایک نہایت سوقیانہ چوٹ کی ہے۔ جس کا پنجاب ہی کے ایک مسلمان اخبار نے دندان شکن جواب دیا اور "قدیم" اور "جدید" واقعات کے حوالوں سے اس شیشے کے گنبد میں رہ کر کنکریاں پھینکنے والے ایڈیٹر کے گھر کو جوابی پتھراؤ سے چکنا چور کر دیا۔

کلوخ انداز را پاداش سنگ است

ہندو اخبار نے ایسی بیہودہ بات کہہ کر جو خود اسی کی طرف پلٹ آنے والی بات تھی اپنی تہی مغزی کا ثبوت دیا لہٰذا وہ بات تو ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی سمجھدار آدمی اسے توجہ سے سنے اور سنجیدگی سے سوچے مگر جواب میں شاہان مغلیہ کا ذکر آ گیا تھا جس نے تاریخ کے طالب علم کو پھر بھولا سبق یاد دلایا اور سلسلۂ خیال کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

ہندوستان کی بادشاہی تیمور کے خاندان میں کم و بیش تین سو برس رہی۔ مورخوں کا اتفاق ہے کہ بابر اور ہمایوں تو قصر سلطنت کی داغ بیل ڈالنے اور بنیاد رکھنے والے تھے۔ اس عالی شان عمارت کو مکمل کر کے اس میں جلال و جبروت کے ساتھ جلوس کرنے والے اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اور اورنگ زیب عالمگیر تھے۔ عالمگیر اوّل (علیہ الرحمتہ) کے بعد اس میں شکست و ریخت شروع ہوئی اور عالمگیر ثانی (علیہ ما علیہا) کے مرتے ہی ساری عمارت زمین پر آ رہی۔ اس کے بعد جو ہوئے وہ مغلیہ سلطنت کے بادشاہ نہیں مغلئی تکیے کے شاہ جی تھے۔

Marfat.com

زوال و انحطاط کے اسباب ہر مورّخ بلکہ ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق بیان کرتا ہے کوئی کہتا ہے اس کا سبب عالم گیر کا غیر مسلموں کے ساتھ ظلم و تعصب تھا۔ کوئی کہتا ہے تازہ دم قوموں یعنی مرہٹوں اور سکھوں کا عروج۔ کوئی کہتا ہے انگریزوں کی حکمت عملی۔ اصلی قوی سبب تاریخ کے صفحوں پر لکھا آنکھوں کے سامنے ہے مگر اس پر نظر نہیں پڑتی اور پڑتی ہے تو اس بے پروائی سے کہ گویا وہ اصلی سبب ہے ہی نہیں۔

شمس العلما محمد حسین آزاد نے دربار اکبری کے اوراق پر الفاظ کا جو دربار سجایا ہے اس میں اکبر کی یلغاروں کا بیان بہت مزے لے لے کر کیا ہے۔ اس بیان میں ایک لفظ سے یوں ہی سا خیال ہوا تھا کہ شاید اصلی سبب وہ سمجھ گئے ہیں۔ مگر اگلے فقروں نے سمجھا دیا کہ کچھ نہ سمجھے اور سمجھے بھی تو سمجھانا نہیں چاہتے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ یلغاریں بابری بلکہ تیموری و چنگیزی خون کے جوش تھے کہ اکبر پر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کسی بادشاہ کے دماغ میں ان باتوں کی بو بھی نہ رہی۔ نیچے تھے کہ گدی پر بیٹھے تھے۔ ان کی قسمتیں لڑتی تھیں اور امرا فوجیں لے کر مرتے تھے۔ اس کا کیا سبب سمجھنا چاہیئے؟ ہندوستان کی آرام طلب خاک باوجود گرمی کے۔ سرد مہر ہوا اور بزدل پانی۔ روپے کی بہتات، سامان کی کثرت، یہاں جو ان کی اولاد ہوئی ایک نئی مخلوق ہوئی" (ص ۲۷)

آزاد کی جادو نگاری اور طلسم کاری مسلّم۔ لیکن آرام طلب خاک - سرد مہر ہوا۔ بزدل پانی۔ روپے کی بہتات اور سامان کی کثرت تو آج بھی ویسی ہی بلکہ اُس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ جیسی اور جتنی محمد شاہ پیا کے زمانے میں تھی۔ پھر کیا بات ہے کہ موجودہ مغربی حکمراں قوم ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے اب تک تین سو برس پورے کر لینے پر روز افزوں طاقت کے ساتھ آج بھی باقی ہے اور ابھی شاید ابھی بہت دنوں رہے گی۔

تاریخ میں اکبر کے حالات پڑھو۔ چاہے وہ ابوالفضل کے قصیدہ نگار قلم کے بجائے

Marfat.com

بدایونی کے واقعہ نویس قلم ہی کے لکھے ہوں۔ جہاں تم یہ دیکھو گے کہ اکبر جاہل تھا۔ بد مذہب تھا۔ دین الٰہی کا موجد تھا۔ وہیں یہ بھی دیکھو گے کہ وہ جری اور جفاکش سپاہی تھا کہ یلغاروں میں ہفتوں کی راہ دنوں میں طے کرتا تھا۔ بلند ہمت اور اولوالعزم فاتح تھا کہ برسوں میں تسخیر ہو سکنے والے ملکوں کو مہینوں میں فتح کر لیتا تھا۔ تجربہ کار اور صاحب تدبیر جنرل تھا کہ حملوں میں تھوڑی سی فوج سے ٹڈی دل لشکروں کو زیر وزبر کر دیتا تھا۔ باخبر اور رعایا پرور بادشاہ تھا کہ جن ملکوں کو فتح کرتا تھا وہاں کا قرار واقعی انتظام کرتا اور مختلف الاقوام رعایا کو غلام بنانے کی جگہ عاشق بنا لیتا تھا۔ وہ بہادر تھا، نڈر تھا، غیرت مند تھا۔

بارہ تیرہ ہی برس کا بچہ تھا کہ باپ کے مرنے پر کھیل کود سے ہٹا کر بیرم خاں کی اتالیقی میں تخت پر بٹھا دیا گیا۔ بیرم خاں سمجھا تھا کہ لڑکے کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔ مگر لڑکے کی رگوں میں صاحبقرانؔ[1] اور ژندہ پیلؔ[2] کا خون تھا۔ اُس نے چار ہی برس بعد بیرم کو رستہ بتا کر سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور تخت پر جم کر اور سنبھل کر بیٹھا۔ جانتے ہو اُس وقت اُس کی حکومت کی حد کہاں سے کہاں تک تھی؟ لاہور سے لے کر آگرہ کے قرب وجوار تک۔ مگر بہادر اور مدبّر نوجوان شاہ نے حدود کو وسعت دینی شروع کی اور عمر بھر کی محنت وکوشش سے ہندوستان کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو کہیں تلوار سے کہیں تدبیر سے سمیٹ کر اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ یہاں تک کہ ۱۰۱۴ ہجری (۱۶۰۵ء) میں جب مرا ہے تو حال کی جغرافی اصطلاح میں احاطہ مدراس، ریاست حیدر آباد اور احاطہ بمبئی کا جنوب مغربی حصہ چھوڑ کر ہندوستان کا کل براعظم اور پورا افغانستان اس کے زیر نگیں تھا۔

اس کے بعد مروج الدین، عالی گہر، شاہ عالم کے حالات پڑھو۔ شہزادگی کے زمانے میں جب کہ تیس پینتیس برس کے ادھیڑ تھے۔ ستر برس کے بڈھے باپ کو اکیلا دشمنوں میں گھرا چھوڑ کر وزیر کے ڈر سے گھر سے نکل بھاگے۔ سہارن پور۔ فرخ آباد۔ بدایوں۔ بریلی۔ لکھنؤ کی خاک چھانتے عظیم آباد

[1] امیر تیمور گورگان صاحبقران۔ اکبر کے باپ ہمایوں کا مورث اعلیٰ۔ مصنف

[2] شیخ الاسلام حضرت ژندہ پیل احمد جام نیشاپوری۔ اکبر کی ماں حمیدہ بانو کے مورثِ اعلیٰ۔ مصنف

Marfat.com

پہنچے اور میر جعفر کے ناخواندہ مہمان ہوئے۔ وہیں پڑے تھے کہ عماد الملک وزیر نے دلّی میں بادشاہ کو قتل کر دیا۔ باپ کی موت کی خبر سن کر جگہ سے نہ ہلے۔ بلکہ ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں عظیم آباد ہی میں نام کی بادشاہی کے مالک بنے۔ شجاع الدولہ وزیر کے ساتھ ہو کر انگریزوں سے لڑے۔ کمپنی کی فوج کے ہاتھوں بکسر کے میدان میں ایسی بُری طرح شکست کھائی کہ بادشاہی کا رہا سہا بھرم کھل گیا اور کمپنی کے اقتدار کا سکّہ سارے ہندوستان میں بیٹھ گیا۔ شکست کے بعد ہی جنرل منرو (GENRAL MUNRO) کے قلم خاص سے شقہ تہنیت لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

"میں خوشی سے نہیں لڑا۔ بلکہ وزیر کا قیدی ہوں، خدا کے لیے مجھے قید سے چھڑاؤ اور اور معاوضے میں بزرگوں کی ہڈیاں جتنی چاہے لو۔"

اس کے بعد ہی فاتح فوج کے پیچھے پیچھے الہ آباد پہنچے۔ یہاں ندی سے نکل کر کنویں میں گرے یعنی شجاع الدولہ کی قید سے چھوٹ کر جنرل اسمتھ (GENERAL SMITH) کی قید میں پہنچے! اسی حالت میں وہ تین صوبے جن کی مردم شماری تین کروڑ نفوس اور محاصل سالانہ چار کروڑ روپے تھے اور جن کی تسخیر میں باپ دادؤں کو برسیں لگی تھیں اتنی دیر میں جتنی دیر میں بقول فارسی مورخ کے "خرید و فروخت اسپ راہوار بل خر بار بردار ہم نمی تواند شد" کمپنی کی نذر کر دیئے۔ اور سلطنت کے تخت کے بجائے کھانے کی میز کے اوپر مسند آرا ہو کر سند عطائے دیوانی بنگال و بہار و اڑیسہ پر مہر مبارک ثبت فرما دی۔ اس کے بعد کنویں سے بھی نکل کر بھاگے تھے کہ آگ میں گر پڑے۔ یعنی کمپنی کی قید سے نکلے تھے کہ مرہٹوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ جو اس وقت ہند کی سلطنت پر قابض اور اکبر کے تخت پر متمکن تھے۔ مرہٹوں کی اِک ذرا آنکھ چوکی تھی کہ پٹھان چڑھ دوڑے اور خزانۂ عامرہ کا روپیہ پیسہ بلکہ شہزادیوں کے ہاتھ گلے کا گہنا پاتا تک ہتیائے گئے۔ اور جاتے جاتے غلام قادر خود بدولت کو بینائی کی دولت تک سے محروم کر گیا۔ مدتوں اس عذاب میں گرفتار رہنے کے بعد انگریزوں کی ملکی مصلحت نے مرہٹوں کا استیصال کیا۔ جنرل لارڈ لیک (GENERAL LORD LAKE) نے کوٹھری سے نکالا اور مرنے کے لیے تخت پر بٹھا کر پھر تاج پہنایا۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں اس عیش پرست، تن پرور، پست ہمت، بدعقل، تلوّن مزاج، ڈرپوک اور بے غیرت زندگی کا خاتمہ ہوا۔

Marfat.com

قلم کانپتا ہے کہ یہ الفاظ اُس شخص کی شان میں لکھنا پڑے جو مجاور سہی، مگر گورگانی اور صاحبقرانی جلال و جبروت کے مقبرہ کا مجاور تھا۔ مگر کیا کیجیے۔ پہلی تصویر سے مقابلے کے لیے دوسری تصویر بھی اس طرح کھینچنی پڑی کہ سب خط و خال نمایاں ہو جائیں۔ اب غور سے دیکھو اور سچائی اور صفائی سے جواب دو۔ دونوں تصویروں میں کسی بات میں خفیف سی بھی مشابہت ہے۔ نہیں۔ تو کیوں نہیں؟

کیا تم کہہ سکتے ہو کہ کمزور دل عالمگیر ثانی اور بزدل شاہ عالم کے جسموں میں بھی وہی تیموری خون تھا جو شیر دل بابر اور دلیر دل اکبر کی رگوں میں بجلی کی تیزی سے دوڑتا تھا؟ تم جواب نہیں دے سکتے۔ ذرا صبر کرو۔ اس کا جواب تاریخ کے معمل میں اکبر کے جانشینوں کے خون کے تجزیہ و تحلیل کیمیائی کے بعد ابھی دیا جاتا ہے۔

پہلے تین باتیں ذہن نشین کر لو۔

۱۔ انسان کے جسم میں خون کی مقدار طبی قاعدے سے کتنی ہی ہو حساب کی آسانی کے خیال سے اسے دو سیر مانا گیا ہے۔

۲۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ بچے کے جسم میں آدھا خون باپ کا اور آدھا ماں کا آتا ہے۔

۳۔ فرق دکھانے کے لیے ولایتی خون کو دودھ اور ہندی خون کو گنگا جل کا نام دیا گیا ہے۔

اب دیکھو ـــــــ

نام بادشاہ	رگوں میں مادۂ سیال کا وزن اور نام	نام رانی مع نام شہزادہ جو اس کے بطن سے ہوا	رگوں میں مادۂ سیال کا وزن اور نام
جلال الدین اکبر ابن ہمایوں	دو سیر دودھ	جے پوری رانی[۱] دختر راجہ بہاری مل کچھواہہ والیٔ ریاست جے پور۔ اس کے بطن سے جہانگیر ہوا۔	دو سیر گنگا جل

۱؎ منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی مطبوعہ کلکتہ جلد ۲ ص ۵۰۰۔ مآثر الامرائے تیموری مطبوعہ کلکتہ جلد ۲ ص ۱۱۱۔ بلیس اورینٹل بیا گرافیکل ڈکشنری لندن ص ۱۰۸ و ۱۹۱ و ۲۲۴۔ امرائے ہنود ص ۷۰۔ مصنف

نام بادشاہ	رگوں میں مادۂ سیال کا وزن اور نام	نام رانی مع نام شہزادہ جو اس کے بطن سے ہوا	رگوں میں مادۂ سیال کا وزن اور نام
نورالدین جہانگیر ابن اکبر	ایک سیر دودھ اور ایک سیر گنگا جل	بال متی جودھا بائی[1] دختر مہاراجہ اودے سنگھ راٹھور والئ ریاست جودھ پور۔ اس کے بطن سے شاہجہاں ہوا۔	دو سیر گنگا جل
شہاب الدین شاہجہاں ابن جہانگیر	آٹھ چھٹانک دودھ اور ایک سیر آٹھ چھٹانک گنگا جل	ارجمند بانو ممتاز محل دختر آصف خاں۔ اس کے بطن سے عالمگیر ہوا۔	دو سیر دودھ
محی الدین عالم گیر ابن شاہجہاں	ایک سیر چار چھٹانک دودھ اور بارہ چھٹانک گنگا جل	نواب بائی[2] دختر راجہ راجو والئ ریاست کشوار راجوری کشمیر۔ اس کے بطن سے بہادر شاہ ہوا۔	دو سیر گنگا جل

[1] بدایونی ج ۲ ص ۱۳۳۔ مآثر الامرا ج ۳ ص ۱۸۱۔ بیل ص ۲۰۲ و ۲۶۳ و ۴۰۷،
امرائے ہنود ص ۹۴ مصنف

[2] مآثر عالمگیری۔ مآثر الامرا۔ خافی خاں ج ۲ ص ۲۶۴، ۵۹۴ و ۶۰۴۔ تاریخ اورنگ زیب جادو ناتھ سرکار جلد اول ص ۶۱۔

(مصنف)

Marfat.com

نام بادشاہ	رگوں میں مادۂ سیال کا وزن اور نام	نام رانی مع نام شہزادہ جو اس کے بطن سے ہوا	رگوں میں مادۂ سیال کا وزن اور نام
قطب الدین محمد معظم بہادر شاہ ابن عالمگیر	دس چھٹانک دودھ اور ایک سیر چھ چھٹانک گنگا جل	نظام بائی[۵۱] لال کنور۔ اس کے بطن سے جہاندار شاہ ہوا	دو سیر گنگا جل
معز الدین جہاندار شاہ ابن بہادر شاہ	پانچ چھٹانک دودھ اور ایک سیر گیارہ چھٹانک گنگا جل	انوپ بائی[۵۲]۔ اس کے بطن سے شاہ عالم ہوا۔	دو سیر گنگا جل
عزیز الدین عالمگیر ثانی ابن جہاندار شاہ	ڈھائی چھٹانک دودھ اور ایک سیر ساڑھے تیرہ چھٹانک گنگا جل۔	بلال کنور[۵۳]۔ اس کے بطن سے شاہ عالم ہوا۔	دو سیر گنگا جل
عروج الدین شاہ عالم ابن عالمگیر ثانی	سوا چھٹانک دودھ اور ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک گنگا جل		

۵۱ ماثر عالمگیری۔ بیل ص ۱۹۰ و ۳۰۰۔ مصنف

۵۲ بیل۔ ص ۴۹ و ۴۷۔ مصنف

۵۳ بیل۔ ص ۱۰۹ و ۳۶۱ و ۴۲۸۔ مصنف

Marfat.com

تحلیل کیمیائی کا نتیجہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کسی ایک دقعہ میں ذراسی غلطی یا حساب میں ذرہ بھر فرق ہو تو کہدو۔ سوا چھٹانک دودھ اور ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک گنگا جل۔ جل جلالہ

یہ قصہ نہیں، کہانی نہیں، ہنسی نہیں، دل لگی نہیں۔ ٹھوس واقعات اور ٹھیٹ سچائی ہے۔ تم اپنے طور پر ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک پانی میں سوا چھٹانک دودھ کی بوندیں ڈالو اور انصاف سے بتاؤ کہ تم اس مرکب کو کیا کہو گے۔ کیا یہ دودھ ہو گیا۔ کیا یہ پانی رہ گیا۔ کیا یہ دو سیر خالص دودھ کا کام دے سکتا ہے۔ کیا یہ صاف پانی کی جگہ پینے یا نہانے دھونے میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر سمجھ لو کہ سوا چھٹانک تیموری خون۔ ایک سیر پونے پندرہ چھٹانک مجہول ہندو خون میں مل جانے کے بعد اصلی اور صحیح تیموری خون کی حرارت۔ غیرت اور جرأت کیسے پیدا کر سکتے

ہم نے چھانٹ کر جن سات رانیوں کے نام گنائے وہ ایسی ہیں کہ انکے پتی بھی مکٹ دھاری تھے اور پتر بھی مکٹ دھاری ہوئے۔ اور اس لیے نسب کا سلسلہ اوپر سے نیچے تک سیدھا چلا آیا۔ جس سے خون کی مقدار کا صحیح حساب ہو سکا۔ ورنہ قلعہ میں تو ہندو رانیوں کی اتنی کثرت تھی کہ محل کو رنواسا کہنا زیادہ موزوں تھا۔

ذیل کی فہرست پر ایک نظر ڈالو۔ اگرچہ اس کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے اب بھی بہت سی رانیوں کے نام رہ گئے ہوں مگر جتنے لکھے ہیں تاریخی ثبوت کے ساتھ لکھے ہیں۔

نام بادشاہ یا شہزادہ	نام رانی	تاریخی حوالہ
بادشاہ اکبر	۱۔ جے پوری رانی دختر راجہ بہاری مل کچھواہہ والیٔ جے پور	بدا‌ؤنی ج ۲ ص ۔ د ماثر الامراء ۲ ص ۱۱۳۔ بیل اورئینٹل بیاگرفی ص ۱۰۸ و ۱۹۱ و ۲۴۴۔ امرائے ہنود ص ۷۷۔
	۲۔ دختر راجہ کلیان مل والی بیکانیر	بدا‌ؤنی ج ۲ ص ۱۴۳
	۳۔ دختر راجہ ڈونگرپور	ماثر الامراء ۲ ص ۱۱۲۔ امرائے ہنود ص ۸۸

Marfat.com

نام بادشاہ یا شہزادہ	نام رانی	تاریخی حوالہ
	۴۔ تارا رانی	بیل
	۵۔ من بھاوتی رانی	بیل
	۶۔ جے پوری رانی دختر راجہ بھگوان داس کچھواہہ والیٔ جے پور	بداؤنی ج ۲ ص ۳۴۱۔ مآثرالامراج ۲ ص ۱۳۰۔ خافی خاں ص ۲۴۵۔ بیل ص ۱۰۶ و ۲۲۰ و ۳۶۲۔ امرائے ہنود ص ۸۲
	۷۔ بال متی جودھا بائی دختر راجہ اودے سنگھ راٹھور، والیٔ جودھپور	بداؤنی ج ۲ ص ۳۴۳۔ مآثرالامراج ۲ ص ۱۸۱۔ بیل ص ۲۰۲ و ۳۶۳ و ۴۰۷، امرائے ہنود ص ۴۹۔
بادشاہ جہانگیر	۸۔ دختر راجہ رائے سنگھ پسر کلیان مل راٹھور والیٔ بیکانیر	بداؤنی ج ۲ ص ۳۵۳۔ مآثرالامراج ۲ ص ۱۵۲۔ بیل ص ۳۲۵۔ امرائے ہنود ص ۲۱۴۔
	۹۔ دختر راول بھیم والیٔ جیسلمیر	بیل ص ۲۳۷۔ امرائے ہنود ص ۲۸۵
	۱۰۔ دختر راجہ کیشو داس راٹھور پسر راجہ جے مل۔	بیل ص ۲۱۰
	۱۱۔ دختر راجہ جگت سنگھ کچھواہہ پسر مرزا راجہ مان سنگھ	مآثرالامراج ۲ ص ۱۷۵۔ خافی خاں ص ۲۵۹ امرائے ہنود ص ۱۴۵
	۱۲۔ دختر راجہ رام چند ربندیلہ والیٔ اورچھا۔	مآثرالامراج ۲ ص ۲۱۳۔ امرائے ہنود ص ۱۰۰
شہزادہ پرویز ابن جہانگیر	۱۳۔ دختر راجہ سورج سنگھ راٹھور والیٔ جودھپور	بیل ص ۱۳۹

Marfat.com

نام بادشاہ یا شہزادہ	نام رانی	تاریخی حوالہ
شہزادہ مرادبخش ابن شاہجہاں	۱۴۔ سرستی بائی	مآثر الامرا ج ۲۔ ص ۲۸۵۔ خافی خاں ج ۲ ص ۱۵۵۔ جادوناتھ سرکار ج ۲ ص ۹۸
شہزادہ شجاع ابن شاہجہاں	۱۵۔ دختر راجہ کنور سین کشتواری	امرائے ہنود ص ۳۷۰
شہزادہ سلیمان شکوہ ولد داراشکوہ	۱۶۔ دختر راجہ گج سنگھ راٹھور ولد راجہ سورج سنگھ	بیل ص ۱۲۹۔ خافی خاں
بادشاہ عالمگیر	۱۷۔ نواب بائی دختر راجہ راجو والیٔ ریاست کشتوار	مآثر عالمگیری۔ مآثر الامرا۔ خافی خاں۔ ج ۲ ص ۲۶۴ و ۵۹۴ و ۶۰۴ جادوناتھ سرکار ج ۱۔ ص ۶۱
محمد اعظم ابن عالمگیر	۱۸۔ دختر راجہ جے دھج سنگھ والیٔ آسام و عزیز راجہ کوچ بہار	مآثر عالمگیری ص ۳۷
	۱۹۔ بائی اتم گیر	مآثر عالمگیری ص ۲۳۴
کام بخش ابن عالمگیر	۲۰۔ کلیان کنور، منوہر پوری رانی دختر امر سنگھ زمیندار منوہر پور	خافی خاں ج ۲ ص ۵۱۰ مآثر عالمگیری ص ۲۱۱
محمد سلطان ابن عالمگیر	۲۱۔ رانی بھوپ متی دختر راجہ کشتوار	مآثر عالمگیری ص ۱۴۸
بادشاہ محمد بہادر شاہ ابن عالمگیر	۲۲۔ دختر راجہ روپ سنگھ راٹھور برادرزادہ راجہ جسونت سنگھ	مآثر الامرا ج ۲ ص ۲۷۰ مآثر عالمگیری ص ۳۷ و ۴۹
	۲۳۔ نظام بائی لال کنور	مآثر عالمگیری بیل ص ۱۹۰ و ۳۰۰

Marfat.com

تاریخی حوالہ	نام رانی	نام بادشاہ یا شہزادہ
بیل ص ۹۴ و ۴۷	۲۴- انوپ بائی	نادر شاہ
بیل ص ۱۹۰ و ۲۳۶ زبدۃ الاخبار قلمی ص ۱۰۴ و ۱۰۵	۲۵- لال کنور	جہاندار شاہ ابن بہادر شاہ
مآثر عالمگیری ص ۱۶۷ و ۱۸۲	۲۶- دختر کیرت سنگھ یا کیسری سنگھ	شہزادہ عظیم الشان ابن بہادر شاہ
بیل ص ۵۴ و ۱۳۰ زبدۃ الاخبار قلمی ص ۱۰۹ - امرائے ہنود ص ۱۷ - یہ آخری راجپوتنی تھی جو مغلیٔ حرم سرا میں آئی -	۲۷- دختر مہاراجہ جیت سنگھ پسر مہاراجہ جسونت سنگھ جودھپور	بادشاہ فرخ سیر
بیل ص ۴۲ و ۲۸۴ و ۳۰۸ و ۴۰۷ عماد السعادات	۲۸- ادھم بائی	بادشاہ محمد شاہ
بیل ص ۱۰۹ و ۲۶۱ و ۴۲۰	۲۹- بلال کنور	بادشاہ عالمگیر ثانی -
بیل ص ۹۵ - اس کے بطن سے خاتم السلاطین سراج الدین بہادر شاہ - بہادر شاہ ظفر پیدا ہوئے -	۳۰- لال بائی	بادشاہ اکبر ثانی

یہ راج کماریاں تیموری قلعے میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پاٹ کرتی تھیں۔ ٹھاکر جی کو جل پھول چڑھاتی تھیں۔ تلک لگاتی تھیں۔ پرکرما کرتی تھیں ہون کرتی تھیں[1]

[1] قلعے کے محل میں ایک طرف پر کھا' دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک پائے جاتے ہیں جس سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ محلات شاہی میں راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے مذہب کے رسوم اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔" امرائے ہنود" ص ۵۰ - مصنف

Marfat.com

یہ بھی سنا جاتا ہے کہ ہندو رانیوں کا ڈولہ لانے کے بعد تیموریوں نے بہ استثنار اورنگ زیب[1] اعلی اللہ مقامہ کے ۔ اسلامی سنت ختان کو یک قلم اٹھا دیا تھا تاکہ غیر جنسیت کا خیال تک نہ آنے پائے ۔

جس نسل نے اپنے خون اور اپنے حالات کو یہاں تک بدل ڈالا ہو اُس کے بقا کی تم کیا امید رکھ سکتے تھے۔

مکند ابرہمچاری[2] کے اوتار مہابلی مہاراج اکبر نے مسلم ہندو خون کے میل کی جو رسم اپنے خاندان میں قائم کی اور جس پر (اور صرف جس ہی پر) اُس کے جانشینوں نے آخری وقت تک[3] عمل کیا، اُس رسم اور صرف اُسی رسم نے تیموری نسل، تیموری خون اور تیموری حمیت کو گنگا کی منجھدار میں ڈبو دیا۔

میں کہتا ہوں کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب مغل بادشاہوں کی کاہلی، بزدلی، عیش پرستی، خیالات کی پستی، دون ہمتی اور دنائت نفس تھے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں مگر ضرورت اس بات کے جاننے کی ہے کہ یہ اسباب پیدا محض اس وجہ سے ہوئے کہ انھوں نے اپنے خون

[1] "سنت سنیہ فتنہ تازہ نہال حشمت محمد اکبر بتقدیم رسید" مآثر عالمگیری ص ۲۸۔
"سنت ختان بادشاہ زادہ محمد کام بخش زیب سرانجام وحسن اختتام یافت"۔ مآثر عالمگیری ص ۱۳۷۔ مصنف

[2] اکبر کے سامنے ایک پراچین پتر پیش ہوا کہ الہ آباد میں مکند ابرہمچاری (جس نے اپنا سارا بدن کاٹ کاٹ کر ہَوَن کر دیا تھا) اپنے چیلوں کے لیے ایک اشلوک لکھ کر رکھ گیا تھا کہ ہم عنقریب ایک بااقبال بادشاہ ہو کر آئیں گے۔ اُس وقت تم بھی حاضر ہونا۔ بہت سے برہمن بھی اُس پترے کے ساتھ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ جب سے آج تک مہاراج پر دھیان گیان جمائے بیٹھے ہیں حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اُس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں صرف تین چار مہینے کا فرق تھا۔ دربار اکبری ص ۸۴ نیز دیکھو بداونی ج ۲ ص ۲۳۶۔ مصنف

[3] سب سے آخری بادشاہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر جس عورت سے پیدا ہوئے تھے اس کا نام لال بائی تھا۔ دیکھو بیل ص ۹۵۔ مصنف

Marfat.com

کی خوبی اور خصوصیت کو خراب آمیزش کی بہتات سے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔

میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو ایک نہایت مستند رائے پیش کرتا ہوں۔ فرانس کے مشہور فلسفی مستشرق۔ مورخ و مصنف گستاولی بان نے اپنی بیش بہا تصنیف "تمدن عرب" میں عربوں کے تنزل کے اسباب گناتے ہوئے ایک قوی سبب اُن کا ادنیٰ قوموں کے ساتھ میل جول اور شادی بیاہ بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ان مختلف اقوام کے ازدواج و امتزاج کی وجہ سے عربی خون کی خاصیت بہت بدل گئی" (ص ۵۴۹)

"ایک ہی ملک میں مختلف اقوام کا گھل مل جانا ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ حکومت قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ فاتح قوم مفتوح قوم سے ازدواج و امتزاج نہ کرے اور اُن میں گھُل مل نہ جائے عربوں نے اس کا کبھی خیال نہ کیا۔ رومیوں نے کچھ دنوں اس کا خیال رکھا اور ان کا تنزل اُسی دن سے شروع ہوا جس دن سے انھوں نے اس امر کا ملحوظ رکھنا چھوڑ دیا۔" (ص ۵۵۰)

"عرب برابر اُن اقوام سے جن کے ساتھ رہتے رہے ازدواج و امتزاج کرتے رہے۔ اس ازدواج و امتزاج سے اُن کے قومی خصائل کا تلف ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ محض یہ امتزاج اقوام ... ان کے تنزل کے لیے کافی تھا۔"

(ص ۵۵۱)

النا ظر لکھنؤ

ملا مضمون العلی

روٹیوں کی جنگ

متحدہ رومانی[1] سلطنت کا آخری شہنشاہ تھیوڈوسی اس[2] مرتے وقت ۳۹۵ء میں سلطنت اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر گیا۔ اس تقسیم کی رو سے مشرقی یا یونانی یا بزنطینی[3] سلطنت جس کے اجزا ایشیا میں ممالک ایں روئے فرات۔ سواحل بحیرۂ اسود اور ایشیائے کوچک۔ افریقہ میں ملک مصر اور یورپ میں آبنائے دردانیال سے لے کر بحیرۂ ایڈریاٹک[4] اور دریائے ڈینیوب[5] تک کل ممالک تھے بڑے بیٹے آرکے ڈی اس[6] کو ملی جس کا پایہ تخت قسطنطنیہ قرار پایا۔ اور مغربی یا رومانی یا لاطینی[7] سلطنت جس میں افریقہ میں ممالک ماورائے مصر اور یورپ میں اٹلی۔ اسپین، فرانس، برطانیہ اور مغربی البانیہ شامل تھے چھوٹے بیٹے ہونوری اس[8] کے حصے میں آئی جس کا دار الحکومت رومتہ الکبریٰ[9] ہی برقرار رہا۔ یہ حصے بخرے ایسی منحوس گھڑی میں ہوئے تھے کہ یونانی اور رومانی قصور مملکت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی مگر انھیں متحد ہونا پھر کبھی نصیب ہی نہ ہوا۔

اس زمانے میں دین و دنیا اور مذہب و حکومت آجکل کی طرح ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے نہ تھے بلکہ ان کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ وہ مل جل کر رہنا سہنا جانتے اور امداد و استمداد سے بسر کرنا چاہتے تھے۔ اب تک چونکہ سلطنت کے کل اجزا باہم دگر متحد اور ایک ہی

ف۱ United Roman Empire

ف۲ Theodocius ف۳ Eastern or Greek or Byzantine Empire ف۴ Adriatic Sea ف۵ Danube ف۶ Arcadius

ف۷ Western or Roman or Latin Empire

ف۸ Honorius ف۹ Rome

Marfat.com

فرمانروا کے زیرِ نگین تھے اس لیے ساری سلطنت کا مذہبی سردار بھی ایک ہی شخص مانا جاتا تھا اور روما الکبریٰ کا اسقف (بشپ) تھا جو کل جماعت اساقفہ میں ممتاز و معظم سمجھا جاتا تھا اور اگرچہ قسطنطنیہ کا بطریق[1] مشرقی کلیسا کا لاٹ پادری مانا گیا تھا تاہم دنیائے مسیحیت میں سرداری اور پیشوائی کی کرسی روما کے بشپ ہی کے لیے مخصوص و مسلّم تھی۔ چنانچہ ۳۸۱ء میں جو مجلس کلیسائی قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی اس نے تصفیہ کر دیا تھا کہ اقتدار اور اثر کے اعتبار سے قسطنطنیہ کے بطریق کا درجہ روما کے بشپ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ لہٰذا جس طرح حکومتِ ملکی کا مرکز ایک تھا اسی طرح حکومت ہی کا مرکز بھی ایک ہی رہا۔

لیکن ۳۹۵ء میں جب مسندِ حکومت کے حصے ہو چکے تو ناممکن تھا کہ سجادۂ مذہب ٹکڑے ہونے سے بچ جاتا۔ قسطنطنیہ کی دینوی حکومت کا فرماں روا جب اپنے آپ کو روما کی دُنیوی حکومت کے فرماں روا سے کسی طرح کم نہیں سمجھنے لگا تھا اور اُن ممالک میں جو اس کے لوائے تحکم کے سائے میں تھے اپنے رقیب کی طرف سے تنقیدِ احکام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا تو قسطنطنیہ کی دینی حکومت کا فرماں روا جب کہ وہ بھی اپنے آپ کو روما کی دینی حکومت کے فرماں روا سے کسی طرح کم نہیں سمجھنے لگا تھا اُن ممالک میں جو اس کے ردائے تقدس کے سائے میں تھے اپنے رقیب کی طرف سے تنقیدِ احکام کس طرح گوارا کر لیتا۔ چنانچہ جو مذہبی احکام روما کے بشپ کی پیش گاہ سے یونانی سلطنت کی قلمرو کے متعلق نافذ ہوئے۔ قسطنطنیہ کے بطریق کی طرف سے پہلے ان کی تعمیل میں بے توجہی پہلو تہی، اور اس کے بعد علانیہ سرتابی کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تفریق و اقتدار کی ناگوار بحث چھڑی اور نہایت ہی شد و مد کے ساتھ چھڑی۔

روما کے بشپ کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ خداوند مسیح کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ممتاز و مقدس شاگرد پطرس[2] کے تبلیغی صدر مقام روما کا لاٹ پادری اور پطرس ہی کے قائم کیے ہوئے

---

[1] Patriarch

[2] St. Peter

Marfat.com

سب سے قدیم کنیسے کے پیش نماز ہونے کی وجہ سے حقیقی معنی میں خلیفۃ المسیح کا سجادہ نشین، اور اس اعتبار سے مشرق و مغرب کی ساری کلیساؤں کا تنہا واجب الاحترام مقتدا اور رہنما ہے، اور اسی حیثیت و اعتبار سے دنیائے مسیحیت کے حدود کے اندر ہر اسود و احمر اور ابیض و اصغر مسیحی پر عام اس سے کہ وہ عامی ہو یا عالم۔ اس کی حکومت نافذ۔ اس کا حکم رائج اور اس کا اتباع لازم ہے۔

اس کے جواب میں قسطنطنیہ کے بطریق کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ تعمیر قسطنطنیہ کے دن ہی سے مشرقی ممالک کا اسقفِ اعظم بنایا گیا ہے اور اس کے حیطۂ اقتدار میں انطاکیہ۔ قیساریہ۔ دمشق اور اسکندریہ جیسے قدیم شہروں میں خداوند مسیح کے شاگردوں کے قائم کئے ہوئے کنیسے حتیٰ کہ ارضِ مقدس کا وہ محترم خطّہ ہے جس کا چپہ چپہ ابنائے سلف۔ خداوند مسیح اور اکثر رسولوں کے متبرک معابد و مشاہد سے معمور ہے اور اس اعتبار سے عظمت و اقتدار میں وہ رومہ کے بشپ سے بدرجہا اور بہ مراتب ہزارہا افضل و اعلیٰ ہے۔ لہذا بجائے اس کے کہ اس کا درجہ رومہ کے بشپ سے فروتر مانا جائے مسیحی دنیا پر لازم ہے کہ ارضِ مقدس کے معابد و مشاہد کی حرمت کو پیشِ نظر رکھ کر نہ صرف قسطنطنیہ کے بطریق کا درجۂ اقتدار رومہ کے بشپ سے بالاتر قرار دے بلکہ یونانی سلطنت کی طرح کل رومانی سلطنت کو بھی بطریقی حدود میں شامل کر دے۔

اس کا جواب رومہ کے بشپ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ جس زمانے میں رومہ کی خاک مسیحی شہداء کے خون سے لالہ زار بن رہی تھی اور اس میں سے ربانی انوار و برکات کی شعاعیں نکل نکل کر عالم کو منور اور متبرک کر رہی تھیں اس وقت قسطنطنیہ کا وجود بھی نہ تھا اور اس کی جگہ بزنطیوم (Byzantine) اپنے اوثان و اصنام اور اباطیل و اوہام کی ضلالت میں گرفتار ہوئے دنیا میں کفر پاشی کر رہا تھا۔ رومہ کا تقدس اس سے ظاہر ہے کہ وہاں قصرِ مسیحیت کی تعمیر اس ملبے سے ہوئی جو بے دین رومی شہنشاہوں ٹائی ٹس (Titus)، اور ہیڈری اَن (Hedrian) کے مقدس یروشلم (Jerusalem) کو تباہ کرنے کے بعد رومہ میں آیا یعنی جب آخر الذکر

ظالم نے خداوند مسیح کے مدفنِ مقدس کی جگہ یونانی دیوی وینس (Venus) کا بت خانہ تعمیر کیا تو مسیحی رہبان ناسبق کی جماعت ہجرت کرکے اسی شہر رومہ میں تو آئی تھی۔ وہ واجب الاحترام ولیہ یعنی سینٹ ہلینا (St. Helena) رومہ ہی کی مسیحی ملکہ تو تھی جس نے ارضِ مقدس کے مسمار شدہ معابد و مشاہد کی مرمت اور جدید مقابر و مآثر کی تعمیر کرائی تھی۔ اور جس کے آغوشِ تربیت میں مسیحیت کے سب سے پہلے مختار و محب شہنشاہ قسطنطین (Constantine) نے پرورش پاکر ۳۳۰ء میں شہر بزنطیوم کو مسمار کرکے اس کی جگہ شہر قسطنطنیہ کی بنا ڈالی اور وہ رومہ کے آبائی مسیحین کی روحانی تعلیمات سے فیض یاب پادری ہی تو تھا جو تعمیر قسطنطنیہ کا پہلا بطریق بنا۔

یہ سلسلۂ بحث و نزاع ایک مدت تک جاری رہا جس میں ابتداً متانت کے ساتھ منطقی، تاریخی اور مذہبی استدلال سے کام لیا جاتا تھا مگر اس کے بعد متانت و دیانت کو بالائے طاق رکھ کر فریقین عامیانہ سوقیت۔ ملّایانہ سب وشتم۔ اور فقیہانہ تکفیر و تفسیق پر اتر آئے یہ تلاطم دیکھ کر مسیحیت کے اربابِ حل وعقد نے مناسب سمجھا کہ مجلسِ کلیسائی منعقد کرکے اس مسئلے کو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ۴۵۱ء میں مجلسِ کلیسائی منعقد ہوئی جس میں مشرقی کلیسا کے بااثر مندوبین کی تعداد غالب تھی۔ اس میں فریقین کے دعاوی پر کامل غور و توجہ اور مسئلہ اقتدار کے ما لہ و ما علیہ پر کافی فکر و نظر کے بعد قطعی فیصلہ کیا گیا کہ رومۃ القدیم (رومہ) اور رومۃ الحدیث (قسطنطنیہ) کے بشپ دونوں ہر اعتبار سے مساوی عظمت و اقتدار کے مالک اور اپنے اپنے حدودِ اثر و عمل میں کامل الاختیار ہیں اور ایک دوسرے پر کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے تقدم و تفوق حاصل نہیں۔

مجلسِ کلیسائی نے جو فیصلہ کر دیا تھا چاہیے تو یہ تھا کہ اس سے اقتدار و اثر کی اس ناشدنی بحث کا تلاطم فوراً فرو ہو جاتا اور دونوں تقدس مآب شخصیتیں اپنے اپنے مقام پر یہ کہہ کر خاموش ہو جاتیں کہ "تم اپنے گھر کے چاند ہو، ہم اپنے گھر کے چاند" لیکن یہ مقولہ چاہے کسی وقت غلط ہو جائے کہ "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند" چنانچہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس بات کا سخت صدمہ ہوا کہ فریق ثانی

Marfat.com

بجائے ماتحت قرار دیئے جانے کے اس کا ہم سر اور مساوی الاقتدار قرار دیا گیا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ اسی عرصے میں روما کے بشپ کا اعزاز و اقتدار روحانی سلطنت میں حد سے زیادہ بڑھ گیا اور اب وہ بجائے معمولی بشپ کے تقدس مآب پاپائے اعظم (Pope the great) کہلایا جانے لگا۔ اس ترقی مدارج نے پرانی آگ پھر سلگا دی جسے ایک طرف حسد اور دوسری طرف حرص کی ہوا نے خوب بھڑکایا اور تکفیر و تفسیق کے شعلے پھر بلند ہو گئے۔ اس مرتبہ جن مسائل پر رسالہ بازی شروع ہوئی ان میں ایک مسئلہ خصوصیت کے ساتھ پر لطف۔ دلچسپ۔ بصیرت افروز اور اسی لیے قابلِ گزارش ہے مگر اس کے سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تمہید کی ضرورت ہے جو درج ذیل کی جاتی ہے۔

عیسائیوں میں ایک نہایت مقدس اور علیہ رسم عشائے ربانی ہے جسے انگریزی میں یوکرسٹ۔ لارڈز سپر اور ہولی کمیونین کہتے ہیں۔ اس رسم کی اصلیت متی مرقس اور یوحنا کی انجیلوں کی روح سے نہ اسلامی تعلیمات کی رو سے ملخصاً یہ ہے کہ جب حضرت مسیح آخر مرتبہ بیت المقدس میں تشریف لائے تو یہودیوں کے عید فطیر کا زمانہ تھا جس میں فسح کی قربانی ہوتی ہے۔ اس دفعہ حضرت کی طرف رجحان عام زیادہ دیکھ کر اغیار یہود نے طے کر لیا کہ اب جس طرح ہو آپ کی جان ہی لے کر قصہ پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ جس رات کو صبح ہوتے فقیہیوں اور فریسیوں نے آپ کو گرفتار کر کے اس جرم میں کہ آپ عوام کو مذہب یہود سے روگردانی اور حکومت وقت سے بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں رومی گورنر پانطیوس پیلاطوس کی عدالت سے صلیب پر چڑھائے جانے کا حکم حاصل کیا۔ اسی رات کی شام کو حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں کے ساتھ آخری کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں آپ نے روٹی کے ٹکڑے توڑ کر شاگردوں کو دیے اور فرمایا:

" لو کھاؤ۔ یہ ابن آدم (یعنی خود مسیح) کے بدن کے گوشت کے ٹکڑے ہیں " پھر پانی (یا شراب) کا پیالہ دے کر فرمایا:

" لو پیو۔ یہ ابن آدم کا خون ہے "۔ عیسائی اس واقعے کے اندر ایک دقیق روحانی رمز مضمر اور ایک عمیق ربانی راز مرتکز سمجھتے ہیں اور اس کی یادگار میں عشائے ربانی کی رسم ادا کرتے

Marfat.com

ہیں۔ جس میں پادری دعا خوانی کے بعد اس روٹی اور شراب کو جو میز پر رکھی ہوتی ہے مقتدیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ راسخ ہے کہ یہ روٹی مسیح کے جسم کے اصلی گوشت اور شراب ان کے خون میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس روٹی اور شراب میں کراماتاً صلب امراض اور جلب اغراض کی طاقت آجاتی ہے۔ تبدیل ماہیئت کا یہ مسئلہ عیسائیوں کا ایک مہتم بالشان اور معرکۃ الآرا مسئلہ رہ چکا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یونانی اور رومانی کلیساؤں کا مابہ النزاع مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔ رومانی کلیسا کے مذہب کے مطابق ضروری تھا کہ جو روٹی عشائے ربانی کے لیے پکائی جائے وہ تازہ گندھے ہوئے آٹے کی نہ ہو بلکہ جب خمیر اٹھ آئے تو پکائی جائے۔ بالفاظ دیگر عشائے ربانی کے لیے رومانی کلیسا نے فطیری اور یونانی کلیسا نے خمیری روٹی لازمی قرار دی تھی۔ جب روما کے پوپ اور قسطنطنیہ کے بطریق میں دوبارہ بحث شروع ہوئی تو دوسرے مسائل سے بڑھکر یہی چھوٹا سا مسئلہ اُن مہمات المسائل میں قرار دیا گیا جن پر نجات اور شفاعت مسیح کا دارومدار تھا۔ چنانچہ فطیری اور خمیری روٹی کی بحث کے متعلق رسالہ بازی نے مسیحی دنیا میں وہ قیامت بپا کر دی کہ ایک کلیسا والے دوسرے کلیسا والوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ فطیریئے علانیہ خمیریوں کو کافر کہتے تھے اور خمیریئے کھلم کھلا فطیریوں کو بے دین۔

سنہ ۱۰۵۳ء میں قسطنطنیہ کے بطریق مائیکیل کیرولاری اس اور روما کے پوپ لیونہم میں آخری تحریری مناظرہ شروع ہوا جو بڑھتے بڑھتے بہت جلد مشاتمہ تک پہنچ گیا۔ بطریق کی بحث کا پہلو یہ تھا کہ واقعہ صلیب عید فطیر کے دوران میں ہوا جس میں یہودی فطیری روٹی کھایا کرتے ہیں۔ لہذا عشائے ربانی میں فطیری روٹی کے استعمال کے یہ معنی ہیں کہ خود خداوند مسیح نے شاگردوں کے ساتھ فطیری روٹی کھا کر ناپاک اور بے دین یہودیوں کی عید فطیر منائی۔ اور چونکہ اس سے خود خداوند کی ذات گرامی پر تشبیہ بالیہود کا ناپاک الزام عاید ہوتا ہے۔ لہذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خداوند مسیح نے اپنے آخری کھانے میں فطیری روٹی استعمال کی اور جو شخص عشائے ربانی میں فطیری روٹی کے استعمال کا حکم دے یا استعمال کو جائز قرار دے یا جو شخص ایسے عقیدے۔ حکم۔ استعمال یا جواز کو کفر و ضلالت نہ جانے وہ قطعی کافر

بے دین اور جہنمی ہے۔

۱۰۵۴ء میں پوپ صاحب کے سفیر قسطنطنیہ پہنچے۔ پہلے تو انھوں نے بطریق اعظم سے بحث کی۔ جب اس میں ناکام رہے تو سیدھے کنیسہ ہجیا سوفیا میں پہنچے جو بحمد اللہ قسطنطنیہ میں اسلام کی تشریف آوری کے بعد جامع ایا صوفیہ بن کر اس وقت تک مہبط انوار توحید ہے۔ یہاں انھوں نے قربان گاہ پر پوپ صاحب کا وہ دستخطی فرمان آویزاں کیا جس میں خمیری روٹیوں والے بطریق اور اس کے متبعین کو قطعی کافر اور ابدی جہنمی قرار دیا گیا تھا۔ پھر قربان گاہ کے زینے پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور یہ آواز بلند کہا۔

"مقدس باپ۔ مقدس بیٹے۔ اور مقدس روح القدس۔ اگر مردود وخبیث مائیکل اور اس کے بے دین متبعین خمیری روٹی کے متعلق اپنے عقیدۂ کفریہ سے جلد توبہ نہ کرلیں تو اُن سب کی ناپاک روحیں قیامت تک شیطان اور اس کی ذریات کے حوالے اور ان کا ٹھکانا جہنم میں ابدی ہو۔ آمین"

بطریق صاحب کیا تھوڑے تھے، انھوں نے جس وقت یہ واقعہ سنا تو فوراً اپنی توپیں سنبھالیں اور اپنے جرنیلوں کی مدد سے پاپائی قلعے پر دھواں دھار کفر باری شروع کردی اور بالآخر ۱۶ر جون ۱۰۵۴ء کے ہمیشہ یاد رہنے والی تاریخ کو فطیری روٹی کے استعمال کا حکم دینے والوں اور اس کے جواز کا عقیدہ رکھنے اور استعمال کرنے والوں کے کفر و ارتداد اور دائرۂ مسیحیت سے قطعی ابدی اخراج کا برسر منبر اعلان کر کے ہمیشہ کے لیے یونانی اور رومانی کلیساؤں کے درمیان تفریق کامل کی دیوار آہنی کھڑی کردی جو تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں صدی کے مساعیٔ اتحاد کے باوجود آج کے دن تک سر بفلک موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تفریق کے تنازع کی تفصیل لکھنے کے لیے مسیحیت کی آٹھ سو برس کی تاریخ کے صفحات مستعار لینے پڑیں گے۔ لہٰذا صرف ایک ہی واقعہ س لو کہ سلطان غازی محمد خان ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴۵۳ء

Marfat.com

میں جب فتح قسطنطنیہ کا عزم بالجزم کر لیا تو مشرقی سلطنت کے بوسیدہ مقبرے کے مجاور قسطنطین یازدہم (Constantine XI) شہنشاہ قسطنطنیہ نے جہاں یورپ کے اور بادشاہوں سے مدد مانگی وہاں پوپ نکولس پنجم (Nicolas V) کے آگے بھی ہاتھ پھیلائے۔ پوپ نے اپنے ندیم خاص کارڈی نل ایسا ڈور (Cardinal Isador) کو کچھ روپے اور سپاہی دے کر قسطنطنیہ بھیجا اور روانگی کے وقت مطلب کی بات چپکے سے کان میں کہہ دی کہ مشرقی کلیسا کو مغربی کلیسا میں جذب کر لینے کی پوری کوشش کرے۔ جب کارڈی نل مذکور نے قسطنطنیہ پہنچ کر کنیسہ بھیجا سوفیا میں مغربی طریقے پر عبادت کی تو مشرقی کلیسا والے غیظ و غضب سے آگ بگولا ہو گئے اور صلاح لینے ایک مشہور راہب جناڈیوس (Gunnadios) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس نے کہا کہ جو شخص اپنے (یونانی) مذہب کے مقابلے میں فطیریوں کا ذرا بھی لحاظ پاس کرے اس پر خدا وند مسیح کا سخت عذاب نازل ہوگا۔ یہ شہ پا کر قسطنطنیہ کے پادریوں، سپاہیوں اور عام باشندوں نے بلوہ کر دیا جس کا سرغنہ رکن حکومت گرانڈ ڈک نوٹارس (Grand Duke Notaras) تھا۔ چنانچہ نوٹارس اور اس کے بلوائی شرکا علانیہ کہتے تھے کہ "سینٹ سوفیا کا گرجا فطیری کتے کے بھونکنے (دعا پڑھنے) سے ناپاک ہو گیا۔ ہمیں اپنے معابد میں بے دین مسلمانوں کی پگڑیاں دیکھنی منظور مگر رومانی پادریوں کی ٹوپیاں دیکھنی ہرگز گوارا نہیں"

خدا کی شان کہ کارڈینل صاحب کی پگڑی اچھلنے کے بعد تین ہلال بھی بدر نہ ہونے پائے تھے کہ اسلامی پگڑی جس پر سنہرا ہلال جگمگا رہا تھا سینٹ صوفیا کے معبد کے اندر آ موجود ہوئی۔

تم نے دیکھ لیا کہ خمیری روٹی جیسی نرم چیز نے مسیحیت کے ایک ہزار سال کی عمر والے تناور درخت کو کیسا بیچ میں سے چیر کر دو ٹکڑے کر ڈالا۔ اس کے بعد سے یہ دونوں ٹکڑے اپنی اپنی جگہ بڑھنے اور ہوا میں جھومنے لگے اور ہر ایک میں سے پچاسوں ڈالیں نکل آئیں جو موٹی ہو ہو کر اصل درخت سے ہمسری کرنے لگیں۔ پروٹسٹنٹ (Protestant) شاخ تو کہیں ۱۵۲۹ء میں جا کر پھوٹی ہے اس میں سے اور نیز دوسری ڈالوں میں سے بھی بعد کو بہت سی شاخیں نکلیں جو اس وقت سرسبز و شاداب ہیں اور نئی نئی کلیوں اور کونپلوں اور نئے نئے پھولوں اور پھلوں سے لدی

Marfat.com

ہوئی زمین پر لوٹ رہی ہیں کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالہا من قرار۔

یہ تو تھے ان لوگوں کے حالات جن کے متعلق ۔۔۔۔ کی وعید موجود ہے۔ لیکن کیا اس خیر الامم کے لئے جسے واعتصموا الخ اور ولاتکونوا الخ کے صاف اور صریح احکام مل چکے ہیں۔ مقام صد عبرت اور باعث صد ہزار غیرت نہیں کہ فطیری اور خمیری روٹیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنائے تفریق و تمزیق قرار دے کر اپنے آپ کو اولاً یک لہم الخ کا مصداق بنائے۔ اللھم احفظنا۔

الناظر، لکھنو

شمع بے نور

۳۱ر جنوری ۱۹۲۶ء

نقلِ مکان

ملک اطالیہ (Italy) کے صوبۂ انکونا (Ancona) میں شہر انکونا سے پندرہ میل جنوب مغرب۔ شہر ماسیراتا (Macerata) سے سولہ میل شمال و مشرق اور بحیرہ ایڈریاٹک (Adriatic Sea) کے اطالوی ساحل سے تین میل جنوب۔ مشرقی کوہستان اپی نائینز (Apennines) کے سلسلے کی ایک نیچی پہاڑی کی ڈھلوان سطح پر دریائے میوسوں (Musone) کے داہنے کنارے ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر آباد ہے جس کا نام ہے لوریٹو (Loreto)۔ اس شہر کی عمر حقیقت میں تو پانچ سو برس سے زیادہ نہ ہوگی لیکن وضع قطع اور ہیئت تعمیر کہہ رہی ہے کہ ہے تو بہت پرانا اور تاریخی شہر مگر زمانے کا شباب ربا اور ہمگر حسن فرسا ہاتھ اس کی جوانی چھیننے میں ناکام رہا ہے۔ شہر کے گرد مضبوط اونچی دیوار کا حصار ہے جس میں چاروں طرف پھاٹک لگے ہیں۔ مستقل آبادی تو بارہ تیرہ سو نفوس سے زیادہ نہیں مگر آنے جانے والے ہر ہفتے ہزاروں کی تعداد میں آتے جاتے رہتے ہیں اور دسمبر کے نصف آخر میں تو بلا مبالغہ لکھوکھا آدمی حاضر ہوتے ہیں۔

آبادی کے اندر چوک تک دو دکانوں کی قطاریں ہیں جن میں صلیبیں، مالائیں، مذہبی تصویریں۔ انجیلیں۔ دعاؤں کی کتابیں، شمعیں، مر اور لوبان اور اسی قسم کی اشیاء بکثرت فروخت ہوتی ہیں۔ چوک آبادی کے وسط میں ہے جس کے ایک ضلع پر پہاڑی کی چوٹی اور

Marfat.com

اس کے مقابل والے ضلع پر گورنر کا محل حکومت ہے۔ باقی دو ضلعوں میں سے ایک پر دینیات کا دارالعلوم اور دوسرے پر اساتذہ اور تلامذہ کا دارالاقامہ ہے۔ چوٹی پر کینسۂ اعظم (Cathedral church) کی عمارت کا مستحکم قلعہ نما سلسلہ باہر سے مربع اور اندر سے ایک دائرے کی شکل میں بنا ہے۔

اگرچہ کینسہ کی کل عمارت خوبی تعمیر و کثرت تصاویر کے اعتبار سے قابلِ دید ہے اس لیے کہ اس کینسہ پر تین سو برس کی طویل و عریض مدّت تک دنیائے مسیحیت کے دینی فرمانرواؤں یعنی تقدس مآب پاپاؤں (پوپوں) کی نیازمندانہ نظر مبذول رہی ہے اور انھوں نے اپنے ذاتی اہتمام سے کروڑھا روپیہ صرف کر کے اطالیہ اور فرانس کے کامل الفن سنگ تراشوں اور نقاشوں اور معماروں اور دستکاروں کے ہاتھوں اِسے اعجوبۂ ندرت بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے مگر جو چیز اس عمارت کی اور نہ صرف اس عمارت ہی کی بلکہ سارے کلیسائے رومانی۔ (Latin (or western or Roman catholic church) کی جان اور مرکزِ دائرۂ ایمان ہے۔ وہ کینسائی عمارت کے آغوشِ حفاظت میں عین چوٹی کے اوپر ایک چھوٹا سا مکان ہے جسے علما و آبائے مذہب لفظاً و معناً کعبۂ مسیحیت[1] کہتے اور سمجھتے ہیں۔

مالہم بہ من علم ولا لآبائہم۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواہہم۔ ان یقولون الّا کذبا (نہ ان کو اس کا کچھ علم ہے نہ ان کے آبا کو۔ بڑی (سخت) بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ نہیں کہتے وہ سوائے جھوٹ کے)۔

اس مکان کی روکار تو بہترین قسم کی سنگ مرمر کی نہایت منبّت و منقّش مصوّر ہے مگر اندرونی رخ کہا جاتا ہے کہ پرانی پتلی اینٹ یا سیاہ رنگ کے کسی پتھر کا بنا ہے جس پر اعلیٰ درجے کی استرکاری پر مذہبی تصاویر کے مرقّعے کمال صنعتِ مصوری کے ساتھ بنے ہیں۔ دیواروں کے

---

[1] The Holy House by which Lore to became what has been, not inappropriately called the Christian Mecca. Ency, Brit. Vol. 15 P.4

مصنف

Marfat.com

آثار سمیت مکان کا طول بتیس فٹ آٹھ انچ[۱]۔ عرض چودہ فٹ نو انچ[۲] اور ارتفاع کرسی اور منڈیر سمیت اٹھارہ فٹ[۳] ہے۔ اندر جا کر مکان کا طول اٹھائیس فٹ۔ عرض ساڑھے بارہ فٹ اور ارتفاع ساڑھے تیرہ فٹ[۴] رہ جاتا ہے۔ شمالی دیوار میں آبنوسی چوکھٹ کا ایک پرانا دروازہ اور غربی دیوار میں فرش سے ساڑھے چار فیٹ اونچائی پر آبنوسی چوکھٹ کی ایک پرانی کھڑکی ہے۔ کھڑکی تو اب بھی کھلی ہے مگر دروازہ کو اندر کی طرف جوں کا توں ویسا ہی رکھ کر باہر کی طرف سنگِ مرمر کی سلوں سے بند کر دیا ہے اور اس کی جگہ شمالی دیوار ہی میں کسی قدر غرب کو ہٹا کر ایک بڑا دروازہ اور اس کے مقابل جنوبی دیوار میں بھی اسی عرض و ارتفاع کا دروازہ لگا دیا ہے۔ مکان کے اندر سرتاسر سنگِ مرمر کی پچیکار فرش ہے۔ مشرقی حصے کے قریباً وسط میں نہایت چمک دار سنگ موسیٰ کی قربان گاہ بنی ہوئی ہے۔ اس قربان گاہ کے سب سے اونچے مقام پر شمالی گوشے میں چاندی کا ایک نہایت تابناک شعاع دار ستارہ جڑا ہے اور جنوبی گوشے میں پیلپائے کی شکل کا ایک پتھر نصب ہے۔ کینیسائی عمارت میں سب سے زیادہ مقدس یہ مکان اور اس مکان میں سب سے زیادہ مقدس قربانگاہ کا یہ سب سے اونچا مقام ہے۔ مشرقی دیوار میں وسط سے کسی قدر شمال کو ہٹا ہوا ایک طاقچہ ہے جس میں "ام وابن"[۵] کا ایک چھوٹا چوبی بت جس میں جواہرات جڑے ہیں رکھا ہوا ہے[۶]۔

الف۔ پرانا دروازہ جو اب باہر سے بند ہے۔

ب۔ پرانی کھڑکی جو اب بھی کھلی ہے۔

---

[۱]،[۲]۔ ارض سینا و فلسطین مصنفہ ڈین اسٹینلی صفحہ ۴۴۹۔ مصنف

[۳] نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۸ صفحہ ۲۹۴۔ مصنف

[۴] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۵ صفحہ ۴۔ مصنف

[۵] حضرت مریم و حضرت عیسیٰ علیہما السلام۔ مصنف

[۶] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۵ صفحہ ۴۔

مصنف

Marfat.com

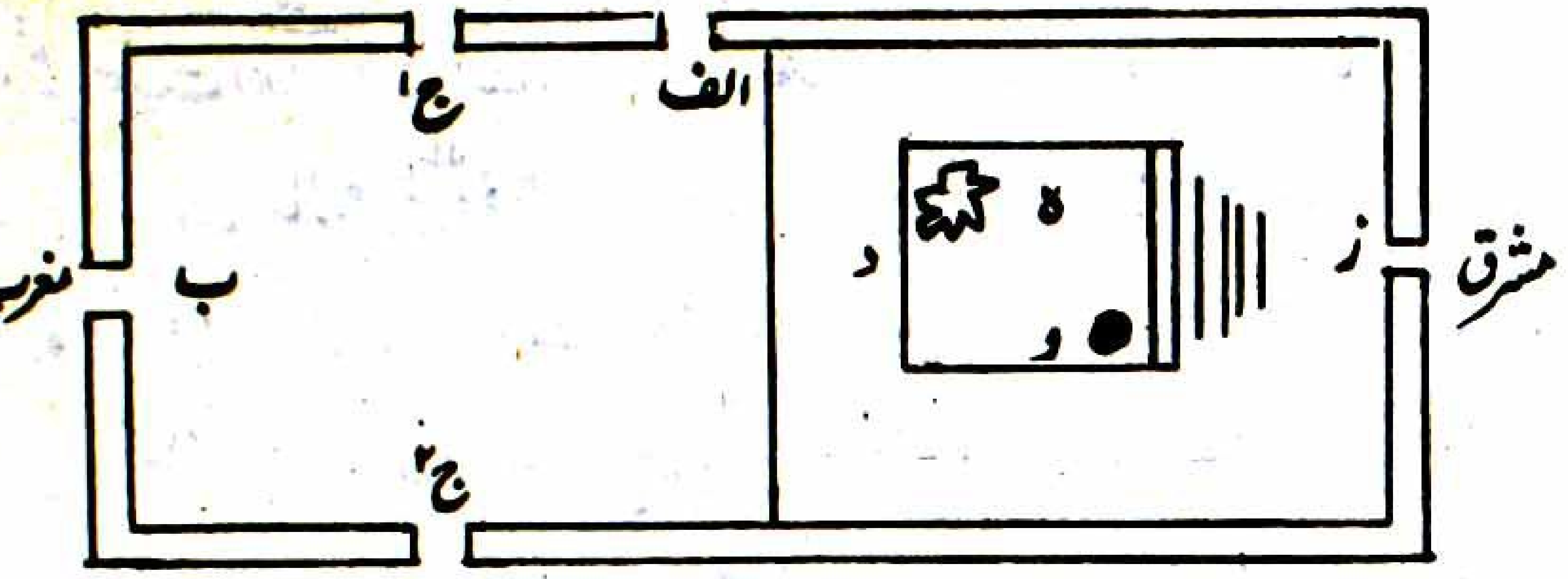

ج۱ ج۲۔ نئے دروازے

د ۔ قربان گاہ

و ۔ پیلپایہ نما پتھر (۲)

ہ ۔ چاندی کا شعاع دار ستارہ (۱)

ز ۔ طاقچہ جس میں چوبی بت رکھا ہے۔

بجائے اس کے کہ میں تفصیلی جزئیات سے آپ کا دماغ پریشان کرنے کی معافی چاہوں آپ سے بڑے زور سے عرض کرتا ہوں کہ ادب کیجئے ادب۔ یہ کوئی ایسی ویسی معمولی عمارت نہیں۔ مکان مقدس (Casa Santa) ہے۔

مکان کی وجہ تقدس

یہ وہی اصلی مکان ہے جو آج سے تقریباً دو ہزار برس پہلے فلسطین[۱] میں صوبہ جلیلی[۲] کے قصبہ ناصرہ[۳] کے جنوبی مشرقی گوشے میں انھیں آثاروں پر بنا کھڑا تھا۔ اسی میں مریم پیدا ہو کر پلیں بڑھیں۔ اسی کے اندر آکر جبرئیل نے انھیں حمل و ولادت مسیح کی بشارت دی۔ اسی میں خود مسیح نے نشو نما پائی۔ اسی کو بعد صعود مسیح ان کے شاگردوں نے پہلا کنیسہ بنایا اور اسی میں (۱۸۰۰ء)

---

۱ Palestine

۲ Galilee.

۳ Nazareth

Marfat.com

تک برابر عبادت ہوتی رہی[1]۔

دروازہ الف وہی اصلی دروازہ ہے جس میں سے ہو کر حضرت مریم اور مسیح مکان میں آتے جاتے تھے۔ اب اسے احتراماً تیغہ کر دیا گیا ہے کہ جس آبنوسی چوکھٹ پر "خدا کے برّے[2] کا مقدس قدم پڑ چکا ہے اس پر کالی بھیڑ کا ناپاک پاؤں نہیں پڑ سکتا۔ کھڑکی ب چونکہ اونچی ہے لہذا وہ کھلی رہنے دی گئی۔ قربان گاہ کے سب سے اونچے حصے پر مقام ء جہاں پہچان کے لیے نقرئی ستارہ جڑ دیا گیا ہے ٹھیک وہ جگہ ہے جہاں حضرت مریم کھڑی تھیں کہ کھڑکی کی راہ سے حضرت جبرئیل مکان میں آکر اس پیلپائے پر بیٹھے جو ستارے سے جنوب کو نصب ہے اور یہیں سے حضرت صدیقہ کو بشارت دے کر کھڑکی کی راہ سے چلے گئے۔

بیسویں صدی کے یورپ کی خوش اعتقادی

کلیسائے روما کے متبعین کا اعتقاد ہے کہ مکان مقدس (Casa Santa) مسیحی دنیا کی نہایت مقدس و محترم زیارت گاہ ہے۔ اس کے وجود سے لوریٹو کا آتنا رقبہ جو شہر پناہ کے اندر ہے فلسطین کی ارضِ مقدس کا اصلی ٹکڑا[3] اور اس اعتبار سے یورپی ناصرہ[3] ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں روزمرہ قرب وجوار سے زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے جن کی تعداد ہر مسیحی زیارت گاہ کے حاضرین کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے[3]۔

خادموں اور مجاوروں کی تعداد کثیر کے علاوہ پورے ایک سو پادری[3] یہاں اس کام پر متعین ہیں کہ ہر وقت قربان گاہ کے گرد مقام مقدس کی تعظیم و عبادت کرتے رہیں۔ ہر دروازہ پر دو سپاہی آٹھوں پہر ننگی تلواریں لیے پہرہ دیتے ہیں[4]۔ زیارت صبح سے شام تک ہوتی ہے۔ اُدھر پو پھوٹی اور اِدھر برجِ حصار سے توپ نے سلامی دی۔ توپ کی آواز کے ساتھ ہی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۵ صفحہ ۴۔ مصنف

[2] یوحنا کی انجیل باب ۱ آیت ۱۹۔ مصنف

[3] تا [3] ارض سینا و فلسطین صفحہ ۳۳۸ تا ۳۴۰۔ مصنف

[4] ارض سینا و فلسطین ۳۳۸ تا ۳۴۰۔ مصنف

پادریوں نے جو قربان گاہ کے گرد کھڑے تھے مناجات کا ترانہ شروع کیا کہ دروازہ کھلا اور داخلی شروع ہوگئی۔ زائرین جو ٹھٹ کے ٹھٹ دروازے سے لگے کھڑے تھے اندر قدم رکھتے ہی والہانہ انداز میں رکوع اور سجود میں گر پڑے اور نہایت ہی خشوع اور خضوع سے رو رو کر دعائیں مانگنے اور مناجاتیں پڑھنے لگے۔ اور جب عرض مدعا سے فارغ ہو چکے تو مقدس مقام کو منہ اور دروازے پیٹھ کیے الٹے پاؤں دوسرے دروازے سے نکل آئے[1] صبح صادق سے غروب آفتاب تک ایاب و ذہاب کا یہی سلسلہ ہر روز رہتا ہے۔

مکانِ مقدس کا تذکرہ تحریراً و تقریراً ایسے الفاظ و عبارات میں کیا جاتا ہے جیسے کسی حی القائم ذی مرتبت انسان کا کیا جائے۔ وہ شہر اور گرد و نواح کے مقامات کا حاکم مطلق اور قرب و جوار کی زرخیز آراضی و املاک کا مالک مستقل ہے۔ وہ صاحب خزانہ اور صاحب توشہ خانہ ہے اور اس کے پاس ضیاع و عقار۔ نقد و جنس۔ زر و جواہر، ظروف و قمشہ اور خدم و حشم سبھی کچھ ہے[2]۔

اہلِ تحقیق کی واماندگیاں

اگر آپ جغرافیہ داں ہیں تو حیران ہوں گے کہ کہاں برّاعظم ایشیا اور کہاں براعظم یورپ کہاں ملک اطالیہ، کہاں صوبہ جلیلی اور کہاں صوبہ انکونا اور پھر کہاں قصبہ ناصرہ اور کہاں قصبہ لورے ٹو۔ آپ کو یقین ہی نہ آئے گا کہ قصبہ ناصرہ میں بنا ہوا مکان مع عملہ خشتی و چوبی دو ڈھائی ہزار میل کا سفر طے کر کے جس میں آبادی و ریگستان، دریا اور پہاڑ اور جھیلیں اور سمندر سبھی حائل ہیں۔ لورے ٹو کی پہاڑی پر پہنچ کیسے گیا۔ لیکن آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مسیح کے ہر خلیفہ (پوپ) اور کلیسائے رومانی کے ہر متبع نے پچھلے پانچ چھ سو برس سے اب تک برابر اسی یقین کو اپنا جزو مذہب[3] سمجھا ہے کہ یہ وہی اصلی مکان ہے جس میں "خدا کا کام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر

---

[1] ارض سینا و فلسطین صفحہ ۳۳۸ تا ۳۴۰۔ مصنّف

[2] ارض سینا و فلسطین صفحہ ۳۳۸ تا ۳۴۰۔ مصنّف

[3] اسپینی کتاب الادعیہ سبق ششم۔ مصنّف

Marfat.com

ہمارے درمیان رہا"[1] کورسواد اور ضعیف الاعتقاد ۔ وحشی اور جاہل کالا اور احمق مشرقی ہوتا تب تو آپ اس کے ایسے یقین اور عقیدے کو قابل التفات نہ سمجھنے میں حق بجانب تھے لیکن جب اجارہ دارِ علم وعقل اور خزانہ دار فہم و فراست صحیح اللون اور صحیح الدماغ مغرب اپنی پانچ لاکھ[2] اولاد ذکور و اناث کو جس میں صوبہ ابروزی[3] کی دخ ستاق زاد سے لے کر مہز مجسٹی شاہ نیپلس[4] تک سبھی شامل ہیں ہر سال اسی عقیدے کے ساتھ لوریٹو بھیجے کہ مریم و مسیح کے اصلی مولد و منشا کو سجدہ کر کے آسمانی بادشاہت میں شامل ہو جائے تو آپ اس کی تضحیک و تحقیق کی جرأت کرنے کو تیار ہیں ؟

مکانِ مقدس کے سفر کی روایت

اس مکان کے سفر کی صحیح روایت جو کتابوں میں مرقوم ہونے کے علاوہ خود اس کی مشرقی دیوار پر تصاویر کی شکل میں مرتسم ہے حسب ذیل ہے ۔

۱۲۹۱ء فرشتے اسے" بے دینوں[5] "کے حملے کے خوف سے اس کی اصلی جگہ ناصرہ کی آبادی

---

[1] یوحنا کی انجیل باب ۱ آیت ۱۴۔ مصنف

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۵ صفحہ ۳۔ مصنف

[3] Abruzzi مصنف

[4] مصنف Naples ارض سینا و فلسطین صفحہ ۳۳۸ ۔

[5] مصلحت بین اور موقع شناس یورپ اپنے کاروبار جہاں گیری کے اغراض و مصالح کو پیش نظر رکھ کر آج چاہے کیسے ہی فردوس گوش خطابوں کے جنت نگاہ تمغوں اور قباؤں سے مسلمانوں کے سینہ و دوش کی تواضع فرمائے ہمیں اب تک یاد ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے عشرہ رابع سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک مسیحی یورپ کے ہر مصنف، ہر مؤرخ، ہر مبلغ اور ہر مبارز کے دربار سے مسلمانوں کی قسمت میں صرف ایک ہی خطاب تھا اور وہ تھا Infidel یعنی بے دین۔ مصنف

Marfat.com

کی جنوبی مشرقی حد سے اکھاڑ کر ہوا میں اپنے کندھوں پر لے اڑے اور اولاً بحیرۂ ایڈریاٹک کے ہنگارونی[۱] ساحل پر صوبہ ڈالمیشیا[۲] کے قصبے ترساتو[۳] کی پہاڑی پر رکھ گئے جو فیوم[۴] اور زینگ[۵] کے درمیان ہے۔ یہاں کے باشندوں کو اس مکان کے تقدس کا یقین تو اسی سے ہو گیا کہ چند روز بعد حضرت مریم خود تشریف لائیں اور معجزات ظاہر ہوئے لیکن مزید اطمینان کے لیے گورنر ڈالمیشیا نے قاصدوں کو ناصرہ بھیج کر تحقیقات کرائی جس سے ثابت ہو گیا کہ مکانِ تقدس وہاں سے اٹھ گیا ہے مگر قصبہ ترساتو میں مکانِ مقدس کی عظمت و حفاظت کا قرار واقعی انتظام نہ ہو سکا لہٰذا تین سال تک ترساتو میں قیام کے بعد مکانِ مقدس پھر فرشتوں کے کندھوں پر سوار ہو کر اس دفعہ بحیرۂ ایڈریاٹک کے اطالوی ساحل پر یعنی اس ملک میں جہاں تقدس مآب پاپاؤں کا قیام ہے ۱۰ دسمبر ۱۲۹۴ء کو قصبہ ریکاناتی[۶] کے قریب ایک نخلستان میں عارضی طور پر اتر آیا۔ فرشتے اس عرصے میں کسی خوش نما اور محفوظ مقام کی تلاش میں رہے اور جب موجودہ مقام ڈھونڈ نکالا تو اوائل ۱۲۹۵ء میں مکانِ تقدس کو نخلستان سے اٹھا کر اس پہاڑی پر رکھ دیا جس پر آج رونق افروز ہے۔ یا تو اس وجہ سے کہ ابتداً مکانِ تقدس کو ایک نخلستان میں رکھا گیا تھا اور نخلستان کو لاطینی زبان میں لاریٹم[۷] کہتے ہیں یا اس وجہ سے کہ جس خاتون کی مملوکہ آراضی پر مکانِ تقدس اب رکھا گیا اس کا نام لریٹا[۸] تھا۔ مکانِ مقدس کے گرد و پیش جو بستی آباد ہوئی اس کا نام لوریٹو ہی پڑ گیا۔[۹]

ایک ضروری گزارش

اس روایت کے متعلق بحث و تحقیق سے قبل گزارش ہے کہ میں بحمد اللہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اصل واقعہ بشارت پر انھیں الفاظ میں اعتقاد رکھتا ہوں جن الفاظ میں

۱ـ Hungarian ۲ـ Dalmatia ۳ـ Tersato
۴ـ Fium ۵ـ Zengg ۶ـ Recanati
۷ـ Lauretum • ۸ـ Laureta مصنف

۹ـ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۵ صفحہ ۴ و نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا۔ مصنف

اس واقعے کو قرآن کریم (الٰلہم اذ قلنا تلاوتہ آناء اللیل وآناء النہار) سورۃ آل عمران کے پانچویں اور سورۃ مریم کے دوسرے رکوع میں بیان فرماتا ہے اور انھیں معانی کے ساتھ اعتقاد رکھتا ہوں جو علم الٰہی میں ہیں۔

روایت کی تفتیش اناجیل میں

مسیحی علما نے عہد نامہ[ا] قدیم اور عہد نامہ جدید[۲] کی کتابوں میں سے ہر ایک کی دو تقسیمیں کی ہیں۔ ایک کینانیکل[۳] اور دوسری اپاکریفل[۴]۔ ان تقسیموں کی تشریح و تفریق کی سطور ہذا نہ ہو سکیں گی۔ صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ علما و عمال کی مجالس نے جو بہ اوقات و مقامات مختلف منعقد ہوئیں بعض کتابوں کو بالاتفاق الہامی تسلیم کر کے صحف سماوی کی فہرست میں شامل کر لیا اور بعض کے الہامی ہونے میں شک کر کے انھیں فہرست سے خارج کر دیا۔ اول الذکر کو کینانیکل بکس یعنی کتب مقبولہ اور ثانی الذکر کو اپاکریفل بکس یعنی کتب مزدودہ کہتے ہیں۔ عہد قدیم کی کتابوں کو چاہے وہ مقبول ہوں یا مردودہ ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بہت قبل کی ہیں۔ عہد نامہ جدید کی کتب مقبولہ میں اناجیل اربع مراسلات حواریین اور مکاشفہ یوحنا ہیں۔ مراسلات اور مکاشفے میں حضرت مریم اور مسیح کے ابتدائی حالات سے بحث ہی نہیں ان میں بشارت و ولادت کی تلاش بے سود ہے لہٰذا صرف اناجیل اربع ہی قابل التفات رہ گئیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے جو کچھ حاصل ہوا وہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ متی کی انجیل[۵]

اس میں حضرت مریم کو فرشتے کی بشارت دینے کا کہیں تذکرہ نہیں بلکہ یوسف (نجار) کو خواب میں ولادت مسیح سے اطلاع دینے کا حال ہے۔ (متی باب ۱ آیات ۲۰۔ ۲۴)۔ اس انجیل میں سب سے پہلی مرتبہ ناصرہ کا تذکرہ۔ مسیح کی

[ا] Old Testament [۲] New Testament
[۳] Canonical [۴] Apocryphal [۵] Gospel of St. Mathew - مصنف

مصر سے واپسی کے بعد ایسے الفاظ میں آیا ہے جن سے پایا جاتا ہے کہ یوسف اور مریم اس سے قبل یہاں رہتے ہی نہ تھے۔ ملاحظہ ہو "(یوسف) خواب میں ہدایت پاکر گلیل کے علاقہ کو روانہ ہوگیا اور ناصرہ نام ایک شہر میں جا بسا۔" متی باب ۲ آیات ۲۲ و ۲۳۔

۲ ۔ مرقس کی انجیل[1]

اس کا آغاز یوحنا کے آنے اور گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کے بپتسمہ کی منادی کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ اس میں حضرت مسیح اور ناصرہ کا تذکرہ اول مرتبہ ان الفاظ میں آیا ہے "ان دنوں ایسا ہوا کہ یسوع نے گلیل کے ناصرہ سے آکر یردن[2] میں یوحنا سے بپتسمہ لیا" (مرقس باب ۱ آیت ۹)

۳ ۔ یوحنا کی انجیل[3]

اس میں (جس کا نمبر حقیقتاً چوتھا ہے) حضرت مسیح کا تذکرہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ مبعوث ہو چکے تھے اور اکثر آدمی ان کی "شاگردی" کا فخر حاصل کر چکے تھے۔ لہٰذا بشارت ولادت کی تلاش اس میں لاحاصل ہے۔

۴ ۔ لوقا کی انجیل[4]

اسی میں (جس کا نمبر حقیقتاً تیسرا ہے) بشارت کا پورا واقعہ درج ہے۔ چنانچہ آیاتِ متعلقہ کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

"جبریل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا۔ جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نامی سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔ فرشتہ نے اس کے پاس اندر آکر کہا سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے خداوند تیرے ساتھ ہے۔ وہ

---

[1] Gospel of St. Mark [2] Jordan
[3] Gospel of St. John [4] Gospel of St. Luke مصنف

Marfat.com

اس کلام سے بہت گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا سلام ہے۔ فرشتے نے اس سے
کہا اے مریم خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ
ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہوگا اور خدا تعالیٰ
کا بیٹا کہلائے گا اور خداوند خدا اس کے باپ داؤد کا تخت اسے دے گا اور وہ
یعقوب کے گھرانے میں ابد تک بادشاہی کرے گا اور اس کی بادشاہی کا آخر نہ
ہوگا۔ مریم نے فرشتے سے کہا یہ کیونکر ہوگا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی
اور فرشتے نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا تعالیٰ
کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی اور اس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے
خدا کا بیٹا کہلائے گا اور دیکھ تیری رشتہ دار الیشبع کے بھی بڑھاپے میں بیٹا
ہونے والا ہے اور اب اس کو جو بانجھ کہلاتی تھی چھٹا مہینہ ہے کیونکہ جو قول خدا کی
طرف سے ہے وہ ہرگز بے تاثیر نہ ہوگا۔ مریم نے کہا کہ دیکھ میں خداوند کی بندی ہوں
میرے لیے تیرے قول کے موافق ہو۔ پھر فرشتہ اس کے پاس سے چلا گیا" (لوقا باب
ا آیات ۲۶ تا ۳۸)۔

یہ موقع اس بحث کا نہیں کہ "یہ انجیل بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے[1]۔ اس لیے کہ لوقا
اس درجے مجہول الاحوال شخص تھا کہ" اگر کوئی یہ دعویٰ کر دے کہ یہ محض فرضی نام ہے تو
شاید عیسائیوں کو مشکل سے جواب بن پڑے گا[2]۔ مسیحی علما کو یہ امر مان لینا پڑا ہے کہ اس نے جو کچھ
اور بیان کیا ہے سب آنکھوں کا دیکھا نہیں بلکہ کانوں کا سنا ہوا ہے[3]۔ لوگوں نے اس انجیل کے
متعلق یہاں تک شک ڈال دیا ہے کہ آیا یہ وہی انجیل ہے جو لوقا نے لکھی تھی یا وہ کوئی
اور انجیل تھی[4]۔ اور اس کے مقام اور زمانۂ تصنیف کے متعلق قیاساً بتایا گیا ہے کہ غالب
یہ انجیل قیساریہ میں ۵۸ اور ۶۰ عیسوی کے درمیان لکھی گئی ہوگی[5]۔

میں کہتا ہوں کہ لوقا کے بیان مندرجہ انجیل کے متعلق شبہہ کرنے کا یہ موقع اور وقت

---

[1] تا [5] مسیح اور مسیحیت۔ مولفہ مولانا محمد عبد الحلیم شرر لکھنوی صفحہ ۲۰۹ و
۲۱۰۔ مصنف۔

Marfat.com

نہیں ہے لہٰذا سلسلہ بحث کو آگے بڑھانے کے لیے مانے لیتا ہوں کہ انجیل کی رو سے (چاہے وہ چار انجیلوں میں سے اکیلی اور لوقا جیسے مشتبہ شخص ہی کی انجیل ہو) حضرت مسیح کی ولادت کی بشارت کا مقام نزول ناصرہ ہی ثابت ہوا۔ مگر لوقا کی انجیل میں یہ کب اور کہاں لکھا ہے کہ بشارت کے وقت جناب صدیقہ ناصرہ کے فلاں مقام پر فلاں مکان ہی میں تشریف فرما تھیں؟ اس فقرے سے کہ "فرشتہ نے اس کے پاس اندر آکے کہا سلام تجھ کو" یہ نتیجہ تو نکال لیا گیا حضرت مریم مکان کے اندر تھیں مگر وہ کون سا مکان تھا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں۔ حالانکہ ہماری بحث کے لیے زیادہ ضروری بات مکان ہی کا پتہ لگانا تھی۔

آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ولادت مسیح کے وقت ہیروڈ اعظم[1] کے حکم سے بیت اللحم اور اس کے قرب وجوار کے بہت سے نوزائیدہ معصوموں کے گلوں پر چھری پھر گئی تھی۔ اسی وجہ سے حضرت مسیح کے دنیا میں تشریف آوری کا زمانہ ایسا مخفی اور حالات ایسے مجہول رکھے گئے تھے کہ تاریخ، سنہ اور مقام کا صحیح اندازہ اور پتہ آج تک نہ معلوم ہونا تھا نہ ہوا۔ ایک زمانے تک تاریخ ولادت اکتوبر کے مہینے میں سمجھی جاتی تھی[2]۔ اس کے بعد ۶ جنوری[3] مقرر ہوئی۔ ۲۵ دسمبر جو آج یوم میلاد منایا جاتا ہے۔ حقیقت میں رومی دیوتا سال[4] کی پیدائش کا دن ہے جو رومیوں میں اشاعت مسیحیت سے بہت پہلے ہر سال منایا جاتا تھا۔ رومیوں نے مسیحی مذہب قبول کرنے کے بعد بھی اسے بھولنا اور چھوڑنا نہ چاہا لہٰذا" پانچویں صدی میں کلیسائے رومانی نے حکم دیا کہ جشن میلاد مسیح آیندہ ہمیشہ رومی دیوتا سال کے جشن کے میلاد کے دن یعنی ۲۵ دسمبر ہی کو منایا جائے اگرچہ مسیح کے ولادت کے دن کا کسی کو علم نہیں[5] اسی طرح سنہ مسیحی جو آج ساری

---

۱ Herod the Great

۲ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۵ صفحہ ۴۰۷

۳ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۵ صفحہ ۴۰۷ و نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۲۲۶۔

۴ Sol

۵ نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد ۳ صفحہ ۲۲۶

Marfat.com

دنیائے تمدن کا مرجع کار بنا ہوا ہے چھٹی صدی عیسوی[1] میں جا کر کہیں رائج ہوا ہے اور اس کا رائج کرنے والا ایک فناتی الاصل پادری تھا ——— یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسیح کی ولادت ان کے سنہ ولادت سے چار سال قبل ہوئی۔ یعنی خود مسیحیوں ہی کے قول کے مطابق سنہ عیسوی میں چار سال کی غلطی رہ گئی جو آج تک باقی[2] ہے۔ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ جب آپ کی ولادت کے متعلق لاعلمی کا یہ عالم ہے تو حالات ماقبل ولادت پر ظلمات "بعضہا فوق بعض" کے کیسے موٹے موٹے پردے پڑے ہوں گے اگر یہ کہا جائے کہ خود جناب مسیح سے ان کے گھر کا پتہ چلا تو انجیلیں تو خود انہی کی زبان سے یہ کہلواتی ہیں۔

"لومڑیاں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابن آدم کے لیے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں" (متی باب ۸ آیت ۲۰۔ لوقا باب ۹ آیت ۵۸)

اناجیل مقبولہ کے مطالعے کا نتیجہ آپ کے پیش نگاہ ہے۔ جس سے زیادہ سے زیادہ آپ کو یہ معلوم ہو سکا کہ بشارت کا واقعہ قصبہ ناصرہ میں کسی جگہ پیش آیا۔ بس اس اتنے سے تنکے پر رومانی کلیسیا نے قلعہ بنا کر کھڑا کر دیا یعنی قصبے کے جنوبی مشرقی کنارے پر ایک عالیشان فرانسسکی[3] گرجا بلا کسی ثبوت کے تعمیر کر لیا۔

اب ذرا اناجیل مردودہ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ ان میں ایک انجیل سینٹ جیمس[4] کی ہے جس میں لکھا ہے کہ مریم پانی بھرنے کے لیے چشمہ پر گئی تھیں کہ فرشتے نے پہلی مرتبہ آ کر سلام کیا اور ولادت مسیح کی بشارت[5] دی۔ اس انجیل کی تحریر کے وثوق پر یونانی کلیسیا[6] نے قصبہ ناصرہ کے شمالی مشرقی کنارے پر یعنی رومانی کلیسیا کے مقرر کردہ مقام بشارت کے مخالف

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۵ صفحہ ۷۱۳۔ مصنف

[2] جیکسن ریفرنس بک صفحہ ۸۲۔ فاؤنڈر آف کرسچیانٹی۔ صفحہ ۲۲۳ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۵ صفحہ ۶۲۲۔

[3] Fransiscan Church [4] St. James

[5] ارض سینا و فلسطین صفحہ ۲۷۳، ۲۳۷

[6] Greek or Eastern church.

سمت میں ایک چشمے کے قریب اپنا کنیسہ بشارت[1] بنایا ہے[2]۔ یونانی کلیسیا کے ارباب حل وعقد کے بیان کے مطابق یہی وہ حقیقی اور اصلی مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم کو مژدۂ ولادت فرزند سنایا تھا۔ اس بیان کی تائید وتصدیق ان روایات سے ہوتی ہے جن کا سلسلہ چھٹی صدی عیسوی سے اب تک متواتر چلا آتا ہے[3]۔

اناجیل مردودہ کے متعلق کچھ بھی کہا جاتے لیکن مسیحی مبصرین ہی کی نظر میں یہ واقعہ ناقابل انکار وتردید ہے کہ ان ہی میں اکثر وہ کتابیں ہیں جن میں "ولادت مسیح سے قبل یوسف ومریم کے حالاتِ زندگی اور مسیح کے ایام طفولیت کے حالات مندرج ہیں[4]۔ اور یہ اندراجات بسا اوقات نہایت شرح وبسط کے ساتھ مع صراحتِ مقامات ہیں اور یہ امر قابلِ غور ہے کہ اناجیل مقبولہ کے مقابلے میں یہی وہ کتابیں ہیں جو ارض مقدس کے متعلق قدیم ترین مقامی روایات کے علم و اطلاع کا اصلی وحقیقی ماخذ ہیں[5]۔

مقامِ بشارت کے ثبوت میں یونانی کلیسیا کے ہاتھ میں کم از کم ایک ایسی کتاب تو ہے جو عرصے تک مسیحیت کے نزدیک قابلِ اعتبار رہی ہے اور اب بھی مبصرین کی نظر میں مقامات کا صحیح پتہ اور روایات کی اصلیت بتانے میں قابلِ وثوق ہے۔ اس کتاب میں مقامِ بشارت کا پتہ چشمہ بتایا گیا ہے جو اب تک موجود ہے اور اسی پر قصبے کی عورتیں آج بھی اسی طرح پانی بھرنے آتی ہیں، جس طرح حضرت مریم تشریف لائی ہوں گی۔ بخلاف اس کے رومانی کلیسیا کا دعویٰ بے دلیل مان لیا جائے اور ایسے مقام کو جس کے ثبوت میں انجیل تو انجیل کوئی روایت تک (چاہے وہ تحریری ہو یا زبانی) پیش نہیں کی جاتی۔ اصلی مقام مان لیا جائے۔

---

۱ Church of Annunciation

۲ ارض سینا وفلسطین صفحہ ۳۳۷۔

۳ جیروسلم مصنفہ رینالڈس بال صفحہ ۱۴۸۔ مصنف

۴ نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۲۵۴ مصنف

۵ ارض سینا وفلسطین صفحہ ۳۱۸۔ مصنف

دوسرے ذرائع سے

۱۔ رومانی کلیسیا کے فرانسسکی گرجا میں جس خالی جگہ پر "انتقال" سے پہلے مکانِ مقدس کا موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے اس جگہ کی اور نیز مکانِ مقدس کی پیمائش سے یہ عقدہ کھلا کہ مکانِ مقدس نے اطالیہ جاکر ماشاء اللہ جسمانی ترقی اچھی کی ہے کہ اب اس کے جسم پر پرانی قبا ٹھیک نہیں آتی۔ خالی جگہ اس قدر تنگ اور ناہموار چٹانوں سے گھری ہے کہ اس عرض وطول کا مکان اس میں آنا دریا کا کوزے میں سمانا ہے۔ ڈین اسٹینلی نے ایک رومن کیتھولک پادری (ڈبلیو، ایچ، ہچنسن) ہی کی کتاب سے دونوں مقامات کا نقشہ ایک ہی اسکیل سے تیار کیا ہے جس سے میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ یہ امر قطعی خارج از امکان ہے کہ لوریٹو والا مکان ناصرہ کے فرانسسکی گرجا کے مظہر مقامِ بشارت کے اندر کسی وقت بنا کھڑا ہو۔[۱]

۲۔ چوتھی صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک جتنے مسیحی زائروں نے اپنے سفر ناصرہ کے حالات قلمبند کیے ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی صراحتاً تو بڑی بات ہے اشارتاً بھی کسی ایسے مکان کا تذکرہ نہیں کیا جس میں یوسف نجار یا مریم کبھی رہے ہوں اور وہ مکان اس وقت موجود ہو یا کسی زمانے میں روایتاً یا تحریراً اس کا موجود ہونا پایا گیا ہو۔[۲]

۳۔ اطالیہ بھر کے کسی دفتر میں کوئی تحریر ایسی موجود ہی نہیں جس میں مکانِ مقدس کے متعلق پندرھویں صدی سے قبل کسی قسم کا تذکرہ ہو۔[۳]

۴۔ مکانِ مقدس کے انتقالات سہ گانہ کی روایت اس آب ورنگ سے جیسی کہ آج کل ظاہر کی جاتی ہے سب سے پہلے پوپ لیو دہم نے ایک فرمان میں بیان کی تھی جو ۱۵۱۸ء

---

[۱] ارضِ سینا و فلسطین صفحہ ۴۳۹ و ۴۴۰۔ مصنف

[۲] ایضاً ایضاً صفحہ ۴۴۰۔ مصنف

[۳] ایضاً ایضاً صفحہ ۴۴۰۔ مصنف

Marfat.com

میں جاری ہوا تھا۔ اس سے قبل ایسی روایت کا کہیں وجود ہی نہیں ملتا۔

امید ہے کہ سطور بالا نے آپ کو مطمئن کر دیا ہوگا کہ بشارت کا واقعہ اس مکان میں پیش نہیں آیا جو آج کل لورے ٹو میں مقیم ہے اور نہ اس مقام پر جو ناصرہ میں فرانسسکی گرجا میں زائرین کو دکھایا جاتا ہے۔

یہ مکان کب اور کس غرض سے عالم وجود میں آیا؟ اس کا جواب سطور ذیل دیں گی۔

فکر و نظر کے چند لمحے

اس بحث کے سلسلے میں نظر کا مطالعہ اور دماغ سوز تحقیقات نے مجھے جن امور تک پہنچایا وہ یہ ہیں۔

۱ ۔ ناصرہ میں جس خاص جگہ سے مکانِ مقدس کا اٹھ جانا ظاہر کیا جاتا ہے اس جگہ کے آس پاس فرانسسکی گرجا کی عمارت بنی ہے جو رومانی کلیسا کے ماتحت ہے۔ اور رومانی کلیسا ہی کے پادری اس جگہ کی خدمت کرتے اور زیارت کراتے ہیں۔

۲ ۔ لورے ٹو میں جس کنیسے کے وسط میں مکان مقدس اب موجود ہے وہ بھی رومانی کلیسا ہی سے متعلق ہے اور مکان مقدس کے خدام اور مجاورین بھی رومانی کلیسا ہی کے ماتحت ہیں۔

۳ ۔ مکانِ مقدس صرف رومانی کلیسا ہی کے نزدیک واجب الاحترام ہے اور رومانی کلیسا ہی کے متبع وہاں زیارت و عبادت کو جانا ثواب و کفارۂ ذنوب سمجھتے ہیں۔

۴ ۔ رومانی کلیسا ہی کے سردار یعنی پوپ مکانِ مقدس کی تعمیر و تزئین میں حصہ لیتے اور وہاں کی زیارت و عبادت کے متعلق وقتاً فوقتاً فرامین و احکام صادر کرتے رہے ہیں۔

ان امور کو پیش نگاہ رکھنے کے بعد کیا اس مکان کا شائبہ بھی ذہن میں آسکتا ہے کہ رومانی کلیسا کی یہ نہایت ہی محترم عمارت، ناصرہ سے ہزارہا میل چل کر اطالیہ کی حدود میں خود روما سے صرف سوڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر آکر ٹھہرے اور رومانی کلیسا کے سردار اعظم (پوپ) اس کے وجود سے بے خبر یا بے توجہ ہوں؟ اگر نہیں۔ تو کیا یہ قیاس صحیح نہ ہوگا کہ مکانِ مقدس جس وقت سے

اطالیہ کے حدود میں داخل ہوا اسی وقت سے پاپایانِ روما نے اپنی توجہ اس پر مبذول کی ؛ اور اس کے بعد گیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ جس زمانے سے پاپایانِ روما کا مکانِ مقدس کی طرف توجہ کرنا ثابت ہوجائے ٹھیک وہی زمانہ اس کے سرزمین اطالیہ میں وجود میں آنے کا ہے ؛ اگر نتیجہ مستخرجہ غلط نہیں ہے تو اس کا پتہ لگانا میرے ذمے ہے کہ سب سے پہلے کس پوپ نے مکانِ مقدس کی طرف توجہ کی۔

ارض سینا و فلسطین[1] مصنفہ ڈین اسٹینلی[2] اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جیسے مستند و معتبر شاہدوں کا بیان ہے کہ پوپ سکسٹس[3] چہارم نے اپنی سعی و اہتمام سے لورے ٹو کی آبادی کے گرد نہایت مضبوط و مستحکم حصار تعمیر کرایا جو آج تک بجنسہ موجود[4] ہے۔ اور اسی پوپ نے مکانِ مقدس کے احترام و زیارت کے متعلق بل[5] (فرمان) جاری[6] کیا جو ویٹیکن[7] کی کتاب القوانین میں شامل ہے۔ اس پوپ کا عہدِ حکومت ۱۴۷۱ء سے ۱۴۸۴ء تک ہے۔ اس کے بعد جن پوپوں نے مکانِ مقدس کے بارے میں وقتاً فوقتاً اظہارِ عقیدت و دلچسپی کیا وہ ملخصاً درج ذیل ہے۔

۱ - انوسنٹ ہشتم Innocent VIII	۱۴۸۴ء تا ۱۴۹۲ء	نے ۱۴۹۱ء میں	مکانِ مقدس کی تعظیم و زیارت کے متعلق فرامین
۲ - الگزنڈر ششم Alexander VI.	۱۴۹۲ء تا ۱۵۰۳ء	نے ۱۵۰۰ء میں	جاری کیے جن میں ظاہر کیا کہ مکانِ مقدس کو فرشتے
۳ - جولی اس دوم Julius II	۱۵۰۳ء تا ۱۵۱۳ء	نے ۱۵۰۷ء میں	ناصرہ سے اٹھا کر لائے۔

[1] Sinai and Palestine

[2] Dean Stanley

[3] Sixtus IV

[4] ارض سینا و فلسطین صفحہ ۱۰۱۔

[5] Bull

[6] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۵ صفحہ ۴۔

[7] Vatican پوپ کے قصر کا نام ہے جو اٹلی کے دار الحکومت روما میں ہے۔ مصنف

۴-	لیو دہم Leo X	سنہ ۱۵۱۳ء تا سنہ ۱۵۲۱ء	نے مکانِ مقدس کے گرد کینسے کی عمارتیں بنوائیں جن میں اطالیہ اور فرانس کے معماروں اور صنعت کاروں نے لکھوکھا روپیہ کے صرف سے دست کاری کے اعلیٰ ترین نمونے دکھائے ہیں۔ اسی پوپ نے ایک بہت بڑا برنجی گھنٹہ جس کا وزن تین سو آٹھ من ہے نذر کیا۔ مکانِ مقدس کی بیرونی روکار پر منقش اور منبت سنگِ مرمر لگوانا شروع کیا تھا کہ خود ہی مر گیا
۵-	ہیڈریان ششم Hadrian VI.	سنہ ۱۵۲۲ء تا سنہ ۱۵۲۳ء	پوپ لیو نے بیرونی روکار پر جو سنگ مرمر لگوانا شروع کیا تھا ہیڈری آن اور کلیمینٹ
۶-	کلیمینٹ ہفتم Clement VII.	سنہ ۱۵۲۳ء تا سنہ ۱۵۳۴ء	کے زمانے میں ان کی مالی امداد سے اس کا کام جاری رہا اور پال نے اس کی تکمیل کرادی
۷-	پال سوم Paul III.	سنہ ۱۵۳۴ء تا سنہ ۱۵۵۰ء	
۸-	سکسٹس پنجم Sixtus V.	سنہ ۱۵۸۵ء تا سنہ ۱۵۹۰ء	اس نے گرجا کی خوشنما روکار بنوائی اور ایک فرمان کی رو سے لوریٹو کی آبادی کو شہری حقوق دیے۔ اس کا مجسمہ صدر دروازہ کی سیڑھیوں پر نصب ہے۔
۹-	پال پنجم Paul V.	سنہ ۱۶۰۵ء تا سنہ [illegible]۲۱ء	اس نے "ام دابن" کا قد آدم برنجی مجسمہ جو اطالیہ کے ایک کامل الفن استاد کا نمونۂ صنعت ہے خاص پھاٹک کے محراب کے اوپر نصب کرایا اور اندرونی عمارت میں تین منبت و منقش برنجی دروازے لگائے

Marfat.com

۱۰۔	انوسینٹ دوازدہم Innocent XII	۱۶۹۱ء تا ۱۷۰۰ء	اس نے ایک فرمان کی رو سے مکانِ مقدس کے تبدیل مقام کا یوم عرس ۱۰ دسمبر مقرر کرکے اس تاریخ کو اعیاد مذہبی کی تقویم میں داخل کیا

ملخصات بالا سے ظاہر ہوگا کہ پوپ سیکٹس چہارم سے لے کر پال سوم تک آٹھ پوپوں نے بلا استثناء یکے بعد دیگرے مکانِ مقدس کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا اور ان کے بعد والے پوپوں نے بھی سترھویں صدی کے آخری برسوں تک مراسم تعظیم توجہ و تعلق و احترام انجام دیے ہیں۔

میں یقین دلاتا ہوں کہ پوری تجسس و تلاش کے باوجود مجھے مکانِ مقدس کے متعلق سیکٹس چہارم سے پہلے کسی پوپ کی کسی قسم کی دلچسپی اور توجہ کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ میرے اس بیان کے ساتھ اگر آپ ڈین اسٹینلی کی فیصلہ کن عبارت کو پڑھیں کہ "اطالیہ بھر کے اندر کوئی تحریر ایسی موجود نہیں ہے جس میں مکانِ مقدس کے متعلق پندرھویں صدی سے قبل کسی قسم کا تذکرہ ہوا ہو[1]" تو گویا اس یقین میں شک و شبہ کی ذرہ بھر بھی آمیزش سمجھی جا سکتی ہے کہ مکانِ مقدس پوپ سیکٹس چہارم کے زمانے بلکہ اسی کے دماغ کی پیداوار ہے۔

اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ مکانِ مقدس کی "ایجاد" کا اصلی باعث کیا تھا۔ اگر آپ پندرھویں صدی عیسوی کے یورپ پر سطحی اور سرسری نظر بھی ڈالیں تو مقامی جنگ و جدال اور نسلی و قومی عروج و زوال سے قطع نظر دو باتیں خصوصیت کے ساتھ سامنے آ جائیں گی۔

پاپائی سطوت کا احیاء

پاپائی اقتدار کا چاند جو حروب صلیبیہ میں مسیحیت کی ناکامی کے بعد گہن میں آ گیا تھا اس نے پندرھویں صدی کے عشرہ رابعہ میں آ کر اپنا نور پھر بتدریج حاصل کرنا شروع کیا چنانچہ ۱۴۳۹ء میں جو کونسل بمقام فلارنس (Florence) منعقد ہوئی اس نے یہ اصول قانون طے کیا کہ "مسند پاپائی اور اسقف رومائی (پوپ) کے حیطۂ اقتدار میں کل ربع مسکون

---

[1] ارض سینا و فلسطین صفحہ ۴۴۰۔ مصنف

داخل ہے اور رومانی اسقف خود اپنی ذات خاص سے قدوۃ الحواریین خلیفۃ المسیح پطرس ولی د ہے (St. Peter) کا حقیقی جانشین اور اس اعتبار سے سارے کلیسا کا سردار مقدس پطرس کے توسط سے ہمارے خداوند علیٰ مسیح نے کلیسا کے بقا و قیام اور نظم و اہتمام کے متعلق تمام حقوق و اختیارات تفویض و مرحمت فرما دیے ہیں[1]۔" اس اصول قانون سے مسلح ہو کر پوپوں نے اپنا گم کردہ وقار۔ پوپ کی نظر میں پھر حاصل کرنا شروع کیا۔ چنانچہ پوپ یوجینیس چہارم (Euginius IV) جو ۱۴۴۷ء میں فوت ہوا۔ مرتے وقت دنیائے مسیحیت کی عقیدت و اطاعت تقریباً پھر حاصل کر چکا تھا[2]۔" ان پوپوں نے حصول عقیدت و اطاعت کے لیے خواص و عوام سب ہی کی افتاد طبع اور رجحان مزاج کا خیال پیش نظر رکھا۔ یعنی جہاں ملکی سیاسی معاملات میں بادشاہوں زعمات و مرغوبات کا احترام کیا۔ مسائل علمی و عقلی کی تحقیق و تدقیق میں علماء کے راستے میں آسانیاں پیدا کر کے انھیں اپنا گرویدہ کیا۔ وہاں عوام کالانعام کے ضعف اعتقاد اور شیفتگی مذہب سے بھی پورا فائدہ اٹھایا۔ جس سکسٹس چہارم کا تذکرہ اوپر کئی جگہ آچکا ہے اور آئندہ بھی آنے والا ہے اسی کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ پہلا پوپ تھا جس نے جادوگری کے جرم کے متعلق محکمۂ احتساب قائم کیا[3]۔"

۲۔ عثمانی سلطنت کا استحکام۔ غازی عثمان بن ارطغرل نے تیرھویں صدی عیسوی کے آخری دنوں میں انگورا کے قریب جو "شجر حکومت[4]" نصب کیا تھا وہ اللہ کے فضل و کرم سے دیکھتے ہی دیکھتے ایسا طویل و تناور ہو گیا کہ اس کا سایہ ۷۵۲ھ[5] ہی میں ایشیائی حدود سے گزر کر گیلی پولی کی یورپی سرزمین پر پڑا۔ اور آل عثمان کے چوتھے تاجدار سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء مطابق ۷۹۲ھ تا ۸۰۶ھ) کی سلطنت کی سرحد ایشیا میں دریائے فرات سے لے کر دریائے ڈینیوب

۱؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۹۔ صفحہ ۵۰۳

۲؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۹۔ صفحہ ۵۰۳

۳؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۹۔ صفحہ ۵۰۳

۴؎ غازی عثمان کے خواب کی طرف اشارہ ہے جس میں اس نے دیکھا تھا کہ اس کے جسم سے ایک درخت پیدا ہوا جو دنیا کے تین حصوں پر چھا گیا اور دنیا کے چار بڑے پہاڑ اور چار دریا اس کے سایے میں آگئے۔ مصنف

۵؎ شارٹ ہسٹری آف دی نیر ایسٹ مصنفہ ڈاکٹر ڈیوس ۱۹۱۔ مصنف

Marfat.com

(Danube) تک پہنچ گئی۔[1] یہاں تک کہ سلطان محمد خاں ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴۵۱ء مطابق ۸۵۶ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی ۲۰ مئی ۱۴۵۳ء مطابق ۲۰ جمادی الاول ۸۵۷ھ کو مشرقی رومانی سلطنت (East Roman Empire) کے پایۂ تخت یونانی کلیسا (Greek Church) کے دار الارشاد اور براعظم یورپ کے عروس البلاد یعنی قسطنطین اول (Constantine I) کے معورۃ الکبریٰ اور رومتہ الحدیث (New Roma) قسطنطنیہ کو قسطنطین یازدہم (Constantine XI) کے مرعوب و مرتعش ہاتھ سے لے کر یورپ اور مسیحیت کی سب سے زیادہ طویل المدت شہنشاہی کو ہمیشہ کے لیے آغوش فنا میں سلا دیا۔

اس "فتح مبین" سے حروب صلیبیہ کے ہزیمت خوردہ یورپ کی نہ صرف آئندہ امیدوں کا قلعہ ہبا منثورا سے ہو گیا بلکہ اسے اپنی موجودہ زندگی ہی کے لالے پڑ گئے۔ فتح قسطنطنیہ سے مسیحی دنیا کو ویسا ہی خطرہ لاحق ہو گیا جیسا آٹھویں و نویں صدی عیسوی میں عربوں کی فتوحات سے ہوا تھا جنھوں نے قریباً تمام ہسپانیہ اور پرتگال کو مغلوب کرکے فرانس پر فوج کشی کی تھی۔[2]"

سلطان محمد خاں فاتح نے اس خطرے کو حق بجانب ثابت کرنے میں اور بہت مدد دی۔ اس نے قسطنطنیہ کی مہم سر کرنے کے بعد ہی جزیرہ نما بلقان کی طرف توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصے میں یونان یعنی موریا (Morea) مع اضلاع ملحقہ سالونیکا (Salonica) رومیلیا (Roumelia) بلگیریا (Bulgaria) ایپایرس (Epirus) البانیہ (Albania) بوسنیا (Bosnia) اور ہرزے گووینا (Herzegovina) حدود مملکت میں شامل کر لیے۔ سرویا (Servia) والیشیا (Wallachia) اور مالڈیویا (Maldavia) جو پہلے برائے نام فتح ہو چکے تھے پورے طور پر زیر اقتدار آ گئے اور اب عثمانی ہلال ریاست ہائے بلقان پر پوری تابانی سے چمکنے لگا۔

یہاں پہنچ کر میری خاطر سے ذرا اٹلس کے اس نقشے پر نظر ڈالیے جس میں جزیرہ نما بلقان کی مغربی حدود اور ملک اطالیہ کا نقشہ ہو۔ آپ ملاحظہ کریں گے کہ البانیہ اور اطالیہ کے درمیان

---

[1] تاریخ عثمانیہ صفحہ ۱۵۔ مصنف

[2] " " ۴۹ "

بحیرۂ ایڈریاٹک کا تنگ ترین حصہ ہی حایل ہے جس کا عرض شکل سے ۳۰-۴۵ میل ہوگا۔ یورپ اچھی طرح جان گیا تھا کہ جو شخص خشکی میں ناؤ چلانے کا حیرت انگیز کارنامہ[۱] اوراقِ تاریخ پر ثبت کر چکا ہو وہ پانی کی اس تنگنائے کو کب خاطر میں لانے والا تھا لہٰذا سب سے زیادہ جو ملک محمد فاتح کے نام سے لرزہ براندام تھا وہ اطالیہ تھا۔ الٰہی خیر کہ اب آگ پاس آن لگی۔

اطالیہ کو اختلاجِ قلب تو اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب کل یورپ کی متفقہ فوجی قوت[۲] ۱۳۹۶ء میں شاہ ہنگاریہ (Hungary) کی مدد کے لیے دریائے ڈینیوب کے قریب بہ مقام نکوپولیس (Nicopolis) جمع ہوئی تھی اور سلطان بایزید یلدرم نے اُسے شکست فاش دے کر کئی سو بڑے بڑے امیروں کو قید کر لیا تھا اور جب یہ امیر بارگاہ سلطانی میں حاضر کیے گئے تو بایزید نے ان سے کہا تھا "آپ میرے علاقے میں کیوں گھس آئے میں تو خود ہی تھوڑے عرصے میں ہنگاریہ کے دارالحکومت کا محاصرہ کروں گا اور جرمنی و اطالیہ کو فتح کر کے سینٹ پیٹر کے گرجے کی قربان گاہ پر اپنے گھوڑے کو دانہ کھلاؤں گا"[۳]

چنانچہ دوسری مہموں سے پیچھا چھڑا کر سلطان محمد فاتح ۱۴۸۰ء میں فتح اطالیہ کے متعلق اپنے دادا کا قول پورا کرنے کو اُٹھا اور اس کے عزم بالجزم نے جرنل احمد پاشا کی شکل میں ادھر کا رخ کیا۔ سمندر کی موجیں اس کے ارادے میں کیا خاک سدِ راہ ہوتیں۔ چنانچہ احمد پادشاہ نے بحیرۂ ایڈریاٹک

[۱] اس واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ محمد فاتح نے یہ دیکھ کر کہ جب تک شاخ زرین (گولڈن ہارن) کی بندرگاہ سے حملہ نہ ہو فتح قسطنطنیہ مشکل لیکن ساتھ ہی اس کے دہانۂ بندرگاہ پر آہنی زنجیروں اور محافظ بیڑے کے باعث وہاں پہنچنا ناممکن ہے ایک راستہ خاکنائے پر باسفورس سے بندرگاہ تک غلاطہ اور پیرا میں چربی لگے ہوئے چوبی تختے بچھوا کر ان پر راتوں رات اسی جہازوں کا بیڑہ کھلے بادبانوں کے ساتھ آٹھ نو میل تک ہزاروں آدمیوں سے کھنچوا کر بندرگاہ میں ڈلوا دیا تھا۔ دیکھو ڈاکٹر ڈیوس صفحہ ۲۰۹ و بیازنٹائین ایمپائر صفحہ ۲۴۷ و تاریخ عثمانیہ صفحہ ۸۰۔ مصنف

[۲] ڈاکٹر ڈیوس صفحہ ۱۹۷

[۳] ڈاکٹر ڈیوس صفحہ ۲۰۰ و تاریخ عثمانیہ صفحہ ۱۶۔ مصنف

Marfat.com

کے بلقانی ساحل سے اطالیہ کے ساحل تک تیس پینتیس میل کے آبی میدان کو روند کر صوبہ نیپلس کے مشہور شہر اور تجارتی بندرگاہ اوٹرانٹو[1] (Otranto) کے پھاٹک پر جا کر دم لیا۔ اور آن کی آن میں اسے مغلوب و مفتوح کر کے مورچہ بند کر دیا تاکہ باقی حصص ملک کی فتح کے لیے صدر مقام کا کام دے[2]

اوٹرانٹو کا فتح ہونا تھا کہ سارے ملک میں بٹّس پڑ گئی کہ آخر "بے دینوں" کے "ناپاک" قدم پاپائے مسیحیت کے ملک میں آ ہی گئے۔ اب یقیناً مقدس پطرس کے گرجے کی قربان گاہ ان کے گھوڑوں کا اصطبل بن کر رہے گی۔ اس فتح سے اطالیہ میں" ایسا تہلکہ برپا ہو گیا کہ پوپ سکسٹس چہارم تک اپنا بوریا بستر باندھ کر ملک سے بھاگ جانے کے لیے تیار ہو بیٹھا[3]۔ بہ اسباب بظاہر وہ دن دور نہ تھا جب کہ اطالوی رومتہ القدیم اپنے بزنطینی (Byzantine) رفیق رومتہ الحدیث کی قسمت میں شرکت کرے اور آب باسفورس کی طرح آب ٹائبر (Tibre) کا سینہ بھی مساجد کے میناروں کے عکس سے منور ہو۔ مگر ۳ مئی ۱۴۸۱ء کو سلطان محمد فاتح کی بے وقت وفات نے مسیحیت کے دل سے اسلامی تلوار کا خطرہ زائل نہیں تو کم ضرور کر دیا۔ اور " باشندگانِ روما نے اس موت کی خوشی میں تین دن متواتر جشن منایا[4]۔

فتح اطالیہ کے متعلق جو خیال سلطان محمد فاتح مرحوم کے دل میں ہر وقت رہتا تھا وہ اس سادہ مگر موثر جملے میں ملفوظ بلکہ متحجر ہو کر آج بھی اس کی لوح مزار پر ٹھیک قلب کے اوپر ابھرے حروف میں نظر آتا ہے۔

"میرا ارادہ مغرور اطالیہ کو مغلوب کرنے کا تھا"

اس ساری داستان کے سن لینے کے بعد اب آپ کا ذہن مکان مقدس کی " ایجاد " کی غرض و غایت کی طرف منتقل ہو گیا یا ابھی مزید صراحت کی ضرورت باقی ہے؟ اگر ہے تو

---

[1] ڈاکٹر ڈیوس صفحہ ۲۱۶۔ مصنف

[2] تاریخ عثمانیہ صفحہ ۵۵۔ مصنف

[3] تاریخ عثمانیہ صفحہ ۵۳۔ مصنف

[4] 〃 〃 ۵۲۔ مصنف

Marfat.com

اور سن لیجیے۔

سرفروشی اور جاں بازی کے لیے سب سے بڑا زبردست محرک مذہب ہی ہو سکتا ہے اس کا تجربہ حروب صلیبیہ کے زمانے میں آبائے مسیحیت کو خوب اچھی طرح ہو چکا تھا۔ سکسٹس چہارم ایک نہایت ہی چالاک مدبر اور با اثر پوپ تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ اب اطالیہ کی سرزمین کو "بے دینوں" کی تیغ بے پناہ سے معرض ہیں اور اطالیہ کے حفظ و دفاع سے ممکن ہے کہ محض جذبۂ حب وطن عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس شراب کو دو آتشہ کیا جائے اور حب وطن کے ساتھ جوش مذہب کی بھی مقدار کثیر میں آمیزش کر دی جائے۔ مگر مذہب مصوری و سنگ تراشی کا نام نہیں جس کا منبع و مخزن اطالیہ ہے۔ بس جب تک اس ملک کو مذہب کا سرچشمہ نہ بنایا جائے اور اہل ملک کے جذبات کو مذہب کے کسی قوی محرک مادّی کے ذریعے ہیجان میں نہ لیا جائے کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ مسیحی دنیا میں چونکہ معجزات اور ملائکہ کی خدمات ہمیشہ کشود کار کا ذریعہ رہ چکی لہٰذا اس سے بہتر اور کیا تدبیر ہو سکتی تھی کہ اطالیہ کو ارض مقدس کا ٹکڑا بنا دیا جائے اور وہاں کا نہایت ہی محترم مقام فرشتوں کے کاندھوں پر سوار کرا کے اور ٹرانسٹو ہی کے صوبے نیپلس کی حدود میں لایا جائے تاکہ اس کی محافظت کے جوش میں اطالیہ کی مسیحیت۔ جاں فروشی اور سربازی کے جوہر دکھائے اور چونکہ پوپ کے الفاظ انجیل کی آیات کے مرادف مانے جاتے تھے لہٰذا ضرور ہوا کہ پاپائی فرمان کے ذریعے اس معجزے کی تصدیق کر دی جائے تاکہ مکانِ مقدس کی عظمت و کرامت ہر کہ و مہ کے ذہن نشین ہو جائے۔ بظن غالب اس میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ مسلمان چاہے حضرت عیسیٰ کے مدفن کو کسی عظمت و احترام کا مستحق اس لیے نہ سمجھیں کہ ان کے مذہب کی رو سے حضرت عیسیٰ کا مصلوب ہونا ہی صحیح نہیں بلکہ ملائکہ کی وساطت سے حضرت مریم کو ولادت مسیح کی بشارت دیے جانے کا واقعہ خود قرآن شریف میں موجود ہے لہٰذا مسلمان کسی ایسے مکان کے انہدام و توہین کا اقدام کبھی نہ کریں گے جسے مسیحیت مہبط ملائکہ اور مولد مسیح مان رہی ہو۔

یہ تھی مکانِ مقدس کی غایت ایجاد جس کے لیے پوپ سکسٹس چہارم کا "مقدس" دماغ مستحق داد ہے مگر جس کے متعلق یورپ کا منصف مزاج اور فلسفہ دان مسیحی مورخ و مصنف نہایت ہی ... سے ... فہ ... سی قدر کہتا ہے کہ "لوریٹو کا مکانِ مقدس محاربات صلیب کی

آخری آہ کی تشکیل و تجسیم ہے۔[1] یعنی یہ ایک یادگار رہے جسے یورپ کے مجبور و مظلوم مذہب پرست مسیحیوں نے (جنھیں ظالم مسلمانوں نے اسلامی ممالک فتح نہ کرنے دیے) مقامات متبرکہ کی محبت تازہ رکھنے کے لیے اپنے ملک میں قائم کیا تھا۔

مسیحی زائرین پر مسلمانوں کے ظلم و ستم کے افسانوں کی تکذیب تکبیت تو انشاءاللہ کسی دوسرے وقت حروب صلیبیہ کی داستان کے بیان کے سلسلے میں کی جائے گی۔ سر دست یہ سنیے کہ جب اطالیہ کی "تقدیس" کی لے زیادہ بڑھی اور پوپ کی طماعی اور پوپ کی صناعی اسے دوسرا فلسطین بنانے میں مصروف ہوگئی تو سوچا گیا کہ جو کام اس سے پہلے مذہب کے معجزوں اور فرشتوں کے کندھوں سے لیا گیا تھا وہ اب سیاست کی چالوں اور مدبّروں کے دماغوں سے کیوں نہ لیا جائے چنانچہ ——

۱۔ پوپ سکٹس پنجم (۱۵۸۵ء تا ۱۵۹۰ء) نے اپنے عہد حکومت میں باب عالی سے درخواست کی کہ خداوند مسیح کا مرقد مقدس (Holy Sepulchre) پیروان مسیح کی نظر میں نہایت ہی محترم شئے ہے لہٰذا جس معاوضے اور جن شرائط پر مناسب سمجھا جائے وہ عمارت رومانی کلیسا کو عطا فرمائی جائے تاکہ اسے انجینیروں کی مدد سے جسماً بعملہ خشتی و چوبی و سنگی پاپائی دارالحکومت روما کو منتقل کر دیا جائے[2]۔ اس درخواست کا جو جواب دیا گیا ہوگا وہ الفاظ کے اعتبار سے نہیں تو معنی کے لحاظ سے غالباً ویسا ہی ہوگا جیسا سومناتھ کے بت کو معاوضہ لے کر چھوڑ دینے کی درخواست کے متعلق ہندوستان کی تاریخیں محمود غزنوی کی زبان سے ادا کرتی ہیں۔

۲۔ جب اصلی مرقد مقدس کو اٹھا کر اطالیہ لے جانے میں کامیابی نہ ہوئی تو اطالیہ کے شہر بولونا (Bologna) کے کنیسۂ سینٹ اسٹیفن (Chuch of St Stephen) کے اندر کنیسۂ مرقد مقدس کی ہو بہو اور طابق النعل بالنعل کی گئی وہی نقشہ۔ وہی ارتفاع۔ وہی رنگ۔ خدام و مجاورین کی بھی وہی شکل و صورت۔ وہی منبع۔ ایام کنیسہ کے اندر بھی اصلی کنیسہ کی طرح نہ صرف

[1] ارض سینا و فلسطین صفحہ ۲۴۲ ۔ مصنف

[2] ارض سینا۔ فلسطین صفحہ ۲۴۳ مصنف

Marfat.com

واقعہ صلیبیہ کی تصویر بنی ہے بلکہ عدالت میں حضرت مسیح کی پیشی صلیب کے حکم دیے جانے اور صلیب پر چڑھا کر اذیت دینے اور برچھی مارنے کے واقعات کے مرقعے دیواروں پر بنے ہیں جن کی وجہ سے اس گرجے کو لفظاً و معناً اطالیہ کا یروشلم مانا جاتا ہے۔

۳۔ شہر یروشلم کے جنوب مغرب کی جانب وادیٔ ہنوم (Valley of Hinnom) ہے جو مقدّس آبادی کے الحاق اور مقدّس خطۂ یہودیہ میں شمول کے باعث مقدس و متبرک سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی مقدّس مٹی فرشتوں کے سر پر نہیں بلکہ بڑے بڑے بادبانوں والے ۵۳ جہازوں کی پیٹھ پر لاد کر لائی اور پی سا (Pisa) کے ایک وسیع میدان میں بچھائی گئی تاکہ جو مرے یہاں دفن ہوں وہ وادیٔ قدس ہی میں محوِ استراحت سمجھے جائیں اور ان کے گناہوں کی پرسش و جو نہ ہو۔ اس میدان کا نام کیمپو سانٹو (Campo Santo) ہے۔

۴۔ ایک شخص برنارڈینو کائیمو (Bernadino Caimo) نے ارضِ مقدّس کی زیارت سے واپس آکر اطالیہ کے اندر ہی ارضِ مقدسہ بنانی چاہی تاکہ مسافت بعیدہ پر "بے دینوں" کے ممالک میں جانے اور صرفِ کثیر اور زحمت شاقہ اٹھانے سے اپنے ہم وطنوں کو بچائے۔ اس غرض سے اس نے ریاست پیڈمانٹ (Piedmont) کے اندر ایک مقام ورالو کو ارضِ مقدس سے اشبہ فرض کر کے دوسرا فلسطین قرار دیا اور وہاں تین پہاڑیاں منتخب کر کے ایک کا نام کوہچہ طبور (Mount Tabor) دوسری کا کوہچہ کالی وری (Mount Calvary) اور تیسری کا کوہچہ زیتون (Mount Olivet) رکھا۔ ان کے نواح میں دو نہریں کاٹ کر اور پہاڑ سے پانی لا کر دو چشمے بنائے جن میں سے ایک کا نام قدرون (Kedron) اور دوسرے کا اردن (Jordon) رکھا۔ مسیحیوں کے اعتقاد کے مطابق حضرت مسیح کو کوہچہ کالوری پر جسے گل گوتھا (Golgotha) بھی کہتے ہیں۔ صلیب دی گئی تھی۔ لہذا نام نہاد کوہچہ کالوری واقع ورالو کو بھی اطالیہ بھر میں مقدس ترین مقام قرار دے کر اس پر بہ صرفِ کثیر ایک عالی شان گرجا تعمیر کیا۔ اب اس گرجے کی پرستش و زیارت کے لیے لاکھوں آدمی ہر سال آتے ہیں اور اپنے نفس کو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ یہ خطہ حقیقتاً ارضِ مقدس ہی کا ٹکڑا ہے اور یہاں کی زیارت و عبادت کا ثواب بالکل اتنا ہی ہے جتنا خود ارضِ مقدس کا۔

یہ ایک نہیں۔ دو نہیں۔ چار حقیقتیں۔ کیا اس کا قطعی ثبوت نہیں پیش کرتیں کہ یورپ کی مذہبی ذہنیت کی سطح ایک زمانے میں اس درجہ پست اور اس کے دل میں صداقت کی مقدار اس قدر کم رہ چکی ہے کہ اگر موقع و مقام مقتضی ہوا تو اس نے اپنے مذہب و اساطیر مذہب میں دجل و خدع تک سے کام لے کر سواد اعظم کے معتقدات و خیالات کو مرعوب و مسحور کرنے میں پس و پیش نہیں کیا ہے۔

جب یہ بات ہے تو کیا اس میں کسی شک و ریب کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ لورے ٹو کی پہاڑی والا مکان مقدس اہل یورپ کے خدع مذہبی کی بلند ترین مثال ہے۔ وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔

اس تصویر کے ملاحظے کے بعد کیا ہمارے وہ بھائی جنھوں نے ہند کے ایک حصّے کو عراق کا ٹکڑا بنا لیا ہے اپنی شکل بھی ذرا آئینے میں دیکھ لیں گے کہ کہیں کچھ مشابہت تو نہیں پائی جاتی؟

ان فی ذلک لذکریٰ لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔ سورہ ق۔

شمع بے نور

حدیبیۃ السادات۔ مدینۃ الاولیا

اگست ١٩١٧ء

الناظر۔ لکھنؤ

مارچ ١٩٢٨ء

حدیثِ دیگراں

(۲۳)

مسلمانوں نے فنِ تاریخ نویسی کو جس رتبے پر پہنچایا اسے دنیا آج بھی مانتی ہے۔ اس باب میں انھوں نے یونانی اور رومی مواخذات سے ہٹ کر اپنا راستہ خود متعین کیا۔ واقعات کی صحت، بیان کی صداقت، شواہد کی جانچ پڑتال، زمانے کا تعین، ان سب کے لیے انھوں نے معیار مقرر کیے۔ انھوں نے تاریخ کو بلاشبہ سائنس کے درجے پر پہنچا دیا۔

قدیم تاریخ پر سیّد محفوظ علی کی نظر غائر تھی۔ بلاذری کی فتوح البلدان، طبری کی کتاب الرسل والملوک، تاریخ فرشتہ، قدیم سیاحوں کے سفرنامے، یہ سب نہ صرف ان کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھے بلکہ وہ ان سب کا غائر مطالعہ بھی کر چکے تھے۔ مسلمانوں کے عہدِ زرّیں میں علما نے جو دوسرے میدان مارے وہ بھی سیّد صاحب کی نگاہ سے پوشیدہ نہ تھے۔ فلسفیوں میں ابونصر فارابی، ریاضی اور فلکیات میں الخوارزمی، جغرافیہ میں المسعودی وغیرہ وغیرہ، نہ صرف ان کے مطالعے سے گزر چکے تھے بلکہ ان کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑ گئے تھے۔

تاریخ ہند پر ان کی گرفت کا ایک نمونہ "مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب" میں نظر سے گزر چکا ہے ایک اور نادر اور حسین نمونہ "نظامتِ باب ہند" میں نظر آتا ہے۔ واقعات کا تجزیہ، کرداروں کی عکاسی، اور اس پر حسنِ اسلوب و نگارش، یہ سب داستان اور داستان گو دونوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

ـــــــــــــــ مولف

Marfat.com

ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور اور ہر ماخذ پر سید مرحوم کو پورا عبور تھا۔ مولانا محمد علی بھی تاریخ کے بڑے جید طالب علم تھے اور اس بابت میں سید صاحب کی علمی معلومات اور مورخانہ تعبیروں پر بڑا بھروسہ کرتے تھے۔

گنجہائے گرانمایہ ——— رشید احمد صدیقی

مغربی مورخین نے ہندوستان کی جو تاریخیں لکھی ہیں ان کی غلط بیانیاں اظہر من الشمس ہیں۔ لہذا بعض حلقوں میں جو سعی نئی تحقیقات کی روشنی میں دوبارہ یہ داستان لکھنے کی ہو رہی ہے نہایت مبارک ہے۔ مضمون ذیل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو معلوم نہیں کب اور کس کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

علی گڑھ میگزین ——— آل احمد سرور

اکتوبر ۱۹۳۳ء

رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ فرمایا ہے "سید کی انشا پردازی کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان کو عورتوں کی صحیح و شستہ زبان لکھنے کا بڑا ملکہ تھا اور وہ اسی زبان میں بڑے پتے کی باتیں بڑے لطف سے بیان کر جاتے تھے۔" عورتوں کے روزمرہ اور محاورے کا نمونہ سید محفوظ علی اپنے مضمون "شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں" میں پیش کر چکے ہیں۔ اس کے نمونے "بلبلان اسیر کی رہائی" میں بھی موجود ہیں، بلکہ یہ مضمون تو بھانت بھانت کی بولیوں کا رنگین مرقع ہے۔ اس مکالماتی مضمون میں جدید تعلیم یافتہ طبقے سے لے کر قدیم مدیکیوں کی انشا تک سبھی کچھ موجود ہے۔

دراصل عورتوں کی با محاورہ بول چال کو سید محفوظ علی نے اس

حسن و دلکشی کے ساتھ قلمبند کیا جو اردو ادب میں حقیقتاً علامہ راشد الخیری کا طرۂ امتیاز تھا، گو اس خاص صنف میں علامہ کا دائرہ تحریر نہایت وسیع تھا اور ان کے مخصوص موضوع کے باعث ہونا بھی چاہیئے تھا۔ دونوں ادیبوں میں رسم و راہ اس وقت پیدا ہوئے جب علامہ دلی کے کوچۂ چیلاں میں سکونت پذیر تھے اور سید صاحب بھی وہیں "ہمدرد" کے سلسلے میں مولانا محمد علی کے ساتھ مقیم تھے۔

عورتوں کی گفتگو کا ایک بڑا حسین نمونہ سید صاحب کے مضمون "نظامت باب ہند" میں ملتا ہے "موتلد جب کٹک میں پہنچا تو جیب میں پھوٹی کوڑی اور جھولی میں بھونی بھانگ نہ تھی۔ خدا جانے موتلد اور اس کے لڑکوں نے مزدوری کر کے کتنے دنوں کو رات اور اُس کی عورت نے پسائی کر کے کتنی راتوں کو دن کیا ہوگا کہ اسی عسرت و ناداری میں اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ نیستی و برخورداری! ماں باپ روئے کہ ننگے بھوکے پہلے ہی کیا کم تھے جو یہ اور آئی مگر تقدیر نے ہنس کر کہا "لڑکی نہ سمجھیو، بنگالے کے خزانے کی کنجی ہے" پڑوس میں ایک بھلے مانس رہتے تھے جن کا حاکم صوبہ کی سرکار سے تعلق تھا۔ اُن کی بیوی نے موتلد کی عورت سے کہلوا بھیجا۔ "بہن! برا نہ مانیو۔ اگر دودھ پلائی کی نوکری کرنی چاہو تو ایسی جگہ پہنچا دوں کہ سونے کے چبوترے پر بیٹھی راج کرو" عورت نے جواب میں کہلا دیا۔ "اندھا کیا مانگے۔ دو آنکھیں۔ اگر ٹکڑے کے سہارے لگا دو تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گی اور اٹھتے بیٹھتے دعائیں دوں گی۔

تاریخی مضامین میں رایت و روایت کو سب سے زیادہ دخل ہوتا ہے، لیکن سید محفوظ علی ان مضامین میں بھی اسلوب کے حسن و قبح کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی داستان کو برمحل محاورات و مکالمات کی چاشنی کے ساتھ قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مضامین سنجیدہ ہوں یا مزاحیہ، وہ ہر جگہ اسلوب کا زیادہ سے زیادہ

Marfat.com

سہارا لیتے ہیں۔ جس طرح بساطی اپنے مال کو پہلے موزوں ڈبوں میں بند کرتا ہے اور پھر اس پر دلکش کاغذ چڑھاتا ہے تاکہ گاہک اسے پسند کرے، اسی طرح سید صاحب بھی بازارِ ادب کے بساطی کی طرح خیالات کو دلکش الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں اور الفاظ کو حسین اسلوب کا۔ ان کا مضمون "نظامتِ باب ہند" جو ان کا آخری مکمل مضمون معلوم ہوتا ہے۔ دلچسپ تاریخی واقعات اور ان کے دل نشین بیان کے امتزاج کا بڑا متوازن نمونہ ہے۔

تاریخی واقعات اور سنوں کا بے شمار خزانہ سید صاحب کے دماغ میں محفوظ تھا۔ جب وہ سومالی لینڈ سے واپس آکر بمبئی میں مولانا ظفر علی خاں کے ہمراہ تجارت کے اتار چڑھاؤ سے سراسیما تھے۔ مولانا کا "دکن ریویو" بمبئی میں بے سرو سامانی سے دوچار تھا۔ مولانا نے اردو رسائل کا ایک انبار سید محفوظ علی کے سامنے لگا دیا اور کہا کہ ان پر تبصرہ کر ڈالو۔ انھیں رسائل میں سے ایک پر نظر پڑی تو اس میں ایک مضمون نگار نے اپنے تاریخی مقالے میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ اسلامی حکومتوں کا چھٹا فرمانروا بالعموم بادشاہت سے دستبردار رہا یا معزول و قتل کیا گیا۔ سید صاحب کو اس وقت نہ تو تاریخ کی کوئی کتاب دستیاب تھی اور نہ کوئی قاموس۔ تبصرہ کرتے ہوئے اس دعوے کو قلم برداشتہ مثالیں دے کر باطل ثابت کر دیا۔

تاریخ کے ذوق کے ساتھ ہی سید صاحب کو آثار قدیمہ سے بڑی دلچسپی تھی اور ان پر وہ بڑی غائر نظر ڈالتے تھے۔ بدایوں میں اس کے ایک قدیم مسلمان گورنر اخلاص خاں کا روضہ جو قدیم فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا، بے اعتنائی اور تباہی کا شکار تھا۔ سید صاحب کی کوشش سے یہ روضہ محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ ملا عبد القادر بدایونی کی قبر کی تعمیر میں انھوں نے بڑی دلچسپی لی۔ جامع مسجد شمسی کی مرمت میں انھوں نے مولانا یونس علی صاحب کے ساتھ بڑا عملی تعاون کیا۔

______ مولف

Marfat.com

نظامت بابِ ہند[۱]

(۱)

آخر عہدِ شاہ جہانی تھا کہ ایک تاجر ایرانی "سفیعائے اصفہانی" تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا اور گھومتے پھرتے دکن پہنچا۔ یہاں اس نے سودا بیچتے بیچتے ایک 'لعل' مول لیا جو کسی غریب بیوہ کا 'لال' تھا۔ تاریخیں اس کے باپ کا یا اس کا اصلی نام بتانے سے قاصر ہیں، مگر سب متفق ہیں کہ "دراصل برہمن پسرے بود[۲]۔"

تاجر نے تھا تو اسے خریدا مگر خود ہی اس کے ہاتھ بک گیا۔ محمد ہادی نام رکھا۔ محبت سے پالا پوسا اور توجہ سے لکھایا پڑھایا۔ جب تک ہندوستان رہا کلیجے سے لگائے رکھا۔ ولایت گیا تو ساتھ لیتا گیا۔ گھر جاکر اپنے مذہب کا مقلّد اور اپنے مال کا مالک بنایا۔

جب تاجر فوت ہوگیا تو غیر ملک میں کسی کو اپنا نہ پاکر محمد ہادی ہندوستان آیا اور دکن جاکر "بہ قلیلے نوکرِ حاجی عبداللہ خراسانی دیوانِ صوبۂ برار شد[۳]" کوئی اور ہوتا تو بسر اوقات کی اس معمولی صورت ہی کو غنیمت جان کر قناعت کرتا، مگر ہادی خاں دل میں ترقی کی امنگ اور دماغ

---

[۱] بنگالے کو ہندوستان کا دروازہ کہنا کوئی چیستان گوئی نہیں۔ اس میں ایک خداداد لطف اور بھی ہے جس طرح انگریزوں نے امپریل برٹش ایسٹ افریقہ (Imperial British East Africa) کے شروع کے حروف جمع کر کے ایبیا (IBEA) یا ایسٹرن بنگال اینڈ آسام (Eastern Bengal and Assam) کے ابتدائی حروف کے مجموعے کو ایباسام (Ebassam) کرلیا، اسی طرح بہار، اڑیسہ، بنگالہ کے ابتدائی حروف کو جمع کرنے سے باب بن گیا۔

[۲] مآثر الامرا جلد ۳ ص ۵۷، مسند آف مرشد آباد ص ۲۱ ہسٹری آف مرشد آباد مصنفہ میجر والش

[۳] مآثر الامرا جلد ۳ ص ۵۱

میں قابلیت کا جوہر رکھتا تھا۔ ایک سیاق وسباق داں اور انشا پرداز تاجر کی آغوشِ محبت میں تعلیم و تربیت اور ایران جیسے مردم خیز خطے میں نشو ونما پا چکا تھا۔ ایسی حالت میں بھلا اس کی امیدوں کا لشکرِ عظیم اس تنگ گلی میں سے کیسے نکل سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے بہت جلد اپنی قابلیت کے لیئے ایک وسیع میدان نکال ہی لیا' یعنی حاجی کی ذاتی نوکری چھوڑ' زمرہ بندگان شاہنشاہی میں منسلک ہوگیا۔

زمانہ تھا حضرت اورنگ زیب اعلیٰ اللہ مقامہ' کی قدرداں فرماں روائی کا جس میں ترقی کا ذریعہ شاہ اسمٰعیل صفوی کا پوتا پڑوتا' یا نورجہاں کا بھانجا بھتیجا ہونا نہیں بلکہ "مردِ حاضر کو کارطلب[1]" ہونا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملازمت کے زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی' محض اپنی کارگزاری کے زور سے کھٹ کھٹ بامِ رفعت پر چڑھنے لگا۔ یعنی دکن ہی میں کچھ دن معمولی اہل کاری کے بعد "در ایّام محاصرہ و محاربۂ دکن خدمات شائستہ بہ تقدیم رسانیدہ منظورِ نظر عالم گیر شد[2]" جب قلمرو قطب شاہی داخل ممالکِ محروسۂ خلافت پناہی ہوگئی' تو حیدرآباد و برار کی دیوانی سب سے پہلے محمد ہادی ہی کو ملی۔ اب اعلیٰ عہدوں کے لیے راستہ صاف تھا۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ صوبۂ اڑیسہ کی دیوانی مل گئی جہاں "در اکثر محالاتِ متعلقۂ اڑیسہ کفایتِ نمایاں بہ ظہور آوردہ در زمرۂ اہل خدمات نام آور شد[3]" یہاں سے اس نے بارگاہ شاہنشاہی میں گزارش پیش کی کہ صوبۂ بنگالہ کا انتظام چونکہ بندگان عالی متعالی کے پسندِ خاطر نہیں ہے لہٰذا اگر جاں نثار کو وہاں کی خدمت گزاری عطا ہو تو انشاء اللہ بہت جلد سارے صوبے کا قرار واقعی انتظام کرکے آبادی میں ترقی اور آمدنی میں توفیر خاطر خواہ دکھا سکے گا۔

قدرداں بادشاہ کی جوہر شناس آنکھ نے اس درخواست کو' جس کی سفارش درخواست گزار کی کارکردگی تھی' توجہ سے پڑھا اور حسب ضیاء اللہ خاں (اپسر عنایت اللہ خاں مدوّنِ احکام عالم گیری و کلمات طیبات) بنگالے کی دیوانی سے اکبرآباد کی دیوانی پر تبدیل ہوا تو محمد ہادی بنگالے کا دیوان مقرر ہوا اور منصبِ مناسب اور خطاب کارطلب خاں سے ممتاز ہوکر جہانگیر نگر

---

[1] کارطلب = بہادر

[2][3] ریاض السلاطین ص۲۴۴

ڈھاکہ پہنچا۔

اس زمانے میں ناظم و دیوان دو جداگانہ عہدے تھے۔ ناظم کا کام تھا کہ ملک کو بیرونی یورشوں اور اندرونی شورشوں سے بچائے رکھے اور امن کے قیام اور قانون کے احترام کا انتظام کرتا رہے۔ اسے سوائے جاگیرِ مشروط اور منصبِ ذات والنعامات کے، خزانۂ شاہی کے تصرف کا اختیار نہ تھا۔ دیوان کا کام تھا کہ ملک کے محاصل و مداخل میں توفیر اور مصارف و مخارج میں تخفیف کی تدبیریں کرے۔ جمع و خرچ کا باضابطہ حساب رکھے اور بعد وضع اخراجات باقی رقم کو خزانۂ عامرہ میں بھیجتا رہے۔ "ناظم و دیوان مدار اجرائے کاروبارِ صوبہ بر دستور العمل کہ سال بہ سال از پیشگاہِ خلافت اصدار می یافت۔ می داشتند و سرموئے تفاوت و تجاوز بہ عمل نمی آوردند۔"[۱] دیوان اگرچہ بارگاہ شاہی سے براہِ راست حکم احکام لیتا اور عرض معروض کرتا تھا تاہم وہ ناظم کا از جہ باعتبار عہدہ صوبہ دار تھا، گو نہ ماتحت سمجھا جاتا تھا۔

جب کارطلب خاں (محمد ہادی) بنگالہ کا دیوان مقرر ہوا تو وہاں کا ناظم (صوبہ دار) بادشاہ کا پوتا شہزادۂ عظیم الشان (ابن بہادر شاہ) تھا۔ اس کا صدر مقام بھی ڈھاکہ ہی تھا۔ ابتدا میں تو مرشد زادگی اور مرید بیشگی خوب شیر و شکر رہی لیکن جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ شہزادگی کا غرور اور کارگزاری کا زعم دو تلواریں ہیں جو ایک میان میں نہیں رہ سکتیں۔ شاہزادے نے مشتعل ہو کر چاہا کہ "بطورے کہ بظاہر موجب بدنامی نہ شود او را (کارطلب خاں را) ازیں عالم بگزرانند"[۲] کارطلب خاں نے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا اور بادشاہ کو ساری کیفیت لکھ بھیجی۔ بارگاہِ شاہی سے پوتے ہی کو سرزنش ہوئی اور فرمان عتاب آمیز پہنچا کہ "کارطلب خاں نوکر بادشاہی ست اگر سرموئے ضرر جانی یا مالی بہ او خواہد رسید انتقام آں از آں بابا گرفتہ خواہد شد"[۳] نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے ڈھاکہ چھوڑا عظیم الشان نے پٹنہ کو عظیم آباد بنایا اور کارطلب خاں نے مخصوص آباد بسایا۔

یہاں آکر اس نے صوبے کے محاصل و مخارج کا انتظام کیا اور آخر سال پر کاغذاتِ حساب

[۱] ریاض السلاطین ص ۲۴۵

[۲] ریاض السلاطین ص ۲۴۷

[۳] ریاض ص ۲۴۵ - ۲۴۹

Marfat.com

لے کر عازم اردوئے معلّٰی ہوا۔ یہاں قاعدہ تھا کہ صوبے کے مالی کاغذات پر جب تک اس صوبے کے قانون گوئے متعینۂ بارگاہ کے دستخط نہ ہوں، وہ دیوانِ کُل میں پیش ہی نہیں ہو سکتے تھے[1]۔ کار طلب خاں نے کاغذاتِ حساب لالہ درپ نراین قانون گوئے صوبۂ بنگالہ کو بغرض دستخط پیش کیے۔ "آں عاقبت وخیم بہ طمع خام ناعاقبت اندیشی نمودہ در دستخط ایستادگی بہ کار بردہ خواہانِ سہ لک روپیہ گردید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اما جے نراین قانون گوئے کہ شریک و سہیم درپ نراین بود ماٰل اندیشی نمودہ دستخط خود ثبت کرد[2]۔"

جب یہ کاغذات مع تحائف و پیش کش ہائے بنگالہ بارگاہ شاہنشاہی میں پیش ہوئے تو قدرداں اور قابلیت شناس بادشاہ اس کی امانت و دیانت اور کار آگاہی و خیر خواہی سے بے انتہا خوش ہوا۔ کار طلب خاں نے مرشد قلی خاں کا خطاب پایا اور دیوانی صوبۂ بنگالہ کے علاوہ نظامت صوبۂ بنگالہ پر نیابۃً منجانب شاہزادہ عظیم الشان فائز ہو کر "بہ عطائے خلعت فاخرہ و علم و نقارہ و اضافۂ منصب ذخیرۂ مباہات اندوخت[3]۔"

مخصوص آباد نے چونکہ ابتدا ہی میں کار طلب خاں کا دامن پکڑا تھا لہٰذا نواب مرشد قلی خاں نے واپس آ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دار الضرب اور قلعہ اور دفاتر اور محلات کی عمارتوں اور بازاروں اور باغوں کی تکمیل کر کے اس کا نام مرشد آباد رکھا اور جس طرح خود ایک معمولی نوکر سے بہار و اڑیسہ اور بنگالہ کا ناظم بنا تھا اسی طرح اسے ایک معمولی قصبے سے بڑھا کر بہار، اڑیسہ اور بنگالہ کا دار الحکومت بنا دیا۔

دوسرے سال ایک کروڑ تین لاکھ روپیہ مع "حلقہ ہائے افیال و اسپان ٹانگن و جاموشانِ ارنہ و آہو خانہ و طیورِ شکاری و ملبوسِ خاص جہانگیر نگر و پیہ ہائے کرگدن و سنیتل پاٹیِ زر باف کرمار رابران یارائے مرد زنبود و مسہری گنگا جمنی سلہٹ با دیگر لفافتی چوب عاج و نافہ ہائے مشک و سرنگ و دیگر تحائفِ فرنگ و ہدایائے کلمہ پوشان نصاریٰ وغیرہ ارسال حضور ساخت

---

[1] ریاض ص ۲۵۱۔۲۵۰

[2] ریاض ص ۲۵۱

[3] ریاض ص ۲۵۱

Marfat.com

وچوں مجرائے حسنِ سلیقہ او منظورِ حضورِ مقدس گردید مورد تفضلاتِ بادشاہی شدہ کارش بالا گرفت[۱]

اس طرح دکن کا ایک یتیم برہمن زادہ جسے ایک ایرانی تاجر نے خرید کر پالا اور محمد ہادی بنایا تھا اب خطاب موتمن الملک علاء الدولہ مرشد قلی جعفر خاں نصیری ناصر جنگ سے مخاطب و ممتاز اور منصب ہفت ہزاری ذات و عطائے ماہی مراتب سے سرفراز ہو کر سلطنتِ مغلیہ کے امرائے عظام کی صفِ اول میں شامل ہوا۔

قدرت نے مرشد قلی جعفری خاں کو اقبال سے جس قدر زیادہ حصّہ دیا اولاد میں اسی قدر کمی کردی۔ اُن کے صرف ایک لڑکی زیب النساء بیگم تھی جس کی شادی نور الدین برہان پوری کے بیٹے شجاع الدین عرف مرزا دکھنی سے ہوئی۔ عالم گیر نے مرشد قلی جعفر خاں کی خاطر سے شجاع الدین کو اڑیسہ کا صوبہ دار مقرر کر کے سسرال ہی میں رکھا اور شجاع الدولہ اسد جنگ خطاب دیا۔

مرشد قلی جعفر خاں نے ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) سے ۱۱۳۹ھ (۱۷۲۵ء) تک ہندوستان کے مشرقی دروازے پر بیٹھ کر تین بہترین صوبوں بہار، اڑیسہ، بنگال پر برائے نام نظامت لیکن حقیقت میں سلطنت کی۔ بڑے چھوٹے سات بادشاہوں کو دہلی کے تخت پر بیٹھے دیکھا۔ تاریخ وفات "زدار الخلافت جدا را وفتاد"[۲] ہے۔ ان کی جگہ ان کے داماد موتمن الملک شجاع الدولہ شجاع الدین خاں بہادر اسد جنگ بہار۔ اڑیسہ و بنگالہ کے ناظم و صوبہ دار ہوئے۔

(۲)

دلّی میں دو بہنیں تھیں[۳]۔ ایک نے سرکاری توپ خانے کے ایک نوکر سے

۱؎ ریاض ص ۲۵۶ و ۲۵۷

۲؎ ریاض ص ۲۸۷ دار الخلافت کے اعداد ۱۳۴۷ء میں سے جدار کے عدد ۲۰۸ نکالنے سے ۱۱۳۹ رہتے ہیں۔

۳؎ یہ تمام حالات عماد السعادت سے لیے گئے ہیں۔ مآثر الامرا میں صرف اتنا ہے کہ "علی وردی خاں کہ از پیش آوردہائے پدر سرفراز خاں بود"۔ ج ۳ ص ۷۵۴۔ ریاض السلاطین میں اس سے زیادہ ہے "حاجی احمد مرزا بندی پسران مرزا محمد بکاول اعظم شاہ خلف اورنگ زیب عالم گیر بودند۔ مرزا بندی بمنصب و خطاب علی وردی خاں (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

شادی کی جس کا نام محمد تھا۔ دوسری نے فرخ سیر کی بیٹی کو گود کھلایا جو آگے چل کر محمد شاہ کی بیگم ملکۂ زمانی ہوئیں[1]۔ سرکاری توپ خانے کا نوکر نہ خالص ہندی تھا نہ اصل ولایتی بلکہ مولّد یعنی عرب باپ اور ہندی ماں سے تھا۔ مولّد کے اس عورت سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ بڑے کو احمد اور چھوٹے کو بندی کہتے تھے۔

مولّد نے دلّی میں ایک خون کیا اور قتل و قصاص کے خوف سے جورو بچوں کو لے، جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔ آوارہ گردی نے اسے کہاں پہنچایا؟ سرزمین اڑیسہ میں۔ اول تو سپاہی کی اوقات کیا۔ اس پر اپنا لمبا چوڑا سفر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مرشد قلی جعفر خاں کے داماد شجاع الدولہ اسد جنگ کے دارالریاست کٹک میں پہنچا تو جیب میں پھوٹی کوڑی اور جھولی میں بھونی بھانگ نہ تھی۔ خدا جانے مولّد اور اس کے لڑکوں نے مزدوری کر کے کتنے دنوں کو رات اور اس کی عورت نے پسائی کر کے کتنی راتوں کو دن کیا ہوگا کہ اسی عُسرت و ناداری میں اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ نیستی و برخورداری! ماں باپ روئے کہ ننگے بھوکے پہلے ہی کیا کم تھے جو یہ اور آئی، مگر تقدیر نے ہنس کر کہا "لڑکی نہ سمجھو۔ بنگالے کے خزانے کی کنجی ہے۔"

پڑوس میں ایک بھلے مانس رہتے تھے جن کا حاکم صوبہ کی سرکار سے تعلق تھا۔ ان کی بیوی نے مولّد کی عورت سے کہلوا بھیجا "بہن! برا نہ مانیو۔ اگر دودھ پلائی کی نوکری کرنی چاہو تو ایسی جگہ پہنچا دوں کہ سونے کے چھپر تلے پڑی بیٹھی راج کرو۔"

عورت نے جواب میں کہلوا دیا "اندھا کیا مانگے۔ دو آنکھیں۔ اگر ٹکڑے سے سہارے

(پچھلے صفحے کا بقیہ) فوجداری چکلہ اکبر نگر سرفراز شاہ ص ۲۹۳ ۲۹۲۔ مولوی ذکاء اللہ بھی اپنی اردو تاریخ میں عماد السعادت کی روایت ہی کو دبی زبان سے کہتے ہیں۔ "مرزا محمد ۔۔۔۔۔۔ کی بی بی شجاع الدولہ کی رشتہ مند تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی اتاتقی جلد ۹ ص ۲۶۲۔ مصنف ہسٹری آف بنگال کہتا ہے۔ "مرزا محمد بہت غریب آدمی تھا اور اڑیسہ میں آوارہ گردوں کی طرح قسمت آزمائی کرنے آیا تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے حاجی احمد اور علی وردی۔"

[1] ملکہ زمانی دختر فرخ سیر و زوجۂ محمد شاہ" مآثر الامرا جلد ۲ ص ۸۵

لگا دو تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گی اور اٹھتے بیٹھتے دعائیں دوں گی۔" وہ نیک بی بی میانہ منگا، ہمسائی کو ساتھ بٹھا، کہاں پہنچی؟ اڑیسہ کے صوبے دار بہادر کے مشکوئے معلیٰ میں، جہاں مرشد قلی جعفر خاں کے نواسے اور شجاع الدولہ اسد جنگ کے لختِ جگر کو، جو آگے چل کر علاء الدولہ نواب سرفراز خاں بہادر حیدر جنگ ہوئے، مولّد کی عورت کی گود میں دیا گیا۔ ایسی بڑی سرکار میں پہنچتے ہی مولّد کے دن پھر گئے۔ خود مولّد بھی پہلے درِ دولت پر اور پھر دربار میں آنے جانے لگا۔ احمد اور بندی نے لکھ پڑھ کر خاصی استعداد پیدا کر لی۔ بندی شروع ہی سے تیز، ذہین اور سلیم الطبع تھا مگر خود مولّد، جیسا کہ ایسے لوگوں کو ہونا چاہیئے، درشت خو اور سخت مزاج تھا۔ آگ پانی کا ساتھ کیسا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بندی جو اب مرزا بندی کہلاتا تھا بنگالے سے پھر دلّی پہنچا اور اپنی خالہ یعنی ملکہ زمانی بیگم کی کھلائی کی دست گیری سے اپنے باپ کی جگہ مقرر ہو کر معمولی گزر بسر کرنے لگا۔

کچھ عرصے بعد بنگالے میں یہ واقعات پیش آئے کہ ماں مرگئی۔ باپ (یعنی مولّد) نے دوسری عورت سے شادی کر لی جس کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو آگے چل کر شاہ خانم زوجہ میر جعفر ہوئی۔ بڑا بھائی حج و زیارت کو چلا گیا۔ بڈھا نواب مرشد قلی جعفر خاں جو اپنی حکومت کے بیس سال پورے کر چکا تھا، آفتابِ لبِ بام تھا اور اس کا جانشین بظاہر حالات اُس کا داماد شجاع الدولہ یا اس کا نواسا علاء الدولہ سرفراز خاں ہونے والا تھا ان دونوں پر مولّد اور اس کے خاندان کے حقوق رضاعت تھے لہٰذا بظاہر تو باپ سے ملنے لیکن حقیقتاً دربار میں قدم جمانے کے لیے مرزا بندی جو دلّی میں مرزا محمد علی ہو گیا تھا کٹک واپس آیا اور باپ کی وساطت سے دربار میں پہنچا۔

مرزا محمد علی اگرچہ دربار میں پھٹے حالوں آیا لیکن آدمی تھا کارگزار، مزاج شناس اور آداب داں۔ لہٰذا شجاع الدولہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے جوہر کی قدر کی اور دربار میں معزز مقام پر جگہ دی۔ اس عرصے میں احمد بھی حاجی احمد ہو کر آ گیا اور دربار میں پہنچ کر باپ اور بھائی کے ساتھ کارگزاری اور کام برآری میں مصروف ہو گیا۔ مرزا محمد علی زیادہ ہوشیار تھا۔ لہٰذا شجاع الدولہ نے پہلے اسے راج محل کی فوجداری اور پھر صوبۂ کٹک کی نیابت دی اور خطاب علی وردی خاں اور منصبِ مناسب کے لیے بادشاہ کے حضور میں سفارش کی جو منظور ہوئی۔

چونکہ نواب مرشد قلی جعفر خاں اپنے آپ کو پابہ رکاب سمجھ کر اس کوشش میں تھا کہ اپنی جگہ اپنے نواسے علاء الدولہ سرفراز خاں کو مقرر کرائے۔ شجاع الدولہ نے اس کی سن گن پا کر علی وردی خاں اور حاجی احمد سے مشورہ کیا۔ انھوں نے نہایت گہری چال سمجھائی۔ یعنی شجاع الدولہ نے یہ دکھانے کو کہ وہ بنگالے کی گدی کے لیے خفیف سی کوشش بھی نہ کرے گا اپنی ساری فوج ظاہر میں تو برطرف کر دی مگر خفیہ یہ حکم دیا کہ متفرق طور پر دار الامارۃ مرشد آباد کے آس پاس پہنچ جائے۔ اور حکم کی منتظر رہے۔ ادھر اپنے وکیلوں کو بادشاہ کی خدمت میں صوبہ داری و نظامت کی درخواست کے ساتھ بھیج کر خود ایک مختصر جماعت کے ساتھ جن میں علی وردی خاں اور حاجی احمد پیش پیش تھے، کٹک سے نکل کھڑا ہوا۔ راستے ہی میں تھا کہ پہلے مرشد قلی جعفر خاں کی موت کی خبر اور اس کے بعد نظامتِ صوبہ داری کی سند مل گئی۔ چنانچہ رات دن یلغار کر کے مرشد آباد پہنچا اور مسند حکومت پر بیٹھ گیا۔

ضروری تھا کہ شجاع الدولہ کی نوابی میں جس خاندان کے اقبال کا ستارہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ چمکے وہ موئدکا ہو، اور یہی ہوا۔ شجاع الدولہ کے گدی پر پہنچتے ہی علی وردی خاں اور حاجی احمد اپنے بیٹوں اور دامادوں کے ساتھ ساری صوبہ داری پر چھا گئے۔ تیرہ برس کے عرصے میں انھوں نے چپے چپے پر اپنے رشتے داروں، بہی خواہوں اور لگے بندھوں کو لگا دیا۔ اب محکمۂ فوج میں اُن کے آدمی، محکمۂ نظامت میں ان کے آدمی، اعلیٰ عہدہ داران کے آدمی، ماتحت اہلِ کاران کے آدمی، پیش دست اور خدمت گار اُن کے آدمی، چپراسی اور چوکیدار اُن کے آدمی، یہ حالت شجاع الدولہ کے پورے عہد بھر رہی۔

"شجاع الدولہ چوں عیش دوست و عشرت طلب بود مدار کار نظامت بر رائے حاجی احمد و رائے رایان عالم چند و جگت سیٹھ فتح چند گزاشتہ تن بہ آسائش در داد"[1]

جب عظیم آباد کی صوبہ داری بھی شجاع الدولہ ہی سے متعلق ہو گئی تو اقانیم ثلاثہ (حاجی احمد، عالم چند، فتح چند) نے شجاع الدولہ کی طرف سے علی وردی خاں کے لیے بارگاہ شاہی میں نیابت صوبۂ عظیم آباد مع اضافہ منصب پنج ہزاری، خطاب مہابت جنگ بہادر و پالکی جھالردار و علم و نقارہ کی سفارش کی

---

[1] ریاض السلاطین ص ۳۱۱

Marfat.com

جو منظور ہوئی۔ چنانچہ نواب مہابت جنگ بہادر پنج ہزاری (سابق محمد علی وردی خاں۔ سابق مرزا محمد علی سابق مرزا بندی۔ سابق مخص بندی یہ مولد) اسماً نائب صوبہ وعملاً ہو۔ دار بن کر عظیم آباد تشریف لے گئے:

شجاع الدولہ بہار۔ اڑیسہ و بنگالہ کی نظامت و صوبہ داری کی مسند پر تیرہ سال سوئے اور جب تہرمان ایران شاہجہاں کے لال قلعے میں نیند کے ماتے محمد شاہ پیا کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۹ء) میں قبر میں آرام کرنے چلے گئے۔ خالی مسند پر اُن کا بیٹا علاء الدولہ سرفراز خاں آبیٹھا۔

"چوں سرفراز خاں ہم سوائے نائے و نوش سروکار بہ ہیچ چیز نہ داشت"[1]

مہابت جنگ جو اس مسند کی تاک میں بیٹھا تھا عظیم آباد کی سرحد پر پہنچ گیا۔ اس نے وہیں سے دربار شاہی میں درخواست بھیجی کہ اب تک صوبۂ بنگال و اڑیسہ و بہار سے دو کروڑ روپے سالانہ آتا ہے اگر خانہ زاد کو سند نظامت و صوبہ داری عطا ہوا اور رشقۂ بادشاہی کے ذریعے سرفراز خاں سے لڑنے کی اجازت ملے تو خانہ زاد تین کروڑ پچاس لاکھ روپے نقد اور اس کے ساتھ تحف و ہدایائے لائق پیشکش درگاہ آسماں جاہ ہر سال روانہ کرتا رہے گا۔ دربار میں ان روز دں موتمن الدولہ اسحاق خاں شستری کا دور دورہ تھا جو ادھر مہابت جنگ کا رفیق اور ہم مذہب تھا اور اُدھر محمد شاہ رنگیلے کا ندیم اور ہم مشرب۔ چنانچہ اِدھر درخواست پہنچی اور اُدھر سند اور رشقہ آیا۔ مہابت جنگ نے فوراً مرشد آباد پر چڑھائی کی، جس میں سرفراز خاں نے جان کھوئی اور مہابت جنگ نے بہار۔ اڑیسہ۔ بنگالے کی صوبہ داری پائی۔ یہ واقعہ صفر ۱۱۵۳ھ (اپریل ۱۷۴۰ء) کا ہے۔

ایک مفلوک الحال عورت ایک امیر زادے کو دودھ پلانے پر نوکر رکھی جاتی ہے۔ اس خدمت کی بدولت اس کا سارا خاندان فقیر سے امیر ہو جاتا ہے۔ مگر زیادہ زمانہ نہیں گزرتا کہ خود اسی دودھ پلانے والی عورت کا بیٹا اسی دودھ پینے والے امیر زادے کو ذبح کر کے اس کے ملک و مال اور جاہ و جلال کا مالک بالاستقلال بن جاتا ہے۔ احسان فراموشی ہی نہیں بلکہ احسان فراموشی اور محسن کشی کے مرکب اس بدترین مثال پر انسانیت جس قدر ماتم کرے کم ہے۔

---

[1] عماد السعادت ص ۳۲

Marfat.com

مہابت جنگ مظفر و منصور مرشد آباد میں پہنچ کر شجاع الدولہ کے بنائے ہوئے چہل ستون میں مسند آرا ہوا۔ سرفراز خاں اور شجاع الدولہ بلکہ خود مرشد قلی جعفر خاں کے زمانے کے خزانے جن کی مقدار کروڑوں تک پہنچتی تھی ہاتھ آئے۔ اسی عرصے میں دربار شاہی سے خلعت نظامت و خطاب شجاع الملک حسام الدولہ مع منصب ہفت ہزاری و ماہی مراتب پہنچ گیا۔ حاجی احمد کے تینوں بیٹے جن میں سے دو مہابت جنگ کے داماد بھی تھے ہفت ہزاری بنائے گئے۔ چھوٹی لڑکی آمنہ بیگم جو احترام الدولہ زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ دلپسر حاجی احمد کو بیاہی تھی اس کے بطن سے ایک لڑکا تھا مرزا محمد۔ یہ بچہ نانا (مہابت جنگ) کو بہت پیارا تھا۔ اس نے بھی دربار شاہی سے خطاب و منصب ہفت ہزاری حاصل کیا تھا۔ جانتے ہو یہ بچہ کون تھا؟ یہی تھا جس نے ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ میں سراج الدولہ کے نام سے قابلِ رشک شہرت پائی ہے۔

مہابت جنگ کے زمرۂ ملازمین میں ایک صاحب جعفر خاں تھے جنھیں چاہو میر جعفر علی خاں کہو چاہے میر جعفر۔ ان کا حال تاریخ کے سفینے میں اور ان کے خط و خال جاوید نامہ[1] کے آئینے میں دیکھو۔ اوپر اشارہ ہو چکا ہے کہ مہابت جنگ نے اپنی سوتیلی بہن، جس کا نام شاہ خانم تھا، ان کے حبالۂ نکاح میں دی تھی۔ اس سے ایک لڑکا صادق علی خاں عرف میرن پیدا ہوا اور ایک لڑکی جس کی شادی قاسم علی خاں (میر قاسم) سے ہوئی۔

مہابت جنگ نے سولہ سال نوابی کی اور ۹ رجب ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۷۵۶ء کو اسی برس کی عمر میں وفات پائی۔ "ہنرش نیز بگو" اس نے ہندوستان کے مشرقی حصے کی جو خدمت کی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر وہ گدی پر نہ ہوتا تو سارا ہندوستان نہیں تو بنگال تو یقیناً مرہٹوں کی ہو جاتا۔ کہا کرتا تھا کہ "دیکھ لینا ہمارے بعد ہندوستان کے کنارے ٹوپی والوں کے قبضے میں چلے جائیں گے[2]"۔ اس کے مرتے ہی جو کچھ ہوا وہ دنیا نے دیکھ لیا۔

اب آگے مارٹن صاحب بہادر، لتھ برج صاحب بہادر، کین صاحب بہادر، ہنٹر صاحب بہادر، وہیلر صاحب بہادر، ٹامسن صاحب بہادر، اسمتھ صاحب بہادر اور خدا جانے کن کن

---

[1] جعفر از بنگال و صادق از دکن

[2] سیر المتاخرین ص ۶۰۸ جلد دوم

صاحب بہادروں کی بنائی ہوئی تاریخ کی پختہ سڑک ہے جس پر چلنے سے معلوم ہوگا کہ مہابت جنگ کی جگہ ان کے نواسے سراج الدولہ گدی پر بیٹھے اور گر پڑے۔ اُن کی جگہ میر جعفر بیٹھے اور اٹھے ان کی جگہ میر قاسم بیٹھے اور اٹھے۔ ان کی جگہ پھر میر جعفر بیٹھے اور گرے۔ اور یہ سب کچھ نو برس میں ہوا۔ خدا جانے یہ حالت کب تک رہتی کہ اتنے میں عالی شان آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو رحم آگیا اور محض اس خیال سے کہ اس جلد جلد اور بار بار کی اٹھا بیٹھی بلکہ اتار چڑھاؤ کے تکان و اضمحلال سے خدانخواستہ کہیں قلب کی حرکت بند نہ ہو جائے یا کم از کم صحت پر مُضر اثر نہ پڑے اُس نے آئندہ نسل کو آہستہ آہستہ اور بہ لطائف الحیل انتظام حکومت کی تکلیف ہی سے بچا لیا اور پھر دوامی اور مستقل آرام کے لیئے مسند سے اٹھا کر مسہری پر لے جا کر سُلا دیا۔

اِنّ فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار

سالنامہ ——— شمع بے نور

علی گڈھ میگزین

اکتوبر ۱۹۳۳ء

ضمیمہ "نظامت باب ہند"

برہمن

(۱) موتمن الملک علاء الدولہ نواب مرشد قلی جعفر خاں بہادر
اسد جنگ نصیری، ناظم وصوبہ دار بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ
۱۷۰۴ء تا ۱۷۲۵ء

زیب النساء بیگم ــــــ زوجہ ــــــ (۲) موتمن الملک شجاع الدولہ نواب شجاع الدین خاں بہادر
اسد جنگ، ناظم وصوبہ دار بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ
۱۷۲۵ء تا مارچ ۱۷۳۹ء

نورالدین برہان پوری (والد: شجاع الدین خاں)

(۳) موتمن الملک علاء الدولہ نواب سرفراز خاں بہادر
حیدر جنگ، ناظم وصوبہ دار بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ
مارچ ۱۷۳۹ء تا ۲۹ اپریل ۱۷۴۰ء

Marfat.com

حاجی محمد

(۴) شجاع الملک حسام الدولہ نواب علی وردی خاں بہادر
مہابت جنگ، ناظم و صوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ
۲۹ اپریل ۱۷۴۰ء تا ۹ اپریل ۱۷۵۶ء (دیکھو میجر والش)

حاجی احمد

شاہ خانم —— زوجہ —— (۶) شجاع الملک حسام الدولہ نواب سید جعفر علی خاں بہادر
مہابت جنگ، ناظم و صوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ
بار اوّل ۲۹ جون ۱۷۵۷ء تا ستمبر ۱۷۶۰ء
بار ثانی جولائی ۱۷۶۳ء تا وفات ۱۷ جنوری ۱۷۶۵ء
عمر ۷۴ سال

آمنہ بیگم دختر خورد —— زوجۂ —— زین الدین احمد خاں بہادر ہیبت خاں

(۵) سراج الدولہ
ناظم و صوبہ دار بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ
۱۰ اپریل ۱۷۵۶ء تا ۲۳ جون ۱۷۵۷ء

فاطمہ بیگم ـــــ زوجہ ـــــ
ازبطن شاہ خانم

(۷) نصیر الملک امتیاز الدولہ عالی جاہ نواب سید محمد قاسم علی خاں بہادر نصرت جنگ، ناظم وصوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ
ستمبر ۱۷۶۰ء تا جولائی ۱۷۶۳ء

(۸) شجاع الملک نجم الدولہ نواب سید نجم الدین علی خاں بہادر مہابت جنگ میر پھلوری عمر ۱۵ سال، ناظم و صوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ
۱۷ جنوری ۱۷۶۵ء تا مئی ۱۷۶۶ء

(۹) سیف الملک سیف الدولہ نواب سید نجابت علی خاں بہادر شہامت جنگ عمر ۱۶ سال، ناظم وصوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ
۳ مئی ۱۷۶۶ء تا ۱۰ مارچ ۱۷۷۰ء

(۱۰) مؤتمن الملک مبارک الدولہ نواب سید مبارک علی خاں بہادر فیروز جنگ عمر ۱۱ سال ناظم وصوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ۔
۲۵ مارچ ۱۷۷۰ء تا ۶ ستمبر ۱۷۹۳ء
(۱۲ لڑکے اور ۱۳ لڑکیاں چھوڑیں)

Marfat.com

(۱۰) موتمن الملک مبارک الدولہ نواب سید مبارک علی خاں بہادر فیروزجنگ عمر ۱۱ سال ناظم وصوبہ دار بنگال۔بہار۔اڑیسہ۔

۲۵ر مارچ ۱۷۷۰ء تا ۶ر ستمبر ۱۷۹۳ء عمر وقت وفات ۳۴ سال
(۱۲ لڑکے اور ۳ لڑکیاں چھوڑیں)

(۱۱) ناصر الملک عز الدولہ نواب سید ببر علی خاں بہادر دلیر جنگ ناظم وصوبہ دار بنگال، بہار اڑیسہ
۶ر ستمبر ۱۷۹۳ء تا ۲۸ر اپریل ۱۸۱۰ء

(۱۲) شجاع الملک مبارک الدولہ عالی جاہ سید زین الدین علی خاں بہادر فیروزجنگ ناظم و صوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ
۲۸ر اپریل ۱۸۱۰ء تا ۶ر اگست ۱۸۲۱ء

(۱۳) برہان الملک احتشام الدولہ والاجاہ نواب سید احمد علی خاں بہادر مہابت جنگ ناظم وصوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ۔
۶ر اگست ۱۸۲۱ء تا ۳۰ر اکتوبر ۱۸۲۴ء

(۱۴) شجاع الملک احتشام الدولہ ہمایوں جاہ نواب سید مبارک علی خاں بہادر فیروزجنگ عمر ۴ سال ناظم وصوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ ۳۰ر اکتوبر ۱۸۲۴ء تا ۳ر اکتوبر ۱۸۳۸ء

(۱۵) منتظم الملک محسن الدولہ فریدوں جاہ نواب سید منصور علی خاں بہادر نصرت جنگ ۸ سال آخری ناظم وصوبہ دار بنگال، بہار، اڑیسہ
۳ر اکتوبر ۱۸۳۸ء تا یکم نومبر ۱۸۸۰ء وفات در ۱۸۸۴ء بعمر ۵۹ سال
(۱۹ لڑکے اور ۲۱ لڑکیاں چھوڑیں)

Marfat.com

احتشام الملک رئیس الدولہ امیر الامرا نواب عالی قدر
ہز ہائینس سر سید حسن علی مرزا خاں بہادر مہابت جنگ
جی سی آئی ای نواب مرشد آباد یکم نومبر ۱۸۸۰ء تا ۱۹۰۵ء

احتشام الملک رئیس الدولہ امیر الامرا نواب آصف قدر
ہز ہائینس سر سید واصف علی مرزا خاں بہادر مہابت جنگ
کے سی ایس آئی نواب مرشد آباد ۱۹۰۵ء بہ عمر ۴۰ سال

Marfat.com

حدیث دیگراں

۲۴

بعض تاریخی موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھ رہے تھے جو آخر تک نامکمل مسودوں کی صورت میں رہے اور اب نہ معلوم ان پر کیا گزری۔

مضامینِ محفوظ علی ——— عبدالحق

سید صاحب ہمیشہ اور ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے اور تقریباً ہمیشہ ہر موضوع کو نا تمام چھوڑتے۔ یہ کسی معتقد کا کمال ہی ہوتا کہ وہ سید صاحب سے مکمل مضمون حاصل کر لیتا۔ نا تمام مضامین کا ایک مینا بازار اُن کے صندوق میں مقفل ہے۔ دیکھیے کب اور کس کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ وہ ان کو مرتب اور مدون کرتا ہے۔

گنج ہائے گرانمایہ ——— رشید احمد صدیقی

ایک قدیم وضع کے لکڑی کے بکس میں بہت سے کاغذ کے پرچے اور کاپیاں موجود ہیں جن پر کچھ ادھورے مضامین اور نامکمل یادداشتیں نظر آتی ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر بالغ نظری اور تحقیق کا ثبوت دیتی ہے، مگر ہر چیز نامکمل ہی نہیں غیر مربوط بھی ہے۔ مثلاً ایک مضمون خوارزمیوں کی نسبت ہے تو دوسرا امرائے تیموری پر۔ یہ صندوقچہ ایک بہت بڑا شہر ہے جس میں بہت سی عمارتیں جدا جدا طرز کی تجویز کی گئی تھیں، اور سب کی داغ بیل ڈال کر چھوڑ دی گئی ہے۔

علی گڑھ میگزین ——— سبطین احمد بدایونی

جنوری ۱۹۳۹ء

Marfat.com

مئے باقی

زندگی کے آخر زمانے میں لکھنؤ کے شیعہ سنّی فسادات، لاہور کی مسجد شہید گنج کے قضیے اور پنجاب کی حکومت وقت اور خاکساروں کے خوں ریز تصادم سے بہت ملول خاطر تھے۔ میں دہلی چلا گیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے ایک تو سکھوں کے بارے میں اس مقالہ کی فرمائش کی جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ENCYCLOPAEDIA BRITTANKA) میں درج ہے۔ میں نے نئی دہلی کے ایک کتب خانے کی مدد سے مطلوبہ مقالے کی نقل کر کے میر صاحب کو فراہم کر دی۔

اُن کی دوسری فرمائش مولانا اسلم جیراج پوری کے مضمون "نادر شاہ اور اتحادِ شیعہ سنّی" کے لیے تھی۔ یہ مضمون کسی زمانے میں رسالہ "طلوعِ اسلام" میں شائع ہوا تھا، لیکن اس رسالے کا مطلوبہ شمارہ نایاب ہو چکا تھا۔ ایک جگہ "طلوعِ اسلام" کی متعلقہ جلد تک اس شرط پر رسائی ہوئی کہ اس کے مالک کے یہاں ہی بیٹھ کر نقل کر لوں۔ مضمون خاصہ طویل تھا اور اس لیے اس کی نقل کے واسطے کافی وقت درکار تھا۔ اس نقل کے کام پر میری تیسری نشست تھی۔ لیکن معاملہ قابو میں نہیں آ رہا تھا میں صاحبِ خانہ کے برآمدے میں تنہا بیٹھا لکھ رہا تھا، وہ خود کہیں گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک بزرگ وہاں آئے اور برابر پڑی ہوئی چھوٹی سی ڈھیلی ڈھال، بان دان کی کُھری چارپائی پر سیاہ چشمہ لگائے، ہاتھوں کا تکیہ بنا کر، ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر لیٹ گئے۔ میرے دل میں اچانک خیال گزرا کہ ہو نہ ہو یہ مولانا اسلم جیراج پوری ہیں۔

مولانا سے میری ملاقات تو تھی ہی نہیں، البتہ کبھی "نیرنگ خیال" لاہور کے اقبال نمبر میں اُن کی تصویر ضرور دیکھی تھی۔ اُس تصویر اور ان بزرگ میں تغیرات کے باوجود مماثلت کا شبہ ہوتا تھا۔ میں نے بات کرنے میں پہل کی۔ مجھے مسرت آمیز تعجب ہوا کہ میرا قیاس صحیح نکلا۔ میں نے مولانا سے صورتِ حال عرض کی۔ انھوں نے مسرت کا اظہار فرمایا کہ میر محفوظ علی جیسی قبحر ہستی نے مولانا کے مضمون کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ فرمایا — "مضمون کافی طویل ہے۔ کہاں تک نقل کرو گے؟" میں نے عرض کی۔ "کوئی اور صورت بھی تو نہیں" آخرکار اسلم صاحب نے مجھے اس مضمون کی کٹی چھپی ہوئی کا بیان ایک

ذریعے سے قیمتاً دلوادیں۔ یہ مضمون ان کے مجموعہ " نوادرات " میں موجود ہے۔

مولانا نے خود میر صاحب کے مضامین کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ میں نے عرض کی کہ میں کئی بار تحریک کر چکا ہوں کہ اُن کی شیرازہ بندی کر کے کتابی صورت میں شائع کرا دیا جائے، لیکن میر صاحب ہمیشہ ٹال دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ " ستر سال کے تجربے نے مجھے اسی نتیجے پر پہنچایا کہ 'کتاب' ہے تو صرف ایک' اور بس۔" مولوی نہال بدایونی فرماتے ہیں۔ "حج کو گئے۔ واپس آئے۔ میں نے کہا میر صاحب مصر، ایران یا عراق سے کوئی عمدہ عربی یا فارسی کی کتاب دستیاب ہوئی۔ فرمایا بہت عمدہ کتاب ملی ہے۔ عرض کیا کیا؟ فرمایا کہ وہ کتاب کہ جس نے دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی اور ہمیشہ کے لیے انسان کی زندگی کو مکمل دستور العمل دیا۔ اور قرآن پاک کی ایک جلد دی۔ کہا یہ پڑھو اور سمجھ کر پڑھو۔

میں بدایوں گیا تو مولانا اسلم کے مضمون کی دو کاپیاں لے کر میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے متعلق سارا ماجرا سنایا۔ دوسری کاپی " ڈسٹرکٹ گزٹ" بدایوں کے اڈیٹر شیخ معظم علی مرحوم نے مانگ لی جو اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہندوستان میں ریزگاری کی شدید قلت ہو گئی تھی۔ میر صاحب مسکرا کر بولے۔ " اس کی قیمت ڈاک کے ٹکٹوں سے ادا کروں یا دیا سلائی کی ڈبیوں سے۔" اُن دنوں ان چیزوں نے روزمرہ کے لین دین کے لیے ریزگاری کے بدل کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ میں نے عرض کی۔ " اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ تو میری طرف سے ناچیز ہدیہ ہے۔" بولے۔ " تم دہلی میں رہتے ہو۔ مجھے کبھی کبھار ان چیزوں کی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔ لہذا اصولاً قیمت لے لینی چاہیے۔ میں نے عرض کی۔ " اگر کسی موقع پر آپ کی مطلوبہ اشیاء میری بساط سے باہر ہوئیں تو اس صورت میں معاوضہ لوں گا۔" اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔

مولانا اسلم جیراج پوری کے حوالے سے میں نے میر صاحب سے ان کے مضامین کی اشاعت کا ایک بار پھر تذکرہ کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ " ایک دفعہ اکٹھے کیے تھے تو احسن مارہروی لے گئے اور واپس نہ کیے۔ انھیں اپنی تصنیف کے لیے اردو کے اسالیب بیان کے نمونے درکار تھے۔ پھر کہنے لگے کہ۔ " ابنِ علی بھی دیر سے مصر تھے، لہذا پھر جمع کیے ہیں۔ کچھ تو میرے پاس نکل آئے،

Marfat.com

باقی، "انتخاب نقیب" اور "ملفوظاتِ حاجی بغلول" سے مل گئے جو دونوں کتابیں تم نے مجھے دی تھیں۔ اب وہ سب ابنِ علی کے پاس حیدر آباد میں ہیں۔"

مجھ سے فرمایا کہ — "عبدالحق لغات کے سلسلے میں بضد ہیں کہ میں دہلی اُن کے پاس آؤں اور چند مسائل میں ان کی مدد کروں۔ اگر آیا تو تمھاری ملاقات دلی میں مقیم پرانی ہستیوں بالخصوص عبدالحق حسن نظامی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے کرادوں گا۔" مجھے اپنے پوتے مسعود علی کے پاس کبھی کبھی پھیرا کرنے کی ہدایت بھی کی جو جامعہ ملیہ میں زیرِ تعلیم تھے۔ میں اس غرض سے ایک دو بار اوکھلے گیا بھی اور مسعود سے ملا۔

وہ سکھوں اور مسجد شہید گنج، نیز شیعہ سنی اختلافات کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن عمر نے وفا نہیں کی۔ میری ان سے یہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد نہ تو انھوں نے مجھ سے کوئی فرمائش کی اور نہ وہ خود دہلی آئے۔ ان کی وفات کی خبر دہلی میں مجھے ملی تو غالب پر حالی کا مرثیہ یاد آیا اور نظمی بدایونی کا ایک شعر کچھ ترمیم کے ساتھ ذہن میں آگیا ؎

خواجہ حالی جو غالب کے لیے فرما گئے
شعر وہ محفوظ علی صاحب پہ صادق آگئے

دوسری بات میرے ذہن میں، نہ جانے کیوں، ابھری وہ خواجہ فریدالدین عطّار سے متعلق ایک واقعہ تھا جو کبھی انھوں نے مجھے سنایا تھا۔ وہ واقعہ یہ ہے۔ خواجہ فریدالدین حسبِ دستور اپنے کاروبار میں مشغول تھے کہ ایک روز ایک فقیر کا گزر ہوا۔ فقیر نے صدا لگائی — "بابا، اللہ کے نام پر کچھ دے۔" خواجہ فقیر کی جانب متوجہ نہ ہوئے۔ وہ کام میں اس قدر محو تھے کہ جواب کا بار نہ پایا، گو فقیر نے بار بار صدا لگائی۔ بالآخر فقیر نے جھلّا کر کہا — "مصروفیت کا یہ عالم ہے تو جان کیسے دوگے؟" خواجہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "جیسے تم دوگے۔" فقیر نے کہا — "میری برابری کیا کروگے۔" یہ کہہ کر کاسۂ گدائی سر کے نیچے رکھ کر دراز ہوگیا، لا الٰہ الا اللہ کی ضرب لگائی اور جان دے دی۔ خواجہ کے دل پر اس واقعے کا اتنا اثر ہوا کہ آن کی آن میں کاروبار لٹا کر درویشی لے لی۔ میر صاحب نے فرمایا کہ موت آئے تو اس درویش جیسی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی "گنج ہائے گراں مایہ" میں فرماتے ہیں۔

Marfat.com

سید کی شخصیت کا یہ کمال تھا کہ کوئی کسی ذوق یا مسلک کا کیوں نہ ہو سید سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ میرے بعض احباب انگریزی تہذیب و معاشرت کے دلدادہ اور انگریزی حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے سبب سے زندگی اور ملنے کا مخصوص تصور رکھتے ہیں۔ ان کو مشرقی آداب بود و ماند سے کوئی سروکار نہ تھا یہاں تک کہ شرقیت کا مذاق اڑانا اپنی طرز زندگی کا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ اس قبیل کے ایک دوست بدایوں پہنچ گئے۔ ایک بار علیگڈھ آئے اور ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے سید صاحب سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح سنایا جیسے زندگی میں ان کو ایسا عجیب و غریب واقعہ کبھی پیش نہ آیا تھا۔ کہنے لگے بھائی ' یہ سید تو کہیں بند نہ تھا۔ اس پر کسی کا رعب ہی نہ پڑتا تھا۔ میں نے ایسا شریر و شگفتہ بڈھا کہیں نہ دیکھا۔ جو بات جہاں کہہ دیتا اور جتنا برجستہ کہتا وہ کسی کے اٹھائے نہ اٹھتی تھی۔ میں نے ایسا باغی نہ دیکھا جس کی کہیں سے گرفت نہ ہو سکتی تھی یہ بڈھا تو ذہین نوجوان اور حسین عورت سے زیادہ کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کے سامنے چپ بھی نہیں رہا جاتا تھا اور بے باک ہونے کی جرأت بھی نہ ہوتی تھی۔ سید صاحب کی وفات کے بعد دوست کو یہ خبر سنائی تو دم بخود سے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بولے 'بھئی میں ہوتا تو اس کی میت دیکھنے خود جاتا۔ مرنے پر بھی اس کی دلفریبی نہ گئی ہوگی۔

"ورق تمام ہوا"

——— مولف

گجر شام غریباں کا

بہ بر و بحر زمین فرصتِ اقامت نیست
بہ چار حد جہاں می زنند طبلِ رحیل

آج جب یہ تالیف ترتیب، کتابت اور تصحیح کی طویل مسافت قطع کرکے طباعت کی منزل میں داخل ہو رہی ہے تو میرا ذہن کئی ان دانشوروں کی طرف جاتا ہے۔ جنھوں نے اس کی تشکیل و تدوین کے سلسلے میں تو میری اعانت فرمائی لیکن جواب اس کے مطالعے کے لیے اس جہانِ فانی میں موجود نہیں۔ جب کبھی سر میں شعر کا سودا تھا اس وقت کا اپنا ہی ایک شعر زبان پر آتا ہے ؎

مجھے چھوڑ کر اکیلا دبے پاؤں چل دیے سب
نہ جرس کا شور اٹھا نہ غبار کارواں سے

جن حضرات متعلقہ نے اس کارواں سرائے سے کوچ کیا وہ علی الترتیب یہ ہیں۔

(۱) مولانا عبدالحامد بدایونی نے کراچی میں ۲۱ جولائی ۱۹۷۰ء کو وفات پائی اور وہ شارع منگھوپیر کے کنارے اپنی قائم کردہ درس گاہ میں سپرد خاک ہوئے۔ جب میں نے اس تالیف کے لیے سلسلہ جنبانی کی تو مولانا کو میرے بارے میں مغالطہ ہوا۔ ۱۲ اگست ۱۹۶۹ء کو انھوں نے میرے مراسلے کے جواب میں لکھا: "ڈاک میں محی الدین صاحب کے نام کا ایک لفافہ دیکھا تو دستخطوں سے پہچانا کہ آپ غازی محی الدین صاحب اجمیری عرف پیارے میاں معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا۔ دو ماہ بعد جب میری

ملاقات غازی صاحب سے ہوئی تو میں نے انھیں یہ لطیفہ سنایا۔ وہ ہنسے اور بولے کہ تم اور میں دونوں اکٹھے کسی دن مولانا کے پاس چلیں گے۔ افسوس کہ غازی صاحب ۱۵ اپریل ۱۹۷۱ء کو وفات پاگئے اور ان کے تین ماہ بعد خود مولانا نے ملکِ عدم کی راہ لی۔ ان کی خدمت میں ایک بار پھر میری حاضری تو ہوئی لیکن آخری دیدارِ میت اور نمازِ جنازہ میں شمولیت کے لیے۔ سید محفوظ علی صاحب کے مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے مجھے تحریر فرمایا۔ "جناب محی الدین صاحب اس خصوص میں کوشش کریں تو بڑی خدمت ہوگی اور بدایوں کا یہ علمی و ادبی انسان اور اس کی زندگی بے نقاب ہو جائے گی۔ اور موجودہ نسل کے لیے سرمایۂ حیات بن جائے گی۔"

(۲) مولوی سبطین احمد بدایونی کا انتقال کراچی میں ۲۵ اگست ۱۹۷۱ء کو ہوا اور وہ گورستانِ سخی حسن میں سپردِ خاک ہوئے۔ ہجری سالِ وفات (۱۳۹۱) اس مصرع سے نکلتا ہے ع "گلشنِ خلد میں آباد ہیں سبطین احمد"۔ ان کا رتبہ میر محفوظ علی صاحب کے بزم نشینوں میں بہت بلند تھا۔ جب میں نے ان سے رجوع کیا تو وہ بولے۔ "افسوس ہے کہ میر صاحب کو ہم نے بہت جلد بھلا دیا۔" پھر انھوں نے اپنا ایک پرانا مضمون "میر صاحب" یہ کہتے ہوئے مرحمت فرمایا۔ "تحفۂ درویش یہی کچھ ہے۔" جب اس تالیف کا مسودہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو اسے دیکھ کر انھوں نے فرمایا۔ "یہ تم نے بڑا کام کیا۔"

(۳) مولانا غلام رسول مہر نے لاہور میں ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو وفات پائی اور وہیں اپنے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ انھوں نے اپنے آخر دم تک اس تالیف کی ترتیب میں دلچسپی لی اور اس کی اشاعت میں تاخیر پر مرتے مرتے اظہارِ تاسف کرتے رہے۔ آخر میں ہم دونوں سید محفوظ علی، مولانا محمد علی جوہر اور خواجہ حسن نظامی مرحومین کے باہمی تعلقات کے بارے میں چھان بین کر رہے تھے۔ بات خواجہ صاحب کے "روزنامچہ، سفرنامہ ہندوستان" تک پہنچی جس کا مہر صاحب اس سلسلے میں از سرِ نو مطالعہ کر رہے تھے اور اس میں سے متعلقہ حصوں کا اقتباس میرے لیے فرما رہے تھے۔ اپنی وفات سے صرف ڈیڑھ ماہ پیشتر ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء کو انھوں نے مجھے لکھا۔ "میرے ذہن میں ان اقتباسات سے سید صاحب کی شخصیت کا جو نقشہ قائم ہوا وہ

Marfat.com

اس سے بالکل مختلف ہے جو پہلے تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم کے اس دور کی تصویر (مراد ہے تحریری تصویر) بھی اس میں مل گئی جب وہ ریاست بڑودہ میں بڑے افسر تھے۔ ہنر صاحب کی عنایات کے سبب یہ کتاب انھیں کے نام نامی سے معنون ہے گو وہ اب ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔

(۴) سید حسن ریاض نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو کراچی میں وفات پائی اور وہیں جامعہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ وہ اپنی تصنیف "پاکستان ناگزیر تھا" کے تیسرے ایڈیشن کی اصلاح فرما رہے تھے۔ اسی ہنگام چشمہ اتارا اور آنکھیں موند لیں۔ گویا کچھ غور کرنا چاہتے تھے، لیکن دیکھا تو ان کی روح سفر آخرت پر روانہ ہو چکی تھی۔ کتنی قابلِ رشک موت انھوں نے پائی۔ "دودھ اور گنگا جل" والا مضمون ان ہی کی رہبری کا مرہونِ منت ہے۔

(۵) پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی نے فروری ۱۹۷۳ء میں ہندوستان میں وفات پائی۔ سید محفوظ علی صاحب کے یارِ غار مولانا ظفر الملک کے وہ بھتیجے تھے۔ میں نے فرقت صاحب سے اس تالیف کے سلسلے میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ بہرحال انھوں نے اپنی تصنیف "اردو ادب میں طنز و مزاح" میں سید محفوظ علی صاحب کی تحریروں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس سے میں نے پورا استفادہ کیا۔

(۶) پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے ۸ جولائی ۱۹۷۳ء کو علی گڑھ میں انتقال فرمایا۔ "انتقالِ ضیا" سے ان کی وفات کا سال ہجری (۱۳۹۳) نکلتا ہے۔ انھوں نے بطور خاص اس مجموعے کا مقدمہ "ذکرِ میر" کے عنوان سے قلمبند فرمایا اور ساری دشواریوں کے باوجود ہندوستان سے میرے لیے اسے کراچی بھجوایا۔ جب اس سے پیشتر میں نے اس تالیف کا خیال ان سے ظاہر کیا تھا تو ۲۳ دسمبر ۱۹۶۹ء کو انھوں نے مجھے لکھا۔ "اگر مجموعہ مضامین وہاں (یعنی پاکستان میں) شائع ہونے کا انتظام ہو جائے تو ضرور سعی کیجیے۔ ایک مفید ادبی خدمت کے علاوہ ناشر کے لیے نفع کا موقع ہے۔" پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا مقدمہ جب میں نے اپنے محترم دوست ڈاکٹر شوکت سبزواری (متوفی کراچی ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء مدفون قبرستان الطاف نگر) کو دکھایا تو انھوں نے کہا۔ "مقدمہ بہت خوب ہے اور اس کے لیے ضیاء

صاحب کا انتخاب تم نے نہایت مناسب کیا۔" میں نے کہا۔" اشاعت کے بعد تبصرہ آپ کو کرنا ہوگا۔" بولے۔" ضرور" اور پھر کہنے لگے" مضامین محفوظ علی کا مطالعہ میں نے حال ہی میں کیا ہے۔ بھئی وہ بنیادی طور پر طنز نگار تھے۔ ان کا اسلوب نگارش پختہ اور دلنشین ہے۔ برمحل الفاظ سے وہ بڑی حسین عبارت آرائی کرتے ہیں۔"

(۷) مولوی نہال الدین فرشوری بدایونی نے ۱۲ فروری ۱۹۷۴ء کو بدایوں میں وفات پائی۔ میری درخواست پر انھوں نے ایک مفصل تحریر سید محفوظ علی صاحب کے بارے میں ہزارہا دقتوں کے باوجود بدایوں سے کراچی بھجوائی جس سے میں نے استفادہ کیا۔

(۸) عباس احمد عباسی نے ۸ مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں وفات پائی۔ جان ہار انجمن ترقی اردو پاکستان کے شریک معتمد تھے مرحوم کا اس کتاب کی اشاعت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ دراصل اس کی اشاعت کی بات مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے توسل سے ۱۹۷۰ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے طے پاچکی تھی۔ بعد میں شیخ صاحبان کو کاغذ کی کمیابی اور گرانی کی دشواریاں پیش آئیں اور پھر مولانا مہر بھی ہم سے رخصت ہوگئے۔ یوں یہ بات رفت وگزشت ہوئی۔ میں کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک دن عباسی مرحوم میری طرف آنکلے۔ ان سے ذکر ہوا تو وہ مسودہ میرے پاس سے لے گئے اور کہا کہ جو تعلق خاطر مولوی عبدالحق کو سید محفوظ علی مرحوم کی ذات سے تھا اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت انجمن ترقی اردو ہی کرے۔ پھر انھوں نے اس بارے میں بڑے انصرام اور تگ و دو سے کام لیا۔

(۹) پروفیسر حمید احمد خاں نے لاہور میں ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں گلبرگ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ مرحوم سید محفوظ علی کے ہم جماعت اور رفیق مولانا ظفر علی خاں کے بھائی تھے۔ انھوں نے اس تالیف کے سلسلے میں میری کوششوں کو بہت سراہا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو انھوں نے مجھے لکھا۔" اگر آپ مرحوم کی تمام تحریروں کو یک جا کر کے شائع فرما سکیں تو یہ اردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔" یہ کام تو ہوگیا لیکن افسوس کہ حمید صاحب اس کا مطالعہ نہ کرسکے۔

Marfat.com

(۱۰) سید ابن علی بدایونی نے علی گڑھ میں ۲۷ مارچ ۱۹۷۲ء کو انتقال فرمایا۔ وہ سید محفوظ علی صاحب کے خلفِ اکبر تھے۔ انھوں نے اپنے والد مرحوم کے متعدد مضامین کی فراہمی میں میری بڑی مدد فرمائی۔ انتہائی دشواریوں کے باوجود انھوں نے کئی نایاب تحریریں علی گڑھ سے میرے پاس کراچی پہنچوائیں اور اپنے والد ماجد کے مستند سوانح حیات بھی اس مجموعے کے لیے بطور خاص مرحمت فرمائے۔ وہ مجھے برابر لکھتے رہے کہ کسی طرح یہ مجموعہ ان کی زندگی میں طبع ہو جائے۔ میں نے انھیں اشاعت کا تو یقین دلا دیا تھا، لیکن وقت کا تعین میرے بس میں نہ تھا۔ بہرحال مرنے سے قبل انھیں یہ علم تھا کہ اس بارے میں انجمن ترقی اردو پاکستان سرگرم عمل ہے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۶۷ء کو انھوں نے اپنی ایک تحریر میں کہا تھا کہ یہ کام پورا ہو جائے تو "جب بلاوا آئے تو مطمئن اور خوش جاؤں کہ ان (یعنی والد مرحوم) کے سامنے پہنچ کر شرمساری نہیں ہو۔" افسوس میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی کہ یہ کتاب بھائی ابن علی کو پیش کرتا۔

آخر میں دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے ؎

یا آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

کراچی
۷ جون ۱۹۷۲ء

محمد محی الدین بدایونی

آخری بات

مولوی سبطین احمد بدایونی کے مضمون "میر صاحب" کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ ہوا یوں کہ جب علی گڑھ میگزین کے علی گڑھ نمبر (شمارہ جنوری ۱۹۲۹ء) کی ترتیب اور اشاعت کا کام (ڈاکٹر) ابواللیث صدیقی کی ادارت اور پروفیسر ضیا احمد صاحب کی نگرانی میں شروع ہوا تو سیّد محفوظ علی صاحب کے سوانح حیات کے لیے ان حضرات کے تقاضے ہوئے۔ اسی سلسلے میں یہ مضمون اس طرح مرتب ہوا کہ سیّد صاحب نے خود حالات بیان کیے جنھیں سبطین صاحب قلمبند کرتے گئے۔ اس لیے سیّد محفوظ علی صاحب کے بارے میں یہ مضمون ایک خاص حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ایک لحاظ سے یہ سیّد صاحب کی "خود نوشت" ہے۔ اس مضمون کے کچھ حصے تو میں اس کتاب میں پہلے نقل کر چکا ہوں۔ چند اور حصے جو دلچسپ ہیں اور معلومات سے پر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

میر صاحب

مڈل پاس کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں (میر صاحب) بریلی بھیجے گئے جہاں انٹرینس کی تعلیم اور دارالاقامہ کی زندگی شروع ہوئی۔ شوکت علی اور محمد علی بھی اس بورڈنگ میں رہتے تھے۔ اور یہیں سے میر صاحب کے تعلقات ہندوستان کے ان نامور فرزندوں سے قائم ہوئے جو مرور ایام کے ساتھ گہری محبت میں تبدیل ہوتے گئے یہاں تک کہ موت کے ہاتھ نے ان ریشمی رشتوں کو توڑ دیا۔ محمد علی کسی قدر کم عمر تھے اور میر صاحب اکثر بزرگانہ طمانچوں سے اُن کی خاطر کر دیا کرتے تھے۔ بالخصوص جب رات کو گرمی کے موسم میں چارپائیاں

Marfat.com

باہر بچھتی تھیں اور شوکت کی چارپائی پر یارانِ طریقت کا ہجوم ہوتا تھا۔ یہاں تک کے برابر بچھی ہوئی چھوٹے بھائی کی چارپائی بھی گھر جاتی تھی تو محمد علی بچپن کی نیند کے نشے میں میر صاحب کی خالی چارپائی پر سو جاتے تھے۔ پیشاب کر دیتے تھے۔ اور فطرت کے اس قصور پر سزا پاتے تھے۔

سنہ ۱۸۹۰ء میں انٹرینس پاس ہونے کے بعد دیرینہ صحبت تتر بتر ہو گئی۔ شوکت اور محمد علی، علی گڑھ چلے گئے۔ ایک مرتبہ جب میر صاحب شوکت سے ملنے علی گڑھ تشریف لے گئے تو شوکت نے اپنے مخصوص سپاہیانہ اور جارحانہ انداز میں گھٹے کی نمائش اور ناک توڑ دینے کی دھمکی دے کر علی گڑھ آجانے پر اصرار کیا۔ چنانچہ محبت کا یہ حربی مظاہرہ خالی نہ گیا اور ایف اے پاس کرنے کے بعد سنہ ۱۸۹۳ء میں میر صاحب بھی علی گڑھ کو سدھار گئے۔

پکی بارک کے ۲۰ نمبر میں جگہ ملی جس میں دو بدایونی اور مقیم تھے۔ مولوی شکور بخش صاحب مرحوم جن کی ناوقت موت نے ایک غیر معمولی جوہر کو دنیا سے اٹھا لیا اور مولوی زوار حسین صاحب جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور میونسپل کمشنر ہیں۔ آس پاس پڑوس کے کمروں میں مولوی نور الحسن صاحب سب رجسٹرار ریٹائرڈ، مولوی قمر علی صاحب وکیل بریلی، مولوی ریاض الدین صاحب وکیل بدایوں، مولوی عبد الحق صاحب، مولوی ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر 'زمیندار'، ڈاکٹر ضیاء الدین، شیخ عبد اللہ اور علی برادران وغیرہ رہتے تھے۔ ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو بعدہٗ اپنی قومی اور علمی خدمات کی بدولت جریدۂ عالم پر ثبتِ دوام حاصل کر چکے ہیں۔ یہ صحبت ایک کارگاہ تھی جہاں مستقبل کے ادیب، خطیب، افاضل اور مشاہیر بن رہے تھے۔ غیر معمولی ذہانت، کثیر مطالعہ، اور متین شوخی نے میر صاحب کو اس انجمن میں ایک محفوظ اور ممتاز مقام دے دیا تھا۔ ایک وجہ امتیاز میر صاحب کی وہ ریش مقدس بھی تھی جو اب سراپا نور ہو کر

رہ گئی ہے۔ سارے کالج میں اس جرم کے مجرم دو ہی تین طالب علم تھے اور ان میں ایک میر صاحب بھی تھے۔ منظرِ عام سے میر صاحب اس وقت بھی محترز رہتے تھے۔ چنانچہ آج یونین کی 'الواحِ افتخار' میں جہاں ظفر علی خاں، شوکت علی اور محمد علی کے نام ملتے ہیں، محفوظ علی کا نام نظر نہیں آتا۔

۱۸۹۵ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سیّد محمود مرحوم نے میر صاحب کو دربار خیرپور کی ملازمت کے لیے منتخب فرمایا۔ ۱۸۹۶ء سے یہ سلسلۂ ملازمت شروع ہوا۔ ابتدا میں اسسٹنٹ جج رہے اور بعد میں جوڈیشل سکریٹری اور ریونیو سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۰۱ء میں سندھ کو خیرباد کہہ کر بمبئی کا رُخ کیا۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی مرحوم ریاست بڑودہ میں محکمۂ افیون کے افسر تھے اور اپنے کارِ منصبی کے سلسلے میں اکثر بمبئی آتے جاتے رہتے تھے۔ اسکول اور کالج کے تعلقات ان ملاقاتوں میں اور زیادہ استوار ہوگئے اور انھی صحبتوں میں پہلی مرتبہ وہ خواب دیکھا گیا جو بعد کو 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' کی عملی صورت میں ظاہر ہوا۔

میر صاحب کو بہت جلد بمبئی سے رخصت ہونا پڑا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب اس وقت حیدرآباد (دکن) میں موجود تھے اور میر صاحب کو طلب کر رہے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد تشریف لے گئے اور مسٹر ہینکن (HANKIN) کے دفتر میں مترجم کی خدمت پر مامور ہوگئے۔ حیدرآباد میں مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولانا ظفر علی خاں، مولوی شبلیؔ اور مولانا شررؔ کی صحبتوں میں وقت گزرتا رہا۔ مولوی شبلیؔ کی خدمت میں تو گفتگو نستعلیق ہوتی تھی لیکن مولوی عزیز مرزا مرحوم اور مولوی عبدالحلیم شررؔ کے ساتھ بے تکلف نشستیں رہتی تھیں۔

یہ لوگ پڑھتے تھے، لکھتے تھے اور ہنستے تھے۔ ادبی ذوق اور زندہ

Marfat.com

دلی اکثر ساتھ رہتے ہیں۔ میر صاحب ایک سندھی دوست سے مل کر واپس آ رہے ہیں، جن کا نام اپنی ندرت اور اعجوبیت کے لحاظ سے ہر طبیعت میں گدگدی پیدا کر سکتا ہے۔ مولوی عزیز مرزا پوچھتے ہیں کہاں سے تشریف آ رہی ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں۔ جنڈوڈے خاں سے مل کر آ رہا ہوں۔ پس توسن طبع پر تازیانہ لگتا ہے۔ مولوی عزیز مرزا برجستہ مصرعہ پڑھتے ہیں۔ جنڈوڈے خاں کی نانی مرگئی'۔ مولانا ظفر علی خاں مطلع کر دیتے ہیں۔

'حیف ہے کیسی پٹھانی مرگئی'۔ پھر تو سلسلہ شروع ہو گیا ؎

بیل کھاتے کھاتے بھوسہ چل بسا
بھینس کھاتے کھاتے سانی مرگئی

غرض تفریح اور تفنن کی یہ چاشنی ان بزرگوں کی صحبت میں عالمانہ مباحث کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

اس زمانے میں سومالی لینڈ میں انگریزی حکومت کو ایک تعلیم یافتہ مسلمان کی ضرورت تھی جو انگریزی قانون اور اسلامی شریعت دونوں سے واقف ہو۔ مسٹر ماریسن اس وقت ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل تھے اور میر صاحب کے استاد رہ چکے تھے۔ اُنھوں نے اس اسامی کے لیے میر صاحب کو منتخب فرمایا اور حیدر آباد خط لکھا۔ میر صاحب نے بھی منظور کر لیا اور درخواست مع نقول اسناد روانہ کر دی۔ آخر ۱۹۰۲ء میں سومالی لینڈ پہنچ کر عہدۂ ججی کا چارج لے لیا۔ اُن پندرہ سولہ اشخاص میں جو برٹش سومالی لینڈ میں اس خدمت پر مامور تھے تنہا یہی ہندوستانی تھے اور باقی سب انگریز اور انگریز بھی اُس قسم کے جو کھاتے زیادہ ہیں اور پڑھتے کم ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے فیصلوں کی خامیاں جب جنرل صاحب یعنی ہائی کمشنر کو بتائی گئیں تو میر صاحب کے سپرد یہ خدمت بھی کر دی گئی کہ ان لوگوں کو قانون سمجھانے کے لیے وقت دیا کریں۔

Marfat.com

سومالی لینڈ کے قیام میں میر صاحب نے دیکھا کہ ایک سادہ زندگی بسر کرنے والی قوم میں مسیحی حکومت کے ساتھ تمدن کے تحفے یعنی شراب اور زنانِ بازاری بھی رائج کیے جا رہے ہیں۔ میر صاحب نے اُدھر تو شیوخ اور اعیان کو آئندہ خطرے سے آگاہ کر کے اس بات پر آمادہ کیا کہ ایک درخواست کے ذریعے سے احتجاج کریں اور ادھر ہائی کمشنر کو مطلع کیا کہ دیسی آبادی میں غم و غصہ بڑھ رہا ہے، مبادا پیالہ لبریز ہو جائے اور چھلک جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شراب کی فروخت ان لوگوں کے ہاتھ جن کو تحریری اجازت حکومت کی طرف سے نہ مل گئی ہو ممنوع کر دی گئی اور عورتوں کا وہ طائفہ جو چند پیسوں کے لیے اپنی عصمت بیچتا تھا منتشر کر دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء تک میر صاحب کا قیام سومالی لینڈ میں رہا۔

۱۹۰۹ء میں رفیقۂ حیات کے انتقال سے ایک بیڑی کٹی اور ہزار بیڑیاں اور پڑ گئیں۔ پھر بھی ۱۹۱۳ء میں جب مولانا محمد علی مرحوم 'کامریڈ' کا دفتر کلکتے سے دلی اٹھا کر لائے تو میر صاحب کو بدایوں سے کھینچ لے گئے اور نقیب ہمدرد' اور 'ہمدرد' کی ادارت اور نگرانی میر صاحب کے سپرد کر دی۔ حیدر آباد کے بعد دلی میں پھر ہم جنسوں کی صحبت میسر آئی۔ اوّل تو کام ہی علمی اور ادبی اور پھر محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسے اصحاب کی موجودگی۔ 'ہمدرد' کی ادارت کے زمانے میں مولانا محمد علی مرحوم اس بے تکلفی سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے جو قدیم تعلقات نے میر صاحب کے ساتھ پیدا کر دی تھی۔

جاڑے کے موسم میں رات کے بارہ بجے ہیں۔ مولانا محمد علی کو کسی مضمون میں ایک شعر چسپاں کرنا ہے۔ شعر نہیں یاد آتا۔ بے تکلف میر صاحب کے کمرے کے دروازے پر گھونسے پڑنے لگتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے اور مولانا محمد علی اس عجلت اور بے صبری کے ساتھ شعر طلب کرتے ہیں گویا ٹمٹم گھر

کی کھڑکی پر ٹکٹ مانگ رہے ہیں اور گاڑی چھوٹی جا رہی ہے۔ چند لمحے بعد میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہر کفے جام شریعت، ہر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام سنداں باختن

شعر کچھ اس قدر حسب موقع ہے کہ مولانا وجد کرتے ہوئے پھر اپنے آفس میں چلے جاتے ہیں اور مضمون لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ آج ان واقعات کی یاد میر صاحب کے لیے ایک روح فرسا چیز ہے۔ اُس محفل کے بیٹھنے والے ایک ایک کرکے گزر چکے۔ چند نفوس باقی ہیں۔ اور وہ بھی چراغ سحری۔

اب بدایوں ہے اور حاجی اور مقدس سید محفوظ علی صاحب سن کے تقاضے سے متانت شوخی پر غالب آگئی ہے اور بالخصوص جدید سیاسی حالات نے اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے لیے جو خطرات پیدا کر دیے ہیں ان کا تکلیف دہ احساس میر صاحب کے سکونِ قلب کو تاراج کر چکا ہے۔ قلم کو جنبش دینا تو بالکل ہی موقوف کر دیا ہے۔ البتہ مطالعہ جاری ہے اور خصوصیت کے ساتھ بعد مغرب قرآن معہ ترجمہ و تفسیر پڑھتے ہیں اور وہ بھی چراغ سحری۔"

سبطین صاحب مرحوم کا یہ مضمون ۴۲ سال پرانا ہے۔ وہ سید محفوظ علی صاحب کی وفات سے چار پانچ سال قبل لکھا گیا تھا اور آج سے اسی نوے سال پرانی صحبتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ آج اس کا اعادہ گزرے ہوئے زمانے کی یاد ہے۔ اس میں اہم نقشانِ رفتہ کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سید محفوظ علی صاحب کی "تلاش" کا سفر جو میں نے برسوں قبل شروع کیا تھا آج اختتام کو پہنچا۔ یہ تالیف میری منزل ہے۔ سید محفوظ علی صاحب کی شخصیت اور فن کی عظمتوں کا محاصرہ الفاظ و بیان میں جس قدر ممکن تھا کیا لیکن دل کی بات پھر بھی لب پر آتی ہے ؎

زبان ز نطق فرو ماند راز من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

کراچی، ۶ اگست ۱۹۷۴ء ———— محمد محی الدین بدایونی

Marfat.com

کتابیات

۱۔ خطاب از ملّاجی۔ الناظر بک ایجنسی، لکھنؤ۔ مولانا ظفر الملک علوی مرحوم

۲۔ مضامین محفوظ علی۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان)، کراچی۔ مولوی عبدالحق مرحوم

۳۔ مقدماتِ عبدالحق۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

۴۔ چند ہم عصر۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ مولوی عبدالحق مرحوم

۵۔ علی گڑھ میگزین، سالنامہ ۱۹۳۳ء مدیر آل احمد سرور

۶۔ علی گڑھ میگزین، اکتوبر ۱۹۳۹ء۔ مدیر ابو اللیث صدیقی

۷۔ خطوطِ محمد علی۔ مکتبۂ جامعہ، دہلی۔ پروفیسر محمد سرور

۸۔ سیرتِ محمد علی۔ مکتبۂ جامعہ، دہلی۔ مولانا رئیس احمد جعفری مرحوم

۹۔ علی برادران۔ محمد علی اکیڈمی، لاہور۔ مرتبہ مولانا رئیس احمد جعفری مرحوم

۱۰۔ محمد علی، ذاتی ڈائری۔ معارف پریس، اعظم گڑھ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔

۱۱۔ مقالاتِ ماجد۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور۔ مولانا عبدالماجد دریابادی

۱۲۔ صدق، لکھنؤ ۸ر نومبر ۱۹۴۳ء مدیر مولانا عبدالماجد دریابادی

۱۳۔ کتاب الاشرار۔ مولانا ظفر الملک علوی مرحوم

۱۴۔ چٹکیاں اور گدگدیاں خواجہ حسن نظامی مرحوم

۱۵۔ سفرنامہ (۱۹۰۷ء) خواجہ حسن نظامی مرحوم

۱۶۔ روزنامچہ (۲۳-۱۹۲۲ء) خواجہ حسن نظامی مرحوم

۱۷۔ میرا افسانہ۔ غیر مطبوعہ۔ ملّا واحدی۔

Marfat.com

۱۸ - عصمت، کراچی، سالگرہ نمبر ۱۹۶۴ء، سوانح عمری علامہ راشد الخیری - مدیر مولانا رازق الخیری۔

۱۹ - طنزیات و مضحکات - ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد - پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

۲۰ - خنداں - مکتبۂ جامعہ، دہلی - پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

۲۱ - گنج ہائے گراں مایہ - فرینڈز پبلشرز، راولپنڈی - پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

۲۲ - یادِ رفتگاں - مکتبۃ المشرق، کراچی - مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم۔

۲۳ - حیاتِ شبلی - مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم۔

۲۴ - عظمتِ رفتہ - تعلیمی مرکز، کراچی، مولانا ضیا الدین احمد برنی مرحوم

۲۵ - اردو ادب میں طنز و مزاح - اکادمی پنجاب ٹرسٹ - ڈاکٹر وزیر آغا

۲۶ - انتخاب آل احمد سرور - لاہور اکیڈمی لاہور، مرتبہ فقیر احمد فیصل

۲۷ - سخنہائے گفتنی - کتاب منزل، پٹنہ - پروفیسر کلیم الدین احمد۔

۲۸ - اردو ادب میں طنز و مزاح - ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ - پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی۔

۲۹ - تنقیدیں - انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ - ڈاکٹر خورشید الاسلام۔

۳۰ - آج کا اردو ادب - فیروز سنز لمیٹڈ لاہور - ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔

۳۱ - صحافت پاکستان و ہند میں - مجلس ترقی ادب، لاہور - ڈاکٹر عبد السلام خورشید

۳۲ - فنِ صحافت - مرکزی اردو بورڈ لاہور - ڈاکٹر عبد السلام خورشید۔

۳۳ - منتخب التواریخ - ملا عبد القادر بدایونی - شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور - ترجمہ محمود احمد فاروقی۔

۳۴ - تذکرۃ الواصلین - نظامی پریس، بدایوں - مولوی رضی الدین بسمل مرحوم۔

۳۵ - تجلیات سخن - نظامی پریس - بدایوں - مولوی نظام الدین حسین نظامی مرحوم۔

۳۶ - ذوالقرنین، بدایوں نمبر - نظامی پریس - بدایوں - مدیر مولوی احید الدین نظامی۔

۳۷ - حیاتِ امیر خسروؒ - شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور - خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی مرحوم

۳۸ - ادبی خطوط غالب - ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ - مرزا محمد عسکری مرحوم

Marfat.com

۳۹۔ اقبال نامہ۔ شیخ محمد اشرف، لاہور۔ مرتبہ شیخ عطا اللہ۔

۴۰۔ نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر ۱۹۵۷ء۔ مدیر محمد طفیل

۴۱۔ نقوش، لاہور، طنز و مزاح نمبر ۱۹۵۹ء۔ مدیر محمد طفیل

۴۲۔ نقوش، لاہور، اگست ۱۹۶۱ء۔ مدیر محمد طفیل

۴۳۔ نگار، کراچی، سالنامہ ۱۹۶۶ء اصناف ادب نمبر۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۴۴۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

۴۵۔ افادات مہدی، مہدی افادی

۴۶۔ فصیح الملک (رسالہ) مدیر مولانا احسن مارہروی

سید محفوظ علی صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ مرتب کیا جا چکا تھا کہ پروفیسر محمد ایوب قادری کی سعی سے سید صاحب کے تین اور مضمون دستیاب ہوئے جو قادری صاحب کے شکریے کے ساتھ اس تالیف میں شامل کر لیے گئے ان میں "صوبجات متحدہ" مولانا احسن مارہروی مرحوم کے رسالہ "فصیح الملک" میں نکلا تھا۔ "شہاب ثاقب" اور "تقلید کا اثر اقوام کی نشو و نما پر" مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے رسالہ "دکن ریویو" سے ماخوذ ہیں۔

مولف

صحت نامہ

ہمیں افسوس ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے کتاب میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئیں لیکن اکثر ایسی ہیں جنھیں قارئین خود درست فرما لیں گے۔ البتہ ذیل میں چند ضروری غلطیوں کی تصحیح پیش کی جاتی ہے۔

صفحہ		غلط	صحیح
۵۰۱	آخر سے تیسری سطر	مہور	لہور
۵۰۲	(حاشیہ)	صدیقی کے بیٹے ہیں	صدیقی ان کے بیٹے ہیں
۵۰۸	شجرے میں اس طرح پڑھا جائے		حاجی احمد

Marfat.com

طنزیات و مقالات

سیّد محفوظ علی بدایونی

+++

مؤلفہ

محمد محی الدین بدایونی، بی اے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۔۱

Marfat.com